#

Cot by Ah

OSMANIA UNIVERSITY

سیاسی تاریخ ہند

جلد اوّل

سلسلۂ نصابیات علمیہ جامعۂ عثمانیہ

سیاسی تاریخ ہند

جلد اوّل

از سنہ ۱۷۸۴ء تا سنہ ۱۸۲۳ء

تصنیف

میجر جنرل سر جان میلکم

جی۔ سی۔ بی۔ کے۔ ایل۔ ایس۔ ایف۔ آر۔ ایس۔ وغیرہ وغیرہ

ترجمہ

مولوی ابن حسن صاحب، ایم۔ اے۔

مددگار پروفیسر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

سنہ ۱۳۵۱ھ م سنہ ۱۳۴۱ف م سنہ ۱۹۳۲ء

دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

یہ کتاب مسٹر جان مرّے پبلشر (لندن) کی اجازت سے
جن کو حق اشاعت حاصل ہے اردو میں ترجمہ کر کے
طبع و شائع کی گئی ہے۔

فہرست مضامین

سیاسی تاریخ ہند جلد اول (میلکم)

پہلا باب

دوسرا باب

لارڈ کارنوالس کا عہد حکومت

تیسرا باب

سر جان شور کی حکومت

چوتھا باب

لارڈ ویلزلی کا دور حکومت

۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۵ء

پانچواں باب

۱۸۰۵ء تا ۱۸۰۶ء

لارڈ کارنوالس کا دوسرا دور

اور

سرجارج بارلو کے عہد حکومت کے واقعات

(جسونت راؤ ہولکر سے صلح ہونے کے وقت تک)

ساتواں باب

مارکوئس ہیسٹنگز کا دور حکومت

۱۸۱۳ء تا ۱۸۲۳ء

تمت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیاسی تاریخ ہند

(میلکام)

پہلا باب

دیباچہ

انگلستان نے مشرق میں جو بڑی شہنشاہی قایم کی ہے وہ آنے والی نسلوں (۱)
کے لئے ایک حیرت انگیز چیز ثابت ہوگی۔ بحر اٹلانٹک کے ایک چھوٹے سے
جزیرے کا ہندوستان سے وسیع ملک کو فتح کرنا اور اُسے مثل ایک صوبے
کے اپنے زیر اقتدار رکھنا بجائے خود ایک ایسا واقعہ ہے جس کا ذکر حیرت
پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہمارا یہ تحیر اور زیادہ ہو جاتا ہے جب ہم یہ معلوم
کرتے ہیں کہ یہ فتح قوم کی مجموعی طاقت سے نہیں بلکہ سوداگروں کی ایک جماعت
کے ذریعے سے حاصل ہوئی ہے۔ ابتدا میں اس جماعت کو بذریعۂ منشور محض تجارت
کرنے اور بزور شمشیر اپنے مال کی حفاظت کرنے کا اختیار اور حق عطا کیا گیا تھا
لیکن چند ہی سال کی مدت میں وہ اپنے گماشتوں اور کارندوں کی جدوجہد
اور اولوالعزمی۔ دیگر اقوام یورپ کی حریفانہ سرگرمی اور والیانِ ملک کی کمزوری
اور ریاکاری کی بدولت بہت جلد شاہی اختیارات کی مالک بن بیٹھی اور ان (۲)
والیان ملک کی نظر میں یہ جماعت اپنی غاصبانہ حرکتوں یا نمول کی وجہ سے
رشک کرنے یا لوٹنے کے قابل ایک چیز ہوگئی۔ غرض یہ ادنیٰ کارخانوں کے
نظار ابھی اپنی تجارتی حیثیت ختم نہ کرنے پائے تھے کہ وہ حقیقی معنوں میں

خودمختار بادشاہوں کی طرح وسیع سلطنتوں پر حکومت کرنے لگے۔

جو لوگ بڑے بڑے انقلابوں کے اسباب پر غائر نظر ڈالنے کے خوگر ہیں اور جو ان انقلابات کو حریص مدبرین سیاست کے پیچیدہ اختراعات کا نتیجہ نہیں سمجھتے بلکہ فطری اور بدیہی اسباب کے سیدھے سادے عمل کا نتیجہ تصور کرتے ہیں وہ شاید یہ معلوم کر لینگے کہ جن ذرائع سے ہندوستان انگلستان کے زیر اقتدار لایا گیا وہ (خواہ بادی النظر میں کتنے ہی ناکافی کیوں نہ معلوم ہوں) دیگر تمام ذرائع کے مقابلے میں اس بڑے مقصد کے حصول کے لئے بہترین تھے۔ ہند کے ساحل پر فوج و لشکر کے ساتھ اس طرح پہنچ جانا کہ کوئی مزاحم نہو ممکن نہ تھا۔ لیکن سیدھے سادے تاجر جب وہاں پہنچے تو والیان ملک نے ہر طرح سے ان کی ہمت افزائی کی۔ اور ابتداء میں جس حزم و احتیاط سے اِن نو واردوں نے اپنے مال و اسباب کو دوسروں کی دست برد سے محفوظ رکھا اُس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ جس طرح یہ لوگ اپنے تجارتی معاملات میں پختہ کار تھے اسی طرح فوجی خصوصیات میں بھی اعلیٰ و برتر تھے۔ اس بنا پر ہندوستان کی ممتاز طاقتوں نے ان سے حسد نہیں کیا بلکہ انھیں تحسین کی نظر سے دیکھا اور آیندہ چل کر ایک دوسرے کے خلاف وہ اُن کی امداد و اعانت کی خواہاں بن گئیں۔

(۳) اس قسم کی اعانت سے انکار کرنا اِن تاجروں کے لئے نہ صرف ناممکن تھا بلکہ بسا اوقات خود اِن کی حفاظت کے لئے سخت خطرناک تھا۔ اس کے برعکس مدد دینے سے اُن کے حقوق و مراعات میں اضافہ ہوتا تھا جو کمپنی کے لئے نفع بخش اور توسیع تجارت کا باعث ہوتا تھا۔ اس طور پر اُنھیں ابتداء میں اپنا وجود مستحکم کرنے اور اپنی تجارتی کاروبار کی سر سبزی بڑھانے کے خیال سے سیاسی تعلقات قایم کرنے پڑے۔ اسی طریقے سے گو اُن کے انتظام کی ظاہری شکل بدستور قائم رہی تاہم اس کی حیثیت قطعی بدل گئی۔ ملک کے سیاسی معاملات اور پیچیدہ تعلقات میں وہ اس قدر الجھ گئے کہ اُن سے نکلنا اُن کے اختیار سے باہر ہوگیا۔ انگلستان میں کمپنی کے

منتظمین نے اِس اہم تبدیلی کو بادلِ ناخواستہ گوارا اور منظور کیا۔ چونکہ شروع میں
ہندوستان کی تجارت سے فائدہ حاصل ہوتا تھا اس لئے اب مالکانِ کمپنی
کو اپنے سرمائے کی وجہ سے جو تجارت میں لگا ہوا تھا اس قسم کے ہر
انقلاب سے جس کی بدولت اُن کی ذمہ داری تو بڑھتی نظر آتی تھی لیکن
منافع کی کوئی معقول صورت نہیں دکھائی دیتی تھی پریشانی اور حیرانی ہونے
لگی۔ لہٰذا انھوں نے ہر قدم پر ایسی ترقی کی مخالفت کی جو ان کے ہندوستانی
علاقوں میں توسیع کا باعث ہوتی تھی اور ملک گیری کی اس ہوس کو روکنے کی
غرض سے انھوں نے بالآخر قانون ساز جماعت کی مدد چاہی جس نے نہایت
مستعدی سے اُن کی کوششوں کی تائید کی اور اُن کے احکام کو قانون کی
حیثیت عطا کر دی لیکن اگر مالکانِ کمپنی یا وزرائے انگلستان کو معاملات
سے پوری واقفیت ہوتی یا وہ عام سلوک کے مجرد اصول سے نتائج اخذ کرنے (۴۲)
کے بجائے سیدھے سادے عملی دلائل سے اپنے نتائج اخذ کرتے اور
اس کے ساتھ ہی ساتھ انسانی فطرت کا (جیسی کہ وہ اُس ملک میں تھی جس
کے لئے وہ قانون بنا رہے تھے) صحیح اندازہ کر لیتے تو غالباً وہ نظامِ حکومت
کے درست کرنے کی کوششوں میں اعتدال کی طرف زیادہ اور تحکم کی طرف کم
مائل ہوتے اور انھیں معلوم ہو جاتا کہ خواہ کتنا ہی انتظام کریں اُن کی ہر ممکن
کوشش ایک ایسی مملکت کی ترقی کے روکنے کے لئے بے سود ثابت ہوگی جو
نہایت سرعت کے ساتھ ایسے اسباب کے زیرِ اثر عروج حاصل کر رہی تھی
جو اپنی قوت کی وجہ سے نہ کسی کے روکے رُک سکتی تھی اور نہ جس پر کوئی
حاوی ہو سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جس دن کمپنی کی فوجیں اپنے کارخانوں
سے ایک میل آگے بڑھیں اُسی دن سے اپنے علاقوں میں توسیع اور اپنی
فوجوں میں اضافہ کرنا اُن کی حفاظت کا اصول بن گیا۔ اُن متعدد تنازعات
میں سے ہر ایک کے بعد جن میں کہ وہ اپنے ہمسایوں کے حسد۔ لالچ۔
حوصلوں یا اپنے ملازموں کی زیادتیوں اور اولوالعزمیوں کی وجہ سے مبتلا
ہوئے انھیں مجبوراً اپنی طاقت بڑھانے کے ذرائع اختیار کرنے پڑے

اور انھیں بہت جلد محسوس ہوگیا کہ اس قسم کے خطرے کو دوبارہ نمودار ہونے سے روکنے کا بھی ایک ذریعہ ہے۔

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ترقی اور عروج کی یہ مختصر تاریخ ہے لیکن سوداگروں کی اس جماعت کو برطانیہ عظمیٰ کی قوم سے جدا کرنے (۵)
کے لئے اور بھی متعدد اسباب موجود ہیں جن کی بدولت ایک طرف تو کمپنی کے دستور حکومت میں ایک خاص رنگ پیدا ہوگیا اور دوسری طرف اس کامیابی کے حصول میں مدد ملی جس کی بدولت کمپنی نے سیاسی طاقت میں اس قدر نمایاں حیثیت حاصل کرلی۔

کمپنی کے ملازموں کو اپنے جوہر دکھانے کے لئے ہندوستان میں ایک وسیع میدان موجود تھا اور ان کے ابتدائی زمانے میں افراد کی جاہ و ثروت کا انحصار بہت بڑی حد تک اُن کی حکومت کے عروج پر تھا لہٰذا ایسے حالات کے تحت اور ایسے دور دراز مقام پر کام کرنے کی صورت میں جہاں نہ اُن پر کسی قسم کا اثر پڑسکتا تھا اور نہ دباؤ یہ لازم تھا کہ وہ اپنے تمام معلومات اور اپنی تمام قابلیتوں کو آخرالذکر مقصد کے حصول میں اُسی ذوق وشوق کے ساتھ صرف کریں جو اکثر اوقات حب وطن کے زعم اور ذاتی اغراض کے یکجا جمع ہونے سے پیدا ہو جاتا ہے اور اس میں بھی کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ دوسرے سبب یا جملہ دیگر اسباب کے مقابلے میں انھیں اپنی نسبتاً قلیل تعداد کی وجہ سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اسی کی بدولت اُنھوں نے اپنے گردونواح کی مختلف سلطنتوں کے حسد کو دبایا اور اسی کی وجہ سے انھیں وہ طریقہ اختیار کرنا پڑا جس کے بغیر اس قسم کا انقلاب ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔ انھوں نے اپنی اعلیٰ اور نمایاں قابلیتیں ہندوستانیوں کو رام کرنے میں صرف کیں۔ انھیں اپنا مطیع بنایا اور جب کبھی مجبوری سے جنگ کرنی پڑی تو انھیں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑا کر فتح حاصل کی اس وسیع ملک کی اصلی حالت کی وجہ سے بھی اس کام میں بڑی سہولت حاصل ہوئی۔

امیر تیمور کے شاہی خاندان کے زوال کے بعد ہی سے جب کہ ہندوستان
کے مختلف نواب شکستہ سلطنت کے علاقوں کے لئے آپس میں لڑ رہے تھے
اور ہر صوبہ اُن کی چھوٹی چھوٹی لڑائیوں سے تباہ یا اُن کے عارضی قبضہ
سے نالاں تھا ایسٹ انڈیا کمپنی نے بحیثیت مملکت کے سیاسی ترقی اور اہمیت (٦)
حاصل کرنی شروع کر دی تھی لہذا یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ اِس زمانے میں
ملکی باشندے ایک ایسی جدید حکومت کے قیام سے خوش ہوتے تھے جو اُن
کے ساتھ مذہبی رواداری برتتی تھی اور اُن کے مال کی حفاظت کرتی تھی اور
اپنی مخصوص نوعیت کے لحاظ سے اُن کے اور اُن کی آنے والی نسلوں کے
لئے ایسا دیرپا امن و امان مہیا کرتی نظر آتی تھی جیسا کہ انھیں اب تک کبھی میسر
نہیں ہوا تھا۔

جو لوگ مسلسل جنگ و جدال سے تنگ آ گئے تھے اور جو دوسروں کے
فتوح برداشت کرتے کرتے اپنے قومی احساس و فخر کے جذبات کھو چکے
تھے وہ کسی مستقل قوت کے قیام ہی کو ایک بڑی نعمت سمجھتے تھے اگرچہ
اُس کا مدار غصب ہی پر کیوں نہ ہو یہ ایک قدرتی امر تھا کہ انصاف پسندی
دیانت داری اور اعلیٰ تمدن کا لحاظ کرتے ہوئے جو اس حکومت کے ساتھ
لازمی طور پر وابستہ تھے وہ اپنے یورپی آقاؤں کے خلاف اپنے تعصبات
کو بھلا دیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عروج سے دراصل سب سے زیادہ نقصان
ہندوستانی فرمانرواؤں اور سرداروں کو پہنچا۔ انھیں لوگوں کی غلطی سے کمپنی نے
غیر معمولی طاقت حاصل کر لی لیکن انھیں اپنی اس غلطی کا اس وقت احساس
ہوا جب کہ وہ اسے کوئی صدمہ نہیں پہنچا سکتے تھے۔ وہ اس کی بیخ کنی کے
لئے طرح طرح کی تدبیریں اختیار کرتے تھے لیکن بمصداق قہر درویش
برجان درویش وہ دیکھتے تھے کہ ان کی یہ تدبیریں کمپنی کی مزید تقویت
اور استحکام کا باعث ہوتی تھیں۔ یہ طاقت فتح و نصرت سے تو بڑھتی ہی
تھی لیکن مصیبت کے وقت وہ اور زیادہ ابھرتی تھی اور اس صورت حال

کا ان پر بہت گہرا اثر پڑتا تھا کیونکہ اس کا مدار ایک بعید سرزمین کے اُن
ذرائع پر تھا جو ان کی آنکھوں سے اوجھل تھے اور جن کی بابت ہندوستان
کی قوموں کا یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ یہ کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ انگریزوں
(۲) کے ایک قابل اور زبردست اور سخت ترین دشمن کے یہ پر زور الفاظ ہیں کہ
"میں کمپنی کی اُس طاقت اور ان ذرائع سے قطعی مرعوب نہیں جو میرے
سامنے ہیں بلکہ اُن سے جو میری آنکھوں سے اوجھل ہیں[1]"۔ اس قول
سے اُن ناواقف اقوام کے خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے جو انھوں نے اس
مملکت کی بابت قائم کئے تھے جو اپنی مرضی کے مطابق دوسرے ملک
سے کمک منگا لیتی تھی اور جس کے وسائل سے انھیں قطعی واقفیت نہ
تھی اور جس کی طاقت کا اندازہ صرف نتائج سے ہوتا تھا اور اُن نتائج
کی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی کہ وہ اپنے اندازے میں اس کی بابت
بہت مبالغہ کر جاتے تھے۔

ہندوستان میں انگریزوں کے اسباب عروج پر محض اُن کی اہمیت
کے لحاظ سے اظہار خیال کیا گیا ہے مستقبل میں کامیابی کی توقع ہمیں
صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ ہم حالات ماضی سے مدد لیتے رہیں۔
اگر ہم کبھی اپنی طاقت کے زعم میں اُن ذرائع کو بھول جائیں جن سے یہ
طاقت حاصل ہوئی ہے اور اپنے بے شمار تجربات کو نظر انداز کر دیں
اور اپنی طاقت ہی کو سب کچھ سمجھ کر ناعاقبت اندیشی سے اس پر بیجا اعتماد
کر لیں اور اس کے ساتھ کے اُن تمام ذرائع کو فراموش کر دیں جن کے
سہارے ہندوستان میں ہماری حکومت کا عظیم الشان ڈھانچہ قائم
ہے تو ہم بہت جلد اپنے ہاتھوں سے اپنے زوال کے اسباب فراہم
کر دیں گے لیکن یہی بات ایک برعکس غلطی سے اور کبھی جلد وقوع میں آسکتی ہے

ا؎ حیدر علی خاں کے اس قول کو میسور کے موجودہ دیوان پورنیا نے مجھ سے
بیان کیا تھا۔

یعنی یہ کہ ہم اپنی شان و عظمت ترک کردیں اور بناوٹ سے عجز و انکسار اختیار کریں یہ طرز عمل نامناسب اور ہماری حیثیت کے لئے ناموزوں ہوگا اس سے ہمارے دوست پست ہمت ہو جائیں گے اور ہمارے دشمنوں میں ذاتی اعتماد پیدا ہو جائیگا۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ جن لڑائیوں اور
فتوح سے بچنا چاہتے ہیں ان میں اور زیادہ پھنس جائیں گے۔ (۸)

ان انتہائی حدود کے مابین ایک درمیانی راستہ بھی ہوسکتا ہے اور اگر ہمارا مقصد ہندوستان میں اپنی سلطنت کو پائدار بنانا ہے تو ہیں پر ضرور عمل کرنا چاہیئے۔ وہ درمیانی راستہ یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم اپنی مطلق العنان گر اعتدال پسند حکومت کو غیر متزلزل استحکام بخشیں اور اس کی شان و شوکت کو برقرار رکھیں۔ دوسری طرف اپنی ہندوستانی رعایا کے مذہبی احساسات اور ملکی حقوق کا ہر وقت خیال رکھیں اور ہمیشہ ان کی حاجات سنبھالنے کی فکر کرتے رہیں اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ جس پایہ کی سلطنت ہم نے یہاں قایم کی ہے وہ بغیر رعایا کی اعانت کے پایدار نہیں ہوسکتی اور یہ ایک قدرتی بات ہے کہ رعایا ہماری اعانت کے لئے اس وقت تک آمادہ نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ اس میں اپنا مسلسل فائدہ نہ دیکھے اور اس فائدے کے خیال سے سلطنت کی بقا و ترقی میں عملی اور گہری دلچسپی نہ لے۔

برطانوی حکومت ہند

برطانیہ کی قانون ساز جماعت نے ہندوستانی کمپنی کی ترقی کو ہمیشہ دیر میں سمجھا۔ جب اس نے غیر ملکی ساحل کے کارخانوں کے لئے قانون بنایا اس وقت کمپنی بڑے بڑے صوبوں پر قابض ہوچکی تھی اور جب ان صوبوں کے لئے قوانین مکمل ہوے اس وقت وہ بڑی بڑی سلطنتیں مغلوب کرچکی تھی۔ ہر ایسے شخص کو جو نفس مضمون سے واقف ہے یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ موجودہ نظام حکومت سراسر نامکمل اور چند ایسے ناقص قوانین کے تابع ہے جو ایک
شہنشاہی کے شایان شان نہیں ہیں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے (۹)

جب کہ ہمیں ان قوانین میں لازمی طور پر اہم تبدیلیاں کرنی پڑینگی لیکن آج کل بھی ہندوستان میں ہمارے اغراض و مفاد ہر لحاظ سے سخت توجہ کے محتاج ہیں۔ خواہ موجودہ دستورِ حکومت برقرار رہے یا بدل دیا جائے بہر صورت ہمیں ان تمام واقعات کی تحقیق کرنی ضروری ہے جن کی بدولت ہم اس کی خوبیوں اور نقائص کا صحیح اندازہ کرسکیں۔ اِس سلطنت کی آیندہ بقا اور ترقی کے لئے تجاویز پیش کرنے کی خدمت صرف انھیں لوگوں کے تفویض کی جاسکتی ہے جنھوں نے اس طور پر تحقیق کی ہو۔

ہندوستان کی سیاسی حکومت کے لئے انگلستان سے جتنے آئین وقوانین نافذ ہوئے ہیں اُن سب میں نمایاں غلطی یہ ہے کہ وہ ایک تحکمانہ اُصول پر مبنی ہیں اور ایک ایسی چیز کو مستقل بنانا چاہتے ہیں جو ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ یہ اصول غالباً اُن لوگوں کے لئے قدرتی طور پر ضروری معلوم ہوتا ہے جو ایسے آئین وقوانین بنانا چاہتے ہیں جو کبھی تبدیل نہ ہوسکیں۔ (اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جن امور کا فوری تعلق ان لوگوں کے وطن سے ہوتا ہے ان میں تو وہ گہری دلچسپی لیتے ہیں لیکن جو معاملات ان دور دراز مقبوضات سے متعلق ہوتے ہیں اُن کے ساتھ وہ بے اعتنائی برتتے ہیں) لیکن سلطنت ایک ایسی چیز ہے جو کسی خاص سانچے میں نہیں ڈھالی جاسکتی۔ وہ انسان کی قوت کو ابتک نیچا دکھاتی رہی ہے اور ہمیشہ اسی طرح دکھاتی رہے گی۔ کیونکہ وہ چند ایسے اسباب کے زیر اثر متغیر ہوتی رہتی ہے جن پر انسان کی عقل حاوی نہیں ہوسکتی۔ دنیا کی دوسری سلطنتوں کی طرح ہماری مشرقی سلطنت میں بھی یہ خاصیت موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن لوگوں کو اس کے حدود متعین کرنے یا ایشیا میں برطانوی حکومت کی طاقت کو ایک نقطے پر قایم کرنے کی توقعات میں اب تک مایوسی ہوتی رہی ہے اور آیندہ بھی ہوتی رہے گی۔ (۱۰)

کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ یہ خیال ہمارے ہندوستانی تعلقات کو جتنا اہم بناتا ہے اُتنا ہی مہیب بھی کردیتا ہے۔ انسان کی عقل اُن نتائج کی بابت پیشین گوئی کرنے سے قاصر ہے جو اس قدر وسیع سلطنت کے قبضے سے ظہور میں آسکتے ہیں لیکن ان بعید اور غیر یقینی خرابیوں کی وجہ سے ہمیں اپنے اصلاحی تجاویز کو ہرگز نہ روکنا چاہئے برخلاف اس کے جب ہم نہایت سنجیدگی کے ساتھ اُن خطرات پر غور کریں جو ان مقبوضات کے ہمارے ہاتھ سے نکل جانے یا کسی یوروپی حریف کے ہاتھ میں چلے جانے سے پیدا ہونگے تو اس کے ساتھ ازروئے انصاف ہمیں اُن فوائد کا بھی اعتراف کرنا چاہئے جو برطانیۂ عظمیٰ کو اپنے ہندوستانی مقبوضات سے حاصل ہوے ہیں اور انھیں برقرار رکھنے اور ترقی دینے سے آئندہ ہوسکتے ہیں۔ اس قسم کے خیالات سے ہمارے ملک کے قانون ساز دانشمندوں کو ترغیب ہونی چاہئے کہ وہ برطانوی ہند کی حکومت کو ایک ایسے پایے پر پہنچانے کے ذرائع اختیار کریں جو اُنکے نزدیک اس ملک کو برطانیۂ عظمیٰ کے ساتھ وابستہ رکھنے کے لئے مناسب و موزوں ہوں۔ اس مقصد کے حصول میں جب وہ ایک طرف معقول اور مسلمہ حقوق کی وقعت کرینگے اور دوسری طرف ناعاقبت اندیش جدتوں کی خام اور عجلت پسند تجاویز کو رد کردینگے تو بلاشبہ وہ اُن وسیع النظر اور روشن اُصول پر ہماری ہندوستانی سلطنت کی حکومت کی بنیاد رکھینگے جو اس کی موجودہ حیثیت کے لئے موزوں ہوگی جس حد تک کہ دو مختلف باتوں میں یک رنگی پیدا کیجاسکتی ہے یہ دونوں باتیں اس سلطنت میں موجود ہونگی یعنی ہندوستان میں ایک زبردست اور مکمل مقامی حکومت بھی قایم ہوجائیگی اور ساتھ ہی ساتھ دباؤ اور نگرانی کے اہم اصول کا بھی لحاظ رہیگا جو حکومت انگلستان کی روح رواں ہیں۔ (۱۱)

ہمارے ایک اعلیٰ مدبر[1] کا قول ہے کہ برطانیہ کی مشرقی سلطنت سے

---

[1] مسٹر پٹ۔

سے علاقے کی حکومت کے لئے جو خاکہ بھی پیش کیا جائے گا وہ لازمی طور
پر نامکمل ہوگا۔ ایسی حالت میں عملی کامیابی تو درکنار وہ نظری طور پر بھی
مکمل نہیں سمجھا جا سکتا اور حکومت کا کوئی خاص دستور بنانا گویا متعدد دقتوں
میں سے ایک دقت کا انتخاب کرنا ہے لیکن یہ اہم اور مشکل کام جن اشخاص
کے تفویض ہوا ہے انھیں اس عام نتیجے کی صداقت کے یقین سے بجائے
پست ہمت ہونے کے اور زیادہ مستعد ہونا چاہیے اور جب اس نتیجے
کی وجہ سے موجودہ نظام حکومت میں جسے خود اس کے بنانے والوں نے
علی الاعلان بطور تجربے کے قائم کیا تھا تبدیلی کی ضرورت کی تائید ہو جاتی
ہے تو انھیں اس سخت ترین کام کی تکمیل کے لئے جو شاید ہی کبھی انسانی
عقل کو انجام دینا پڑا ہو اور بھی تن دہی سے کوشش کرنی چاہیے۔

یہ اہم خدمت جن لوگوں کے سپرد ہو اُن کے لئے معلومات بہم
پہنچانا اور (جس حد تک مؤلف سے ممکن ہے) اُن سیاسی اصول کو واضح
کرنا جن پر مسٹر پٹ کے مجوزہ قانون سنہ ۱۷۸۴ء[۱] کے بعد سے برطانوی ہند
(۱۳) کی حکومت کا کام چل رہا ہے اس کتاب کا مقصد ہے لیکن اس بیان کے
لئے ایک ایسے دیباچے کی ضرورت ہے جس میں اختصار کے ساتھ کمپنی کے

انڈیا کمپنی کی مختصر تاریخ سنہ ۱۶۰۰ء تا سنہ ۱۷۸۴ء

اُن تمام واقعات کا ایک خاکہ پیش کر دیا جائے جو اس
جماعت کے اتحاد و قیام کے آغاز سے لے کر اس کی مفصل
تاریخ شروع ہونے تک وقوع میں آئے۔

انڈیا کمپنی کا قیام سنہ ۱۶۰۰ء۔

برطانیۂ عظمیٰ کے سوداگروں نے راس کماری سے ہندوستان
کا راستہ (سنہ ۱۴۹۷ء) دریافت ہونے کے بعد ہی سے پرتگالیوں کی
نفع بخش تجارت میں جو وہ یورپ اور کرۂ ارض کے
اس حصے کے درمیان جدید راستے سے کر رہے تھے
حصہ لینے کی کوشش کی تاہم انھیں ایک صدی تک کوئی

[۱] بحوالہ برطانوی ہند کے لئے تجاویز۔

معتد بہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ کئی بار کے تجربے سے یہ ثابت ہوا کہ ہر ایسی تجارت جو بہت پرخطر ہو اور جس کی حفاظت کے لئے فوجیں درکار ہوں خواہ وہ کتنی ہی نفع بخش کیوں نہ ہو انفرادی سرمائے سے نہیں چل سکتی۔

یہی وہ اسباب ہیں جن کی بناء پر ابتداءً متمول سوداگروں کی ایک جماعت نے مل کر ملکہ الزبیتھ سے یہ درخواست کی کہ انھیں ہندوستان سے بلاشرکت غیرے تجارت کرنے کے لئے مراعات خصوصی عطا کئے جائیں اور اس کام میں اُن کی ہمت افزائی کی جائے۔ ملکۂ موصوفہ ہر ایسے کام کو جس میں ملک کی عظمت اور دولت کی ترقی مضمر ہو خوب سمجھتی تھی۔ اُس نے شہنشاہ دہلی یعنی اکبر کے دربار میں اپنا ایک سفیر اس درخواست کے ساتھ روانہ کیا کہ میری رعایا میں سے جو اشخاص آپ کے علاقے میں تجارت کریں اُن کی حفاظت کی جائے اور اُن پر نظر عنایت رہے۔ اس کارروائی کے بعد الزبیتھ نے نہ اس کے نتیجے کا انتظار کیا اور نہ اُس میں کچھ خاص کامیابی حاصل ہوئی بلکہ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۶۰۰ء کو اُس نے منشور عطا کر دیا اور اس کے ذریعے سے درخواست گذار سوداگروں کی ایک

(۱۴) سنہ ۱۶۰۰ء

جماعت یا کمپنی اس نام سے قائم ہو گئی۔
"مشرقی جزائر سے تجارت کرنے والے لندن کے سوداگروں کی کمپنی اور اس کے نظمار"[1]

اس منشور کی رو سے انھیں بلا کسی روک ٹوک کے اراضی خریدنے اور ایک گورنر اور چوبیس ۲۴ اشخاص کی مجلس کے تحت رہ کر تجارت کرنے کا حق

---

[1] "Governors and Company of Merchants of London trading with the East Indies."

[2] درخواست پر ارل آف کمبرلینڈ اور دیگر دو سو پچاس اشخاص کے دستخط تھے۔ ارل آف کمبرلینڈ کا فرمان میں بھی ذکر ہے۔

حاصل ہو گیا۔ اِن کے پہلے گورنر سر تھامس نائٹ (Sir Thomas Knight)
کا نام ایجنٹ میں درج تھا۔ ارکان کمپنی اور اُن کے بالغ بیٹوں کو نیز
ہندوستان کے اندر اُن کے جملہ کارآموزوں اور کارندوں کو بہ الفاظ منشور
یہ حق عطا کیا گیا کہ "وہ بلا شرکت غیرے پندرہ سال کی مدت کے لئے
ممالک ایشیا و افریقہ کے تمام علاقوں میں اور ایشیا و افریقہ و امریکہ کے
تمام جزیروں بندرگاہوں اور شہروں میں اور راس یونا اسپیی رانزا
یا آبنائے میگلان سے آگے جہاں تک وسائل آمد و رفت میسّر ہوں
تجارت کریں۔" کمپنی کے عام مجالس کو اپنا کاروبار چلانے کے لئے ایسے
قوانین و ضوابط بنانے کا جو سلطنت کے "قانون کے خلاف نہ ہوں
اختیار عطا کیا گیا اور اُن کے مال کی برآمد پر چار سال کے لئے چنگی (کروڑ گیری)
معاف کر دی گئی۔ انھیں ہر سال اعلیٰ قسم کے چھ جہاز اور چھ کشتیاں تیار
کرنے اور ہندوستان بھیجنے کا بھی اختیار دیا گیا اور چند قیود کے ساتھ تیس ہزار پونڈ ۱۴۱
غیر ملکی سکوں یا زر کی شکل میں باہر لے جانے کی بھی اجازت دی گئی۔

اس فرمان کے آخر میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اگر اس کا عمل مملکت
کے لئے مفید ثابت نہ ہوا تو بادشاہ کو حق حاصل ہوگا کہ دو سال کی مہلت
دے کر وہ اپنا فرمان واپس لے لے اور اسی دفعہ میں یہ بھی وعدہ تھا کہ اگر وہ
ملک کے لئے نفع بخش ثابت ہوا تو اُس کی مدت میں مزید پندرہ سال کی
توسیع کر دی جائیگی۔

یہ پہلا منشور تھا جس کے تحت انگلستانوں کے سوداگروں نے ہندوستان
سے تجارت شروع کی۔ ان کا ابتدائی سرمایا بہتر ہزار پونڈ تھا جو پچاس پچاس پونڈ
کے حصوں میں منقسم تھا۔

کمپنی نے ابتدا میں جو بیڑے بھیجے وہ کامیاب رہے اور تیسرا بیڑہ جو
کپتان کیلنگ (Captain Keeling) کی کمان میں تھا خاص طور پر
کامیاب رہا۔ سنہ ۱۶۱۰ء میں وہ ایک طویل مگر
مبارک سفر کے بعد بغیر کسی جان کے نقصان

کپتان کیلنگ
سنہ ۱۶۱۰ء

کمپنی کی ترقی کا حال۔

کے دولت سے لدے ہوئے جہاز لے کر انگلستان واپس ہوا۔

باوجود ان کامیابیوں کے ہندوستان کی تجارت قلیل اور غیر معین تھی۔ جن ممالک سے بیوپار تھا وہاں کے باشندوں کی خوشنودی اور دیانت داری اور مقامی گماشتوں کی قابلیت پر جن کے ذریعے سے ہندوستان میں کاروبار چلتا تھا اس تجارت کی ترقی و کامیابی کا مدار تھا۔

چونکہ ان کے پاس نہ مقبوضات تھے اور نہ قلعے لہٰذا نہ وہ اپنے ملازموں کی بود و باش اور حفاظت کا انتظام کر سکتے تھے اور نہ اپنا مال محفوظ رکھ سکتے تھے۔ اس کمی کی وجہ سے انھیں ہر قسم کی ذلت و زحمت برداشت کرنی پڑتی تھی اور جن جن بندرگاہوں سے ان کے یورپی حریفوں (15)
کا گزر ہوتا تھا وہ وہاں کے باشندوں کو اشتعال دلا کر انھیں تکلیف پہنچاتے تھے۔ ابتدا میں انھیں اس تیز اور سخت مخالفت کا پورے زور سے مقابلہ کرنا پڑا جو تجارتی مفاد کے تنازعات کے ساتھ خاص طور پر وابستہ تھے لیکن ان تنازعات کی وجہ سے اُن کی کامیابی میں جو رکاوٹ پیدا ہوئی وہ ان کی جد و جہد کی موجب بن گئی۔

سنہ ۱۶۰۹ء میں انھیں دوسرا منشور ملا جس کی رو سے ان کا تجارتی اجارہ مستقل ہو گیا لیکن اس میں بھی پہلے کی طرح یہ شرط لگا دی گئی کہ اگر وہ مملکت کے مفاد کے لئے نفع بخش ثابت نہ ہوا تو بادشاہ کو (تین سال کی مہلت دینے کے بعد) اس کے واپس لینے کا حق حاصل ہوگا۔

اگرچہ کمپنی نے شہنشاہ دہلی سے اُس کی قلمرو میں بہت سی نوآبادیات قائم کرنے اور ساحل پر کارخانے بنانے کی اجازت حاصل کر لی تھی لیکن پرتگالیوں کی سازش کی وجہ سے وہ کچھ مدت تک اس رعایت سے مستفید نہ ہو سکے۔ بالآخر انھیں اس قوم کے خلاف جو سابق قبضے کی بنا پر ہندوستانی سمندروں میں تجارتی اجارے کا دعویٰ کرتی تھی انصاف حاصل کرنے کے لئے

جنگ کا ذریعہ اختیار کرنا پڑا۔

سنہ ۱۶۱۲ء

اس متکبرانہ دعوے کی مخالفت کی غرض سے کمپنی کے بیڑے مسلح کئے گئے اور ان میں سے ایک بیڑے نے سنہ ۱۶۱۲ء میں کپتان بیسٹ (Captain Best) کی کمان میں پرتگالیوں کو دو مقابلوں میں شکست دی ان فتوح سے نہ صرف کمپنی (۱۶) کی شہرت میں اضافہ ہوا بلکہ اُن کی بدولت سورت میں ان کا ایک کارخانہ بھی قایم ہوگیا جو حالات زمانہ کے لحاظ سے اُن کی آیندہ کامیابی کے لئے نہایت مسعود و مبارک ثابت ہوا۔ جو مراعات اور سہولتیں اُنھیں حاصل تھیں اُنھیں برقرار رکھنے کی فکر سے اُنھوں نے شاہ انگلستان سے درخواست کی کہ وہ اپنا ایک سفیر شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں روانہ کرے تاکہ اُن کی تجارت زیادہ محفوظ اور معقول بنیادوں پر قایم ہوسکے۔ شاہ جیمس نے ان کی درخواست منظور کی اور سنہ ۱۶۱۵ء میں سر تھامس رو (Sir Thomas Roe) شاہی دربار کی طرف روانہ

سنہ ۱۶۱۶ء

ہوا جس کا اس وقت اجمیر میں قیام تھا۔ جہانگیر نے ہر لحاظ سے اس کی عزت کی اور اُس کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ شاید وہ پورے طور پر اس کی درخواست منظور کرلے لیکن اُس کے ایک فرزند اور وزراء کی احتیاط اور پرتگالی مبلغوں کی سازشوں کی وجہ سے متوقع کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

بہرحال سابق عطیات کی توثیق ہوگئی اور سلطنت کے خاص خاص شہروں میں مقامی کارندوں کے رکھنے کا مزید حق عطا ہوا اس کام کے ختم کرنے کے بعد یہ سفیر سورت واپس ہوا اور اُس مقام کے اور بروچ کے جدید کارخانوں کی حالت سنبھالنے کی غرض سے کچھ مدت اُس نے وہاں قیام کیا اور وہیں سے بذریعہ جہاز ایران روانہ ہوگیا۔ وہاں بھی اسے شاہ وقت شاہ عباس کے دربار میں اگر اس سے زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی ہی کامیابی ضرور حاصل ہوئی اور اُس کی دوستی سے اُس نے وہاں

وہ تمام مراعات حاصل کر لیے جو خلیج فارس میں کمپنی کی تجارت کے لئے نفع بخش ہو سکتے تھے۔

(۱۷) پرتگالیوں نے ہندوستان میں انگریزوں کی ترقی روکنے کے لئے جو جدوجہد کی وہ کمزور تھی اور غالباً اسی کی وجہ سے انگریزوں میں زیادہ مستعدی آگئی اور وہ قطعی فیصلے کرنے کے خوگر ہوگئے اور اُس کی بدولت اُن کی ترقی میں سرعت پیدا ہوگئی لیکن لڑائیوں کی تیاریوں میں جو مصارف انھیں برداشت کرنے پڑے اُن سے اُن کی مالی حالت ایک حد تک خراب ہوگئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے یہ بھی کوشش کی کہ مسالے بہم پہنچانے والے جزائر کی نفع بخش تجارت میں جو ڈچ باشندوں کے ہاتھ میں تھی شریک ہوں۔ بدقسمتی سے اس کا جو حشر ہوا اُس نے اُن کے مالی مشکلات میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ ابتدا میں وہ جزیرۂ ملایا کے چند کپتانوں کو ملانے اور چند کارآمد مقبوضات حاصل کرنے میں کامیاب رہے لیکن آخر میں ان کے تمام کارخانے تباہ و مسمار کر دئے گئے۔ یہ ایک ایسے سلوک کا نتیجہ تھا جس سے فوری مقصد تو حاصل ہو گیا لیکن برطانوی قوم میں ہمیشہ کے لئے عداوت اور ناخوشی کا جذبہ پیدا ہو گیا اور جس ملک والوں سے یہ حرکت سرزد ہوئی تھی اُس کی شہرت پر ایک ایسا دھبہ آگیا جو مٹائے نہیں مٹ سکتا۔

سنہ ۱۶۲۲ء

امبائنا (Amboyna) کے قتل عام[1] کا وہی اثر ہوا جو اُس کے مرتکبین کی پیش بین نگاہوں نے جانچا تھا اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اِس واقعے کے بعد یعنی سنہ ۱۶۲۲ء سے انگریزوں نے مشرقی جزائر کی تجارت اپنے حریفوں کے حوالے کر دی۔

---

[1] جس دردناک واقعے سے اس تنازع کا خاتمہ ہوا اُسے ہمیشہ اسی نام سے موسوم کرنا چاہیے۔

اس حادثے کی بدولت اور انگلستان میں کمپنی کے چند اہم دستوری
نقائص ۔ سرمائے کی قلت ۔ مصارف کی فراوانی اور قلعوں کی کمی اور اس
کی وجہ سے ہندوستانی حکومتوں کی غیر مطمئن حفاظت پر اعتماد کرنے سے
کمپنی کے معاملات بڑی تباہی میں آ گئے ۔ اُن کی تجارت جس کا مدار ابتدا
سے ایسے مہمات پر تھا جو محض خوش قسمتی سے سر سبز ہو جاتے تھے اب (۱۸)
گھٹنے لگی اور آیندہ ایک مدت دراز تک اُن کی تاریخ میں بجز تجارتی ناکامیوں
کے ذیلی واقعات کے اور کچھ نہیں ملتا ۔ البتہ ان کے ساتھ پُر جوش
لڑائیوں کا ایک سلسلہ ضرور نظر آتا ہے ۔ اِن میں سے خاص طور پر بحری
محاربات میں انگریزوں نے اپنے خصوصیات برابر نمایاں کئے اور انھوں
نے ساحل پر جو ذلتیں اُٹھائی تھیں اُن کے بدلے ولندیزیوں اور پرتگالیوں
سے خوب گن گن کر لئے ۔

بنگال میں کارخانے کا قیام

انھیں ایام مصیبت میں وہ واقعہ پیش آیا جس کی بدولت بنگال میں
اُن کا ایک کارخانہ قائم ہو گیا جو اُس روز سے ان کی تمام
ترقی اور خوشحالی کا موجب رہا ۔ کمپنی اپنی طاقت و عظمت
کے اس آغاز کے لئے ایک طبیب کی مہارت فن کی مرہونِ منت
ہے ۔

یہ شخص جس کا نام بوٹن (Boüghton) تھا سورت سے آگرے
روانہ ہوا اور خوش قسمتی سے شہنشاہ شاہ جہاں کی صاحبزادی کو جو اس وقت
سخت علیل تھی اس کے ہاتھ سے کامل شفا حاصل ہوئی ۔ اس کے عوض
میں دیگر انعامات کے ساتھ اُسے بلا ادائے محصول تجارت کرنے کا
حق بھی عطا ہوا ۔ یہاں سے وہ بنگال روانہ ہوا اور اپنی قابلیت سے
وہاں کے نواب کی بھی خوشنودی حاصل کر لی ۔ شہنشاہ نے تو یہ رعایت صرف

سنہ ۱۶۳۶ء

اس کی ذات کے لئے مخصوص کی تھی لیکن نواب بنگال
نے یہی رعایت اُس کی کل قوم کے لئے عام کر دی
اور سنہ ۱۶۳۶ء میں کمپنی کے ملازموں نے جو سورت میں مقیم تھے ہگلی میں بھی

اپنا ایک کارخانہ قایم کرلیا۔ یہ مقام دریائے گنگا کی ایک شاخ کے دہانے سے جو اسی شہر کے نام سے موسوم ہے تقریباً سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

(۱۹) اگرچہ اس واقعہ سے تجارت کے لئے جدید اور نفع بخش راستہ کھل گیا تاہم کمپنی کی حالت جو مائل بہ زوال تھی اس سے بھی نہ بدل سکی اور انگلستان کی خانہ جنگی کے زمانے میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس جماعت کا بحیثیت ایک کمپنی کے قریب قریب خاتمہ ہوگیا ہے۔

۱۶۵۲ء

ہندوستان کی تجارت عام کردی گئی۔

سنہ ۱۶۵۲ء سے سنہ ۱۶۵۷ء تک ہندوستان کی تجارت درحقیقت سب کے لئے کھلی رہی لیکن اس آخری سال میں کرامویل نے دوبارہ کمپنی کو حقوق عطا کئے اس قلیل مدت میں کمپنی کا اجارہ جو مسدود رہا اس کے نتائج پر مختلف مصنفین کے بیانوں میں اس قدر اختلاف ہے کہ شاید ہی کسی اور مسئلے پر ہو ان میں سے ایک مصنف سنہ ۱۶۵۸ء میں انہیں واقعات کو قلمبند کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اُس زمانے میں قوم کو ہندوستان میں جس قدر حقوق حاصل تھے وہ اس کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ انگریزی مال کی قیمت گر گئی تھی اور ہندوستانی مال کی قیمت بڑھ گئی تھی۔ برخلاف اس کے دوسرا مصنف جس کی تصنیف سنہ ۱۶۵۹ء میں شایع ہوئی لکھتا ہے کہ جب مشرقی ہند کی تجارت سب کے لئے عام ہوگئی تو انگریز سوداگروں نے ہندوستانی مال اس قدر ارزاں کردیا کہ وہ یورپ کے بہت سے علاقوں حتیٰ کہ خاص امسٹرڈم (Amsterdam) کو سامان بھیجنے لگے۔[۱]

---

[۱] اس آخری واقعہ کی تائید کرامویل کے معتمد تھرلو کے خطوط کے ایک حصے سے بھی ہوتی ہے جس میں یہ درج ہے کہ جب امسٹرڈم کے سوداگروں کو یہ معلوم ہوا کہ لارڈ پروٹیکٹر (Lord Protector) لنڈن والی ایسٹ انڈیا کمپنی کو برخواست کرکے جزائر ہند کی تجارت اور راستوں کو آزاد اور عام کرنے والا ہے تو وہ بہت گھبرائے کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ اس فعل سے اُن کی ایسٹ انڈیا کمپنی بھی تباہ ہو جائیگی۔

کرامویل کے انتقال کے بعد اُن تمام توقعات کی طرف سے مایوسی
(۲ ہوگئی جو اُس کی حکومت کی امانت کی وجہ سے قایم ہوگئی تھیں لیکن اپریل ۱۶۶۱ء
میں انھوں نے چارلس ثانی سے ایک جدید منشور حاصل کیا اور اس سے پھر یہ
تمام امیدیں زندہ ہوگئیں۔

کمپنی کیلئے جدید منشور ۱۶۶۱ء

اِس منشور سے ملکۂ الزبیتھ اور شاہ جیمس کے عطا کردہ حقوق و مراعات
کی محض توثیق ہی نہیں ہوئی بلکہ ان میں چند اہم مراعات
کا اور اضافہ ہوگیا۔ کمپنی کو دیوانی اور فوجی اختیارات
حاصل ہوئے اور ہندوستان کے "مشرکوں" کے خلاف
جنگ کرنے یا ان سے صلح کرنے کا بھی اختیار مل گیا۔ البتہ یہ امتیاز
باقی رہا کہ جہاں تک یورپی حکومتوں کا تعلق تھا۔ سرکار برطانیہ نے
حقوق خاص اپنے لئے محفوظ رکھے۔ سابقہ فرمانوں میں ایک دفعہ یہ موجود
تھی کہ جب کبھی وہ قومی مفاد کے لئے مضر ثابت ہونگے منسوخ کردئے
جائینگے۔ یہ دفعہ اس فرمان میں بھی شامل کی گئی۔

جب چارلس ثانی نے ۱۶۶۲ء میں پرتگال کی شہزادی انفنٹا (Infanta)
سے شادی کی تو اُسے ۱۶۶۳ء میں جزیرۂ بمبئی جہیز میں ملا لیکن اس پر قبضہ
برقرار رکھنے کے مصارف اُس کی آمدنی سے زیادہ ہوتے تھے اس لئے
چارلس نے اپنے دور کے بیسویں سال میں اُسے کمپنی کو دیدیا پانچ سال
بعد جزیرۂ سینٹ ہیلینا (St. Helena) بھی اُس نے عطا کردیا اور جس شوق سے
یہ قابل قدر عطئے دیئے گئے تھے اُسی شوق سے اُس کی حکومت نے کمپنی کو
فروغ اور اُس کے مفاد کو ترقی دینے میں پوری مدد دی۔

(۲۱) اس ہمت افزائی اور حمایت اور خود کمپنی کی عملی جد و جہد کی بدولت
اس کے سرمایہ دار مالا مال ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی پر ہر طرف سے
حملے شروع ہوگئے لیکن ساتھ ہی ساتھ مدافعت کے معقول ذرائع بھی
حاصل ہوگئے تھے۔ چارلس ثانی نے اپنے اٹھائیسویں سن جلوس میں ۱۶۶۱ء
کے منظور شدہ منشور کی توثیق کردی اور پینتیسویں سال بذریعہ قانون ان

مراعات میں اضافہ بھی کردیا لیکن اب بھی کمپنی جیمس ثانی ہی کی زیادہ مرہون منت تھی کیونکہ وہ اپنے بھائی کے زمانے میں بھی اپنے اثر سے اس کی اعانت کرتا رہتا تھا اور اپنی تخت نشینی کے بعد اُس نے کمپنی کے حقوق میں مزید اضافہ کیا اور اُسے بہت کچھ شاہی اختیارات عطا کردئیے کمپنی کو قلعے بنانے فوج تیار کرنے ۔ بذریعہ کورٹ مارشل مقدمات فیصل کرنے اور سکے ڈھالنے کا اختیار دے دیا ۔ اس طرح ان مراعات کی بدولت مالکان کمپنی کو ایک قسم کی طاقت و قوت حاصل ہوگئی لیکن انھوں نے رشوت ستانی اور جور و ستم و تشدد کے متعدد افعال سے اُس کی تذلیل کی ۔

کمپنی کی حکومت میں نقائص اور اُن کے اثرات

ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدائی تاریخ کے ایک گمنام اور قابل مصنف نے خوب کہا ہے کہ ایک فرد واحد کو اگر غیر محدود اختیارات حاصل ہوں تو اُسے ذلت و رسوائی اور ذاتی خطرات کا خوف دلا کر ظلم و ستم سے باز رکھا جاسکتا ہے لیکن ایک برسر اقتدار جماعت پر اس قسم کے کسی خوف کا شاید ہی کبھی کچھ اثر ہوتا ہو کیونکہ جس طرح اُن کے بہترین کاموں سے انفرادی طور پر انھیں بہت کم تحسین حاصل ہوتی ہے اسی طرح جو بدترین کام ان سے
سرزد ہوتے ہیں اُن کی بدنامی کا بھی اُن کی ذات پر بہت تھوڑا اثر ہوتا ہے (۲۲)
چونکہ انھیں نیکی کی کوئی معقول ترغیب نہیں ہوتی اس لئے وہ اکثر اوقات بدترین خواہشات نفسانی کے غلبے سے بدی کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ عام جماعتوں[1] کے فیصلوں میں کبھی کبھی ایسے تکلیف دہ ظلم کی جھلک آجاتی ہے جو ناقابل علاج اور ساتھ ہی ساتھ ناقابل انتقام

---

[1] جن جمہوری حکومتوں کا طرز عمل اس عام قاعدے سے مستثنیٰ معلوم ہوتا ہے انھوں نے چند خاص مقاصد کے زیر اثر کام کیا ہے ۔ یہ مقاصد ان لوگوں کے دماغوں میں جگہ نہیں پاسکتے جو اپنی قلمرو سے کوئی قومی جذبہ وابستہ نہیں رکھتے اور جو اپنے مقبوضات اور اختیارات کو محض تجارتی نفع کا ذریعہ تصور کرتے ہیں ۔

بھی ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں کا اطلاق بغیر کسی ناانصافی کے ہندوستانی کمپنی
کے تمام اندرونی و بیرونی کاموں پر کیا جاسکتا ہے۔ حرص جو انسانی دماغ کا
بدترین اور سخت ترین جذبہ ہے تجارت کا پہلا اصول ہے اور اس لحاظ
سے وہ مالکان کمپنی کے باہمی اتحاد کی اصل بنا تھی۔ انسانیت و انصاف
حتیٰ کہ اصول و حکمت عملی بھی نفع کی توقع یا اس کی محبت پر نثار کردئے جاتے
تھے"۔ یہی مصنف مذکورۂ بالا بیان میں اتنا اور اضافہ کرتا ہے کہ "فیاضی کا
اصول تو ہر با اختیار تجارتی جماعت کے دستور سے خارج ہی ہوتا ہے لیکن
دور و دراز فاصلے پر کاروبار کرنے کے باعث کمپنی اپنے طرز عمل کی جانچ پڑتال
سے بھی محفوظ تھی لہٰذا انھیں بلا کسی دباؤ کے من مانے طریقے پر طاقت و قوت
استعمال کرنے کے معتد بہ مواقع حاصل تھے۔ اسی وجہ سے جب کبھی اُن کے
نادری احکام میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوجاتی خواہ اُن کے ملازمین کی طرف
سے ہو یا ملک کے دیسی باشندوں کی طرف سے وہ بغاوت و بیوفائی پر
محمول کی جاتی تھی اور اس کی سخت ترین سزائیں دی جاتی تھیں۔ وطن میں جو
لوگ حکمراں تھے انھوں نے اپنے اپنے آدمی ہندوستان بھیج رکھے تھے۔ (۲۳)
ان لوگوں کو باوجود انتہائی ظلم و تشدد کے وہ اپنے اثر سے بچا لیتے تھے۔
نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے طرز عمل کا انحصار اکثر و بیشتر محض ذاتی شکایات اور
خودغرضانہ خیالات پر ہوتا تھا اور اُن کی حکومت میں بجز اس کے کوئی
اور اصول اتحاد نہ رہا کہ اُن میں سے ہر ایک انصاف کا خون کرنے کا مجاز
تھا حتیٰ کہ اجارے کی خاص رعایت جو اُن کی تجارت کے فروغ کے
لئے ضروری سمجھی جاتی تھی اُن کے ہاتھوں میں ہر ایسے شخص کے خلاف
جسے وہ خلل انداز تصور کرتے تھے ظلم کا ایک آلہ بن گئی۔ اُن کے وحشیانہ
مظالم کی ایسی مثالیں تائیدی واقعات کے ساتھ پیش کیجاسکتی ہیں جنھیں
پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوجائینگے"۔

یہ مصنف اگرچہ مائل بہ اعتدال اور غیر جانبدار نہیں ہے تاہم قابل اور
صاحب استدلال ہے اور اپنے تمام نتائج کی تائید میں زبردست واقعات

پیش کرتا ہے۔ یہاں ان میں سے صرف ایسے واقعات پیش کئے جائینگے جو قابل وقعت اسناد پر مبنی ہیں۔ ایک عرصے تک کمپنی نے اپنے معاملات راز میں رکھے اور جو لوگ

۱۶۸۲ء

برسر انتظام تھے انھوں نے بلاشبہ اس پردے میں بہت کچھ دھوکے سے کام لیا۔ اگرچہ اُن کی بدولت کمپنی کا سرمایہ ۱۶۸۲ء میں دو چند ہو گیا تھا لیکن موعودہ رقم کا نصف حصہ بھی وصول نہیں ہوا تھا۔ ایک طرف تو یہ لوگ کھلتے ہوئے جسم میں صحت کے آثار دکھانے کی کوشش میں مالکان حصص کو غیر معمولی منافع تقسیم کر رہے تھے دوسری طرف انھوں نے دو ملین کا قرضہ کر لیا تھا اور واجب الاداء قوم کے مناسب مطالبات کو پورا کرنے کے بجائے خزانے کے دروازے پر یہ اعلان لگا دیا تھا کہ ایک خاص تاریخ تک کوئی رقم ادا نہ کیجائیگی۔ حالانکہ وہ ساتھ ہی ساتھ یہ جتلا رہے تھے کہ اُن (۲۴)
کا کاروبار نہایت ترقی پذیر حالت میں ہے[1]۔

گھر کی ان فریب کاریوں کے ساتھ ساتھ باہر بھی ناانصافی جاری تھی۔ کمپنی کے اہلکار اپنے آقاؤں کی ہدایتوں کے بموجب کثیر رقمیں قرض لیتے اور بعد میں قرض خواہوں سے لڑ بھڑتے تھے[2]۔ ان کے سب سے زیادہ بدنام گورنر سر جان چائلڈ (Sir John Child) کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھا اور سورت سے تیرہ بڑے جہاز پکڑ کر لے گیا جو وہاں کے سوداگروں کی مِلک میں سے تھے اور اپنے اُس شرمناک مال غنیمت کے ساتھ بمبئی واپس پہنچ گیا[3]۔

[1] بحوالہ ہندوستان کی تجارت کا حال مصنفہ وائٹ (White)۔

[2] بحوالہ ہیملٹن جلد اول و ہیرس جلد دوم

[3] وزیر مال کی عدالت میں حلفیہ بیان لینے سے اس کا انکشاف ہوا۔ اس مال غنیمت کی رقم میں سے تئیس ہزار پونڈ مجلس نظار کی فریلی کمپنی کو جس نے اس کا حکم دیا تھا روانہ کی گئی (بحوالہ ہندوستان کی تجارت کا حال مصنفہ وائٹ)۔

سنہ ۱۶۹۴ء میں کمپنی نے جدید منشور حاصل کیا تھا لیکن سنہ ۱۶۹۵ء میں پارلیمنٹ نے اُس کے معاملات میں چند سخت نقائص کی گرفت کی۔ یہ پتا لگا کہ وطن میں اُن کے مصارف نہایت سرعت کے ساتھ بارہ سو پونڈ سے نوّے ہزار پونڈ تک پہنچ گئے ہیں یہ رقم کمپنی کے گورنر سر تھامس کوک (Sir Thomas Cooke) کی تحریروں پر قرض دی گئی تھی جب اُسے قانون (Bill of Pains & Penalties) کی دھمکی دی گئی تو اُس نے خوف زدہ ہو کر یہ اقبال کیا کہ اس رقم میں سے دس ہزار پونڈ نقد خود بادشاہ کی نذر کیے گئے تھے اور باقی رقم اُن کے وزراء اور خاص خاص عہدہ داروں کو دی گئی تھی۔ ملزموں میں ڈیوک آف لیڈز[1] نہایت قابل نفرت تھا۔ اُس پر پانچ ہزار پونڈ وصول کرنے کے جرم (۲۵)
میں مقدمہ چلایا گیا لیکن شاہ ولیم نے پارلیمنٹ کا اجلاس برخاست کر دیا اور اس طرح نہ صرف مقدمہ کی کارروائی ختم کر دی بلکہ مزید تحقیقات بھی روک دی۔

کمپنی کی مخالفت

کمپنی کے خاص فطری دشمن جن کے خلاف وطن میں اور باہر اُس کی سختی جاری تھی وہ انگریز سوداگر تھے جو کمپنی کے اجارے میں مداخلت کرنا چاہتے اور اس وقت کی زبان میں "خلل انداز" کہلاتے تھے۔ یہی لوگ انگلستان و ہندوستان دونوں جگہ کمپنی کی زیادتیوں کے خاص کر نشانہ بنے ہوئے تھے۔ انھیں کو روکنے اور تباہ کرنے کی کوشش میں بلاشبہ بہت کچھ مظالم کیے گئے لیکن مصیبت زدہ طبقے کے مصنفین نے مبالغے سے کام لے کر ان مظالم کو وحشیانہ سفاکی پر محمول کیا ہے۔

سنہ ۱۶۹۸ء

یہ "خلل انداز" باوجود ان تمام زیادتیوں کے جن کی وہ شکایت کرتے تھے برابر زور پکڑتے رہے اور سنہ ۱۶۹۴ء میں کمپنی کو جو منشور عطا ہوا تھا اُسے انھوں نے سنہ ۱۶۹۶ء میں دوبارہ پارلیمنٹ میں پیش کرا دیا

[1] بحوالہ رسالہ اپریل سنہ ۱۶۹۵ء

اور دو ملین پونڈ بشرح آٹھ فی صدی پیش کر کے سابق جماعت پر سبقت[1] لے گئے اور اس کے عوض مشرق سے تجارت کرنے کا اجارہ جدید حصہ داروں کو مل گیا اور مسودۂ قانون ان کے موافق منظور ہو گیا لیکن ان کی فتح دیرپا نہ ہوئی اور قدیم کمپنی نے دوسرے اجلاس میں اپنے منشور کی توثیق کرالی۔ اس فیصلے کے بعد ایک کمپنی کے بجائے جس کا وجود شاہی منشور پر تھا پارلیمنٹ کے اختیار سے قوم کی دو مشرقی کمپنیاں ہو گئیں۔ ان دونوں جماعتوں کے الگ الگ وجود کی قلیل مدت میں جس شدت سے باہمی کشمکش جاری رہی اس کی مثال مشکل سے (۳۶)
مل سکتی ہے۔ دونوں کی بڑی کوشش یہ تھی کہ مجلس معوثان میں اثر حاصل کیا جائے اور سنہ ۱۷۰۱ء کے عام انتخاب میں ہر ایک کی رشوت و بددیانتی پکڑی گئی۔

سنہ ۱۷۰۱ء

مخالف کمپنی سے مقابلہ اور اتحاد

قدیم کمپنی نے ارکان کو رشوت دی اور جدید نے نشستیں خریدیں اس طرح ایک نے نمایندوں کو رشوت دی اور دوسری نے رائے دہندوں کو لیکن بالآخر اس تنازعے سے تنگ آکر جو دونوں کو تباہ کرتا دکھائی دیتا تھا انھوں نے اپنا سرمایہ قدیم کمپنی کے منشور مورخۂ ۵ ستمبر ۱۶۹۸ء کے تحت یکجا کر دیا اور اور وہ نام اختیار کیا جو اس وقت سے اب تک جاری ہے یعنی (The united East India Company) "متحدہ ایسٹ انڈیا کمپنی"

جب گھر میں یہ تنازعات جاری تھے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ کمپنی کے معاملات کی باہر کیا حالت ہو گی جن اصول پر یہ کام چلتے تھے ان کی اسپرٹ کا اندازہ ایک گورنر کے خط کے اقتباس سے ہوتا ہے۔ یہ خط ایک ایسے عہدہ دار کو لکھا گیا تھا جو ہندوستان میں عدالت دیوانی کا جج مقرر ہو کر آیا تھا۔ یہ مطلق العنان تاجر

[1] قدیم کمپنی نے سات لاکھ پونڈ چار فیصدی پر پیش کئے تھے۔

لکھتا ہے کہ[1] "اب مجھے توقع ہے کہ تم انگلستان کے قوانین پر عمل کرنے کے بجائے جو حماقت کا ذخیرہ اور دیہات کے چند ایسے اشخاص کے بنائے ہوئے ہیں جنھیں تجارتی جماعتوں اور بیرونی تجارت کا انتظام تو درکنار اپنے گھر کا انتظام بھی کرنا نہیں آتا" "میری مرضی اور میرے احکام پر عمل کروگے جو لوگ کمپنی کے دشمن ہوں "زیادہ جو دشمن تصور کئے جائیں اور خاص گروہ جو ہندوستان کی برطانوی رعایا پر ہمارے حقوق تسلیم (۲۷)
نکریں ان سب کو سزا دینے کا اب ہمیں اختیار حاصل ہوچکا ہے لہذا مجھے توقع ہے کہ وقتاً فوقتاً میرے جو احکام جاری ہونگے اُن کی تعمیل پارلیمنٹ کے قوانین کی طرح ہوگی"۔

انگلستان میں دونوں تجارتی جماعتوں کے متحد ہوجانے سے اُن کے مقامی اور بیرونی ملازموں میں فوری مصالحت نہ ہوسکی۔ اور اُن کی دیرینہ مخاصمتوں کے بجائے عام مفاد کا احساس پیدا ہونے کے لئے ایک مدت درکار تھی بالآخر یہ احساس پیدا ہوگیا اور

۱۷۰۸ء

۱۷۰۸ء میں متحدہ کمپنی نے اپنی تجارت و مراعات خصوصی کے لئے ایک نہایت مناسب حال قانون اس شرط سے منظور کرایا کہ وہ حکومت کو دو ملین کی رقم کے علاوہ جو جدید کمپنی کے قیام کے وقت قرض دی گئی تھی مزید ایک لاکھ بیس ہزار پونڈ قرض دے گی۔

صلح یوٹریکٹ (Utrecht) سے یورپ میں جو امن قائم ہوا اور اُس کی بدولت تجارت کو جو فروغ حاصل ہوا اُس کا اثر برطانیہ کے مشرقی مقبوضات میں بھی محسوس ہوا مزید براں اس زمانے میں

۱۷۱۳ء

(۱۷۱۳ء) یہ علاقے قابل اور ہوشیار اشخاص کے تحت تھے لیکن کامیابی نے دشمن پیدا کردیئے اور کمپنی کے

[1] بحوالہ ارلیف جلد دوم صفحہ ۵۴۰۔

اجارے کے خلاف ایک اودھم مچ گیا اور اُسے سلطنت کے عام تجارتی
مفاد کے خلاف بتایا گیا۔ مجبوراً انھیں ہندوستان میں اپنا تجارتی اجارہ
برقرار رکھنے کی غرض سے ایک سمجھوتا کرنا پڑا جو سلطنت کے مفاد کے
لئے ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ ازروئے انصاف یہ بیان کر دینا چاہئے
کہ اگرچہ ہمیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ کی پہلی صدی میں بدعنوانیوں کے (۲۸)
بے شمار ثبوت ملتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی دلیرانہ جد و جہد اور
اس کے زبردست جذبۂ استقلال کا بھی پتا لگتا ہے جس میں نہ کبھی کسی
نقصان سے فرق آیا اور نہ جس پر کبھی کسی قسم کے خطرات حاوی ہو سکے
یہی جذبہ جو اجارے اور مراعات خصوصی کی بدولت کمپنی کے کارکنوں
میں پیدا ہوا اور برقرار رہا بالآخر اُن کی کامیابی کا سبب بن گیا۔ اسی کی
بدولت وہ اپنی ناکامی کے زمانے میں یقین کے ساتھ آیندہ منافعے
کی توقع کرتے تھے اور اگر اس کی وجہ سے انھوں نے اپنے اجارے
پر حملہ کرنے والوں کے ساتھ کبھی کبھی ناانصافی یا زیادتی کرکے اپنی
شہرت پر دھبہ لگایا تو اسی کے ذریعہ سے انھوں نے تجارت
اور جنگ دونوں میں وہ نمایاں کارنامے دکھائے جو برطانوی قوم
کے خصوصیات کے لئے باعث فخر ہیں۔

یورپی حریف — **سنہ ۱۷۲۱ء**

فرانسیسی جو تقریباً اسی سال سے ایک ایسٹ انڈیا کمپنی
قایم کرنے اور اُس کا کاروبار چلانے میں متواتر ناکامی
کا مُنھ دیکھ رہے تھے سنہ ۱۷۲۱ء میں اپنے مقصد میں
کامیاب ہو گئے اور اس کمپنی کے قیام کی تاریخ سے
جو منافع باقاعدہ طور پر انھیں حاصل ہوا وہ اس قدر کثیر تھا کہ برطانوی
کمپنی کو اس سے حسد پیدا ہو گیا اور ایسے زمانے میں جبکہ ان دونوں
قوموں میں جنگ چھڑنے کا قرینہ تھا حکومت انگلستان بھی اس
حسد میں سرگرمی سے شریک ہو گئی اور اس نے اپنی توجہ مشرق کی
طرف مبذول کر دی۔ چونکہ فرانسیسی اپنی تجارت کو جو ابھی ابتدائی حالت

میں بھی بڑھانے کی فکر میں تھے اس لئے وہ ۱۷۴۲ء میں دونوں ملکوں
کی تجارتی جماعتوں کے لئے غیر جانبداری کی تجویز پیش کر چکے تھے۔
مجلس نظما نے پہلے تو یہ تجویز منظور کر لی لیکن بعد میں اُسے رد کر دیا۔
لہذا جب ۱۷۴۴ء میں یورپ میں جنگ چھڑی تو اُس کے شعلے تیزی
(٢٩) سے ایشیا تک پہنچ گئے ہر ملک کے بادشاہ نے اپنی اپنی کمپنی کی حمایت
کی تجارتی مشاغل کے بجائے جنگ میں مصروفیت ہو گئی اور یہ ایک
عجیب منظر تھا کہ یورپ کی دو قومیں ہندوستان کے ساحل پر ملک
کے مختلف دیسی فرمانرواؤں کی اعانت سے آپس میں لڑ رہی تھیں۔
ان فرمانرواؤں نے ناعاقبت اندیشی سے کام لے کر باہمی عداوت
اور ہوس کے عارضی مقاصد حاصل کرنے کے لئے اپنی آزادی کا ہمیشہ
کے لئے خاتمہ کر لیا۔ اس تنازعے کی ابتدا ہی میں بدیہی طور پر ظاہر ہو گیا
تھا کہ آخر میں خواہ انگریزی افواج غالب آئیں یا فرانسیسی بہر حال
دیسی حلیفوں کو فاتح کا محکوم بن کر رہنا پڑیگا۔

کمپنی کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے اُس سے نہ صرف اس کے
آغاز کا پتا چلتا ہے بلکہ اُس کی ابتدائی طاقت کی نوعیت پر بھی کافی روشنی
پڑتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے قیام کے ابتدائی زمانے
ہی سے اُس کی زیادتیوں کو روکنے کے لئے جن سے انگلستان
کے قومی خصوصیات کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا ملک کی قانون ساز
جماعت کی سخت نگرانی اور مسلسل مداخلت اشد ضروری تھی کمپنی یا بہ الفاظ دیگر
اس کی مجلس انتظامی کے ارکان جن کے ہاتھ میں اس جماعت کی باگ
تھی اُن احساسات سے ناآشنا تھے جو انسان کے دماغ میں نیک
خیالات اور بڑے کاموں کی رغبت پیدا کرتے ہیں۔ درحقیقت ان میں
خود دولت پیدا کرنے اور اپنے عزیزوں اور متعلقین کو متمول بنانے کی
خواہش کے سوا کوئی دوسری محرک قوت نہ تھی۔ اُن کی جماعتی قوت جیسا
کہ اس قسم کی تنظیم کا لازمی نتیجہ ہے اُن کی بددیانتی اور ظلم و تعدی کے ذرائع

کے ساتھ بڑھتی گئی لیکن اُس زمانے میں زر پرستی کی کچھ ایسی ہوا چلی ہوئی
تھی کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بلند مرتبہ کیوں نہ ہو اُس کے ناپاک اثر سے
محفوظ نہ تھا۔

(۳۰) ۱۷۴۴ء میں انگلستان اور فرانس کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے
بعد سے برطانوی ہند کے ایک جدید دور کا آغاز ہوتا ہے۔ حکومت کی
تنظیم تو وہی قایم رہی لیکن حالات میں تغیر پیدا ہو گیا۔ اس قومی تنازعے
اور جدید کارپردازوں کے داخل ہونے سے کمپنی کو ایک خاص اہمیت
حاصل ہو گئی۔ اب ان کی حیثیت اہلکاروں کی سی نہ رہی تھی جن پر کوئی
نظر نہ ڈالتا تھا اور نہ یہ محض ایک تجارتی کمپنی کے کارندے تھے جنہیں
اپنی گمنامی کی وجہ سے نہ نیکی کی رغبت ہوتی تھی اور نہ ذلت کا خوف
بلکہ یہ چند ممتاز عمّال تھے جو باوقار حکام کی نگرانی میں کام کرتے اور
ہمیشہ اپنے اُن اہل وطن کی نگاہوں میں رہتے تھے جو اب ہندوستان
کے معاملات میں گہری دلچسپی لینے لگے تھے۔

اگرچہ یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ اس طرح سے محض چند افراد کے
دماغ میں عزت و شہرت کی خواہش پیدا ہو جانے سے ایک ایسی
جماعت میں جن کی بنیاد ڈھنگ خراب تھی اس قدر زبردست انقلاب پیدا
ہو جائیگا تاہم تسلیم کرنا چاہیئے کہ ان کا تعجب خیز اثر ضرور پڑا۔ ہندوستان
ایک ایسا میدان بن گیا جہاں کیرکٹر بنتا تھا اور شہرت حاصل ہوتی تھی اور
ساتھ ہی ساتھ دولت بھی ملتی تھی۔ جو لوگ اس ملک میں ممتاز عہدوں
پر مامور ہوئے اُن میں سے اکثروں نے وہ اعلیٰ ترین اعزاز حاصل
کئے جو کسی احترام یا قدر و تحسین سے حاصل ہو سکتے ہیں یا جسے شجاعت
اور دماغی قابلیت عطا کر سکتی ہے۔ جب تک کہ انگلستان کی تاریخ باقی
ہے لارنس اور کلائیو کے نام (جنھوں نے کمپنی کی تاریخ کے اسی دور میں
اپنی زندگی شروع کی تھی) زندہ رہینگے اور جب تک کہ ذاتی شجاعت اور
فن سپہ گری اور اعلیٰ دماغی قابلیت کی قدر و تحسین بنی نوع انسان سے نہ

ہٹ جائے اُس وقت تک ان دونوں کا شمار شاندار اور قابل تقلید (۳۱
ہستیوں میں ہوگا۔

۱۷۴۸ء تا ۱۷۶۷ء۔

فرانسیسیوں اور انگریزوں کے درمیان جو جنگ ہندوستان میں جاری تھی وہ ۱۷۴۸ء میں ایلاشیپل کی صلح سے ختم ہوگئی۔ لیکن ان دونوں ملکوں کی جو فوجیں ساحل کارومنڈل پر موجود تھیں اُن سے وہ مختلف ہندوستانی فرمانرواؤں کی مدد کرتے رہے۔ ہر فریق کا مقصد یہ تھا کہ اس حکمت عملی سے وہ ایک خاص قوت حاصل کرلے تاکہ دوبارہ جنگ چھڑنے کی صورت میں وہ دوسرے پر فوقیت حاصل کرسکے۔ چند سال تک فرانسیسی اور انگریز دونوں نے یہی طرزِ عمل جاری رکھا اور گاہے گاہے اس میں کامیابی بھی حاصل ہوتی رہی لیکن جب اس کی وجہ سے مصائب پیش آئے تو ہر کمپنی کے نظما نے اپنے اپنے بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ بیچ میں پڑکر اپنے اثر سے ان میں سمجھوتہ کرادے۔ سمجھوتے کے شرائط بھی قریب قریب طے ہوگئے تھے لیکن ۱۷۵۶ء میں ان دونوں قوموں کے درمیان پھر جنگ چھڑ گئی اور ہندوستان میں ان کی رعایا کو پہلے سے بھی زیادہ وسیع پیمانے پر جنگ کرنی پڑی۔ اس جنگ میں انگریزوں کو بے نظیر کامیابی حاصل ہوئی اور ۱۷۶۳ء کی صلح میں وہ بنگال و بہار و اوڑیسہ اور شمالی سرکار اور کرناٹک کے ایک علاقے کے حقیقی مالک قرار پاگئے اور ساحل کارومنڈل پر اُن کے سابق مقبوضات بھی بحال رہے۔

پارلیمنٹ کی طرف سے تحقیقات۔

انگلستان والوں کو قدرتی طور پر کمپنی کی ترقی کی اس تیز رفتاری سے تعجب ہوا اور انھوں نے اُس کے معاملات کی طرف توجہ کی۔ ۱۷۶۷ء میں مجلس مبعوثان نے
ایک ذیلی مجلس مقرر کی تاکہ وہ کمپنی کے منشوروں (۳۲
کی نوعیت کو جانچے اور اس کے معاہدوں اور عطیات پر غور کرے اور

حکومت نے اُس کے دیوانی علاقے اور بحری وبری محکموں پر جو روپیہ صرف کیا ہے اُس کا بھی حساب دیکھے۔

اس موقع پر ملک گیری کے حقوق پر نہایت سختی سے اعتراض کیا گیا اور اجارے کے مسئلے پر بھی نہایت آزادی سے بحث ہوئی لیکن مالکان کمپنی کو سابقہ موقعوں کی طرح مخالفین کی اُس جماعت کو جو اُن کے نزدیک خطرناک ثابت ہوسکتی تھی اس موقعے پر بھی خاموش کرنے کا ذریعہ مل گیا۔ ان کی دولت اور دوسروں پر احسان کرنے کے ذرایع سے ان کا ذاتی وسیاسی اثر ملک میں بہت بڑھ گیا تھا۔ اس وقت مشرق میں جو سونے کی کان کھلی ہوئی تھی اُس سے اس قدر کثیر تعداد کے اغراض وابستہ ہوگئے تھے کہ ایسی زبردست ومتحدہ جماعت کا اُکھاڑنا تو درکنار اُسے دبانا بھی آسان نہ تھا۔ اس تحقیقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ کمپنی اور وزرا میں ایک سمجھوتہ ہوگیا جس کی رو سے کمپنی کے مقبوضات دو سال کے لئے اس شرط پر بحال رکھے گئے کہ وہ حکومت کو چالیس ہزار پونڈ سالانہ ادا کرے۔ ۱۷۶۹ء میں بھی اسی قسم کا معاہدہ ہوا لیکن اس مرتبہ اس کی مدت پانچ سال قرار دی گئی۔

۱۷۷۳ء — قانون تنظیم سے کمپنی کی حکومت میں تبدیلیاں

اس معاہدے کی مدت ختم ہونے سے قبل ہی کمپنی کو سخت مالی مشکلات پیش آئے اور ۱۷۷۳ء میں اُس نے حکومت سے مالی امداد کی (۳۳) درخواست کی۔ درخواست منظور ہوگئی لیکن مجلس مبعوثان نے اس مرتبہ تحقیقات کرنے کے بعد ایک قانون نافذ کیا جس سے کمپنی کی مقامی وبیرونی دونوں حکومتوں میں اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ جن میں سے خاص تبدیلیاں یہ تھیں:-

اول۔ مجلس نظما کا انتخاب آیندہ سے بجائے سالانہ کے ہر چار سال بعد ہوا کرے۔ ہر سال چھ ارکان اس طرح علیحدہ ہوں کہ کوئی اپنی جگہ چار سال سے زیادہ نہ رہ سکے۔

دوم۔ رکنیت کے سرمایے کی رقم بجائے پانچسو کے ایک ہزار پونڈ ہو۔ تین ہزار کے حصہ دار کو دہری رائے کا حق حاصل ہوگا اور چھ ہزار والے کو تہری رائے کا۔

سوم۔ حاکم شہر کی عدالت کے بجائے جسے محض چند ادائی انتجارتی مقدمات فیصل کرنے کا اختیار تھا ایک عدالت العالیہ قایم کیجائے۔ اس میں ایک میر مجلس اور تین تحتانی جج ہوں اور ان سب کا تقرر بادشاہ کی طرف سے ہو۔ اسے علاقہ بنگال کے تمام انگریز باشندوں پر اور کمپنی کے ملازموں اور اُس کی رعایا پر وسیع دیوانی و فوجی اختیارات حاصل ہوں۔

چہارم۔ فورٹ ولیم کے علاقے کے لئے ایک گورنر جنرل اور چار مشیروں کا تقرر ہو۔ انھیں کمپنی کے دوسرے علاقوں پر بھی کامل اختیارات عطا کئے جائیں۔ اگر ان میں کسی معاملے پر اختلاف ہو تو فیصلہ کثرت رائے سے ہو۔ اس مجلس کو بموجب قانون ہدایت تھی کہ وہ اپنی جملہ کارروائیوں کی کیفیت باضابطہ طور پر نظما کے پاس بھیجتی رہے اور نظما ان کاغذات کے پہنچنے کے بعد چودہ دن کے اندر ان کی نقلیں بادشاہ کے معتمدوں میں سے کسی ایک کے پاس روانہ کریں اور اگر وہ کسی قسم کے قواعد و ضوابط مرتب کریں تو اُن کی نقلیں بھی روانہ کریں اور اگر بادشاہ انھیں نامنظور کرے تو وہ باطل سمجھے جائیں (۳۴)

اس قانون کی رو سے وارن ہیسٹنگز ہندوستان کا گورنر جنرل

وارن ہیسٹنگز کا تقرر سنہ ۱۷۷۴ء

مقرر ہوا اور پہلی مرتبہ جان کلیورنگ آنریبل جارج مان سن اور رچارڈ باردیل و فلپ فرنسس مجلس کے چار ارکان مقرر ہوئے۔

مسٹر ہیسٹنگز کے دور کے واقعات کو تفصیل سے بیان کرنا اس کتاب کے موضوع کے خلاف ہوگا۔ اس دور میں شروع سے آخر تک

اس قدر اہم اور غیر معمولی واقعات پیش آئے کہ ان کی وجہ سے ایک
ایسی بحث چھڑ گئی جس کی بدولت برطانوی قوم کو بہ نسبت پہلے کے
ہندوستان کے معاملات سے محض زیادہ واقفیت ہی حاصل نہ ہوئی
بلکہ اُس کے جو اغراض ہندوستان سے وابستہ تھے اُن کی اہمیت کا
بھی اُسے صحیح اندازہ ہوگیا۔ اس وقت مختلف فرقوں اور جماعتوں کے
خیالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں برطانوی ہند کی تاریخ کے اس حصے میں
چند ایسی نمایاں باتیں ہیں جن پر تمام انصاف پسند اور سنجیدہ افراد متفق
ہیں۔ جو لوگ ہسٹنگز کے بعض افعال کو قابل ملامت سمجھتے ہیں وہ
بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اُس نے حکومت کی ایسے مشکلوں کے
زمانے میں جن کی کوئی نظیر نہیں ملسکتی اور ایسے وقت میں جب کہ وہ اُن
لوگوں کی مخالفت کا مقابلہ کر رہا تھا جن سے اُسے مدد ملنی چاہیے تھی
ایک مدبر اعظم کی طرح مستعدی ظاہر کی اور اپنی سرگرمی اور غیر معمولی جد و جہد
سے اپنے ملک کے مفاد کو جو ہندوستان میں معرض خطر میں تھا
تباہی سے بچا لیا اور وہ اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اگر اس وقت
عنان حکومت ایسے پائے کے مستقل مزاج اور باہمت اور ذہین (۴۵)
آدمی کے ہاتھ میں نہ ہوتی تو کمپنی ضرور تباہی میں آجاتی۔ یہ اُس کی تعریف
ہے اور کوئی شخص اس سے زیادہ کی خواہش نہیں کرسکتا لیکن اس ممتاز
شخص کے زبردست حامی اگر ایک طرف اُس کی راستبازی کے قائل
ہیں اور اُس کی تعریف کرتے ہیں تو وہ دوسری طرف یہ بات بھی تسلیم
کرنے پر مجبور ہیں کہ جس حکومت کا وہ صدر تھا وہ ناقص تھی اور اُس کی تنظیم
میں بہت کچھ نقائص تھے ۱۷۸۴ء کے قانون کی رو سے بادشاہ کے
وزراء کو جانچ پڑتال اور عام نگرانی کا جو حق حاصل تھا اُس سے اِن
بنیادی نقائص میں بجائے کمی کے اور اضافہ ہوگیا۔ وزراء مداخلت
کے مجاز تھے لیکن ان پر حکومت ہند کے معاملات کی کچھ ذمہ داری
نہ تھی اور اگر کچھ تھی بھی تو برائے نام۔ گورنر جنرل کے لئے اُن کی عنایت و

اعانت نہایت ضروری تھی لہٰذا اُسے نظمائے کمپنی کے دوستوں کے علاوہ شاہی وزرار کے دوستوں کو بھی جگہ دینی ضروری تھی۔ گورنر جنرل کے لئے انگلستان میں اعانت حاصل کرنے کا اگر تنہا نہیں تو خاص ذریعہ یہ تھا کہ وہ ہندوستان میں دوسروں کی پرورش کا انتظام کرے۔ برطانوی دستور میں دوسروں کو ملانے کی جو ضرورت پڑتی ہے اس کالحاظ کرتے ہوئے یہ بعید معلوم ہوتا تھا کہ مشرق کے دولت خیز تقررات میں حصہ بٹانے سے جو اثر حاصل ہوتا ہے اُسے کوئی وزیر اپنے ہاتھ سے جانے دیگا۔ پس اگر کمپنی کے چند خاص کارکنوں کو ماخوذ کرنے کی غرض سے تحقیق کی ان تھک سرگرمی اُس کی ضخیم مسلوں کو روشنی میں نہ لاتی تو یہ نظام حکومت باوجود بددیانتی اور نااہلی کے مدت دراز تک برقرار رہتا۔ مجلس مبعوثان کی پہلی ذیلی مجلس (۳۶)

سنہ ۱۷۸۲ء

یار از وار کمیٹی نے مسٹر ڈنڈاس کی صدارت میں عمل شروع کیا۔ اس کی رپورٹ کے بعد ہی مجلس منتخبہ کی رپورٹ شایع ہوئی جس نے مسٹر برک کی نگرانی اور رہنمائی میں کام کرکے ہر طبقے کو کمپنی کے عام حالات سے واقف کرادیا۔ انگلستان کو اپنے جن دانشمند افراد اور زبردست مقررین پر فخر رہا ہے اُن میں برک کا رتبہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔

اس تحقیقات کی پیروی کرنے والوں کے مقاصد میں کتنے ہی ذاتی اغراض کیوں نہ شامل ہوں اس میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ وہ ملک کے شکریے کے ضرور مستحق ہوگئے کیونکہ جب تک اس قسم کے مواد سے عام واقفیت نہ ہوتی اس حکومت کی اصلاح اور بہتری کی تمام کوششیں جن میں بددیانتی برقرار رکھنے کی ترغیب موجود تھی بے سود و لاحاصل ثابت ہوتیں۔

کلکتے کی عدالت العالیہ

سنہ ۱۷۷۳ء کے ایکٹ سے فورٹ ولیم میں جو عدالت العالیہ وسیع اختیارات کے ساتھ قایم ہوئی وہ عملاً کمپنی کے صوبوں کی دیسی رعایا کے تعصبات کے سخت خلاف ثابت ہوئی اور

حکومت کے جس شعبہ کی اس سے تقویت منظور تھی اُسی کے لئے وہ اس قدر مفر ثابت ہوئی کہ جب ۱۸۱۳ء میں دوسرا ایکٹ منظور ہوا تو اسے گانو کے ہیئے اور سواد شہر کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔

۱۷۸۳ء

۱۷۹۳ء میں جو ایکٹ منظور ہوا تھا اُس کی رو سے مقبوضہ علاقوں پر کمپنی کا قبضہ صرف ایک سال کے لئے برقرار رکھا گیا تھا۔ اُس کے بعد سے ۱۷۸۳ء تک نظار اور شاہی وزراء کے درمیان برابر اس مسئلے پر کشمکش جاری رہی کہ کمپنی کے منشور میں آیندہ کن شرائط پر توسیع کیجائے اور اُس کے کن کن مراعات خصوصی کو برقرار رکھا جائے۔ یہاں نہ اُن مختلف تجاویز پر تبصرے کی ضرورت ہے جو اس تنازعے کے اثناء میں کمپنی نے پیش کئے اور نہ خاص طور پر اُن تجویزوں کا ذکر ضروری ہے جنھیں شاہی وزراء نے قبول یا مسترد کر دیا اس زمانے میں دوسرے اہم کام جو انجام پائے اُن کی وجہ سے یہ سب باتیں فراموش ہو گئیں اور (چونکہ یہ سب بدیہی طور پر عارضی تدابیر تھے اس لئے) جو حشر ان کا ہوا اُس سے وہ محفوظ رہنے کے قابل بھی نہ تھے۔ (٣٧)

مسودۂ قانون مجوزۂ مسٹر ڈنڈاس ۱۷۸۳ء

۱۷۸۳ء میں ہندوستان کے معاملات پر نہایت سخت بحث رہی۔ تحقیقاتی مجالس میں سے ایک کا صدر مسٹر ڈنڈاس تھا۔ اس نے اس سال کے اوائل میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا جس سے بہت کچھ اہم تبدیلیاں مقصود تھیں۔ صرف ایک اہم تجویز یہ تھی کہ گورنر جنرل اور کپتان جنرل کے اعلیٰ لقب سے ایک شخص کا تقرر کیا جائے اور اسے (چند قیود کے ساتھ) برطانوی ہند کے تمام معاملات میں پورا اختیار اور اُن کی جانچ پڑتال کا پورا حق حاصل ہو۔ بادشاہ حکومت کے اس اعلیٰ عہدہ دار کو نامزد نہ کرے بلکہ محض اُس کے تقرر کی منظوری دیدے اور اس کی علیحدگی صرف اُسی کے حکم سے عمل میں آئے۔ اس مسودے

میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ تمام مراسلوں کی نقلیں بادشاہ کا معتمد خاص وصول کرے۔ ان تجاویز کے ساتھ ہندوستانیوں کے قوانین و مذہب و رسم و رواج کی حفاظت کے لئے بھی اُس میں چند عام اور مفید قواعد شامل تھے۔

اس مسودے کا خاص منشا یہ تھا کہ منشور کی باقی ماندہ مدت میں حکومت کے عہدہ داروں کو کمپنی کے انتظامی معاملات میں زیادہ مداخلت کا حق حاصل ہو جائے اُس اصول کو عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ۱۳۸۱
اور یہ بھی مان لیا گیا کہ مقامی حکومت بہ نسبت پہلے کے زیادہ اہل اور مستعد ہونی چاہیے۔ اس بات پر بھی اتفاق تھا کہ سنہ ۱۷۷۳ء کے قانون سے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جب تک کہ اُن کی تشریح زیادہ توضیح سے نہ کی جائے اور مختلف جماعتوں پر اُن کا معقول اثر نہ ہو موجودہ نظام حکومت کے سخت ترین نقائص کی اصلاح نہیں ہو سکتی لیکن مجلس المبعوثان میں اس مسئلے پر زیادہ اختلاف آرا رہا ہے کہ اس طرح جو بااختیار حکومت قائم کرنی مقصود ہے اُس پر کسی قسم کے قیود کا عائد کرنا ضروری ہوگا اور خاص طور سے اسی بنا پر اس کے افادے پر بھی بحث ہوئی۔ مسٹر ڈنڈاس نے حکومت ہند کے لئے جو مسودۂ قانون پیش کیا وہ تو منظور نہ ہوا لیکن اُس کی بدولت اسی قسم کا ایک اور مسودہ دوسرے اجلاس میں مسٹر پٹ نے پیش کیا اور منظور کرا لیا۔ اس مسودے کی کامیابی کا راز کمپنی کے نظار اور سرمایہ داروں کے اُن خیالات اور احساسات میں مضمر ہے جو پٹ کے سیاسی حریف مسٹر فاکس کے پیش کردہ مسودے کی شورش سے پیدا ہوئے تھے لہٰذا اس کے خاکے پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔

مسٹر فاکس کے پیش کردہ مسودے سنہ ۱۷۸۳ء۔

سنہ ۱۷۸۳ء میں مسٹر فاکس نے ہندوستان کے برطانوی مقبوضات کے بہتر انتظام اور حکومت کے بارے میں اپنے

مشہور مسودے[1] پیش کئے۔ یہ مسودے خاص اصول پر مبنی تھے جس کا ذکر سرنامے میں کر دیا گیا تھا یعنی یہ کہ برطانوی ہند کے مقبوضات (۳۹)
اور سررشتۂ مال اور تجارت کے انتظام میں ایک عرصے سے انتہا درجہ کی پریشان کن ابتری برپا ہے اور وہاں کے باشندے تباہی کے درجے تک پہنچ گئے ہیں اور سرکاری مفاد کے تباہ ہونے کا بھی اندیشہ لگا ہوا ہے اور ان سب کا علاج ضروری ہے لہذا مندرجۂ ذیل تجویز پیش کی جاتی ہے۔

مجلس نظار اور سرمایہ داروں کو جو اختیارات اس وقت حاصل ہیں وہ چار سال کی مدت کے لئے سات نظار یا کمشنروں کے تفویض کر دئے جائیں (جن کے نام ایکٹ میں درج ہیں) ان کی اعانت کے لئے دو ہزار پونڈ والے حصہ داروں میں سے سات مددگار نظار مقرر کئے جائیں جو کلیتہً اول الذکر کے احکام کے تابع رہیں (ان کے نام بھی ایکٹ میں درج ہیں)۔ اگر سات اعلیٰ نظار میں سے کوئی انتقال کر جائے یا مستعفی ہو جائے یا (ایسے الزامات کی بنا پر جو مجلس ہندوستان میں ثابت ہو جائیں) علیحدہ کر دیا جائے تو خالی شدہ جگہ کا انتظام بادشاہ کرے اور اگر سات مددگار نظار میں سے کسی کی جگہ خالی ہو تو حصہ دار (جو ۱۷۸۳ء کے ایکٹ کی رو سے اس کے اہل ہوں) دوسرے کا انتخاب کریں۔

ان مسودوں میں گورنر جنرل کے اختیارات جس اصول پر مبنی تھے وہ مسٹر ڈنڈاس کے اصول کے سراسر برعکس تھے۔ یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو جو اختیارات حاصل ہیں وہ تنہا اُسے یا کسی اور شخص یا اشخاص کو خواہ وہ کوئی ہوں کسی صورت میں

[1] یہ دو تھے ایک سے مقامی (یا بہ الفاظ مسودۂ قانون گھر کی) حالت سنبھالنی مقصود تھی اور دوسرے سے بیرونی حکومت کی۔

۱۷۸۳ء

نہ دئے جائیں۔ جس حد تک ممکن تھا گورنر جنرل اور اس کی مجلس پر ہر
معاملے اور خصوصاً اعلانِ جنگ کے بارے میں قیود عائد کر دئے (۴۰)
گئے تھے۔ گورنر جنرل نہ ہندوستان کے کسی فرمانروا
کی سلطنت میں مسلح فوج کے ساتھ داخل ہو سکتا تھا
اور نہ اُن میں سے کسی پر حملہ ہی کر سکتا تھا۔ البتہ صرف اس صورت
میں وہ اس کا مجاز ہو سکتا تھا جب کہ اُسے یہ اطلاع ملے کہ ان
میں سے کوئی کمپنی یا اُس کے حلیفوں پر حملہ کرنے والا ہے اور
اس خبر کی تصدیق ہو جائے اور مجلس کے نصف سے زیادہ
ارکان فرداً فرداً اس کے موافق اپنی رائے قلمبند کریں۔ گورنر جنرل
اور اس کی مجلس کو ہدایت تھی کہ وہ بغیر کمشنروں کے احکام کے کسی
علاقے کو کسی ہندوستانی فرمانروا سے مل کر تقسیم کرانے کی غرض سے
کوئی ایسا معاہدہ نہ کرے جس کی وجہ سے کمپنی کو جنگ میں پیش قدمی
کرنی پڑے۔ ان دونوں کو کمپنی کی فوجوں کو (خواہ وہ یورپی ہوں
یا دیسی) کسی ہندوستانی ریاست کے علاقے میں کرائے پر بھیجنے کی
بھی اجازت نہ تھی۔

ان مسودوں کے یہ خاص تجاویز تھے۔ مجلس معبوثان
نے تو انھیں ایک معقول کثرت رائے سے منظور کر لیا لیکن مجلس اعیان
نے رد کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس مدبر نے انھیں تیار کیا تھا
وہ اپنے عہدے سے علیحدہ ہو گیا اور جس جماعت نے اس کی تائید کی
تھی وہ پارلیمنٹ سے خارج ہو گئی۔ مسٹر فاکس کے تجاویز بدیہی طور
پر عارضی تھے اور اُن سے محض فوری علاج مقصود تھا۔ اُس نے
جن سات کمشنروں کے نام پیش کئے تھے اُن کی حیثیت ایک
ایسے تجارتی کارخانے کے ٹرسٹیوں کی سی تھی جس کا دیوالہ نکل
چکا ہو اور انھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کام اُس وقت تک سنبھالنا
تھا جب تک کہ اس بات کا ٹھیک اندازہ نہ ہو جائے کہ آیندہ

اُس کا کاروبار چلانے کا بہترین اور معقول ترین طریقہ کیا ہے۔ اس بات کا
اندازہ نہیں ہو سکتا کہ اگر یہ تجاویز عمل میں آجاتے تو حکومت ہند کے لئے (۴۴۱)
مستقل انتظام کیا ہوتا لیکن اس کا امکان بہت کم تھا کہ یہ کمپنی آیندہ کبھی
اپنے اختیارات حاصل کرلیتی۔ بہر حال اس جگہ مسٹر فاکس کے مسودوں
کی خوبیوں یا اُن کے نقائص پر بحث کرنا مقصود نہیں۔ ان میں جہاں
چند دانشمندی اور دور اندیشی کی باتیں پائی جاتی ہیں وہیں یقینی طور پر
زبردست فرقہ دارہی جذبہ اور تعصب بھی حاوی نظر آتا ہے اور معاملات
سے صحیح اور پوری واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے اس مدبر اعظم کے
اکثر نمایاں اصول اُس ملک کی حقیقی حالت کے مطابق نہ تھے جس کے
لئے اُس نے انھیں تیار کیا تھا۔

اگرچہ اُس کا تیار کیا ہوا دستور ہندوستان کے سابق
نظام حکومت سے بہتر تھا تاہم اغلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے
چند بنیادی اُصول تک غلط ثابت ہوتے اور خاص طور پر اُس کا وہ
اصول جس کے تحت اُس نے ہندوستان کی برسر حکومت طاقت
میں اہم اور براہ راست ذمہ داری کے ذریعے سے اعتماد پیدا کرنے
کے بجائے وہاں کی مقامی حکومت پر طرح طرح کے قیود عائد کئے
اور اس طرح سے اُس کے اختیارات میں کمی کی اور اُس کے دائرۂ
عمل کو کمزور و محدود کیا اور اُسے اُن اہم فرائض کی انجام دہی کے
معاملے میں جنھیں وہ درحقیقت خود مختارانہ حیثیت سے انجام دیتی ہے
پہلے سے بھی زیادہ نااہل بنا دیا۔ مسٹر فاکس کے مجوزہ قانون کے
خلاف سخت چیخ پکار مچی۔ اُس کی سات کمشنروں والی تجویز سے یہ مطلب
نکالا گیا کہ وہ اس ترکیب سے اپنی طاقت مستقل بنانا چاہتا ہے۔ یہ
کہا جاتا تھا کہ اُس کے تجاویز سے وہ وزراء صاحب اثر ہو جائینگے
جن کا ملک کے دستور میں کوئی ذکر نہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جو
ابتک اپنے اجارے اور اُن الزامات کی وجہ سے جو اُس پر عائد

کیئے جاتے تھے قابل نفرت سمجھی جاتی تھی اور جس پر گالیاں پڑتی رہتی تھیں وہ اب قابل رحم ہوگئی اور لوگ اس پر ترس کھانے لگے۔ (۴۲)
اس زمانے کے مصنفوں نے اسے ایک مظلوم اور بیکس جماعت سے تعبیر کیا جس پر ایک ناعاقبت اندیش اور جاہ طلب وزیر کا حملہ ہونے والا تھا اور جس کے حقوق و اختیارات ختم ہوتے نظر آتے تھے۔

مخالفت کی اس شدت کی وجہ سے کمپنی کے معاملات کی نگرانی کا مسئلہ دو بڑی اور قریب قریب ہم پلہ جماعتوں کے مابین ایک سیاسی تنازعہ بن گیا لیکن مسٹر پٹ اور مجلس نظما یا یوں کہئے کہ مسٹر پٹ اور ہندوستانی سرمائے کے مالکوں کی کثیر تعداد کے اتحاد سے پانسہ پلٹ گیا۔ یہ لوگ ابتدا میں کسی قسم کی مداخلت نہیں چاہتے تھے لیکن جب انھیں یہ محسوس ہوگیا کہ وہ اس سے نہیں بچ سکتے تو وہ قدرتی طور پر اس فریق کے ساتھ ہو لئے جو ان کے اختیارات و مراعات خصوصی کا (جنھیں وہ اپنے مسلمہ حقوق تصور کرتے تھے) سب سے کم مخالف تھا۔

دوسرا باب
لارڈ کارنوالس
کا
عہد حکومت

مسٹر پٹ کا مسودہ قانون۔

یہاں محض پٹ کے قانون مجریہ ۱۷۸۴ء ہی پر نہیں
بلکہ قانون مجریہ ۱۷۸۶ء جو اس کی تشریح کے لئے نافذ
ہوا نیز دیگر ان جملہ قوانین پر جو اس کے بعد عمل میں آئے (۴۳)
غور کرنا مناسب و مفید ہوگا۔ کیونکہ انہیں کے مجموعے پر حکومت ہند کے
موجودہ دستور کی بنیاد ہے۔

پٹ کے قانون کی رو سے مجلس مشیران شاہی (Privy Council)
کے چھ ارکان ہندوستان کے معاملات کی نگرانی کے لئے کمشنر مقرر کئے
گئے اور معتمدین ریاست میں سے ایک کو سردست ان کا صدر بنایا گیا۔
ان کمشنروں کا تقرر براہ راست بادشاہ کی جانب سے ہوا تھا (۴۴)
اور وہی انہیں علیحدہ بھی کر سکتا تھا۔ کمپنی کے تمام سول۔ فوجی اور مالی
انتظامات کی نگرانی ان کمشنروں کے سپرد کی گئی۔

جو کاغذات کہ ان کمشنروں کو مجلس نظماء سے وصول ہوں انہیں

چودہ دن کے اندر منظور کرکے واپس کر دینا لازم اور نامنظوری کی حالت میں تفصیل کے ساتھ اس کے وجوہ بیان کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ اسطرح منظور شدہ یا ترمیم شدہ مراسلات میں اگر مجلس نظماء مزید ترمیم یا تبدیلی کی درخواست نہ کرا سے تو اُن کو ہندوستان روانہ کر دیا جاتا تھا [1]

صیغۂ راز کے تمام امور میں اور خصوصاً ان میں جن کا تعلق ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ صلح و جنگ سے ہوتا تھا کمشنر اپنے احکام مجلس نظماء کے شعبۂ راز کی معرفت ہندوستان روانہ کر سکتے تھے۔ اگرچہ ان معاملات میں مجلس کا محض توسط ہی تھا۔

اس قانون کے بموجب حکومت ہند ایک گورنر جنرل اور تین ارکان کی ایک مجلس پر مشتمل ہوئی اور گورنر جنرل کے بعد فوج کے سپہ سالار کا درجہ رکھا گیا لیکن گورنر جنرل کی جگہ خالی ہونے پر وہ اُس کا قائم مقام اُس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا۔ جب تک کہ نظماء خاص طور سے اسے مقرر نہ کریں۔

(۴۵) مدراس اور بمبئی کے تحتانی علاقوں کی حکومت کا دستور بھی مثل بنگال کی حکومت کے کر دیا گیا اور گورنر جنرل کی طرح ان دونوں گورنروں کو بھی اپنی اپنی مجلس میں زائد رائے کا حق مل گیا۔

یہ مقبوضات اس قانون کی رو سے دیسی ریاستوں سب کے تمام معاملات میں خواہ اُن کا تعلق جنگ سے ہو یا صلح سے نیز اپنی آمدنی اور افواج کے انتظام میں پوری طرح سے گورنر جنرل باجلاس کونسل کے تحت ہو گئے۔

[1] (اگر کمشنر حکومت کے سول یا فوجی معاملات یا کمپنی کے مقبوضات کی مالگزاری کے متعلق مجلس نظماء کو کچھ احکام صادر کرتے تو نظماء اُن کے خلاف بادشاہ اور اس کی مجلس سے مرافعہ کر سکتے تھے)

اگر خاص خاص مقامات پر کوئی ایسی جگہ خالی ہو جس پر مجلس نظماء کو تقرر کرنے کا حق حاصل ہو اور وہ جگہ خالی ہونے سے دو ماہ تک کسی کو نامزد نہ کریں تو شاہ وقت کو نامزد کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اس قانون کی رو سے بادشاہ کو گورنر جنرل یا کمپنی کے کسی اور عہدہ دار کو ہندوستان سے واپس بلانے کا حق حاصل تھا۔ نیز ایسے عہدوں کی خالی جگہ کے لیے جن پر نظماء کو تقرر کرنے کا حق حاصل تھا اگر جگہ خالی ہونے سے دو ماہ تک وہ کسی کو نامزد نہ کرتے تو شاہ وقت اس عہدے پر کسی کا تقرر کر سکتا تھا۔

اس قانون کے ذریعے سے یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ چونکہ ملک گیری اور فتوح کی جد و جہد برطانوی قوم کی خواہش، اس کے اقتدار اور مسلک کے خلاف ہے لہٰذا فورٹ ولیم کے گورنر جنرل باجلاس کونسل کو مجلس نظماء یا شعبۂ راز سے باضابطہ اجازت و منظوری حاصل کئے بغیر اعلان جنگ کرنے یا جنگ شروع کرنے یا کسی ہندوستانی فرمانروا یا کسی دیسی ریاست سے ان کے علاقوں اور مقبوضات کی حفاظت اپنے ذمہ لینے کا اس وقت تک اختیار نہ ہوگا جب تک کہ وہ مخالف ہندوستان میں برطانوی قوم یا اس کے ایسے حلیفوں کے خلاف جن کی حفاظت سابق معاہدوں کی رو سے اس کے ذمہ ہو، اعلان جنگ نہ کر دے یا ان پر حملہ کرنے کے لئے درحقیقت تیاریاں عمل میں نہ لائے۔ (۴۶)

تحتانی احاطوں کو فورٹ ولیم یا مجلس نظماء یا مجلس راز سے اجازت حاصل کئے بغیر صلح و جنگ کرنے کی ممانعت کر دی گئی لیکن فوری ضرورت یا ایسے خطرے کی حالت میں جب کہ جنگ یا صلح میں تاخیر سے خطرناک نتائج پیدا ہونے کا اندیشہ ہو انھیں جنگ و صلح کرنے کی اجازت دی گئی۔ حکومت اعلیٰ کو اختیار دیا گیا کہ اگر تحتانی مقبوضات کا کوئی گورنر اس کی نافرمانی کرے تو وہ اسے معطل کر دے۔

اس قانون کے ذریعے سے ہندوستانی ملزموں کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے ایک جدید اور غیر معمولی عدالت قایم ہوئی یہ عدالت مجلس اعیان اور مجلس ہندوستان کے چند ارکان پر مشتمل تھی اور اسے ان تمام مقدمات کے فیصل کرنے میں جن کی سماعت معمولی عدالتوں میں جن کی تشریح درج تھی انہیں ہو سکتی تھی وسیع اختیارات حاصل تھے۔ قانون کے اس حصے پر بحث کرنا بیکار ہے کیونکہ ہندوستانی رعایا کی درخواست پر اسے قطعی تبدیل کر دیا گیا اور اس کی نوعیت بدل دی گئی۔

۱۸۶۱ء میں ایک قانون جاری ہوا جس کی رو سے ۱۷۸۴ء کے قانون کے اکثر حصوں کی تشریح کی گئی اور اکثر میں ترمیم ہوئی ہندوستان کی مقامی حکومتوں کو اختیار دیا گیا کہ مجالس میں جگہ خالی ہونے پر وہ ایک ایسے سول عہدہ دار کا تقرر کر سکتی ہیں جو بارہ سال تک ملازمت کر چکا ہو۔

سپہ سالار کا تقرر ان مجالس میں اختیاری رکھا گیا، لازمی قرار نہیں دیا گیا۔ نظار کو اختیار تھا کہ اگر وہ چاہیں تو سپہ سالار ہند کو گورنر جنرل اور مدراس و بمبئی کے سپہ سالاروں کو ان کے مقبوضات کا صدر مقرر کریں اور اس سے بھی زیادہ اہم بات اس میں یہ تھی کہ گورنر جنرل اور مدراس و بمبئی کے گورنروں کو غیر معمولی حالات میں اپنی اپنی مجلس کے بلا اتفاق رائے اپنے اختیار تمیزی پر عمل کرنے کا اختیار تھا اور ایسی صورت میں اس عمل سے جو نتائج پیدا ہوں ان کی ذمہ داری بھی تنہا انہیں کی ذات پر تھی۔

یہ اہم اختیار محض ایسے گورنر جنرل اور گورنروں کو حاصل تھا جن کا خاص طور پر ان عہدوں پر تقرر ہوا ہو۔ ان کے عارضی جانشین اس سے مستفید نہیں ہو سکتے تھے اور نہ اس کا اطلاق عدالتی معاملات پر ہو سکتا تھا اور نہ برطانوی مقبوضات ہند کی سول حکومت کے ہر درجہ

۱؎ ۱۸۶۱ء میں ایک قانون جاری ہوا جس کے تحت مدراس اور بمبئی میں بھی عدالتیں

قواعد وضوابط کی ترمیم کے لئے اسے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ پٹ کا قانون ہندوستان کی حکومت کو بہتر بنانے کے لئے نافذ ہوا تھا اُس کا منشا عارضی اصلاح کرنا تھا نہ کہ ایک مستقل دستور قائم کرنا۔

اس کا مقصد صرف خرابیوں کی اصلاح اور حکام با اختیار کی نگرانی (۴۸)
کرنا تھا نہ کہ مسلمہ خرابیوں کا کامل طور پر انسداد کرنا یا کوئی جدید اور معقول نظام قائم کرنا۔ اس سے زیادہ کے لئے نہ توقع ہو سکتی تھی اور نہ غالباً اس کی کوشش کی گئی تھی۔ چونکہ پٹ کا منشا ان تجاویز سے علانیہ طور پر یہ تھا کہ کمپنی کی حکومت کا سابق دستور بجائے منہدم کئے جانے کے برقرار رکھا جائے۔ لہذا قدیم دستور کی خاطر اکثر نئی تجاویز کی خوبیوں کو نظر انداز کر دیا گیا چنانچہ اس قانون کے عمل میں جو مشکلات پیش آئے اُن کی وجہ اسی صلح پسند مسلک میں پائی جاتی ہے جس سے اس کی ابتدا کی گئی تھی۔

جن حالات میں اس قانون پر عمل شروع ہوا وہ اس کی کامیابی اور عام پسندیدگی کے لئے نہایت موزوں تھے۔ مزید برآں مسلمہ خرابیوں کا انسداد۔ اس کے پیش ہونے وقت حکومت انگلستان کی طاقت۔ بورڈ آف کنٹرول یعنی مجلس نگراں کے صدر کی لیاقت اور اُس کا ذاتی اثر۔ اور اس شریف شخص کی مستقل مزاجی اور ذاتی اقتدار جسے پہلی مرتبہ وہ اختیارات حاصل ہوئے جو ۱۷۸۶ء کے ترمیم شدہ قانون نے نہایت عقلمند سے گورنر جنرل ہند کو عطا

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۴۲) قایم ہوئیں۔ انھیں بھی وہی اختیارات دئیے گئے جو بنگال کی عدالت العالیہ کو حاصل تھے۔ یہ عدالتیں کمپنی کی ہندوستانی حکومت سے آزاد تھیں لیکن وہ گورنر یا مجلس کے خلاف بجز غداری یا سازش کے اور کسی معاملے میں سماعت نہیں کر سکتی تھیں۔ ۱۸۰۰ء کے قانون سے اُن کے قواعد وضوابط میں تبدیلی کی گئی اور مدراس کی عدالت میں ایک میر مجلس اور دو تحت کے ججوں کا تقرر عمل میں آیا)

گئے تھے۔ ان تمام امور نے متحد ہو کر اس کے نقائص کو پس پشت
ڈالدیا اور اس کی خوبیوں کو پورے طور پر نمایاں کر دیا۔ لیکن بعد کے
واقعات سے ثابت ہوا کہ اسے کامیاب بنانے کے لئے ان سب (۴۹
امور کی امداد ضروری تھی اور ان میں سے ایک کی کمی سے بھی بہت
سخت خطرات کا اندیشہ تھا۔

اس قسم کے انتظامات کا اندازہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ
اس کے عملی نتائج کو دیکھا جائے۔ لہذا پٹ کے قانون کے اجرا کے
بعد سے حکومت ہند میں جو خاص سیاسی واقعات پیش آئے ہیں
ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اس قانون کے نقائص اور خوبیوں
کا اندازہ ہو جائیگا۔ اس قانون کو اس کے بانی نے خود ہی امتحاناً
جاری کیا تھا اور ان مشکلوں کو دیکھتے ہوئے جو اس وقت درپیش
تھیں کوئی انسانی عقل اس کی کامیابی کی توقع نہ کر سکتی تھی۔

لارڈ کارنوالس کا تقرر۔

۱۷۸۴ء کے قانون نے جو اعلیٰ اختیارات گورنر جنرل ہند
کو عطا کئے وہ پہلی مرتبہ مارکوئس کارنوالس کو حاصل ہوئے۔ اس
امیر کے ذاتی خصائل اس اعلیٰ مرتبے اور اہم فرائض
کے لئے نہایت موزوں تھے۔ یہ شخص بات
کا دھنی اور دھن کا پکا تھا اور اس کی عزت پر
کوئی داغ نہ تھا۔ اس نے اپنے خیالات و مقاصد کو عملی جامہ
پہنانے کے لئے اس شوق اور استقلال سے کام کیا کہ ان میں صاف
کامیابی نظر آتی تھی۔ ہندوستان کے دیوانی اور فوجی محکموں میں جو
اصلاحات اور اہم تبدیلیاں اس نے کیں اور بنگال و بہار کی اندرونی حکومت (۵۰
میں جو نظام اس نے قائم کیا اس کی وجہ سے اس کا نام ہمیشہ عزت
سے لیا جائیگا۔

ہندوستان میں جو کامیابی اسے حاصل ہوئی اس میں بڑی
مدد اس ذاتی وقار سے ملی جو اسے انگلستان میں حاصل تھا ایک طرف

اِس کے اعزاز و وقار اور ذاتی کیریکٹر نے اسے شاہی وزرا کے اثر اور نظارے کے خوف سے بے پرواہ کر دیا اور دوسری طرف اِس کی وجہ سے کمپنی کے سول اور فوجی ملازموں کی نگاہ میں اس کی وقعت قایم ہوئی اور جو مزید اختیارات اسے حاصل تھے، ان کی بدولت اسے کسی قسم کی مخالفت کا خطرہ نہ رہا۔ اِن اسباب کی وجہ سے اُس کی ذاتی عنایت سے دوسروں کو جو امتیاز حاصل ہوتا تھا اُس کی بدولت اس نے ہندوستان کے ہر قابل ملازم کو مستعد بنا دیا اور ہر خود دار اور حوصلہ مند کی کوششوں کو اپنی حکومت کے کاموں میں شامل کر لیا۔

لارڈ کارنوالس کی حکومت کے واقعات کو تفصیل سے بیان کرنے کی یہاں کوئی ضرورت نہیں۔ جن خاص سیاسی واقعات کی وجہ سے اس کا زمانہ ممتاز ہے اور جن اصول کے تحت اُس نے انھیں انجام دیا، اِن کا مجملاً بیان کرنے سے اِس خاکے کا مقصد حاصل ہو جائیگا۔

اس دور میں جو خاص واقعہ پیش آیا، وہ ٹیپو سلطان سے جنگ تھی۔ اس کی ابتدا اُس فرمانروا کے ایک سخت اقدامی حملے سے ہوئی جو ۲۹ر دسمبر ۱۷۸۹ء کو راجہ ٹراونکور کے حدود پر کیا گیا۔ ۱۷۸۴ء میں جو معاہدہ ٹیپو سے ہوا تھا، اُس کی رو سے اِس راجہ کو باضابطہ طور پر حکومت برطانیہ کی نگرانی اور حفاظت میں تسلیم کر لیا گیا تھا۔

اِن تمام سیاسی انقلابات کی نوعیت اور اہمیت سمجھنے کے لئے جو اس واقعے سے ظہور میں آئے ٹیپو سلطان کی جنگ کے اسباب کی تفصیل بیان کرنے سے قبل مجملاً اِن معاہدوں کی تاریخ کا بیان کرنا ضروری ہے جو لارڈ کارنوالس نے اِس اہم موقع پر اپنا فرض سمجھ کر ریاست حیدرآباد اور دربار پونا سے کئے تھے، (۵۱)

سلطنت آصفیہ سے کمپنی کے معاہدے۔

۱۷۶۶ء میں جو معاہدہ کمپنی اور سلطنت آصفیہ کے درمیان ہوا تھا، اس میں یہ قرار پایا تھا کہ

جب کبھی ریاست کے کاموں کے لئے ضرورت ہوگی تو کمپنی سلطنت حیدرآباد
کو ایک امدادی فوج اس شرط سے دے گی کہ اس تفویض کے دوران
میں اگر کمپنی کو اپنے مقبوضات یا ریاست کرناٹک کی حفاظت کے
لئے فوج درکار ہوئی تو کمپنی اس فوج کو یا اس کے ایک حصے کو واپس
بلالے گی۔ اس معاہدے کی ایک دوسری دفعہ کے بموجب (اسی قسم
کی شرط کے ساتھ) حیدرآباد نے بھی کمپنی کو اس کی ضرورت کے وقت
فوجی امداد دینے کا وعدہ کیا۔
اس معاہدے[1] کے مطابق فوج کے ایک کور کے دو بٹالین

---

[1] چونکہ اس عبارت سے واقعات و حالات متعلقہ کی توضیح نہیں ہوتی اس لئے تزک آصفیہ
سے مندرجہ ذیل اقتباس درج کیا جاتا ہے۔
"جب حیدرعلی نے میسور کے علاقہ پر قابض ہونے کے بعد بیجاپور اور کرناٹک کے
علاقوں پر بھی قبضہ کرلیا تو مرہٹوں اور انگریزوں نے خوف زدہ ہوکر اس کی طرف توجہ
کی لیکن مادھو راؤ کی فوج کو سخت شکست ہوئی اور انگریز بھی باوجود اپنی فوج کی دلیری
اور شہرت کے ناکام رہے اور ان کی کوئی تدبیر اس کے خلاف کارگر نہ ہوئی۔ بالآخر
انہوں نے رکن الدولہ کے توسط سے اپنے ایک فوجی سردار مسٹر جنرل اسمتھ کو حضور اقدس
کی خدمت میں مناسب تحائف کے ساتھ روانہ کیا اور نہایت انکسار کے ساتھ عرض داشت
پیش کی کہ حیدرعلی خاں کے وجود سے اس علاقے کے امن و امان میں خلل واقع ہوگیا
ہے اور ایسی حالت میں جب کہ اس نے خود اپنے آقا کے ساتھ حق نمک ادا نہیں کیا
تو دوسروں کو اس سے کیا توقع ہوسکتی ہے لہذا آئیے اس کے حال پر چھوڑنا مناسب
نہیں۔ اگر حضور اقدس ارادہ فرمائیں اور ایک مناسب فوج اس کے خلاف روانہ
کریں تو اس کی بیخ کنی ممکن ہوسکتی ہے۔ اگرچہ بندگان حضرت انگریزی قوم سے بخوبی
واقف تھے تاہم رکن الدولہ کی خاطر حیدرعلی خاں کے استیصال میں انگریزوں کو
مدد دینے پر راضی ہوگئے جنرل اسمتھ کو خلعت عطا ہوا اور اسے رخصت کرنے
کے بعد فوجی تیاریاں شروع کردی گئیں۔

حیدرآبا کی فوج میں شامل کردئے گئے لیکن حیدر علی سے مصالحت ہوجانے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ۔ انگریزی فوج نے بھی اس میں شرکت کی اور ایک دوسرے کے مشورہ کے بعد متحدہ فوجیں دریائے کشنا ونتگ بھدرہ عبور کرکے حیدر علی کے علاقے میں داخل ہوگئیں ۔

جب حیدر علی کو ان واقعات کا علم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوا ۔ اور محی الدین صاحب خلف کریم صاحب مشائخ کے توسط سے مدارالمہام کے پاس سفارش پہنچائی اور اطاعت قبول کرانے کا وعدہ کیا اور انگریزوں کے خصائل و حالات سے آگاہ کرنے کے بعد اپنی رائے ظاہر کی کہ انگریزوں کی اعانت نہ خداوند نعمت کے شایان شان ہے ۔ اور نہ ان لوگوں کی دوستی قابل اعتماد ہے ۔ لہذا اس سفر میں جو کچھ بھی فوج نیز مال وزر درکار ہو وہ فدوی خاندان عالیشان کے دولت خواہ ہونے کی حیثیت سے پیش کرنے کے لئے آمادہ ہے ۔

اسی عرصہ میں حیدر علی کی استدعا سے مادھو راؤ بھی انگریزوں کی مدافعت کے لئے آمادہ ہوگیا لہذا اس مجبوری سے رکن الدولہ بہادر بھی اس کی درخواست قبول کرنے پر آمادہ ہوگئے ۔ اور تمام واقعات حضور اقدس کے گوش گزار کئے ۔ ان کی سنجیدہ طبیعت کو یہ باتیں ناگوار گزریں ۔ لیکن رکن الدولہ نے مکرر عرض کیا اور کہا کہ میں اپنے قصور پر نادم ہوں لیکن دولت ابد مدت کے لئے اس وقت یہی مناسب ہے کہ حیدر علی خاں کا ساتھ دیا جائے ۔ بالآخر بندگانعالی نے طوعاً و کرہاً اس پر اپنی رضامندی ظاہر کی ۔

رکن الدولہ بہادر نے حیدر علی خاں کے ساتھ مل کر انگریزی افواج پر حملہ کیا ابتدا میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی لیکن دوسری لڑائی میں حیدر علی خاں کی فوج کو پسپا ہونا پڑا اور حیدرآباد کی فوج کے بھی اکثر آدمی ضائع ہوئے ۔

جب جنگ نے طول پکڑا تو نواب سراج الدولہ نے مداخلت کی اور رکن الدولہ سے مراسلت شروع کی اور شائستہ تمہید کے ساتھ بندگان حضرت کے پاس پیغام بھیجا کہ انگریزوں کی طرف سے کوئی لغو حرکت سرزد نہیں ہوئی محض ہمارے بدخواہوں کی چاپلوسی پر فریفتہ گلاہ پوشوں کا ساتھ چھوڑ دیا گیا اور حیدر علی نائک کی اعانت کی گئی

کی وجہ سے حیدر آباد اس معاہدہ کو پورا نہ کر سکا اور کمپنی کی فوجوں کو کمپنی کے علاقے میں جلد واپس ہونا پڑا۔

ان واقعات کی وجہ سے کمپنی کے ساتھ حیدر آباد کے تعلقات میں جو کشیدگی رونما ہوئی، وہ سنہ ۱۷۶۸ء میں دوسرے معاہدے سے رفع ہو گئی۔ اس معاہدے میں والی دکن نے حیدر علی کو غاصب قرار دیتے ہوئے نہ صرف ان اسناد[1] کو منسوخ کرنا منظور کیا جو سابقہ صوبہ دار دکن کے زمانے میں حیدر علی کو دئے گئے تھے بلکہ حیدر علی سے اس کا علاقہ لینے کے لئے مدد دینے کا بھی اقرار اس شرط سے کیا
(۵۲) کہ کمپنی اس علاقے کے معاوضے میں سات[2] لاکھ روپے ادا کیا کرے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ یہ وہ شخص ہے جس نے تمام عالم میں اندھیر مچا رکھا ہے اور مفت کے مال پر غرور کر کے ہمیشہ فاسد خیالات اور بلند مقاصد کے حصول میں مبتلا رہتا ہے۔

لازم ہے آصفیہ کی اعانت سے اس شعلہ پر روغن پاشی نہیں ہونی چاہئے اور نہ اُسے اس قدر مستقل کرنا چاہئے کہ بعد میں اس کا بجھانا ناممکن ہو جائے۔

۶ رمضان المبارک کو سراج الدولہ کے بھیجے ہوئے قاصد مسٹر فیتجر نے رکن الدولہ کے توسط سے نذر پیش کی اور خلعت حاصل کیا۔

۲ شوال کو رکن الدولہ نے تمام عہد و پیمان طے کرنے کے بعد گورنر اور سراج الدولہ کے بھیجے ہوئے تحائف بندگان حضرت کی خدمت میں پیش کئے اور شرف قبولیت حاصل کیا۔

سراج الدولہ اور انگریزوں کے قاصدوں کو خلعت عطا کئے گئے۔ اور حیدر علی کے وکیل اور دیگر سردار اپنے اپنے علاقوں کو واپس ہو گئے (سنہ ۱۱۸۰ ہجری) (خلاصۂ واقعات مندرجہ صفحات ۱۷۳ تا ۱۸۶)

[1] فرامین

[2] بابتہ دیوانی کرناٹک بالا گھاٹ

اس معاہدے میں ایک خاص شرط یہ تھی کہ نواب نظام علی خاں بہادر اپنے بھائی کے انتقال کے بعد یا اُن کا طرزِ عمل ٹھیک نہ رہنے کی صورت میں سرکار گنتور کا علاقہ کمپنی کو عطا کریں گے۔ اور یہ بھی قرار پایا تھا کہ انگریز ضرورت کے وقت حیدرآباد کو امدادی فوج کے دو بٹالین مع توپوں کے اس شرط پر دیں گے کہ جب تک ان سے کام لیا جائے ان کے اخراجات نواب نظام علی خاں بہادر برداشت کریں مگر ان کو اس فوج کی کبھی ضرورت پیش نہ آئی اور باوجود اس معاہدے کے کمپنی کے تعلقات اس سلطنت سے معمولی اور غیر معین رہے۔ حتیٰ کہ لارڈ کارنوالس نے سرکار گنتور حاصل کرنے اور اس کی بابت پیشکش کے سابق بقایا کو طے کرنے کے لئے ایک برطانوی (رزیڈنٹ) سفیر[1] ۱۷۸۸ء میں روانہ کیا۔

گنتور کے مطالبے کے ساتھ کمپنی نے فوجی تیاریاں بھی کیں جن کی بدولت حیدرآباد نے فوراً مطالبہ ادا کر دیا چونکہ فرمانروائے حیدرآباد کی اس زمانے میں ٹیپو سلطان سے معرکہ آرائی ہو چکی تھی لہٰذا وہ خود برطانوی حکومت سے معاہدہ کرنے کے بہت خواہشمند تھے اور اس بارہ میں اپنے خیالات کو گورنر جنرل پر واضح کرنے (۵۳)
کے لئے انہوں نے میر ابوالقاسم[2] کو کلکتے روانہ کیا۔

میر ابوالقاسم[3] کی سفارت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نیا معاہدہ ہوا

---

[1] سر جان کینوے۔

[2] یہ قابل شخص بعد میں میر عالم کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس نے بہ حیثیت مدار المہام کے نومبر ۱۸۰۸ء میں بہ مقام حیدرآباد انتقال کیا۔

[3] میر ابوالقاسم کی سفارت کا جو حال تاریخ گلزار آصفیہ مولفہ خواجہ غلام حسین خاں میں درج ہے اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

سنہ ۱۲۰۱ ہجری میں جملہ امور و مقدمات کے تصفیہ اور عہد و پیمان کی یکسوئی

جس میں ۱۷۶۶ء کے معاہدے کی توضیح کی گئی۔ اس عہد نامہ کو ایک خط کی شکل میں لارڈ کارنوالس نے نواب نظام علی خاں بہادر کے پاس روانہ کیا اور لکھا کہ برطانوی قوم پر بھی اس کی پابندی مثل باضابطہ معاہدوں کے عاید ہوگی[1]۔

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ کی غرض سے میر ابوالقاسم میر عالم بہادر کو کلکتہ روانہ کیا گیا۔ ان کے ہمراہ پانچ منصب دار عاقل الدولہ۔ میر عباس علی خاں بہادر نظام یار جنگ۔ میر عبدالعزیز خاں بہادر۔ غلام نبی خاں بہادر۔ میرزا ابوتراب خاں بہادر مع معقول ساز و سامان روانہ ہوئے۔

کلکتہ کے دوران قیام میں میر ابوالقاسم میر عالم بہادر نے لارڈ کارنوالس سے دس مرتبہ ملاقات کی۔ پانچ بار میر ابوالقاسم لارڈ بہادر کے مکان پر تشریف لے گئے اور پانچ مرتبہ لارڈ موصوف میر ابوالقاسم کی قیام گاہ پر آئے۔ ان ملاقاتوں کے ذریعہ سے دونوں حکومتوں میں اتحاد و یک جہتی پیدا ہوگئی۔ جو معاملات طے پائے۔ ان کا مسودہ حیدرآباد روانہ کیا گیا۔ جسے بندگان حضرت نیز اعظم الامرا نے پسند فرمایا لہذا اسے عہد نامہ کی صورت میں مرتب کر کے لارڈ بہادر کے سپرد کر دیا گیا اور اس کی ایک نقل میر ابوالقاسم اپنے ہمراہ حیدرآباد لائے۔

دوران گفتگو میں لارڈ کارنوالس نے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ معاہدہ میں ایک دفعہ یہ بھی شامل کر دی جائے کہ سرکارین کے قیام تک وکالت کا عہدہ میر ابوالقاسم اور ان کی اولاد اور خاندان کے لئے مخصوص رہے۔ میر ابوالقاسم نے اس شرط کو نمک خواری کے خلاف سمجھا اور جواب دیا کہ ان معاملات کا انحصار خداوند نعمت کی عنایت و خوشنودی پر ہے وہ جسے چاہیں ممتاز و سرفراز کریں اور اصرار کر کے اسے مسودے سے خارج کرا دیا۔

میر ابوالقاسم کی کلکتہ سے روانگی کے وقت لارڈ کارنوالس نے پیغام بھیجا کہ میں پانچ بار آپ کے مکان پر گیا اور پانچ دفعہ آپ نے بھی تکلیف کی لیکن سیری نہیں ہوئی۔ اگر ایک بار آپ اور زحمت گوارا فرمائیں اور واپسی سے قبل ملاقات سے مسرور فرمائیں تو مناسب ہوگا لہذا میر ابوالقاسم ایک بار پھر لارڈ موصوف سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ ان کے روانہ ہوتے وقت لارڈ کارنوالس نے انھیں نیز ان کے ساتھ کے منصب داروں کو قیمتی جواہر و دیگر تحائف مع خلعت کے پیش کئے۔

[1] لارڈ کارنوالس نے نواب نظام علی خاں بہادر کو تحریر کیا کہ جب تک مناسب وجوہ نہ بتائے جائیں میں

اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر ابو القاسم کو اس بات کی ہدایت
کی گئی تھی کہ وہ گورنر جنرل کو اس بات پر آمادہ کرے کہ معاہدہ ۱۷۶۸ء (۵۴)
کے اِن دفعات کی تکمیل ہو جائے جن کی رو سے کمپنی کو کرناٹک بالاگھاٹ
کی دیوانی اس شرط سے ملی تھی کہ وہ اس علاقے کے معاوضے میں آصفجاہ
نظام علی خاں بہادر کو سات لاکھ روپیہ سالانہ پیشکش ادا کرے۔ یا
بہ الفاظ دیگر ۱۷۶۸ء کے معاہدے کی بنا پر کمپنی ٹیپو سلطان کو اس
کے علاقے سے بے دخل کرنے کی تدبیر کرے۔

گورنر جنرل نے ان تجاویز کو ناقابل تسلیم قرار دے کر رد کر دیا کیونکہ
اسے ایک مدت درازہ گزر چکی تھی اور جس فرمانروا کے مقبوضات پر اُن
کا اثر پڑتا تھا، اس سے برطانوی حکومت کے تعلقات اُس وقت
دوستانہ تھے۔

اگرچہ اس وقت تک ٹیپو سلطان نے کمپنی یا اُس کے حلیفوں کے
خلاف کسی علانیہ مخاصمت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ تاہم اُس کا طرز عمل

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ اپنے ملک کے قوانین اور شاہ انگلستان اور کمپنی کے احکام کی وجہ سے ایسا معاہدہ
کرنے سے مجبور رہوں اپنے مراسلہ مورخہ یکم جولائی ۱۷۸۹ء میں وہ ان مقاصد کو بیان کرتا ہے جن کی بنا پر انگریزی
حکومت کو سرکار گنتور کے مطالبہ پر اصرار تھا اور پیشکش کی باقاعدہ ادائی کے لئے بجز قومی عزت کے اور کوئی ضمانت دینے
پر جو اعتراضات تھے اُن کا ذکر کرنے کے بعد (جس کے سابق بقایا کے لئے خاطر خواہ سمجھوتہ ہو چکا تھا) ۱۷۶۸ء کے
معاہدے کی دفعہ ۶ کے مفہوم کو بیان کرتا ہے کہ "اس دفعہ میں جس فوج کا وعدہ کیا گیا ہے وہ فرمانروائے دکن کے طلب
کرنے کے وقت دیجائے گی لیکن اس کے ساتھ یہ شرط ہوگی کہ اس سے کسی ایسی طاقت کے خلاف کام نہیں لیا جائیگا جو کمپنی
کی حلیف ہو (یعنی پنڈت پوردھان، مادھوجی سندھیا، مادھوجی، رگھوجی بھونسلا۔ دیگر مرہٹے سردار، نواب ارکاٹ، نواب وزیر اودھ
راجہ تنجور اور ٹراونکور)۔ اس تشریح سے معاہدے کی ایک خاص شرط میں بہت بڑا فرق آگیا۔ ۱۷۶۸ء کے معاہدے سے
نواب میر نظام علی خاں بہادر کا یہ حق پورے طور پر قائم ہوگیا اور تسلیم کرلیا گیا کہ کمپنی کے مندرجہ بالا حلیف
فرمانرواؤں اور سرداروں کے علاوہ جس کے خلاف وہ چاہیں اِس فوج کو استعمال کریں اور جہاں
چاہیں اسے رکھیں۔

ضرور ایسا رہا ہوگا جس کی وجہ سے لارڈ کارنوالس کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ لازمی طور پر مخاصمانہ ارادے رکھتا ہے ورنہ گورنر جنرل مندرجۂ بالا تجاویز کی بنا پر حیدرآباد سے اس قسم کا سیاسی معاہدہ نہ کرتا جس کی حیثیت ازروئے انصاف سلطان ٹیپو کے خلاف ایک دفاعی معاہدے سے (۵۵)
کہیں زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

ٹیپو سلطان کے خلاف حیدرآباد سے معاہدہ۔

ٹیپو سلطان کے خلاف اقدامی معاہدے کی تجدید سے اگر پارلیمنٹ کے قانون کے الفاظ کی مخالفت نہیں ہوتی تو کم از کم اس کے منشاء کی تو ضرور مخالفت ہوتی ہے۔ ۱۷۶۸ء کا معاہدہ یقیناً ایک اقدامی معاہدہ تھا۔ اگرچہ لارڈ کارنوالس اپنی تحریر مورخۂ پنجم جولائی ۱۷۸۹ء میں بیان کرتا ہے کہ زمانے کی تبدیلی کی وجہ سے وہ ۱۷۶۸ء کے صلح نامے کی اُن دفعات پر عمل نہیں کر سکتا، جن کی رو سے کرناٹک بالاگھاٹ کی دیوانی کمپنی کو ملنی چاہیئے تھی تاہم اسی خط میں وہ یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ "اگر آیندہ واقعات ایسے پیش آئیں کہ کمپنی آپ کی امداد سے مندرجۂ بالا مقامات پر قابض ہو جائے تو وہ آپ کی اور مرہٹوں کی مرضی کے موافق ان شرائط کی پوری تکمیل کرے گی۔"

یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ ۱۷۶۸ء کے معاہدے کے بعد سے کمپنی اور حیدر علی خاں کے درمیان دو اور معاہدے ہو چکے تھے اور ۱۷۸۴ء میں کمپنی نے اس کے بیٹے ٹیپو سلطان سے بھی ایک معاہدہ کیا تھا جس میں اس کی بادشاہی کو اس کے مقبوضہ علاقے پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ایسی حالت میں اس کی طاقت کے خلاف اقدامی معاہدے کو کسی ترمیم کے ساتھ بھی از سر نو تازہ کرنے سے سلطان کو یقیناً حیرت ہوئی ہوگی اور یہ حیرت اس فقرے سے دور نہیں ہو سکتی تھی جو اس کے ساتھ شامل کر دیا گیا تھا کہ اس کی سلطنت پر کوئی فوری (۵۶)
حملہ نہ کیا جائے۔ اس فقرے کے بعد کی عبارت سے صاف ظاہر

تھا کہ جن دفعات کی رو سے اس معاہدے کے فریقین ٹیپو کو اس کے چند علاقوں سے بے دخل کرنا ضروری سمجھتے تھے، ان کی تعمیل کسی وقت بھی عمل میں آسکتی تھی اور کم از کم بعید از امکان نظر نہیں آتی تھی۔

اس معاہدے کی دوسری شرط جس سے ٹیپو کو لازمی طور پر تشویش ہونی چاہیئے تھی، اُس امدادی فوج کے استعمال کے متعلق تھی جو حیدرآباد کو دی گئی تھی۔ اس فوج کو محض اس شرط کے ساتھ فرمانروائے دکن کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ اسے کمپنی کے حلیف فرمانرواؤں اور سرداروں کے خلاف جن میں ٹیپو کا نام شامل نہ تھا، کام میں نہ لایا جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا تھا کہ جس وقت ٹیپو نے اس معاہدے کے متعلق سنا ہوگا اس وقت سے اس کے دل میں اس قسم کے خیالات پیدا ہوگئے ہونگے۔

پونا کے رزیڈنٹ کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کے وزیر نے بھی اسے اپنے آقا کے خلاف ایک اقدامی معاہدہ تصور کیا۔

جن حالات میں کہ یہ معاہدہ کیا گیا تھا ان سے کوئی شخص واقف نہیں لیکن ہر ایک کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ٹیپو سلطان کے بلند حوصلوں کا مقابلہ کرنے اور اس کی سازشوں کے جال توڑنے کے لئے برطانوی قوم کو حفظ ماتقدم کے اصول کے لحاظ سے نہایت احتیاط سے کام لینے کی ضرورت تھی لیکن جو کچھ اوپر بیان ہوچکا ہے اُس سے ظاہر ہوگا کہ پارلیمنٹ کے قانون سے جو قیود عاید ہوتے تھے اُن کی
لفظی بحث سے متاثر ہوکر گورنر جنرل نے ایسا طرز اختیار کیا جو بلحاظ (۵۷)
دیانتداری محض قابل اعتراض ہی نہ تھا بلکہ ٹیپو سلطان کے نزدیک اس معاہدے سے کہیں زیادہ اقدامی۔ اشتعال انگیز اور جنگ کے اسباب مہیا کرنے والا تھا جو علانیہ اور بجا طور پر اس کے غیر معمولی

حوصلوں کے روکنے کے لئے دفاعی طور پر کیا جاتا۔

جیسے ہی ٹیپو سلطان کی ئلی مخالفانہ پیش قدمی سے لارڈ کارنوالس کو اُن قیود سے آزادی ملی، جو اس کے نزدیک پارلیمنٹ کے قانونی الفاظ سے اس پر عائد تھے اس نے بہ عجلت ممکنہ اپنی پوری اختیاری کوشش کی کہ حیدر آباد اس جنگ میں پوری تن دہی سے شریک ہو جائے جو اس حملے کے سبب سے کمپنی کو کرنی پڑے گی۔ رزیڈنٹ کو جو ہدایات اس نے روانہ کی تھیں[1] ان میں وہ اسے تاکید کرتا ہے کہ وہ دربار حیدر آباد کو مطلع کر دے کہ سلطان اور کمپنی کے درمیان جو صلح نامہ تھا، اسے ٹیپو توڑ چکا ہے اور تمام اختیاری مواقع پر جو اسے حاصل ہو سکیں، وہ سلطان کی بے وفائی کو حقیقی طور پر نمایاں کرتا رہے اور بندگان حضرت اور ان کے وزراء کو واضح طور پر سمجھا دے کہ اس موقع پر برطانوی حکومت سے قریبی تعلقات قائم کرنے سے اُن کا بڑا فائدہ ہوگا۔

گورنر جنرل نے رزیڈنٹ کو یہ اختیار بھی دے دیا کہ وہ انھیں اس بات کا بھی اطمینان دلا دے کہ جب تک جنگ سے پورے فوائد حیدر آباد کو حاصل نہ ہو جائیں گے ٹیپو سلطان سے صلح نہ کی جائے گی اور چونکہ ٹیپو سلطان کی اس حرکت سے انگریزی حکومت اب آزاد ہو گئی ہے لہذا وہ حیدر آباد سے ایک ایسا معاہدہ کرنے کے لئے آمادہ ہے جس کی رو سے فریقین پر ایک دوسرے کے ان علاقوں کی حفاظت لازم ہوگی جو اختتام جنگ پر ان کے زیر نگیں ہوں۔

انھیں ہدایات کے ساتھ حیدر آباد کے رزیڈنٹ کو اس بات کا بھی کامل اختیار دے دیا گیا کہ اگر ٹیپو سلطان کی باج گزار ریاستوں

---

[1] مورخہ ۲۴ جنوری ۱۷۹۰ء۔

یار نمایاں سے کوئی کمپنی کے ساتھ تعلقات قائم کرنا چاہے تو اس کی ہمت افزائی کی جائے اور اسے اس بات کی بھی ہدایت کی گئی کہ وہ ٹیپو کے ارادے معلوم کرنے کے لئے معتبر اور باوقعت اشخاص سے کام لے یا اُس کے وزرا یا اعلیٰ عہدہ داروں میں سے کسی کو ترغیب دلاکر اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ سلطان کو چھوڑکر انگریزی حکومت کی ہدایات پر عمل کرے اور اسے سلطان کا تختہ اُلٹنے کی کوششوں میں مدد دے۔ رزیڈنٹ کو اس امر کا یقین دلادیا گیا کہ اس قسم کے اشخاص سے جو معاہدہ بھی وہ کرے گا حکومت اُس کی سختی سے پابندی کرے گی۔

ان ہدایات کے بموجب دربار حیدرآباد سے ایک دفاعی اور اقدامی معاہدہ قرار پایا جس کی گورنر جنرل باجلاس کونسل نے ۱۲ر جنوری سنہ ۱۷۹۰ء کو توثیق کردی۔ اس معاہدے کے شرائط یہ تھے کہ ٹیپو سلطان کی تادیب کی جلد تدبیر کیجائے اور آیندہ کے لئے اُسے امن میں خلل ڈالنے کے ذرائع سے محروم کردیا جائے۔

نواب میر نظام علی خاں بہادر اور پیشوا جنگ میں نہایت زبردست حصہ لیں۔ حیدرآباد سے دس ہزار سوار کا ایک رسالہ افواج کمپنی کے ساتھ (۵۹)
کام کرنے کے لئے بھیجا جائے اُس کے اخراجات کمپنی ادا کرے گی اور صلح کے بعد بجز اُن مقامات اور قلعوں کے جن پر کمپنی دیگر فریقین کی شرکت سے قبل قبضہ کرلے تمام مفتوحہ علاقے[۱] کی مساوی تقسیم ہوگی۔

خاص خاص زمیندار اور پالیگار جو پہلے حیدرآباد اور مرہٹوں کے تحت رہ چکے ہیں (اگر ان کے قلعے یا علاقے تسخیر ہوں) تو مثل سابق اُن کی وہی حیثیت قرار دی جائے گی۔ اگر واقعات کے لحاظ سے مصلحت صلح میں سمجھی جائے تو اس کا تصفیہ بھی باہمی اتفاق سے ہوگا

۱ چتیل درگ۔ انگدی۔ ہرپلی۔ بلاری۔ رائے درگ وغیرہ وغیرہ۔

اور صلح کے بعد اگر فریقین میں سے کسی ایک پر ٹیپو حملہ کرے، تو اُن شرائط اور اس طرز پر جو بعد میں قرار پائے، سب مل کر اس کی تادیب کریں۔

رزیڈنٹ کی مراسلت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب میر نظام علی خاں بہادر برابر مرہٹوں پر شبہ کرتے رہے اور ایک مرتبہ اثنائے ملاقات میں رزیڈنٹ سے انھوں نے دریافت کیا کہ افواج سلطنت جب کمپنی کی حفاظت کر رہی ہوں، اگر اس وقت پیشوا ٹیپو کے ایما سے حیدر آباد پر حملہ کردے (۶۰) تو آپ کی حکومت کیا کرے گی۔ رزیڈنٹ نے شرافت آمیز جوش کے ساتھ جواب دیا کہ "کمپنی فرمانروائے دکن کی حفاظت کے لئے اپنی ہر چیز نثار کرنے کے لئے تیار ہوگی"۔ اس سے قدرے اطمینان ہوا لیکن گفت و شنید کے اثناء میں وہ متواتر اس بات پر زور دیتے رہے کہ کمپنی ان کی سلطنت کی حفاظت کے لئے اس معاہدے میں ایک مخصوص دفعہ شامل کردے۔ لیکن گورنر جنرل کو یہ خوف تھا کہ شاید یہ بات مرہٹوں کے خلاف پڑے اور وہ جنگ میں مدد نہ دیں۔ اُس کا یہ خوف سچا تھا لہذا اس نے نواب میر نظام علی خاں بہادر کی اس تجویز کو ٹال دیا لیکن اس کے ساتھ ہی رزیڈنٹ کو اس بات کا اختیار دے دیا کہ وہ انھیں اس امر کا یقین دلادے کہ آئندہ کسی مناسب موقع پر اس کی تکمیل ضرور کردی جائیگی۔

جس اصول کی بناء پر لارڈ کارنوالس نے فرمانروائے دکن کی اس تجویز کو ٹالا اسے وہ اپنے ایک مراسلے[1] میں جو اس نے رزیڈنٹ کو لکھا تھا صاف طور پر بیان کرتا ہے کہ جب نواب نظام علیخاں بہادر اپنی اس تجویز پر غور کرینگے کہ مرہٹوں کی طرف سے نامناسب مطالبات کی صورت میں کمپنی مداخلت کرے تو ان پر یہ بھی روشن ہو جائیگا کہ ایسی حالت میں جب کہ مرہٹے نہایت اخلاص اور خوشی سے اس

---

[1] مراسلہ مورخہ ۱۲ر اپریل ۱۷۹۰ء

اتحاد میں شریک ہو گئے ہیں ان کی بابت میرا یہ خیال کرنا کہ وہ خود اپنے ایک حلیف کے ساتھ ناانصافی کرینگے کس قدر نازیبا ہوگا اور اس قسم کی شرط کو وہ اپنے لئے کس قدر مضر اور اشتعال انگیز سمجھینگے۔

(۶۱) اسی سلسلے میں وہ لکھتا ہے کہ "فرمانروائے دکن پر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں ان کے مفاد کا لحاظ رکھنے اور ان کی خواہشات پورا کرنے کے لئے خود بہت کوشاں ہوں۔ انھیں مطلع کردو کہ اگر مرہٹوں کو کوئی خاص اعتراض نہ ہوا تو میں اس معاہدے میں ایک زائد دفعہ شریک کردونگا کہ اگر فریقوں میں کوئی باہمی تنازعہ پیش آئے تو تیسرے فریق پر لازم ہوگا کہ وہ بحیثیت ثالث کے اس میں مداخلت کرے اور اختلافات کو ازروئے انصاف اور صلح پسند طریقے سے طے کرانے میں اپنی پوری کوشش صرف کرے۔

اسی مراسلے میں اس نے رزیڈنٹ کو اس بات کا بھی اختیار دیا کہ وہ نواب نظام علی خاں بہادر اور اُن کے وزراء کو یقین دلادے کہ "اگر مذکورۂ بالا شرط تسلیم کرلی گئی اور اس کے مطابق اگر کسی موقع پر مجھے مداخلت کرنی پڑی تو آپ دیکھینگے کہ میں آپ کی سلطنت کو نقصان سے بچانے اور اس کا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے ہمیشہ کوشش کرونگا۔"

ان زبانی وعدوں کا اثر یہ ہوا کہ فرمانروائے دکن نے ان پر اعتبار کرلیا اور جس شکل میں کہ معاہدہ پیش ہوا تھا اسے منظور کرلیا۔ گورنر جنرل کے زبانی وعدوں سے بندگان حضرت کو جو توقعات ہوگئے تھے، ان کی تائید گورنر جنرل کے مراسلے مورخہ ۲۹ر جولائی سے ہوگئی جو اس نے معاہدے کے مسودہ کے ساتھ روانہ کیا تھا۔

رزیڈنٹ کو وہ ایک مراسلے میں تحریر کرتا ہے کہ "مجھے کامل

یقین ہے کہ تم دربار حیدر آباد پر اس بات کے ظاہر کرنے میں کچھ کسر (۶۲)
نہ اٹھا رکھو گے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد اور وقار کے لحاظ سے اپنے
وعدوں کی سختی سے پابندی کریں اور جنگ کو نہایت شدومد کے ساتھ
جاری رکھنے کے لئے اپنی حکومت کی پوری قوت صرف کریں۔
تم پر لازم ہے کہ تم ہمیشہ اس بات کا خیال رکھو کہ فرمانروائے دکن اور
ان کے وزراء کو ہماری حکومت سے آیندہ کے لئے جو توقعات ہو سکتے
ہیں انھیں وہ کہیں بیجا اور مغالطہ آمیز اہمیت نہ دیں، اور حیدر آباد کے مفاد
کے بارے میں تم خود ایسے الفاظ ہرگز استعمال نہ کرنا جن سے مرہٹوں
کو حسد کرنے کا موقع ملے لیکن اس کے ساتھ ہی نواب نظام علیخاں بہادر
اور ان کے وزراء کو اس بات کا یقین دلاتے رہو کہ اس جنگ کے
جاری رکھنے میں ہمارے مفاد و مقاصد کا وہ جس قدر لحاظ رکھینگے اور
اس کا جس قدر ثبوت دینگے اس کے معاوضے میں وہ ہمارے اخلاص
وہ اعانت کی توقع رکھ سکتے ہیں اور وہ دیکھینگے کہ جب کبھی ہمیں مناسب
موقع ملے گا اور جہاں تک دیگر حلیفوں سے ہمارے معاہدے ہمیں
اجازت دینگے، ہم دونوں حکومتوں کے درمیان تعلقات بڑھانے
کے لئے ہمیشہ آمادہ رہینگے۔"

اس نازک موقع پر مارکوئیس کارنوالس نے فرمانروائے دکن
کے ساتھ یہ مسلک اختیار کیا کہ امدادی فوج سے ان کی سلطنت
کی حفاظت کا فوری انتظام کر دیا اور ٹیپو سلطان کے خلاف ان سے
دفاعی اور اقدامی معاہدہ کر لیا اور اس کے معقول اور نفع بخش شرائط سے
انھیں آئندہ کے لئے بڑے بڑے مستقل فوائد کی امید دلائی اور ان
کے دربار کے برطانوی رزیڈنٹ کی معرفت دلجوئی کی باتیں کر کے (۶۳)
اس بات کی بھی امید دلائی کہ ان کی طاقت کو جو سب سے بڑا
خطرہ اپنے ہمسایہ مرہٹوں کی غیر متناہی ہوس سے لگا رہتا ہے،
اس سے بھی انھیں پورے طور پر نجات مل سکتی ہے۔

اس مسلک کی تہ میں جو دانشمندی مضمر تھی، وہ اس کے نتائج سے ظاہر ہو گئی جب نظام نے نہایت دلی صداقت اور تن دہی سے سلطان کے خلاف جنگ میں شرکت کی۔ اُن کی فوج کی تعداد اور آمدنی کے ذرائع کو دیکھتے ہوئے ان کی اعانت سے جس قدر فائدے کی توقع ہو سکتی تھی اگرچہ وہ ان کے سپاہیوں کے خصائل اور ان کی حکومت کے طرزِ عمل سے حاصل نہ ہو سکا، تاہم اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان کی جد و جہد کا طریقہ کتنا ہی خراب کیوں نہ رہا ہو، جنگ کے خوشگوار خاتمے میں ان کا بہت بڑا حصہ تھا اور درحقیقت بغیر ان کی اعانت کے یہ جنگ اس قدر بڑے پیمانہ پر نہیں ہو سکتی تھی۔

ٹیپو سلطان کے خلاف پیشوا سے معاہدہ۔

صلح نامۂ سلبائی[1] کے بعد سے برطانوی حکومت کے تعلقات دربار پونا سے خوشگوار گو معمولی رہے تھے جب ٹیپو سے جنگ کے آثار نظر آئے تو لارڈ کارنوالس نے پیشوا سے معاہدہ کرنے کی طرف توجہ مبذول کی اور جب سلطان کے طرزِ عمل سے جنگ یقینی ہو گئی تو اس نے پونا (۹۰ء) کے برطانوی رزیڈنٹ[2] کو تقریباً وہی ہدایات روانہ کئے جو اس وقت حیدر آباد کے رزیڈنٹ کو بھیجے گئے تھے۔ دربار پونا سے کوئی تعاون کا معاہدہ نہ تھا۔ مرہٹوں کی فوج کے ساتھ (جو تقریباً کل سوار تھے) انگریزی پیدل فوج کی قلیل تعداد شریک کرنے میں خطرہ تھا لہٰذا گورنر جنرل نے ان ہدایات[3] میں یہ توقع ظاہر کی کہ مرہٹے جنگ

---

[1] یہ معاہدہ مادھوجی سندھیا اور انگریزی حکومت کے درمیان ۱۷۸۲ء میں ہوا تھا۔

[2] سر چارلس میلٹ۔

[3] مورخہ ۱۴ جنوری ۱۷۹۰ء

میں خود اپنی فوج سے کام لیں، لیکن رزیڈنٹ کو مطلع کر دیا کہ اگر برطانوی فوج کی اعانت کے بغیر مرہٹے جنگ میں مستعدی سے کام کرنے لیے آمادہ نہ ہوں تو اس کا بھی انتظام کر دیا جائیگا۔

واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست پونا مختلف اسباب کی بنا پر مجوزہ معاہدے کے لئے پورے طور سے آمادہ تھی۔ مرہٹوں کے معاملات میں عام طور سے جو تاخیر ہوا کرتی ہے وہ اس نازک وقت پر سخت پریشانی کا باعث ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ[۱] لارڈ کارنوالس نے اس موقع پر ان قیود کے مضر اثرات کو بہت محسوس کیا جن کی وجہ سے وہ پیشوا سے کسی ایسے موقع پر معاہدہ نہ کر سکا جب کہ اُسے ضرورت کم تھی اور حالات اُس کے زیادہ موافق تھے۔

وہ بیان کرتا ہے کہ قانون ساز جماعت نے یہاں کی حکومت کے لئے عدم مداخلت کا جو طرز عمل قرار دیا ہے اس سے بلا شبہ چند فوائد ظہور میں آئے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ناگزیر وقت بھی ہمیشہ باقی رہتی ہے کہ کہیں ہمیں کسی وقت بھی پہلے سے معقول حلیفوں کی امداد حاصل کئے بغیر جنگ کرنے کی ضرورت پیش نہ آجائے۔ (۶۵)

اگر ہم راجہ تراونکور کو جس کا نام اس معاہدے میں ہمارے حلیفوں کی فہرست میں شامل ہے ذلیل و پائمال ہونے دیتے تو بجا طور سے ہم پر بزدلی اور عہد شکنی کا الزام عائد ہو سکتا تھا اور اُن کی وجہ سے ہم تمام ہندوستانی طاقتوں کی نگاہ میں ذلیل ہو جاتے۔ ایسی حالت میں جب کہ ہم گزشتہ چند سال سے تقریباً ہر روز مرہٹوں اور دربار حیدر آباد سے مجبوراً یہ کہتے آئے ہیں کہ ہم اُن سے کسی قسم کا کوئی جدید معاہدہ ٹیپو کی ہوس اور

---

[۱] ۔ بحوالہ مراسلہ مورخہ ۲۸ فروری بنام سر چارلس میلٹ۔

نا انصافیوں کو روکنے کے لئے نہیں کر سکتے" تو آج ہم کس منہ سے اور کس طرح اپنا حق جتلا کر مرہٹوں سے اس بات کا مطالبہ کر سکتے ہیں کہ ٹیپو سے جنگ چھڑ جانے کی صورت میں انھوں نے ہمارا ساتھ دینے کا جو وعدہ کیا تھا اور جسے وہ برابر دُہراتے رہے ہیں اسے اب وہ پورا کریں۔

اس مراسلے میں گورنر جنرل اپنے ارادے کو دُہراتا ہے کہ "وہ ٹیپو کے خلاف دفاعی معاہدے کی تجویز مرہٹوں کے سامنے ضرور پیش کریگا اور اگر اس قسم کا معاہدہ کیے بغیر وہ ہمارے ساتھ جنگ میں شریک ہوگئے تو میری رائے میں وہ از روئے انصاف اس قسم کے معاہدے کے اور بھی زیادہ مستحق ہوجائینگے۔"

(۶۶) دوسرے مراسلے[1] میں لارڈ کارنوالس رزیڈنٹ کو اختیار دیتا ہے کہ اس جنگ میں اس کے جو ارادے ہیں اُن سے وہ دربار پونا کو آگاہ کر دے۔ اپنا پہلا ارادہ وہ یہ بتاتا ہے کہ اثنائے جنگ میں یا جنگ کی تیاری میں کمپنی کو جو کچھ صرف کرنا پڑے اور جو نقصانات اسے برداشت کرنے پڑیں، اُن سب کی تلافی ٹیپو سے کرائی جائے اگر نواب نظام دکن اور مرہٹے جنگ میں شریک ہوجائیں تو اس کا دوسرا مقصد یہ ہوگا کہ ٹیپو کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ اُس نے اور اس کے باپ نے اُن دونوں طاقتوں کے جو علاقے غصب کر لئے ہیں اور جن پر وہ اس وقت قابض ہے، ان سب سے وہ دست بردار ہو جائے۔ علاوہ ازیں کرناٹک اور پائین گھاٹ کا جو علاقہ اس کے تحت ہے اس سے بھی وہ دست برداری دے اور چونکہ ساحل ملیبار کے نیروں پر اس نے دل ہلانے والے وحشیانہ مظالم کئے ہیں لہذا میرا ارادہ ہے کہ اس بات پر اصرار کیا جائے کہ یہ لوگ

[1] مورخہ ۲۲ مارچ۔

ہمیشہ کے لئے اُس کی حکومت سے آزاد ہو جائیں۔"
کچھ عرصے بعد انگریزوں اور مرہٹوں میں ٹیپو کے خلاف ایک اقدامی اور دفاعی معاہدہ ہو گیا اور ۵ر جولائی ۱۷۹۰ء کو اس پر دستخط ہو گئے۔

ٹیپو سلطان کے خلاف اتحاد کی تکمیل۔

اس معاہدے کے شرائط مجموعی طور پر حیدرآباد کے معاہدے سے کسی قدر مختلف تھے۔ اس معاہدے میں یہ اقرار پایا تھا کہ پیشوا کو اختیار ہو گا کہ وہ اثناء جنگ میں حیدرآباد کی طرح انگریزی فوج کا ایک دستہ اپنی امانت کے لئے حاصل کرے اور اُس کے ساتھ ہی اگر ضرورت پڑے اور مطالبہ کیا جائے تو وہ اپنی سوار فوج کا ایک دستہ حیدرآباد اور انگریزوں کی فوج کے ساتھ مل کر لڑنے کے لئے مہیّا کرے۔

گورنر جنرل نے دولت راؤ سندھیا اور رگھوجی بھونسلا[۱]
سے التجا کی کہ وہ اس اہم معاہدے کو کامیاب بنانے میں اپنا پورا (۶۷)
اثر ڈالیں، لیکن اگر نانا فرنویس اور ریاست پونا کے دوسرے فوجی سرداروں کے لئے اس وقت دیگر زبردست محرک قوتیں موجود ہوتیں تو باوجود مذکورۂ بالا سرداروں کی کوششوں کے پیشوا کی مجلس کے صدر نانا فرنویس پر کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ اس مسلک پر ہرگز عمل نہ کرتا۔ ٹیپو سلطان مرہٹوں کو نیچا دکھا چکا تھا۔ اس کی طرف سے انہیں اب بھی خوف لگا ہوا تھا۔ ٹیپو اور اس کے باپ حیدر علی خاں نے ان کے جو زرخیز علاقے چھین لئے تھے ان کے دوبارہ حاصل کرنے کی بھی انہیں خواہش تھی، لہٰذا دیگر اسباب کے ساتھ مرہٹوں کی شرکت کے یہ بھی خاص وجوہ تھے۔

[۱] راجہ برار

نواب میر نظام علی خاں بہادر کے دل میں بھی کچھ ایسی قسم کے مقاصد تھے اور اگرچہ لارڈ کارنوالس نے دربار حیدرآباد اور پیشوا دونوں سے معاہدہ کرنے اور تعلقات بڑھانے کی کوشش میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا تھا تاہم اسے اس بات کا پورا احساس تھا کہ اگر اسے اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی تو صرف مذکورۂ بالا اسباب کی بنا پر ہی ہوگی۔ وہ اپنے اس خیال کو ان الفاظ میں ادا کرتا ہے کہ "اس وقت نظام اور پیشوا کی اعانت پر بھروسہ کرنے کی صرف یہی ایک وجہ ہے کہ اس معاملے میں ان کے ذاتی اغراض اور انتقامی جذبات شامل ہیں۔ ٹیپو سے ان دونوں کو نقصان پہنچ چکا ہے اور مزید برآں اس کی حرص و ہوس کی کچھ انتہا ہی نظر نہیں آتی۔ لہذا
یہ دونوں کسی ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دینگے جس سے انہیں (۶۸)
سلطان کی طاقت کم کرنے کی توقع ہوسکے۔"

واقعات کرانگنور
وجیکوٹہ

اب ان واقعات کا بیان کرنا ضروری ہے جن کی وجہ سے ٹیپو سے جنگ چھڑی۔ جنگ چھڑنے کے بعد حکومت فورٹ سینٹ جارج نے جو طرز عمل اختیار کیا اور اس کی وجہ سے لارڈ کارنوالس نے جو تدابیر اختیار کیے، ان کا اندازہ کرنا بھی ضروری ہے۔ ٹیپو نے کرانگنور اور جیکوٹہ کے علاقوں کو حاصل کرنے کی غرض سے راجہ ٹراونکور کی سرحد پر حملہ کیا۔ سلطان نے اس حملے کا سبب یہ بیان کیا کہ اگرچہ راجہ نے یہ دونوں علاقے ڈچ سے خریدے ہیں لیکن درحقیقت وہ اس کے باجگذار راجہ کوچین کی ملک ہونے کی وجہ سے اس کی نگرانی میں ہیں۔ حکومت مدراس نے (حکومت بنگال کی ہدایت کے بموجب) راجہ ٹراونکور کو مشورہ دیا کہ وہ ان علاقوں کے بیعنامے کو منسوخ کردے

لہ بحوالہ مراسلہ مورخہ ۲۸ فروری ۱۷۹۰ء بنام سرچارلس میلٹ۔

راجہ نے اُس کی تعمیل سے انکار کیا اور جواب میں یہ دلیل پیش کی کہ ٹیپو کا بیان قطعی غلط ہے۔ ڈچ نے یہ مقامات پرتگالیوں سے خرید کیے تھے اور اُس پر وہ عرصے سے قابض تھے اور اِس وقت تک راجہ کوچین حکومت میسور کا باجگذار بھی نہیں بنا تھا۔

جب اِس اعتراض کی اطلاع بنگال روانہ کی گئی تو حکومت عالیہ نے حکومت فورٹ سینٹ جارج کو اِس بارے میں مفصل ہدایات روانہ کیے۔

(٦٩) ان ہدایتوں[۱] کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر پوری تحقیقات کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ جس وقت راجہ کوچین میسور کا باجگذار بنا تھا، اس وقت تک مقامات زیر بحث اُس کی ملکیت میں تھے تو راجہ ٹراونکور کو ان سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا جائے۔ اور اگر برخلاف اِس کے یہ ثابت ہو کہ اُس کے باجگذار ہونے کے وقت یہ مقامات اُس کی ملکیت میں شامل نہ تھے تو ٹیپو سلطان کے مطالبات کی مخالفت کیجائے اور راجہ ٹراونکور کے جائز حق اور قبضے کو برقرار رکھا جائے۔ اگر ان ہدایات کے موصول ہونے سے قبل ہی ٹیپو ان مقامات پر قبضہ کرلے تو حکومت مدراس مذکورۂ بالا اصول کے تحت حتی الوسع مصالحت کے ذریعے سے معاملہ طے کرنے کے لئے ٹیپو سے مراسلت شروع کرے۔ حکومت عالیہ نے اُس مراسلے میں یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ اگرچہ یہ مقامات راجہ ٹراونکور کی ریاست کی حفاظت کے لئے ضروری ہیں تاہم جنگ کے اہم نتائج کے مقابلے میں انھیں ترجیح نہیں دیجا سکتی۔ لیکن اُس کے ساتھ ہی ہم اِس بات کے بھی قائل ہیں کہ نقصان یا توہین کو

[۱] ۔ مورخہ ۱۳ر نومبر ۱۷۸۹ء۔

خاموشی سے برداشت کرنا ہمیشہ مضر اور مہلک ثابت ہوتا ہے"

حکومت عالیہ نے حکومت فورٹ سینٹ جارج کو مزید ہدایت روانہ کی کہ اگر ٹیپو اِن مقامات پر قبضہ کر چکا ہو تو اسے وہاں سے نکالنے کا اِس وقت تک خیال نہ کیا جائے جب تک کہ سلطان راجہ ٹراونکور (۷۰)
کے کسی دوسرے علاقے پر ہاتھ نہ ڈالے اور اگر وہ کسی ایسے علاقے پر بھی حملہ کر چکا ہو تو حکومت فورٹ سینٹ جارج کو قطعی طور پر حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اُس کے اس فعل کو علانیہ مخالفت اور اعلان جنگ پر محمول کرے اور اس جنگ کو پوری قوت اور مستعدی سے جاری رکھے۔

حکومت فورٹ سینٹ جارج نے ان احکام کی قطعی پابندی نہ کی، بلکہ جن دلائل پر یہ احکام مبنی تھے اُن کا اپنے جواب میں ابطال کیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ راجہ ٹراونکور کا ڈچ سے کرانگنور اور جیکوٹ کا خرید کرنا ہر لحاظ سے انصاف اور مصلحت دونوں کے خلاف تھا، لہٰذا وہ برطانوی حکومت کی اعانت کا ہرگز مستحق نہیں ہو سکتا۔

حکومت مدراس نے ٹیپو سلطان کو جو مراسلہ روانہ کیا اس میں مندرجۂ بالا ہدایت کو ملحوظ نہ رکھا اور اپنے خیالات کی بنا پر اسے یہ تحریر نہ کیا کہ اگر یہ بات ثابت ہو گئی کہ ڈچ کو ان مقامات کے فروخت کرنے کا حق حاصل تھا تو برطانوی حکومت سلطان کے ہر حملے کی مدافعت کریگی۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ راجہ ٹراونکور کو جو مراسلہ روانہ کیا گیا اس میں حکومت مدراس نے اس مسئلے پر محض سکوت ہی اختیار نہ کیا بلکہ اپنے طرز تحریر سے یہ ظاہر کر دیا کہ راجہ کو انگریزی حکومت سے کسی قسم کی اعانت کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔

حکومت فورٹ سینٹ جارج کو اپنی فوجیں جمع کرنے اور تجارتی لین دین روکنے اور نواب کرناٹک کے قرض خواہوں کے

اقساط بند کرنے کا بھی حکم دیا گیا تھا اور یہ ہدایت کی گئی تھی کہ حتی الامکان مصارف میں کمی کیجائے تاکہ حکومت کے تمام وسائل جنگ کی تیاری میں لگائے جاسکیں۔ لیکن اگر ان ہدایات کو قطعی نظر انداز نہیں کیا گیا تو کم از کم ایک بڑی حد تک انھیں ٹالا ضرور گیا۔ کفایت کے لحاظ سے جنگ کی تیاریاں ایک محدود پیمانے پر کی گئیں اور وہ بھی نہایت بھدّے طور سے شروع کی گئیں اور نقد سرمایہ کا ایک بڑا حصہ تجارت میں ہی لگا رہا۔

حکومت عالیہ نے اس کارروائی پر ابتدا میں اظہار نفرت کیا اور اس پر نہایت سخت نکتہ چینی کی اور سخت ترین الفاظ میں حکومت مدراس سے جواب طلب کیا کہ باوجود ناطق اور متواتر احکام و ہدایات کے اس قدر نازک وقت میں اس قسم کا طرز عمل کیوں اختیار کیا گیا۔

جب ٹیپو ٹراونکور کی سرحد پر پسپا ہوا تو اس نے حکومت مدراس کو دو خط[۵۲] روانہ کئے۔ اپنے طرز عمل کی تلافی کرنے کی غرض سے اس نے یہ عذر تحریر کیا کہ راجہ ٹراونکور کے سپاہیوں کے نازیبا حرکات (۶۵)
سے مشتعل ہو کر میری فوج نے یہ حملہ کر دیا تھا۔ ان خطوط میں اس نے انگریزی حکومت کی دوستی کا بھی خوب دم بھرا تھا۔ اگرچہ اس کا طرز عمل اس تمام زبانی جمع خرچ کے قطعی خلاف رہا تھا، تاہم حکومت مدراس نے اسے سلطان کے صلح پسند ارادوں کا ناقابل تردید ثبوت سمجھا۔ اسی موقع پر فورٹ سینٹ جارج کے گورنر جان ہالینڈ نے لارڈ کارنوالس کو ایک خط لکھا اور اس میں انگلستان واپس ہونے کا ارادہ ظاہر کیا اور ٹراونکور کے معاملے

۵۱۔ (بحوالہ مراسلہ ۰ر فروری)
۵۲۔ (مورخہ ۱۴ر دسمبر و یکم جنوری)

پر بھی اپنے خیالات کا مندرجۂ ذیل الفاظ میں اظہار کیا کہ "جہاں تک میں اندازہ کرسکا ہوں، ٹیپو کا مقصد کمپنی سے بگاڑ کرنے کا نہیں ہے البتہ وہ ہمارے حلیف راجہ ٹراونکور کے طرزِ عمل سے برافروختہ معلوم ہوتا ہے اور آپ اس بات کا خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس عزت کا وہ ہم سے اور بین الاقوام قوانین کی نگاہ میں مستحق ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے راجہ کا طرزِ عمل کس حد تک جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ میں خود اسے ایک نہایت اہم سوال سمجھتا ہوں لیکن ٹیپو سلطان کے جو خطوط اب تک موصول ہوئے ہیں، ان کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ زیرِ بحث معاملے پر گفت و شنید کرنے کے لئے ضرور آمادہ ہو جائیگا۔"

حکومت مدراس کے ان تمام حرکات پر لارڈ کارنوالس کو جو غصہ آیا اس کا وہ نہایت پرزور الفاظ میں اظہار کرتا ہے اور اس موقع پر مدراس کے منصرم گورنر ہالینڈ کو اس نے جو مراسلہ روانہ کیا اس
میں اس کا ذکر کرتا ہے اور اس مراسلے[1] کو مندرجۂ ذیل الفاظ پر ختم (۴۳)
کرتا ہے۔

ٹیپو کے معاملے میں حکومت مدراس کا رویہ۔

حکومت مدراس نے حکومت عالیہ کے ناطق احکام کے باوجود جنگ کی ضروری تیاری میں جو کفایت شعاری دکھائی ہے، اسے میں تحسین کی نظر سے ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔ میرے نزدیک اس سے بڑھکر کسی قوم کی ذلت نہیں ہوسکتی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہر ایک پائی کے معاوضے میں جو اس برے طریقے سے بچائی گئی ہے کمپنی کو ایک کروڑ روپیہ صرف کرنا پڑیگا۔ علاوہ ازیں مجھے اس کا دلی رنج ہے کہ تم نے اس بیجا تاخیر سے ہمارے گستاخ اور ظالم و سفاک غنیم کو ہمارے حلیف

[1] مورخہ ۳۰ مارچ ۱۷۹۰ء

راجہ ٹراونکور کی ریاست پر حملہ کرنے کا موقع دیا حالانکہ سابق اخلاص واعتماد اور اتحاد کی رو سے اُس کی حفاظت ہم پر لازم تھی اور اِس طور سے ہمارے ملک کی سخت ذلت و توہین ہوئی ۔"

لارڈ کارنوس نے فوراً فورٹ سنیٹ جارج پہنچتے اور وہاں کی مقامی حکومت کے حرکات سے اُس کے نزدیک عام مفاد کو جو نقصان پہنچنے والا تھا اسے رد کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن ہالینڈ کے جانشین جنرل میڈوز کے وہاں پہنچ جانے کے بعد اس نے اپنا ارادہ ترک کردیا اور اُس جنگ کا کام اُن کے تفویض کردیا اور اُس کی بابت
اپنے مراسلے میں تحریر کیا کہ جنگ محض قومی ہتک و ذلت کے انتقام (۷۴)
کے لئے ہی ضروری نہیں بلکہ اپنی آئندہ حفاظت کے خیال سے اس مناسب موقع پر ٹیپو سلطان کی طاقت کو کم کرنا بھی ضروری ہے ۔" ہالینڈ کی تحریر کے جواب میں ٹیپو کو جو خط موصول ہوا تھا اسے حکومت مدراس نے جنرل میڈوز کے مدراس پہنچتے ہی حکومت عالیہ کو اپنے ایک مراسلہ کے ساتھ روانہ کردیا ۔ ٹیپو نے اپنی اس تحریر میں راجہ ٹرانکور اور نواب کرناٹک کے متعلقہ معاملات کے سلسلے میں اپنے بچاؤ کی غرض سے طویل دلائل پیش کئے تھے ۔ مسٹر ہالینڈ نے کمشنر مقرر کرنے کی جو تجویز پیش کی اسے اس نے منظور کیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ درخواست کی کہ کمشنروں کو اس کے دربار میں روانہ کردیا جائے ۔ حکومت فورٹ سنیٹ جارج نے سلطان کو اس تحریر کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن مذکورۂ بالا مراسلے میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ اُس کی درخواست کے مطابق کمشنروں کو اس کے دربار میں روانہ کرنا انگریزی حکومت کے اغراض واقتدار کے سخت خلاف ہوگا ۔

اس مراسلے کے جواب میں حکومت عالیہ نے اپنے سابق احکام کو دہرایا کہ راجہ ٹراونکور کی ریاست پر جو حملہ ہوا ہے، اسے

اعلان جنگ سمجھا جائے اور تحریر کیا کہ حکومت عالیہ کا تو یہ خیال تھا
کہ حکومت فورٹ سینٹ جارج ان مسلسل احکام کے بعد یا تو جنگ میں
پورے طور سے مشغول ہوگی یا ان دہی سے جنگ کی تیاریاں کر رہی
ہوگی ۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ٹیپو سلطان سے جو حرکت سرزد ہوچکی (۷۵)
ہے جب تک اس کی پورے طور سے تلافی نہ ہو جائے ۔ کیونکر
کسی قسم کی گفت و شنید عزت کے ساتھ کیجا سکتی ہے ۔

حکومت عالیہ اس مراسلے میں حکومت فورٹ سینٹ جارج
کو حکم دیتی ہے کہ "ٹیپو کے ان خطوط کے جواب میں اسے صاف
طور پر مطلع کر دیا جائے کہ یہ امر پورے طور سے ثابت ہوچکا ہے
اور اس کی تردید ناممکن ہے کہ کرانگنور اور جیکوٹہ ڈچوں کے آزاد
مقبوضات تھے ۔ ڈچوں نے راجہ کوچین کو کبھی خراج ادا نہیں کیا۔
انھیں بلا شبہ اس بات کا پورا حق حاصل تھا کہ وہ ان مقامات کو
راجہ ٹراونکور یا کسی اور دوسری طاقت کے ہاتھ جسے وہ مناسب
خیال کریں، فروخت کر دیں ۔ ٹیپو نے ٹراونکور کی سرحد پر خود حملہ کیا،
اسے محض اتفاقی امر تصور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ٹیپو خود وہاں موجود
تھا اور فوج کی کمان غالباً اسی کے ہاتھ میں تھی ۔ اور چونکہ راجہ
اس علاقہ پر بیس سال سے قابض ہے اور صلح نامے کی رو سے
ان پر اس کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا تھا لہٰذا اس قدر سخت اور مخاصمانہ
کارروائی کو بجز عہد شکنی کے اور کسی بات پر محمول نہیں کیا
جا سکتا "

ان آخری احکام کے موصول ہونے کے بعد جنرل میڈوز اپنی
فوج میں شریک ہونے کے لئے مدراس سے روانہ ہوا
جو ترچناپلی کے میدان میں جمع ہوچکی تھی اور ۲۴ر مئی کو اس کے
پڑاؤ پر پہنچ گیا ۔ جنرل میڈوز ٹیپو سلطان کو اپنی روانگی کی اطلاع
کر چکا تھا ۔ فوج کے پڑاؤ پر پہنچنے کے بعد اسے سلطان کا دوسرا

(۷۷) خط ملا جس میں اس نے کمپنی کی سرحد پر فوج جمع کرنے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس بات کی خواہش ظاہر کی تھی کہ اسے اپنے ایک ممتاز اور معتبر شخص کے روانہ کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ ان تمام باتوں کی صفائی ہو جائے اور دونوں حکومتوں کے درمیان دوبارہ اخلاص و اعتماد قائم ہو سکے۔

اس کے جواب میں جنرل میڈوز نے نہایت شان سے مندرجۂ ذیل مختصر سا جواب روانہ کر دیا:-

"آپ کا خط ملا۔ جو کچھ اس میں درج ہے، اسے میں خوب سمجھتا ہوں۔ آپ ایک عظیم الشان فرمانروا ہیں۔ آپ نے اپنے قیدیوں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا ہے اگر اسے نظر انداز کیا جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا شمار روشن خیال فرمانرواؤں میں ہوتا ہے۔ انگریز نہ کبھی ذلت برداشت کرتے ہیں اور نہ کبھی خود دوسروں کی توہین کرتے ہیں جس وقت کہ آپ نے ہمارے حلیف راجہ پر حملہ کیا ہمارے اسی وقت سے جنگ چھڑ گئی۔ خدائے تعالیٰ ہمیشہ زبردست ہی کو فتح و نصرت عطا نہیں کرتا اور نہ نبرد رو ہی ہمیشہ دوڑ میں جیتتے ہیں بر خلاف اس کے فتح و کامیابی کا انحصار عام طور سے انصاف و عدل پر ہوتا ہے اور اسی پر ہمارا اعتقاد ہے۔"

ٹیپو سلطان سے جنگ۔

اس مراسلے کے روانہ کرنے کے چند روز بعد جنرل میڈوز ۱۲ر جون کو سلطان کے علاقے میں داخل ہوا اور جنگ شروع کر دی، جس کا اختتام خود کارنوالس نے ۲۳ر فروری ۱۷۹۲ء کو برطانوی حکومت اور اس کے حلیفوں کے لئے شایان شان طریقے سے کیا۔

جب ٹیپو سلطان کے طرز عمل سے یہ بدیہی طور پر ظاہر ہو گیا کہ وہ برطانوی حکومت اور اس کے حلیفوں کا مخالف ہے تو لارڈ کارنوالس

نے نہ تو جنگ چھیڑنے میں دیر کرنی چاہی اور نہ صرف فوری خطرے کی مدافعت
کو، جو اُس کی حکومت کو اس وقت درپیش تھا۔ اپنا مسلک بنایا۔ جب (۷۷)
ٹیپو کے ارادوں کا پتا چل گیا تو اُس نے اس پر حملہ کرنے میں جلدی کی
اس نے اُن تمام فوائد کا بخوبی اندازہ کرلیا جو فوری اور اقدامی کارروائی سے حاصل
ہوتے ہیں اور جس وقت جنگ کا تہیہ کیا اسی وقت سے (جیسا کہ اس کی تمام
مراسلت سے پتا چلتا ہے جو اُس نے جنگ چھیڑنے سے قبل کی) اُس نے
کرناٹک اور ملابار کی سمت کمپنی کے حدود بڑھانے کا خیال کرلیا تھا جسے وہ اپنے
مسلک کا ایک خاص جزو قرار دے چکا تھا، کیونکہ اُس توسیع سے برطانوی
حکومت کی طاقت اور اُس کے وسائل میں بھی اضافہ ہو جاتا تھا اور اس
کے زبردست ترین حریف کی قوت بھی کم ہو جاتی تھی۔ اور جب اُس نے
پیشوا اور فرمانروائے دکن سے اس بات کی درخواست کی کہ وہ کمپنی کے
حلیف کی حیثیت سے اس جنگ میں شریک ہوں تو اس وقت بھی اُس نے
اسی اصول کو پیش نظر رکھا اور مالی اور ملکی فوائد کے توقعات دلا کر ان کے
حوصلوں کو بڑھایا۔

لارڈ کارنوالس نے حکومت برطانیہ کی عزت برقرار رکھنے اور اس
کا اعتماد قائم رکھنے کی غرض سے جس زور اور مستعدی سے جنگ شروع کی
اُس کا نہایت اچھا اثر پڑا اور فوجی کامیابی کے علاوہ جس اعتدال سے
کارنوالس نے جنگ کے اختتام پر کام لیا، اس سے اُس اثر میں مزید اضافہ
ہوگیا۔ جب ٹیپو سلطان اپنی مایوسی اور شکست خوردہ افواج کے ساتھ
قلعۂ سرنگاپٹم میں محصور ہوگیا تو اُس نے اپنے آپ کو فاتحین کی رحمدلی اور
فیاضی پر چھوڑ دیا یا بالفاظ دیگر اپنے آپ کو لارڈ کارنوالس کے حوالے کر دیا۔
کارنوالس کے حلیفوں کو اُس کی ذات پر اس قدر اعتماد تھا کہ انھوں نے
بلاتخصیص اپنے جملہ اغراض و مفاد کی نگرانی بھی اسی کے سپرد کر دی، انھوں نے
نہ کبھی موقع پر اُس کی نیک نیتی پر شبہ کیا اور نہ اُس کی رائے سے کبھی (۷۸)
اختلاف ہی کیا۔ ایک فرد کے خصائل اور اس کی حکومت کے اصول کی

ٹیپو سے صلح

خوبی کا اس سے بڑھکر اور کیا احترام و اعتراف ہو سکتا ہے۔

ٹیپو کے وکیلوں سے ملاقات کرنے کی غرض سے لارڈ کارنوالس کے خیمے کے قریب ایک مقام تجویز کیا گیا۔ ۱۴ فروری کو سلطان کے وکیل اس مقام پر پہنچے انگریزوں کی طرف سے سر جان کینوے (Sir John Kennenay) اور حیدر آباد کی طرف سے میر عالم اور مرہٹوں کے دو نمایندوں نے ان سے ملاقات کی۔ ان کے سامنے پہلی تجویز یہ پیش کی گئی کہ ٹیپو سلطان اپنی ریاست کے نصف علاقے سے دستبردار ہو جائے اور چھ کروڑ روپیہ نقد ادا کرے لیکن سلطان کے وکیلوں کے بیان[1] پر کہ سلطان میں اس قدر رقم ادا کرنے کی استطاعت نہیں صرف تین کروڑ کا مطالبہ قائم کیا گیا اور مرہٹوں کے سپہ سالار ہری پنت کی تحریک پر اس میں تیس[2] لاکھ روپیہ دربار کے اخراجات کے لئے شامل کئے گئے۔ ہری پنت (۹۲ء) نے بیان کیا کہ ایسے موقعوں پر اس نام سے کچھ رقم حکومت کے ان سول عہدداروں کے لئے وصول کر لی جاتی ہے جو جنگ میں شریک ہوتے ہیں۔

جب صلح کے ابتدائی شرائط قرار پا گئے ایفائے عہد و تکمیل شرائط کی ضمانت کے طور پر ٹیپو نے اپنے دو بیٹے لارڈ کارنوالس کے پاس روانہ کر دئے۔

۱۔ انھوں نے اس بات کی قسم کھائی اور لارڈ کارنوالس سے درخواست کی کہ وہ اپنے آدمی سرنگا پٹم بھیجکر حسابات کی جانچ پڑتال اور خزانے کی حالت سے اس کے اس بیان کی تصدیق کرائے۔ اس کے مطالبات کی بابت جو کچھ علم تھا اور آمد و خرچ کا جو حساب ملا اور ۱۷۹۹ء میں سرنگا پٹم کے قبضے کے بعد خزانے میں جو نقد رقم ملی اور جو مع جواہرات کے دس لاکھ تھی اس کی بناء پر ٹیپو کے سفیروں کا بیان صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ مرہٹوں کے سردار نے سر جان کینوے کو رائے دی کہ مصارف دربار کے لئے ساٹھ لاکھ کا مطالبہ کیا جاوے اور آخر میں تیس لاکھ پر اکتفا کیا جائے۔ ٹیپو کے سفیروں نے جب اس پر نہایت معمولی اعتراض کیا تو معلوم ہوا کہ

گفت و شنید جب شروع ہوئی تو اس میں ایک مہینہ لگ گیا۔ ہر روز کے اجلاس کی کارروائی کے اقتباسات ضمیمے میں درج کردئے گئے ہیں۔ ان اقتباسات کو غور سے پڑھنا چاہئے کیونکہ ان سے ٹیپو سلطان اور اس کے عہدہ داروں کی ترکیبوں اور اس کی ٹال مٹول اور تاخیر پیدا کرنے کی کوششوں کا پتہ چلتا ہے۔ اور جس صبر و تحمل سے ان سب کا مقابلہ کیا گیا اس کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے۔ خواہ ہم ان عاجلانہ کارروائیوں پر غور کریں جو اس صلح میں کرنی پڑیں یا اُن ذیلی واقعات کا لحاظ کریں جو اُس کے لئے ضروری تھے یا اُن دقتوں پر نظر ڈالیں جن پر حلیفوں کو حاوی آنا پڑا۔ ہر حالت میں ہمیں اس اعلیٰ سیاسی عہدہ دار کے معلومات، قابلیت اور ان تھک کوششوں کی داد دینی پڑتی ہے جس کے سپرد لارڈ کارنواس نے یہ سخت کام کیا تھا۔ ۱۹ مارچ کو خان شہزادوں نے سلطان کے تسلیم کردہ شرائط برطانوی سپہ سالار کے حوالے کئے اور اس صلحنامے کی تکمیل ہوگئی۔[1]

کورگ کا مطالبہ اور ٹیپو کی مخالفت

(۸۰) چونکہ لارڈ کارنواس نے یہ طے کرلیا تھا کہ اس جنگ سے ٹیپو کی طاقت کا پورے طور سے خاتمہ نہ کیا جائے لہذا اُس نے حتی الوسع اس بات کی کوشش کی کہ سلطان اپنی اس گری ہوی حالت سے مایوس ہو جائے بنگلور کی واپسی کو بھی اس خواہش پر محمول کرنا چاہئے۔ یہ ایک رعایت تھی جس پر تمام حلیف

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ وہ اس مطالبہ کو رواج کے مطابق خیال کرتے تھے۔

[1] شہزادوں نے اس کی ایک نقل ہمارے حلیفوں کے نمائندوں کو دی جو اس موقع پر موجود تھے۔ اس جنگ کے قابل نامہ نگار کا بیان ہے کہ جب لارڈ کارنواس نے معاہدہ کی دونوں نقلیں بڑے شہزادے کو واپس کیں تو اس نے دوسری طاقتوں کے وکیلوں کو ایک ایک نقل دے دی اور اس موقع پر بھی ان شہزادوں نے بہت ضبط سے کام لیا لیکن اس رسم کے پہلے حصے کے مقابلے میں اسوقت بدیہی طور پر ان میں ایک خاص رکاوٹ اور غیر اطمینانی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ (اقتباس از حالات جنگ مصنفہ ڈرون صفحہ (۲۴۷)۔

ذنگ رہ گئے۔ اس میں کچھ شبہ ہو نہیں سکتا کہ اس اہم قلعے اور اس سے ملحق اضلاع پر جو بالا گھاٹ کے حاصل کردہ علاقے سے ملے ہوئے تھے، قبضہ کر لیا جاتا تو آئندہ اس کی مخاصمانہ جدوجہد کے مقابلے کے لئے نہایت مکمل پیش بندی ہو جاتی۔ فوجی نقطۂ نظر سے بھی اس کی اہمیت کورگ سے کہیں زیادہ تھی جس پر لارڈ کارنوالس نے قبضہ برقرار رکھنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ لیکن اس پر قبضہ کرنے کا ارادہ اس خیال سے نہ تھا کہ وہ ایک اہم فوجی مقام ہے بلکہ کارنوالس کو اپنے وعدے کے ایفا کا لحاظ تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے اس بات کا بھی علم تھا کہ ٹیپو اس علاقے پر اپنا قبضہ محض اس وجہ سے قائم رکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ وہاں کے راجہ سے جس کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ اس نے انگریزوں کی حمایت کرنے میں نہایت جوش و مستعدی کا اظہار کیا تھا انتقام لے سکے۔

ٹیپو نے بجز جنگ کے ہر ممکن کوشش اس بات کے لئے کی کہ کورگ اس کے ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اس نے اس مطالبے کو دیانت داری کے خلاف بتایا اور کہا کہ "یہ علاقہ کمپنی کے مقبوضات سے ملحق نہیں (ابتدائی شرائط میں جن مقامات کا مطالبہ کیا گیا تھا ان کے لئے یہی الفاظ استعمال ہوئے تھے)
مجھ سے ایک کروڑ روپیہ نقد وصول کرنے تک اس مطالبہ کو ادا تاپیش نہیں کیا (۸۱)
گیا اب میرے دو بیٹوں کو ضمانت میں لیکر مجھے بے بس کر دیا گیا اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے بعد میرے لئے مخالفت کی گنجائش ہی نہیں رہی۔" ان الزامات کے جواب میں کورگ کا تعلق دوسرے حاصل کردہ علاقوں سے ثابت کر دیا گیا[۱]

[۱] ملابار کا علاقہ بھی بجز تلیچری (Tellicherry) کے تجارتی مقام کے کمپنی کے مقبوضات سے ملحق نہ تھا لیکن اس کے مطالبہ کی ابتدا میں مخالفت ہی نہیں کی گئی بلکہ جب پہلی ملاقات میں اس کا ذکر ہوا تو سلطان اور اس کے وکیلوں نے اس انتخاب پر علانیہ خوشی کا اظہار کیا اور اپنے آپ کو مبارک باد دی۔ کورگ بھی اس علاقے سے ملا ہوا تھا اور درمیان میں کوئی دوسرا مقام حائل نہیں تھا۔ ابتدائی شرائط میں حدود کا کوئی دائرہ قرار نہیں پایا تھا

اور نہایت واضح طور پر یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ گفت و شنید کا ایک اصول ہے کہ جب تک حلیفوں کو کسی خاص علاقے کی ضرورت پیش نہیں آتی، اُس وقت تک اس کا نام نہیں لیا جاتا۔ (۸۲)

یہ صحیح ہے کہ محض ٹیپو کے احساسات کا خیال کر کے شروع میں چند موقعوں پر اس اصول سے انحراف کیا گیا تھا لیکن جن علاقوں کا حلیفوں نے ابتدائی شرائط میں ذکر کر دیا تھا، اِن کی آمدنی کا تعین کرتے وقت ٹیپو نے اِس قسم کے انکشاف سے نہایت بیجا فائدہ اُٹھایا لہٰذا گفت و شنید کے آخری مراتب میں مجبوراً اُس اصول کی سختی سے پابندی کی گئی۔

اس اہم موقع پر ٹیپو نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اُس سے اُس کی نیت کا اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے۔ اُس نے اپنے دونوں بیٹوں کو انگریزی پڑاؤ پر بھیج دیا تھا اور ایک کروڑ روپیہ ادا کر دیا تھا لیکن اُس طرح صداقت کا اظہار کرنے سے اسے خوب مہلت مل گئی تھی۔ دراصل اُس کا صرف مالی نقصان ہوا تھا کیونکہ جہاں تک اُس کے چھوٹے شہزادوں کی حفاظت اور ان کے ساتھ نیک

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ اور نہ کسی سرحد کا تعین کیا گیا تھا۔ کورگ گھاٹ کے اوپر ایک ایسی نمایاں جگہ پر واقع ہے کہ وہاں سے ٹیپو کا دارالحکومت اور اس کی باقی ماندہ تمام سلطنت اُس کی زد میں آجاتی ہے لہٰذا اِس معاہدے کا علانیہ مقصد یہ ہو کہ سلطان کی طاقت کم کیجائے اور اس کے ذرائع کو اس قدر محدود کر دیا جائے کہ وہ آیندہ نقصان پہنچانے کے قابل ہی نہ رہے۔ اس کی بحث میں اُس مطالبے پر اعتراض کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہوسکتی لیکن جو حقیقت حال ہے اسے تسلیم کرنا چاہئیے کہ دراصل یہ مطالبہ سلطان کے لئے خلاف توقع تھا لیکن بلاخوف تردید یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ خلاف توقع نہیں ہونا چاہئیے تھا۔ کوئی ذی عقل شخص جو ان اصولوں سے واقف ہوگا جن کے ماتحت یہ جنگ شروع ہوئی تھی اور جاری رہی ہرگز یہ خیال نہیں کرسکتا تھا کہ لارڈ کارنوالس اپنے اس تنہا حلیف کو جس نے اپنی ذمہ داریوں کو درحقیقت کامل صداقت اور خوبی اور عزت کے ساتھ پورا کیا تھا اُس طرح چھوڑ دیگا۔

(جنوبی ہند مولفہ ولکس جلد سوم صفحہ ۴۴۶)

سلوک کا تعلق تھا اس کی بابت اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے دونوں بیٹے لارڈ کارنواس کی نگرانی میں تھے۔ برخلاف اس کے اسے اس بات کا علم تھا کہ اس طرح جو تین ہفتے گزر چکے ہیں ان سے محاصرین کو سخت نقصان پہنچ چکا ہے۔ پڑاؤ پر بیکار پڑے رہنے سے فوج میں بیماری پھیل گئی تھی اور جنگ مسالحوں سے جو سامان تیار کیا گیا تھا وہ قطعی بیکار ہو گیا تھا۔ خندقیں اس قدر خراب ہوگئیں تھیں کہ انھیں ازسرِ نو بنانا ضروری تھا۔ یہ سب باتیں ایسی نہ تھیں جن کا سلطان کو علم نہ ہوتا اور جب کہ ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ وہ اس وقت متحدین کے ایک با اثر اور با اقتدار شخص سے رازمیں مراسلت بھی کررہا تھا تو یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ چونکہ وہ اپنی نصف سلطنت کے لئے ہاتھ (۸۳) پاؤں مار رہا تھا لہٰذا ایک ایک گھنٹہ جو اسے ملتا تھا اس سے اس کی امید بندھتی تھی اور وہ آخر وقت تک اس بات کی کوشش کرتا رہا کہ جس مصیبت میں وہ گھرا ہوا ہے اگر اس سے اسے نجات نہ مل سکے تو حتی الوسع اس کے مضر اثرات کو کم کردیا جائے۔ اس وقت متضاد جذبات اس کے دماغ پر اثر کررہے تھے اور غالباً اس پر سب سے زیادہ اثر اس غصّے کا تھا جو اسے اپنی اُن باجگذار ریاستوں پر تھا جو اس وقت اس کی شکست کا باعث ہوئی تھیں اور ان میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ راجہ کورگ کا تھا۔

راجہ سے کمپنی کے جو کچھ تعلقات تھے ان سے ٹیپو واقف تھا۔ راجہ کی ایک فوج کمپنی کے ساتھ ہوکر لڑرہی تھی لہٰذا یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ٹیپو نے یہ کیونکر خیال کرلیا کہ کمپنی اپنے اس حلیف کو اس کے انتقام کے لئے چھوڑ دیگی معاملات کو اس حد تک پہنچانے میں اس کے کچھ ہی مقاصد کیوں نہ ہوں، اُسے اپنے اندازوں کی غلطی بہت جلد معلوم ہوگئی لارڈ کارنواس نے جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا اس میں ایک لمحے کے لئے بھی اس نے پس وپیش نہیں کیا۔ وہ ہر قسم کے خطرات مول لینے کے لئے آمادہ ہوگیا اور برطانوی حکومت کی دیانت داری پر حرف نہ آنے دیا۔ ضامنوں کو کرناٹک کی طرف بھیجدیا گیا۔ توپیں چڑھانے کا حکم ہوگیا اور محاصرہ شروع کرنے کے لئے تیاریاں ہونے لگیں۔

ٹیپو سے معاہدہ ٹیپو ان تیاریوں اور اس مستعدی سے مرعوب ہوگیا اور اس نے صلح نامہ پر دستخط کرکے جنگ کو دوبارہ چھیڑنے سے روک دیا۔

جس طریقے سے صلح کی گفتگو کی گئی اور جس خوبی سے اسے ختم کیا گیا وہ ہر لحاظ سے لارڈ کارنوالس کے شایان شان رہی۔

(۸۴) جس غنیم کو لارڈ کارنوالس نے مغلوب کیا تھا اُسے بھی طوعاً وکرہاً اس کی خوبیوں کا اعتراف کرنا پڑا اور متحدین نے اس کی ذات پر جو اعتماد کیا تھا اس میں حتی الامکان[1] اضافہ بھی ہوگیا لیکن یہ تمام باتیں اس کی ذات تک محدود تھیں اور ان کا فائدہ حکومت کو محض اُس وقت تک حاصل رہا جب تک کہ عنان حکومت اس کے ہاتھ میں رہی۔

مجلس نظماء[2] نے کارنوالس کو بتاکید لکھا کہ "کمپنی کی مالی حالت اور عام

۱۔ جب لارڈ کارنوالس نے اپنے حلیفوں سے درخواست کی کہ گفت وشنید کے لئے وہ اپنے اپنے نمائندے مقرر کریں تو انھوں نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ "محض آپ کے کہنے سے ہم اپنے نمائندے بھیجتے ہیں۔ انہیں بھیجکر ہم کسی قسم کی مداخلت نہیں کرنا چاہتے ہیں آپ کی ذات پر کامل اعتماد ہے۔ ان کے طرز عمل سے بھی ظاہر ہوگیا کہ یہ الفاظ محض اسے خوش کرنے کے لئے استعمال نہیں کئے گئے تھے۔ ان میں سے کسی نے ضمانتوں کو اپنی نگرانی میں رکھنے کی خواہش ظاہر نہ کی اور اس سے بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہوئی کہ جب ٹیپو سے تاوان جنگ کی پہلی قسط (ایک کروڑ روپیہ کی) وصول ہوئی تو حلیفوں نے اس کی رسید لکھنے اور مزید براں روپیہ کے جانچنے اور پرکھنے* کا تمام کام برطانوی حکام پر ہی چھوڑ دیا۔

* روپیہ کے پرکھنے اور جانچنے کا کام صراف کرتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ ایک باقاعدہ پیشہ ہے ایک روپیہ ہو یا ایک لاکھ یہی لوگ اسے پرکھتے ہیں۔

۲۔ ملاحظہ ہو مجلس نظماء کا مراسلہ مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۷۹۱ء

مفاد کے لئے ٹیپو سے جلد از جلد صلح کرنا ضروری ہے۔ فتح کی صورت میں
جن فوائد کی بجا طور پر توقع ہو سکتی ہے اُن میں سے چند کو ہم نثار کرنے کے
لئے آمادہ ہیں لیکن جنگ جاری رکھکر مزید خطرات مول لینا نہیں چاہئیے
خود کارنوالس کے خیالات بھی اس اعتدال آمیز ہدایت کے مطابق تھے
وہ سلطان کو خوب سمجھتا تھا۔ صلح کا مسودہ روانہ کرتے وقت وہ مجلس نظمار کو
اس کی بابت کہتا ہے کہ "وہ ایک بیوفا اور تند مزاج شخص ہے اس پر قطعی اعتماد
نہیں کیا جا سکتا[1]"

لہٰذا کارنوالس یہ توقع نہیں کرسکتا تھا کہ جو کچھ بھی اب ہو چکا ہے اس (۸۵)
کی بدولت یہ شخص قابل اعتماد دوست بن جائیگا اور نہ اس کا یہ خیال تھا کہ
سلطان کی طاقت اس قدر کم ہوگئی کہ اب وہ بہلا ساز بردست دشمن نہ رہے گا۔
اسی قسم کے خیالات اس کے دماغ میں تھے اور اُس کی یہ رائے بھی تھی کہ
سرنگاپٹم کی تسخیر حلیفوں کے ساتھ معاملہ تھی جس وقت پیدا کردیگی اور ان کے
اتحاد و اخلاص کا آیندہ قائم رہنا بھی شبہ سے خالی نہ ہوگا۔ لہٰذا اس نے یہ
طے کیا کہ چند اہم اور بین فوائد جواب تک حاصل ہو چکے ہیں انھیں آیندہ
حکمت عملی کے مشتبہ اور مشروط مقاصد کی خاطر معرض خطر میں ڈالنا دانشمندی
کا کام نہیں ہے[2]۔

---

[1] ۔ ملاحظہ ہو لارڈ کارنوالس کی مراسلت حکومت مدراس سے جس کا ایک اقتباس نظمار کی
تحریر مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۷۹۲ء میں درج ہے جو انھوں نے ہندوستان روانہ کی تھی۔

[2] سالانہ رجسٹر (Annual register) کے یک مضمون میں اس مسئلے کی بابت ۱۷۹۲ء
میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ ان کارپردازوں نے جس دانشمندانہ اعتدال سے کام لے کر
ٹیپو کے مفتوحہ علاقے کے صرف ایک حصے کو آپس میں تقسیم کیا ہے وہ کوئی خاص قابل تعریف
امر نہیں کیونکہ اگر ٹیپو سلطان کے پاس ایک ایسا معقول علاقہ نہ چھوڑ دیا جاتا جس کے ذریعہ
سے وہ عزت سے رہ سکے بلکہ ایک حد تک اپنے ہمسایوں کے مقابلے میں اپنا پلہ بھاری
رکھ سکے تو ہندوستان کی طاقتوں کا بہت کچھ توازن بگڑ جاتا اور اسے از سر نو ترتیب

لارڈ کارنوالس کے اس فعل کے لئے خیالی اسباب کی اب ضرورت نہیں۔
مذکورۂ بالا زبردست دلائل سے اس موقع پر صلح کرنے کی وجہ صاف ظاہر ہے اور انہیں (۸۶)
دلائل سے لارڈ کارنوالس کی پریشانی اور بے چینی کی وجہ بھی سمجھ میں آجاتی ہے جو
جنگ دوبارہ چھڑ جانے کے امکان سے کچھ مدت تک اسے لاحق رہی اور
جس کا خود اس نے بھی ذکر کیا ہے۔

صلح کی بات چیت کے دوران میں لارڈ کارنوالس نے ٹیپو کے سفیروں
سے جو گفتگو کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کمپنی کے مفاد اور اعتبار کو نثار
کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوا لیکن اس کے علاوہ اس نے سلطان کو اپنا ہم خیال بنانے
اور اسے منانے کی پوری کوشش کی جس طریقے سے اس نے ضامن شہزادوں
کا استقبال کیا اور جس قسم کا سلوک ان کے ساتھ کیا گیا اسے محض اس کی عنایت
و مہربانی ہی پر محمول نہیں کرنا چاہئیے بلکہ شفقت پدرانہ کہنا چاہئیے۔

پیشوائی کشیدگی

فرمانروائے دکن سے جو معاہدہ ہوا تھا اس میں اختتام
جنگ پر کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی لیکن اس اتحاد سے ایک
دوسرے کو جو فائدہ پہنچا تھا اس کی بدولت ان میں اخلاص بہت بڑھ گیا۔ فوج
ریاست میں بدستور برقرار رہی۔ لیکن پونے کے دربار میں اس وقت کچھ اور ہی
رنگ تھا۔ ٹیپو سے صلح ہو جانے کے بعد مرہٹوں کی فوج کے سردار ہری پنت
نے لارڈ کارنوالس کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ سرکش باجگذاروں اور (۸۷)
زیر دستوں کی سرکوبی کے لئے پیشوا کو بھی امدادی فوج کا ایک دستہ دے دیا
جائے اور اس کی تعداد اور شرائط وہی ہوں جو حیدرآباد کی امدادی فوج کے
ہیں۔ عام وجوہ کی بنا پر اس تجویز کو رد کر دیا گیا لیکن اس سلسلے میں کارنوالس نے
جو مراسلہ تحریر کیا اس میں وہ بیان کرتا ہے کہ اس تجویز کے رد کرنے کا خاص

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ دینے میں مزید لڑائیوں کا راستہ کھل جاتا" اس رائے کے جواب میں ہم یہ
کہہ سکتے ہیں کہ لارڈ کارنوالس ہندوستانی سلطنتوں کی ساخت سے خوب واقف تھا اور ان سلطنتوں کی
حکمت عملی کے مقاصد اور عام امن قائم کرنیکے اصول دوسری سلطنتوں کے عام اصولوں سے بالکل مختلف تھے اسکے بعد
اس کی بابت اور کہا جائیگا۔

سبب یہ تھا کہ مجھے اس امر کا یقین تھا کہ مادھوجی سندھیا پونے میں اثر قائم
کرنے کی جو ترکیبیں کر رہا ہے ان سے نانا فرنویس بہت خوف زدہ ہے اور
اس طرح وہ اس کے خلاف برطانوی حکومت کی اعانت حاصل کرنا چاہتا
ہے۔

مادھوجی سندھیا کا طرز عمل۔

کمپنی مادھوجی سندھیا کی آزادی کو صلحنامۂ سلبائی میں پہلے
ہی تسلیم کر چکی تھی۔ اس کے بعد سے اس نے اپنی فوج اور
اپنے علاقہ میں کافی اضافہ کر لیا تھا اس کے دربار کے قابل
رزیڈنٹ مسٹر جیمس انڈرسن نے ۱۷۸۶ء میں سر جان میکفرسن کی خدمت میں
(جو اس وقت گورنر جنرل تھا) اس کے عروج کو روکنے کی غرض سے ایک تجویز
پیش کی تھی اور یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر اسے نہ روکا گیا تو برطانوی حکومت
سے اس کا ضرور تصادم ہوگا۔ اس تجویز پر کوئی عمل نہیں کیا گیا۔ لارڈ کارنوالس
علانیہ طور پر پارلیمنٹ کے مقررہ کردہ عدم مداخلت کے مسلک کا حامی تھا
لہذا وہ اپنے آپ تو اس بات کا بھی مجاز نہیں سمجھتا تھا کہ اس سردار کی (۸۸)
دست درازیوں کو روکنے کی غرض سے وہ کسی قسم کی سیاسی تدبیر تک اختیار کرے
نتیجہ یہ ہوا کہ سندھیا نے ہندوستان کے تمام شمالی حصے پر سکہ جما لیا شہنشاہ
دہلی کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ یورپین افسروں اور خصوصاً فرانسیسیوں کی نگرانی
میں ایک عظیم الشان اور جرار لشکر اور باقاعدہ توپخانہ تیار کیا۔ سامان حرب و
آلات جنگ بنانے اور ڈھالنے کے لئے کارخانے قائم کئے۔ الغرض ان
ذرائع سے اس نے ایسی طاقت حاصل کر لی کہ اس کا جانشین برطانوی حکومت
کے خلاف وقت واحد میں دکن اور شمالی ہند دونوں جگہ جنگ جاری
رکھ سکا۔

سندھیا سے گفت و شنید

ٹیپو سلطان سے جنگ چھڑنے سے قبل سندھیا نے اس کے
خلاف اتحاد میں شریک ہونے کی خواہش اس شرط پر کی
تھی کہ برطانوی حکومت سے اس کا ایک معقول معاہدہ
ہو جائے اور اسے انگریزی فوج کے دو بٹالین دیئے جائیں جنہیں وہ اپنی

فوج کے ساتھ لے کر بر وقت پونے روانہ ہو جائے گا۔ اُس نے اس بات کی
بھی توقع ظاہر کی تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں کمپنی اس کی ریاست کی حفاظت
کرے۔ ان خاص شرائط کے علاوہ جن راجپوت سرداروں نے اب تک اس
کی سرداری تسلیم نہیں کی تھی، ان کے خلاف بھی مدد چاہی۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ شرائط
تسلیم کرنے کے قابل نہ تھے اور اس کی خواہش کے مطابق معاہدہ نہ ہو سکا۔ ٹیپو سے
جنگ ختم ہونے کے بعد اس بات کا شبہ ہوا کہ سندھیا کے دربار کا رنگ برطانوی (٨٩)
قوم کے ساتھ دوستانہ نہیں بلکہ مخالفانہ نظر آتا ہے۔[1]

صلح کے بعد لارڈ کارنوالس کو بھی اس کے طرزِ عمل کی وجہ سے سخت شبہات
پیدا ہوئے۔ جولائی ۱۷۹۲ء میں دہلی کے وقائع نویس سے اطلاع ملی کہ شہنشاہ دہلی
نے پیشوا اور سندھیا کو مراسلے روانہ کئے ہیں، اور ان کی امداد اور کوشش سے
بنگال سے خراج حاصل کرنے کی توقع ظاہر کی ہے۔ گورنر جنرل نے سندھیا
کے دربار کے رزیڈنٹ کو اس معاملہ کے متعلق فوراً ہدایات روانہ کئے[2] اور
اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا کہ اگرچہ یہ خبر مستند نہیں ہے
اور اس وجہ سے باضابطہ طور پر اس معاملہ میں کارروائی نہیں کی جا سکتی تاہم
میری خواہش یہ ہے کہ سندھیا اور اس کے وزراء کو میرے خیالات سے
پورے طور پر آگاہ کر دیا جائے۔" رزیڈنٹ کو یہ بھی ہدایت کی کہ اگر اس خبر کی
تصدیق نہ ہو سکے اور علانیہ طور پر اس کے اظہار کا موقع نہ ملے تو اس کے ان
خیالات کو سندھیا تک پہونچانے کے لئے کوئی موقع نکالا جائے۔ وہ لکھتا
ہے "تم سندھیا سے کہنا کہ شہنشاہ دہلی کی آج کل جو حالت ہے اس کا لحاظ
رکھتے ہوئے سیاسی معاملات پر جو خطوط بھی شہنشاہ کے نام سے جاری ہوتے ہیں (٩٠)
اُن کی بابت میرا خیال یہ ہے کہ وہ آپ کی صلاح اور مرضی سے لکھے جاتے ہیں

[1] ۱۷۹۹ء میں سرنگاپٹم کی تسخیر کے بعد اس مراسلت کا پتہ چلا جو ۱۷۹۳ء میں ٹیپو اور سندھیا کے درمیان ہوئی تھی اس سے اس قسم کا شبہ حق بجانب ثابت ہوا۔

[2] یہ ہدایات ۹ اگست ۱۷۹۲ء کو تحریر کی گئی تھیں۔

تم میری طرف سے یہ بھی کہہ دینا کہ اگر اس قسم کے اصول قائم کرنے کی کوشش کی گئی خواہ وہ کسی طاقت کی طرف سے ہوں تو ہماری حکومت نہایت سختی سے ان کی مخالفت کرے گی۔"

اسی سلسلے میں وہ یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ "اگر اس معاملے کے لئے تم سندھیا سے ملاقات کرو یا اسے کوئی تحریر لکھو تو یاد کر کے نہایت زور دار الفاظ میں سندھیا کو جتلا دینا کہ اس نے اس طویل مدت میں شمالی ہند میں فتوح حاصل کئے ہیں اور اپنے حدود بڑھائے ہیں اور ہم نے نہایت صبر و تحمل اور اعتدال سے کام لیا ہے۔ اب اگر ہمیں مجبوراً اس علاقے میں اپنی سابق عدم مداخلت اور صلح پسند مسلک کے اصول سے انحراف کرنا پڑا تو ہمیں بڑا صدمہ ہوگا۔ تم ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ میں نے تمہیں اس بات کے اظہار کی خاص طور سے ہدایت کی ہے کہ ہمارا منشا جدید فتوح حاصل کرنے کا قطعی نہیں ہے اور جہاں تک کہ ہمیں ہماری حفاظت اور عزت اجازت دیگی ہم شہنشاہی کے اندرونی معاملات میں بھی مداخلت نہیں کریں گے۔ لیکن اگر ہمارے ہمسایوں میں سے کسی نے اپنی ناعاقبت اندیشی کی بنا پر ہم سے بیجا مطالبات کئے یا کسی اور طریقے سے ہماری توہین کی تو ہم پورے طور سے اس کا بدلہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس کے لئے اپنے آپ میں قوت بھی پاتے ہیں۔"

یہ ہدایات اس قابل فخر اور انصاف پسند قومی احساس پر مبنی تھے جو شمہ برابر بھی توہین گوارا نہیں کر سکتا اور اس قسم کے خطرات کا مستعدی سے مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ رہ کر انھیں اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتا۔ اس وقت ان کا نہایت اچھا اثر ہوا۔

سندھیا کے وزیر نے رزیڈنٹ کو اس امر کا یقین دلایا کہ اس کا آقا (۹۱)
شہنشاہ کی عنایت سے محض اپنے علاقے پر اپنا تسلط جمانا چاہتا ہے۔ دوسروں کے علاقوں پر حملہ کرنے یا انھیں تسخیر کرنے کا اسے قطعی خیال نہیں۔

راجۂ برار

برطانوی حکومت کے سیاسی تعلقات رگھوجی بھونسلا سے اب تک کبھی دوستانہ نہیں رہے تھے۔ اس فرمانروا کے

ذاتی خصائل اور اس کی ریاست کے مقامی حالات کی وجہ سے ٹیپو کے خلاف جنگ میں کسی قسم کی امداد کی توقع بھی اس سے نہیں ہوسکتی تھی تاہم لارڈ کارنوالس نے اپنے مسلک کی صداقت کو اس پر ظاہر کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا اور بالآخر اس سے بھی اس اتحاد میں شرکت کی درخواست کی۔ اور اس غرض کے لئے اور اس کے علاوہ دیگر چند اور معمولی تجارتی معاملات طے کرنے کی خاطر جن کا دونوں ریاستوں سے تعلق تھا، ایک رزیڈنٹ بھی اس کے دربار میں بھیجا۔ اُسے ہدایت کی کہ وہ راجہ کو پورے طور سے اس بات کا یقین دلادے کہ محض فوجی ضروریات اور مجبوریوں کی وجہ سے برطانوی افواج کو بغیر اس کی اجازت کے اُس کے علاقے اٹک سے روانہ کرنا پڑا۔

لارڈ کارنوالس کے سیاسی دور کا ایک صحیح اندازہ کرنے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مسلک کے اُن اصول پر غور کیا جائے جنکے
تحت اس نے ان دیسی ریاستوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کئے جنھیں زمانے (۹۲)
نے کمپنی کی اعانت و حفاظت کا محتاج بنا دیا تھا اور جن کے اغراض ان تعلقات کی نوعیت کی وجہ سے انگریزی حکومت کے مفاد کے ساتھ وابستہ ہوگئے تھے۔

ان فرمانرواؤں میں نواب کرناٹک اور نواب وزیر اودھ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ لارڈ کارنوالس نے ان دونوں سے جو معاملات طے کئے ان میں سے خاص خاص کا مختصر ذکر ہمارے مضمون کے اس حصے پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہوگا۔

کرناٹک کے معاملات

لارڈ کارنوالس کے یہاں آنے کے بعد فورٹ سینٹ جارج کے گورنر سر آرچیبالڈ کیمبل نے نواب کرناٹک سے ایک جدید معاہدہ کیا۔ اس معاہدہ کا منشا یہ تھا کہ از روئے انصاف کمپنی اور نواب کے مقبوضات کرناٹک اور شمالی سرکار کی حفاظت کے لئے آپس میں ایک معقول سمجھوتہ ہوجائے۔ اس کے طے کرتے وقت یہ خیال کیا گیا تھا کہ اس کی بدولت کمپنی اور نواب کرناٹک کے سیاسی تعلقات بہت بہتر ہوجائیں گے۔ ایک لحاظ سے یہ خیال ضرور صحیح تھا کیونکہ قبل ازیں ریاست کے وسائل دو مختلف

فوجوں پر صرف ہوتے تھے اور ان دونوں فوجوں کی تنظیم مختلف اصول پر تھی اور وہ دو مختلف اور اکثر اوقات مخالف طاقتوں کے تحت کام کرتی تھیں۔

ان حالات کی وجہ سے سلطنت کو بہت سخت خطرات کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ اب اس معاہدہ سے کمپنی کو پورے فوجی اختیارات حاصل ہو گئے اور سلطنت ان سب خطرات سے محفوظ ہو گئی۔

(۹۳) یہی ایک بات ہے جس کے لحاظ سے اس معاہدۂ کو مفید کہا جا سکتا ہے باقی ہر لحاظ سے اس کے خاتمے کے اسباب خود اس کے اندر موجود تھے۔

(۹۴) تلوار ایک کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی اور خزانے کی کنجی دوسرے کے ہاتھ میں۔ کام کو خوش اسلوبی سے چلانے کے لئے ان دونوں میں اتحاد ضروری تھا اور فریقین اس بات سے واقف تھے کہ اس قسم کا اتحاد دونوں کی بقا کیلئے

لہ ۱۲ جولائی ۱۷۸۷ء کو اس معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ اسکی خاص شرائط یہ تھیں کہ فریقین کی سلطنتوں کی حفاظت کے لئے کمپنی امن کے زمانے میں جو انتظامات کرے گی انکے مصارف کیلئے نواب کرناٹک نو لاکھ سترہ پگوڈا ادا کریں گے۔ اگر نواب صاحب یہ رقم پابندی سے ادا نہ کر سکیں تو کمپنی کو حق حاصل ہو گا کہ وہ انکی سلطنت کے چند اضلاع میں اپنے عہدے دار مقرر کرے اور انھیں اختیارات عطا کرے تاکہ وہ ان اضلاع کے عاملوں اور ناظموں کی نگرانی کریں اور وہاں سے مالگزاری وصول کریں۔ معاہدے کی ایک دفعہ کی رو سے چند اضلاع اس قسم کے مطالبات کی ادا کرنیکے لئے مخصوص کر دئے گئے تھے اسکے ساتھ ہی یہ شرط تھی کہ بقایا کی رقم وصول ہونے کے بعد کمپنی کے مقرر کردہ عہدہ دار فوراً واپس بلا لئے جائیں گے۔ لیکن یہ سب شرائط امن کے زمانے کے لئے تھیں۔ اگر جنگ چھڑ جائے تو اسکا پورا انتظام کمپنی کے ذمہ ہو گا۔ کمپنی کرناٹک اور شمالی سرکار کی آمدنی کا ۴/۵ حصہ جنگ میں شریک کریگی اور ایک دوسری دفعہ کی رو سے نواب صاحب بھی اپنی سلطنت کی آمدنی کا ۴/۵ حصہ اس کام کیلئے دیں گے اور اگر مندرجۂ بالا ۴/۵ میں سے کوئی رقم بجز جنگ کے اور کسی کام میں لگائی گئی یا اس پر قرضہ لیا گیا تو کمپنی کو حق حاصل ہو گا کہ وہ نواب کی پوری آمدنی پر قبضہ کر لے اور اسکے انتظام کے لئے عہدہ دار مقرر کرے۔ اور اس انتظام کا وہی طریقہ ہو گا اور اس کے لئے وہی شرائط ہوں گے جو اسکے فوجی مصارف کے سلسلے میں ان اضلاع کی آمدنی کے متعلق طے ہو چکے ہیں جو نو لاکھ پگوڈا سالانہ رقم کی ضمانت میں لکھے گئے ہیں۔

ضروری ہے لہذا اگر نواب اپنی حکومت کے اصول یک لخت نہ بدلیں تو بیرونی طاقت سے جنگ ہونے کی صورت میں اور خاص جنگ کے زمانہ میں کمپنی کو ان تمام علاقوں میں جو مصارف جنگ کے لئے مخصوص ہیں قطعی جدید انتظامات کرنے پڑینگے اور یہ بھی ظاہر تھا کہ ان تمام دقتوں یا خطرات کے علاوہ حکومت کی متواتر تبدیلیوں کی وجہ سے جو اس معاہدے کی بدولت نواب کی ریاست میں ہوتی رہیں گی، وہاں آئندہ ترقی کی تمام امیدیں اور وہاں کی بدقسمت رعایا کے مستقل آرام اور خوشحالی کے تمام توقعات بھی ختم ہو جائیں گے۔

اس عہد نامے نے سب سے پہلا تو یہ گل کھلایا کہ نواب صاحب اس معاہدے کے خاص خاص شرائط ہی پورا نہ کر سکے اور جب ۱۷۹۰ء میں ٹیپو سے جنگ چھڑی تو لارڈ کارنوالس نے مجبوراً دونوں ریاستوں کو ان تمام خطرات سے بچانے کے لئے جو اس کے نزدیک وہاں کی بدنظمی کی وجہ سے پیش آنے والے تھے نواب کی کل ریاست پر قبضہ کر لیا۔ اسے سر۔ اے کیمبل کے
معاہدے کے خلاف مالگذاری وصول کرنے کے لئے بھی اپنے عہدہ دار مقرر ۹۵
کرنے پڑے۔ اگرچہ قرار یہ پایا تھا کہ ایسی حالت میں نواب کے ملازم کمپنی کی نگرانی میں مالگذاری وصول کریں گے تاہم اس وقت یہی مناسب خیال کیا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس بات کی خواہش کی گئی کہ نواب کمپنی کے ملازموں کی نگرانی اور ان کے حسابات کی جانچ پرتال کے لئے اپنے عہدہ دار مقرر کر دیں تاکہ بعد میں معاہدے کے اصول کے مطابق ہی برطانوی حکومت سے اس کا خاطر خواہ سمجھوتہ ہو جائے

لارڈ کارنوالس اپنے ایک مراسلے[1] میں حکومت فورٹ سینٹ جارج کو ان تجاویز پر عمل کرنے کا حکم دیتا ہے اور جن اسباب کی بنا پر مجبوراً یہ طرز عمل اختیار کرنا پڑا انھیں نہایت زوردار الفاظ میں بیان کرتا ہے اور اس بات کا افسوس کرتے ہوئے کہ اس معاملے میں وہ نواب کی منظوری حاصل نہ کر سکا، اس کی فوری تعمیل کا حکم دیتا ہے۔ اسی سلسلے میں وہ لکھتا ہے کہ اگر حکومت نواب کے ذاتی احساسات

---

[1] مورخہ ۱۲ر جون ۱۷۹۰ء۔

کا لحاظ کرکے ان سے معاہدے کی تکمیل نہ کراتی تو اس پر یہ الزام عائد ہوتا کہ اس نے اپنے ملک کے مفاد اور نواب کی سلطنت کی حفاظت کو نظر انداز کر دیا۔

اس مراسلے میں وہ یہ توقع بھی ظاہر کرتا ہے کہ اب نواب صاحب کو اپنے ان مشیروں کی خود غرضی اور بدنیتی کا بہت جلد احساس ہو جائے گا جو انھیں حکومت مدراس کے تجاویز کی مخالفت پر آمادہ کرتے رہے تھے۔ اور اب وہ خود دیکھ لیں گے کہ ایک طرف ان کی رعایا کے ساتھ انصاف و انسانیت کا برتاؤ ہوگا اور دوسری
(۹۶) طرف انھیں اپنے خاندان کی پرورش اور اپنے ذاتی اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے کافی روپیہ مل جائے گا اور ان کی آمدنی کا وہ حصہ جو (لارڈ کارنوالس کے الفاظ میں) سخت گیر کارکنوں اور سود خواروں کے پیٹ میں جاتا تھا اب عزت کے ساتھ ان کی سلطنت اور ان کی رعایا کی حفاظت میں صرف ہوگا"۔

نواب کی ریاست پر قبضہ کرنے سے جنگ کے کاموں میں بڑی آسانی ہو گئی۔ یہی نہیں کہ کرناٹک کے تمام ذرائع کمپنی کے ہاتھ میں آ گئے بلکہ وہاں سے جو کچھ سامان جنگ دستیاب ہو سکتا تھا اسے بروقت مہیا کرنے کا بھی کامل اختیار حاصل ہو گیا۔

اختتام جنگ پر لارڈ کارنوالس فورٹ سینٹ جارج پہونچا اور نواب کرناٹک سے مراسلت شروع کی اور اس سے ایک جدید[1] معاہدہ کیا۔
(۹۷) اگرچہ اس میں کچھ شبہ کی گنجایش نہیں کہ لارڈ کارنوالس نے جو معاہدہ کیا وہ

---

[1] اس معاہدے کی ابتدائی شرائط ۱۲ جولائی ۱۷۹۲ء میں طے ہوئیں۔ ۱۷۸۷ء کا معاہدہ جسے کیمبل نے طے کیا تھا۔ نواب کی درخواست مورخہ ۹ جون ۱۷۹۲ء کے مطابق منسوخ کیا گیا۔ نواب نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ سابق معاہدے کی شرائط کو پورا کرنے کے لئے اس کی ریاست کے ذرائع کافی نہیں ہیں۔ (معاہدے کی رو سے) مقررہ رقوم کے ادا کرنے کے لئے جو ضمانت لی گئی ہے اس سے بھی یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ دیگر اشخاص کے قرضوں کے ادا کرنے کے لئے جو شرائط نواب سے طے کی گئی تھیں وہ بھی منسوخ ہوئیں اور لارڈ کارنوالس نے جو معاہدہ کیا اس میں تحریر کر دیا گیا کہ جو معاہدے اس کی رو سے منسوخ ہوں گے ان کی تمام باتوں کا لحاظ اس میں رکھا جائے گا۔

کسی قدر کیمبل والے معاہدے[1] سے بہتر تھا اور چند معاملات اس سے کچھ

[1] اس عہدنامے کی رو سے (کیمبل کے معاہدے کی طرح) دونوں سلطنتوں کی حفاظت کمپنی کے سپرد کی گئی اور جنگ کے زمانے میں کرناٹک کا کل انتظام بھی اس کے ماتحت رہنا قرار پایا۔ صرف دوران جنگ میں کمپنی کا انتظام رہیگا اور بجز ان چند اصولوں کے جن کا ذکر دوسری جگہ کر دیا گیا ہے، اختتام جنگ پر ریاست کا انتظام نواب کو واپس دیا جائے گا۔ اس معاہدے کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ کرناٹک پر جب تک کمپنی کا قبضہ رہے وہ نواب کو اس کی آمدنی کا ۱/۵ حصہ ادا کرے۔

اس کی ایک دفعہ کی رو سے امن کے زمانے میں فوجی اخراجات کے لئے نواب نے نو لاکھ پگوڈا سالانہ دینے کا وعدہ کیا اور چھ لاکھ اکیس ہزار ایکسو پچیس پگوڈا سالانہ دیگر اشخاص کے قرضوں کے ادا کرنے کے لئے مقرر کئے۔

ان رقوم کے ایک جزو کی ادا کرنے کے لئے پالیگار کا خراج کمپنی کو دیا گیا اور طے پایا کہ ان میں سے دو لاکھ چونسٹھ ہزار سات سو چار پگوڈا نواب صاحب کو دئے جائیں گے اور کمپنی اس رقم میں سے روپیہ وصول کرنے کا معاوضہ منہا نہیں کرے گی اس کے بعد فوجی اخراجات اور دیگر قرضوں کی جو واجب الادا رقم باقی رہے (یعنے بارہ لاکھ چھپن ہزار چار سو پگوڈا) وہ باقاعدہ اقساط میں ادا کی جائے گی اور ادا نہ کرنے کی صورت میں کمپنی ریاست کے مخصوص کردہ علاقے میں سے کسی ایسے علاقہ پر قبضہ کرلے گی جس کی آمدنی مطالبہ کی مساوی ہو اور اگر ایسی صورت پیش آئے تو نواب اپنے تمام ملازم واپس بلالیں اور ہر علاقہ میں ایک ایک آدمی چھوڑ دیں تاکہ وہ اس علاقے کی آمدنی اور وصولیابی کے حساب کمپنی کے ملازموں سے سمجھ لے۔

جب ان علاقوں پر قبضہ کیا جائے گا تو ان کی آمدنی وصول طلب رقم میں سے منہا کر دی جائے گی اور جب تک کمپنی کی اقساط کا بقایا اور دیگر اشخاص کا قرضہ ادا نہ ہو جائیگا کمپنی کا قبضہ برقرار رہیگا۔ بعد ازاں یہ علاقے واپس دیدئے جائیں گے۔ اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ پیشکش یا خراج کی رقم کے علاوہ (۶۳۵۲۹۵) پگوڈا کی جو رقم فوجی مصارف کے لئے طے پائی ہے اگر اس کی سالانہ اقساط کی ادائی پابندی سے نہ ہوئی تو مخصوص شدہ

۹۸ صاف بھی ہو گئے لیکن سابق معاہدے کے نقائص میں سے ایک بھی اس سے رفع نہ ہو سکا۔

یہ جدید معاہدہ سابق عہد نامے سے ایک خاص اہم معاملہ میں مختلف تھا اس کی ایک دفعہ کی رو سے طے پایا کہ کسی بیرونی طاقت سے جنگ ہونے کی صورت میں کرناٹک کے اندر ایک سرتاپا نئی طاقت کی حکومت قایم ہو گی۔

(۹۹) اختیارات کی جو تبدیلی ۱۷۸۷ء کے معاہدے میں مشروط تھی، ۱۷۹۲ء کے معاہدے سے ناطق ہو گئی لہذا نواب یا اس کے جانشین کی حکومت کی اصلاح اور ریاست کے معقول انتظام سے فریقین کو استفادہ حاصل کرنے کی جو کچھ رہی سہی امید تھی وہ بھی اس اہم تبدیلی سے منقطع ہو گئی۔ سابق معاہدے کی طرح اس میں بھی خود غرض اور بدکردار مشیروں کو نواب پر اثر ڈالنے اور سخت گیر سفاکوں اور سود خواروں کو ابھارنے کی گنجائش رہی اور یہ ظاہر تھا کہ مثل سابق کے یہ لوگ ہر ممکن طریقہ سے نواب کو ابھارتے رہیں گے کہ وہ اپنی آمدنی کی کفالت پر روپیہ لے کر یا اپنی ریاست کا کوئی حصہ علیحدہ کر کے حتی الوسع اپنے ذاتی اقتدار میں فرق نہ آنے دیں۔

لارڈ کارنوالس نے اس زمانے میں جو مراسلے لکھے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے اس معاہدہ کی سرسبزی کی قوی امید تھی لیکن انگلستان کے حکام بالا کو اس کی رائے سے اتفاق نہ تھا؛ انھیں کامل یقین تھا کہ اس معاہدے سے جو توقعات قائم کئے گئے تھے وہ ہرگز پورے نہ ہو سکیں گے لہذا انھوں نے ابتدا ہی سے اس میں ترمیم کرنے کی ہدایت کی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) علاقوں میں سے کسی ایسے ایک یا ایک سے زائد علاقے پر جس کی آمدنی بقایا کے مساوی ہو کمپنی قبضہ کرے گی اور اس علاقے یا ان علاقوں کو بعد میں کبھی واپس نہیں کیا جائے گا۔ نواب نے وعدہ کیا کہ اگر وہ اپنا اقتدار قائم رکھنے یا اندرونی امن برقرار رکھنے کے لیے کبھی کمپنی کی امداد حاصل کریں گے تو ان مقررہ رقوم کے علاوہ آئندہ کے مصارف علیحدہ ادا کریں گے۔

نواب وزیر اودھ سے جدید معاہدہ

لارڈ کارنوالس نے نواب وزیر اودھ سے جو معاہدہ کیا اس کی نوعیت سمجھنے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس 100 معاہدے سے قبل کمپنی کے اس فرمانروا سے جو تعلقات تھے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

عہدنامہ فیض آباد کی رو سے جو نواب وزیر آصف الدولہ نے اوائل ۱۷۷۵ء میں اپنی مسند نشینی کے بعد کیا تھا۔ بنارس، غازی پور اور چنار کمپنی کے تحت آ گئے تھے اور یہ قرار پایا تھا کہ اودھ، کڑہ اور الہ آباد کی حفاظت کے لئے کمپنی کی باقاعدہ فوج کا ایک دستہ نواب وزیر کی ریاست میں رکھا جائے اور اس کے قیام کے زمانے میں نواب وزیر اس کے اخراجات ادا کریں اسی سلسلے میں یہ بھی قرار پایا تھا کہ اگر کسی دوسرے علاقے کی حفاظت کے لئے زائد فوج درکار ہو گی تو اس کے اخراجات علیحدہ لئے جائیں گے۔ اور انھیں ضرورت کے وقت طے کر لیا جائے گا۔

اس عہدنامے کے چند ماہ بعد ہی ریاست کی بدامنی اور فوج کی بے قاعدگی اور بدنظمی کی وجہ سے نواب آصف الدولہ نے گورنر جنرل سے درخواست کی کہ اسے چند انگریز افسر دیئے جائیں جو چھ فوجی بٹالین کی کمان لے سکیں اور ان کے ساتھ ایک توپ خانہ اور اسی کی مناسبت سے کچھ سوار فوج بھی مہیا کیجائے۔ اس درخواست کے ساتھ اس نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ یہ جماعت اس کی باقی فوج کو مطیع رکھ سکیگی اور اس کی حکومت کو اس سے بہت تقویت پہنچیگی۔ توپخانے اور سوار فوج کی ترتیب پورے طور سے انگریزی حکومت کی مرضی پر چھوڑ دی اور وعدہ کیا کہ ان کی تنخواہ کے باقاعدہ ادا ہونے کا انتظام کر دیا جائے گا۔

(101) اس طور سے جو فوج تیار کی گئی اُسے ۱۷۷۷ء میں کمپنی کی فوج میں شامل کر کے فرخ آباد میں رکھ دیا گیا۔ نواب کی خدمت کے لئے جو باقاعدہ فوج کانپور میں رکھی گئی تھی، اس سے اسے ممتاز کرنے کے لئے اس کا نام عارضی فوج رکھا گیا۔ اور نواب وزیر کے ذمے اس کے اخراجات تقریباً تیس لاکھ سالانہ ہوئے۔ جب یہ عارضی فوج تیار ہو گئی تو نواب وزیر کو مطلع کر دیا گیا کہ [illegible]

انھیں اس فوج کی ضرورت رہیگی اُس کے پورے اخراجات اُن کے ذمے ہوں گے لیکن نظماء نے اس شرط کو منظور نہیں کیا۔ انھوں نے لکھا کہ" اگر اس شرط کا منشایہ ہو نواب وزیر کو آزادی حاصل ہو گی کہ جب وقت وہ چاہیں ان افواج کو برخاست کر دیں تو ہمارے نزدیک یہ ایک خطرناک شرط ہے اور اس کی وجہ سے آئندہ سخت وقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور اگر اُس کے معنے کچھ اور ہیں جو الفاظ سے ظاہر نہیں ہوتے اور تمھارا منشائیہ ہے کہ اول تم اپنے اثر کے زور سے نواب کو اس تجویز کے قبول کرنے پر مجبور کرو اور بعد میں اپنی مرضی کے موافق اس فوج کو وہاں برقرار رکھو تو ہمارے نزدیک تمھاری نیت سخت خراب ہے۔ اور یہ بات انصاف کے خلاف ہے اور اس قسم کے طرز عمل سے کمپنی کے نام پر بٹہ لگ جائے گا۔"

جن دقتوں کا نظماء نے اندازہ کیا تھا وہ بہت جلد پیش آگئیں ۱۷۷۹ء (۱۰۲)
میں یعنے اس معاملے کے دو سال بعد ہی نواب وزیر نے کہا کہ بارش کی قلت کی وجہ سے اس کی آمدنی میں سخت کمی واقع ہو گئی ہے لہذا وہ ان افواج کے اخراجات اور کمپنی کے دیگر مطالبات کو ادا کرنے سے معذور ہے اور اگرچہ کمپنی کا کُل مطالبہ ایک کروڑ چھتیس لاکھ بارہ ہزار ایک سو اکتالیس ہے وہ اڑسٹھ لاکھ بیاسی ہزار سے زائد رزیڈنٹ کو ادا نہیں کر سکتا۔[1] رزیڈنٹ نے اس معاملے کی اطلاع بنگال روانہ کرتے وقت نواب وزیر کا خط بھی بھیجدیا اس خط میں نواب نے کمپنی کے ساتھ اپنے اخلاص و اتحاد کا ذکر کرکے اس بات کی توقع ظاہر کی تھی کہ کمپنی اس کی مصیبت پر ترس کھا کر اسے فرخ آباد کی فوج کے بار سے نجات دلا دے گی جو اُس کی ریاست کے لئے محض بیکار ہے اور جس کی وجہ سے اس کی آمدنی کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس نے چند اور فوجی دستوں کی علٰحدگی کی بھی درخواست کی تھی جو یورپین افسروں کی کمان میں تھے۔ کیونکہ اس کے نزدیک ان کا خرچ بہت اور فائدہ کم تھا۔

حکومت بنگال نے اپنی رائے ظاہر کی کہ نواب کے مطالبات کو پورا کرنے سے کمپنی کو نیز نواب کے مفاد کو سخت نقصان پہنچیگا۔ یہ بات

[1] مورخہ ۲۹ نومبر ۱۷۷۹ء

صاف ظاہر ہے کہ جب نواب کے پاس اپنے علاقے میں امن برقرار رکھنے
کے لئے بھی کوئی ذرائع نہیں تو وہ اپنی ریاست کو مرہٹوں کے خطرے سے ۱۰۳
جن کا ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا ہے اور جن سے عنقریب جنگ چھڑتی نظر آتی ہے
کس طرح بچا سکیگا۔ اس خیال کی بناء پر رزیڈنٹ کو ہدایت کی گئی کہ وہ حسب
قرارداد کل رقم کے فوری ادا کئے جانے پر ہی اصرار نہ کرے بلکہ نواب وزیر
کو آگاہ کردے کہ ان افواج کا برقرار رکھنا اس کا خاص فرض ہے۔ یہ محض اسکی
حفاظت کے لئے ترتیب دی گئی تھیں اور موجودہ حالات میں ان افواج کے ایک
حصے کو بھی برخاست کرنا خود اس کے لئے بھی اتنا ہی نامناسب ہے جتنا کہ کمپنی
کے لئے اس تجویز کو منظور کرنا۔

گورنر جنرل نے خود بھی نواب وزیر کو ایک خط لکھا اور اس میں ان تمام
مضر اثرات کو جو اس تجویز کے منظور کرنے سے رونما ہو سکتے تھے، نہایت پرزور
الفاظ میں تحریر کیا۔ اس نے اس بات کو صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ جس وقت
آپ نے جدید فوج کا مطالبہ کیا تھا اُس وقت اس بات کا گمان بھی نہیں کیا
جا سکتا تھا کہ کمپنی اتنی بڑی فوج تیار کرنے اور حسب ضرورت اس کے لئے افسروں
کی ایک کثیر تعداد کے تقرر کی زحمت اس لئے گوارا کرے گی کہ آپ بغیر اطلاع اور
بلا مہلت دئے اور بلا کمپنی کی اجازت کے جس وقت چاہیں گے اسے برخاست
کر کے اس کا سب بار اور ان سب افسروں کے مصارف ایک دم سے کمپنی پر
ڈال دیں گے۔ اس نے نواب صاحب کو صاف طور پر جتلا دیا کہ اگر آپ کمپنی سے
رشتہ اتحاد توڑنا اور اس کی اعانت سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں تو آپ
اپنے ارادوں کی اطلاع ایسے وقت میں دیں جب کہ کمپنی کو اس سے کوئی (۱۰۴)
نقصان نہ پہونچے اور آخر میں لکھ دیا کہ "میں ایسے نازک وقت میں اور اسقدر
فاصلے پر فوجوں کی علیحدگی کی منظوری نہیں دے سکتا۔ اگر اب یہ افواج درکار نہیں تو
آپ سے توقع کی جاتی ہے کہ آپ ان کی علیحدگی کے لئے اتنا وقت ضرور
دیں گے جتنا کہ اُن کی تیاری میں صرف ہوا تھا"۔ مسٹر ہیسٹنگز نے اس خط کو
ان الفاظ پر ختم کیا کہ "اگرچہ بدقسمتی سے فصل خراب ہوئی ہے تاہم مجھے اس امر کا

یقین ہے کہ باوجود اس کے آپ کے پاس اس فوج کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے جو آپ کی ریاست کی حفاظت کے واسطے نہایت ضروری ہے، کافی رقم موجود ہے۔" اس نے اصرار کیا کہ کمپنی کے جملہ مطالبات ادا کئے جائیں اور اگر ضرورت پڑے تو اُن کی تکمیل کے لئے ریاست کی فوج کا ایک حصہ علیحدہ کر دیا جائے یا اوس کی تنخواہ روک لیجائے۔

جن اہم مجبوریوں اور ضرورتوں کی وجہ سے برطانوی حکومت کو نواب وزیر کے تجاویز نامنظور کرنا پڑے، ان میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہی لیکن ایک ایسے اعانتی معاہدے کی خرابیاں جس کے شرائط نامکمل ہوں اور جسکی تنسیخ کا مدار ایک بڑی حد تک ایک ہندوستانی فرمانروا کی مرضی پر ہو شاید ہی کبھی اس سے زیادہ نمایاں ہوئی ہوں۔ اس وقت غالباً مسٹر ہیسٹنگز کے سے شخص کی دانشمندی و مستقل مزاجی اور فیصلہ کن طبیعت کی ضرورت تھی جو عوام کے ۱۰۵
مفاد کو اُن تمام خطرات سے محفوظ رکھ سکے جو اس موقع پر ایک ایسے کمزور اور دوباشش فرمانروا کی اس حرکت سے پیدا ہو گئے تھے جو بدکردار اور سازشی لوگوں کے زیر اثر اپنے خواہشات نفسانی کی خاطر یا کسی عارضی مقصد کے حصول کے لئے اپنے ملک کو نیز اُس طاقت کے مستقل مفاد اور ذرائع حفاظت کو جو اُس سے وابستہ ہو گئے تھے نثار کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا تھا۔

نواب وزیر نے اس وقت تو گورنر جنرل کے دلائل طوعاً و کرہاً تسلیم کر لئے اور خاموش ہو گیا لیکن موقع ملتے ہی اُس معاملے کو دوبارہ چھیڑ دیا۔ اور جب چیت سنگھ کے خلاف برطانوی حکومت کو مدد دے کر اس نے اپنے اخلاص کا کامل ثبوت دے دیا تو وارن ہیسٹنگز سے درخواست کی کہ وہ اُس معاملے کی طرف اپنی توجہ مبذول کرے۔ اس نے بھی بہ نسبت پہلے کے نواب کو زیادہ نیک نیت سمجھا اور ۱۹ ستمبر ۱۷۸۱ء کو اس سے ایک جدید معاہدہ کر لیا۔ اس میں یہ قرار پایا کہ عارضی فوج کمپنی کے حدود میں واپس بلا لیجائے اور سیبندی افواج[1]

[1] وہ افواج جن سے محض مالگزاری وصول کرنے کا کام لیا جائے۔

ہیں جو انگریزی افسروں کی کمان میں ہیں تخفیف کی جائے اور نواب وزیر سے صرف سابق[1] فوج اور اس کے ساتھ ایک زاید[2] فوجی دستے کے مصارف لئے جائیں جو لکھنؤ میں رزیڈنٹ کے پاس رکھا جائے اور اگر آئندہ کسی موقع پر نواب وزیر کو زاید فوج درکار ہو تو وہ اُس کی حقیقی تنخواہ اور بھتہ اس کے دریا کرمناسا عبور کرنے کے بعد سے ادا کریں۔ ١٠٦

ان سب شرائط کی تکمیل ہو گئی لیکن سب سے اہم شرط جو عارضی فوج کی واپسی کے متعلق تھی وہ اب بھی پوری نہ ہوئی ہیسٹنگز نے اس کے لئے یہ عذر پیش کیا کہ مجبوراً چند سیاسی امور میں منہمک رہنے کی وجہ سے وہ اس طرف توجہ نہ کر سکا۔ اس مراسلے میں وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ جب ۱۷۸۴ء میں لکھنؤ پہونچکر اُس نے نواب وزیر سے دوسرا معاہدہ کیا تو اس میں بھی فرخ آباد سے فوج واپس بلانے کا وعدہ کیا اور لکھنؤ کے رزیڈنٹ کو اس کے متعلق احکام بھی دے دیئے لیکن کلکتے پہونچکر مجلس کے ارکان کو قطعی اسکے خلاف پایا۔ (چونکہ اس کی واپسی کا زمانہ قریب تھا) لہٰذا اُس نے اپنا فرض سمجھکر محض اس کی تکمیل کا خیال ہی ترک نہ کیا بلکہ اپنی اس تحریک ہی کو منسوخ کر دیا چونکہ یہ اُس کا ذاتی حکم تھا اس لئے اسے خیال ہوا کہ اس تحریک کو کہیں اس کی مخالفت پر محمول نہ کر لیا جائے اور اس کی وجہ سے اس کے (١٠٧) جانشین کی حکومت پر کوئی مضر اثر نہ پڑے۔

سر جان میکفرسن کے مختصر دور میں کمپنی اور اودھ کے تعلقات میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی لیکن اس تاخیر نے نواب وزیر کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے زیادہ بے چین کر دیا اور لارڈ کارنوالس کے ہندوستان پہونچتے ہی نواب آصف الدولہ نے اپنے قابل اور معتبر وزیر حیدر بیگ خاں کو وزارت دے کر روانہ کیا تاکہ وہ نواب کی حالت سے اسے آگاہ کرے اور اس بیجا بار سے

[1] اس کے مصارف دو لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ ماہانہ قرار پائے۔

[2] اس کے مصارف پچیس ہزار ماہانہ طے ہوئے۔

اسے کسی قدر نجات دلانے کا انتظام کرے۔

اس گفت و شنید کی نوعیت اور اس کے نتائج کو کارنوالس نے اپنے مراسلے مورخہ ۳۰ اپریل ۱۷۸۷ء میں توضیح سے بیان کیا ہے اور جن اصول کے تحت اس نے اس دقیق اور اہم معاملے کے متعلق آخری سمجھوتہ کیا، انھیں بھی تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

نواب وزیر نے حیدر بیگ خاں کی معرفت اس امر کی توقع ظاہر کی تھی کہ وارن ہیسٹنگز نے جو معاہدہ اس سے لکھنؤ میں کیا تھا اس کے مطابق انگریزی حکومت اپنی فوج فرخ آباد سے واپس بلالے گی لیکن کارنوالس نے اپنی رائے میں اس فوج کا قیام نواب وزیر اور کمپنی دونوں کے مفاد کے لئے ضروری سمجھا۔ اس موقع پر گورنر جنرل نے جو خط نواب وزیر کو لکھا اس میں اس فوج (۱۰۸) کو بدستور برقرار رکھنے کے مقاصد بیان کیے اور جن اصول کی بنا پر اس نے یہ طرز عمل اختیار کیا تھا۔ اپنے متعلقہ مراسلے میں انکا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ "میں صرف یہ کہونگا کہ میرے نزدیک تنہا کانپور کی فوج نواب وزیر کی سرحد کی حفاظت کے لئے کافی نہیں ہے اگرچہ اس وقت کسی خاص فوری خطرے کا اندیشہ نہیں تاہم ممکن ہے کہ فتح گڈھ کی اسقدر بڑی فوج کو واپس بلالینے سے کوئی حادثہ پیش آجائے۔ یہ بات عیاں ہے کہ نواب وزیر کی فوج میں نہ کوئی تنظیم ہے اور نہ وہ اندرونی امن قائم رکھنے کے لئے کافی ہے۔ کمپنی کی فوجوں کو جو اعزاز حاصل ہے محض اس کی بدولت اس کی رعایا مطیع اور وفادار نظر آتی ہے۔ نواب وزیر کا جو رویہ ہے اور ان کے بیجا مصارف کا جو ڈھنگ ہے اور ذرائع آمدنی کی طرف ان کی جو غفلت ہے اور بجز عارضی خواہشات نفسانی کے دیگر معاملات سے جو بے اعتنائی ہے اس کی وجہ سے اُن سے اس بات کی ہرگز توقع نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنی ریاست کو کسی بیرونی حملے یا اندرونی شورش سے بچاسکیں گے۔

فتح گڈھ کی فوج کی بابت جو روپیہ ہم نواب وزیر سے وصول کرتے ہیں وہ اس رقم سے کہیں زیادہ ہے جس کے ہم مجلس نظما کے احکام کے بموجب مستحق ہیں

(۱۰۹) لیکن اب جو انتظامات اس مراسلت کے ذریعہ سے قرار پائے ہیں ان کے مقاصد کی اہمیت کے مقابلے میں یہ زائد رقم کچھ بھی نہیں۔"

اسی مراسلے میں لارڈ کارنوالس تحریر کرتا ہے کہ سابق نوسال کی مدت میں جملہ رقم جو مختلف مدوں میں نواب نے ادا کی ہے اس کا اوسط چوراسی لاکھ سالانہ ہے حالانکہ ۱۷۷۵ء و ۱۷۸۱ء کے معاہدوں میں نواب نے صرف اکتیس لاکھ اکیس ہزار اور چونتیس لاکھ، بیس ہزار سالانہ کمپنی کو ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

گورنر جنرل اس سلسلے میں یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ حیدر بیگ خاں سے جو معاہدہ ہوا ہے اس کی رو سے اب جملہ مطالبات پچاس لاکھ سالانہ ہو گئے ہیں اور مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اودھ کے تعلقات کی وجہ سے جو اخراجات بھی کمپنی کو برداشت کرنے پڑیں گے ان کی تکمیل اس رقم سے ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ اس رقم کے سالانہ ادا کرنے میں نہ نواب کو کوئی دقت پیش آئے گی اور نہ اس کی وجہ سے اس کے اعزاز میں کچھ فرق آئے گا۔

حیدر بیگ خاں نے اس انتظام کو یہ کہہ کر تسلیم کر لیا کہ "مجھے برطانوی حکومت کے انصاف پر کامل اعتماد ہے کہ وہ میرے آقا کی بہتری کا لحاظ کرے گی اور فوج کا بار کم کرنے کی غرض سے کسی اور مناسب موقع پر جب مصلحت یا سہولت اجازت دے وہ کمپنی کی فوج کا ایک حصہ بھی واپس بلالے گی۔"

حیدر بیگ خاں نے جس بات کی توقع ظاہر کی تھی اس کی بابت لارڈ
۱۱۰ کارنوالس نے بھی اپنے خط میں نواب وزیر کو اطمینان دلایا۔ لیکن اپنی یادداشت میں وہ تحریر کرتا ہے کہ میرے نزدیک شاید ہی کبھی ایسا موقع آئے جبکہ مصلحت اس کی اجازت دے سکے۔

اسی فاضلانہ مراسلے میں کارنوالس نے اودھ اور کمپنی کے تعلقات کی نوعیت پر بحث کی ہے اور اس طرز عمل کو واضح کیا ہے جو اس کے نزدیک انگریزی حکومت کو اپنا فرض سمجھ کر نواب سے تعلقات بڑھانے اور اتحاد مستحکم کرنے کے لئے اختیار کرنا چاہئے۔

وہ لکھتا ہے کہ جن اصول پر اب اودھ اور کمپنی کے تعلقات کی بنیاد رکھی گئی ہے انھیں کی بدولت وہ مستقل و مستحکم ہو سکتے ہیں۔ ہم اس کی ریاست کی حفاظت اپنے ذمے لیتے ہیں اور اس کے عوض وہ اُن حقیقی مصارف کے ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہے جو ہمیں اس معاہدے کی وجہ سے جو خود اس کی ذات کے لیے بہت اہم ہے لاحق ہوں۔ حکومت کے اندرونی معاملات تنہا اس پر چھوڑ دیے گئے ہیں اور جو معاہدہ نواب نے کیا ہے جب تک وہ اُس کے شرائط کی پابندی کرتا رہے گا، میری کوشش برابر اس انتظام کو برقرار رکھنے کی رہے گی۔"

"لیکن نواب وزیر کی حکومت کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کے یہ معنے نہیں کہ ضرورت کے وقت مجھے یا مجلس کو اس کی حکومت کے معاملات میں رائے دینے یا کسی خاص ایسے انتظام کو پیش کرنے کا جو دونوں حکومتوں کے
(١١١) مفاد کے لئے اہم ہو اختیار نہ ہوگا۔

باہمی سہولتوں کی غرض سے اکثر اس قسم کے تجاویز پیش کرنے کی ضرورت ہو سکتی ہے اور صرف ایسے ہی مواقع پر انھیں پیش بھی کرنا چاہیے۔

میرا خیال ہے کہ بورڈ بھی اس بات کو محسوس کرے گا کہ اس میں نواب حیدر بیگ خاں یا جو کوئی بھی وزارت کا کام انجام دے اسے مدد دینی ضرور ہوگی۔ اس وقت نواب وزیر کو اُس پر کامل اعتماد ہے اور تنہا وہی اپنے آقا کے لئے ہماری حکومت کی اعانت حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ میں نے بلا کسی پس و پیش کے نواب حیدر بیگ خاں کو یقین دلا دیا ہے کہ جب تک وہ اپنے آقا کے ساتھ وفادار رہے گا اور انصاف و انسانی ہمدردی کو ملحوظ رکھکر ریاست کی خدمت انجام دے گا۔ اور کمپنی کے معاہدوں کی سختی سے پابندی کرتا رہے گا وہ ہماری حکومت کی اعانت پر کامل اعتماد کر سکتا ہے"

لارڈ کارنوالس نے جو کچھ معلومات بہم پہونچائے تھے اُن سے اُسے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ جہاں تک نواب وزیر کی ذات کا تعلق ہے اُسے اس بات کا احساس کبھی نہیں ہو سکتا کہ جو اخلاص و اتحاد اب دونوں حکومتوں میں قائم ہو گیا ہے اسے برقرار رکھنے کی غرض سے حیدر بیگ خاں اور اُس کے

ہم خیال اور ہم پلّہ اشخاص کی جو اس اتحاد کے حامی ہوں امداد کرنا اشد ضروری
ہے۔ اس بارے میں کارنوالس نے اپنے جو خیالات قلمبند کئے ہیں اُن سے
واضح ہے کہ اگر کوئی موقع پڑتا تو عدم مداخلت کے مسلک سے انحراف کرنے کی (۱۱۲)
اہم ذمہ داری اسے کسی ایسے فیصلہ کن اور عملی کام کے انجام دینے سے ہرگز نہیں
روک سکتی تھی جو اُس کے نزدیک فوری واقعات کے لحاظ سے اس ریاست کے
مفاد و استحکام بڑھانے کے لئے جو اُس کے تفویض کی گئی تھی ضروری ہوتا۔ اس بارے
میں اُس کے جو ارادے تھے اور جن دلائل پر وہ مبنی تھے وہ سب اس کے اُس
فاضلانہ مراسلے میں درج ہیں جس کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے۔
وہ لکھتا ہے کہ "ارکان مجلس خوب واقف ہیں کہ اودھ میں حکومت کا کُل
کام وہاں کے دیوان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ نواب وزیر صاحب تو اپنے ملازموں
کے کاموں کی تائید کرنے اور کاغذات پر دستخط کرنے کے سوا کچھ کرتے ہی
نہیں۔ انھیں کام کے نام سے اس قدر نفرت ہے کہ اس قسم کی معمولی ضابطے کی کارروائی
بھی وہ بدقت تمام اور طوعاً و کرہاً ہی کرتے ہیں۔ انتہا درجے کے تو وہ اوباش ہیں
لیکن اس کی کبھی پروا نہیں ہوتی کہ ان کے ان مشاغل کے لئے روپیہ آئے گا کہاں سے
لہٰذا ایسی حالت میں کمپنی کو اپنے معاہدوں کی تکمیل اور پابندی کے لئے بجائے
نواب وزیر کے دیوان پر بھروسا کرنا چاہیئے لیکن یہ بیچارہ نواب صاحب کے
تلوّن اور دوسروں کی سازشوں کا نشانہ بنا رہتا ہے لہٰذا یہ اندازہ بھی نہیں کیا
جا سکتا کہ حیدر بیگ خاں اپنا اثر نواب وزیر پر کب تک قائم رکھ سکتا ہے۔"
جن مشکلات کا اسے اس حیثیت میں رہ کر مقابلہ کرنا پڑتا ہے وہ بیشمار ہیں
اور اگر نواب وزیر کے متعلق میری رائے صحیح ہے تو اس کے لئے دو متضاد
باتوں کو یکجا کرنا یعنی ایک طرف نواب صاحب کی عنایت و اعتماد حاصل کرنا اور (۱۱۳)
دوسری طرف ریاست میں ایسا نظم و نسق قائم رکھنا جو حقیقی معنوں میں فرمانروا کے
مفاد کے لئے مفید ہو، نہایت دشوار ہوگا۔ میں اب اس پر کچھ تبصرہ کرنا نہیں چاہتا
بس میری تو یہ دعا ہے کہ کوئی ایسا موقع ہی پیش نہ آئے جب کہ اس حکومت
کو نواب اور اس کے وزیر کے تعلقات میں مداخلت کرنی پڑے یا دیوان کو

اس کے خلاف امداد دینی پڑے۔"

لارڈ کارنوالس کے زمانے میں اودھ سے بھی ایک اہم معاہدہ ہوا اور اس کے بھی چند خاص پہلو ہیں جس حد تک کہ نواب آصف الدولہ کی ذات سے توقع ہو سکتی تھی وہاں تک تو اس کے نتائج اچھے رہے لیکن اس کے تساہل اس کے بیجا مصارف اور نازیبا مشاغل کی وجہ سے معاملات میں متواتر مشکلات پیش آتے رہے اور معاہدے کی تکمیل میں اس کی طرف سے اکثر رکاوٹ بھی پیدا ہوئی۔ جب اس کی ریاست میں کامل امن قائم ہو جاتا تھا جو اس اتحاد کی خوبی کا ثبوت ہوتا تھا اسی وقت وہ کمپنی کی اعانت وحمایت کی قدر بھول جاتا تھا۔

لارڈ کارنوالس کے دور کا آخری زمانہ

لارڈ کارنوالس کے دور کے آخری سال تک برطانیۂ عظمیٰ اور فرانس میں صلح رہی اور گورنر جنرل ہندوستان کی پوری برطانوی قوت سے ٹیپو کے خلاف کام لے سکا اور ان تمام فوجی اخراجات میں کمی کر سکا جو فرانسیسیوں کے حملے کے خوف
(۱۱۴) سے غیر محفوظ سرحد کی حفاظت یا فرانس اور اس کے حلیفوں کے مقبوضات اور نوآبادیات کے خلاف جنگ کی تیاری میں صرف ہوتے رہتے تھے۔

جب فرانس سے جنگ چھڑنے کی خبر ہندوستان پہونچی تو فوراً پانڈیچری پر حملہ کیا گیا اور فورٹ سینٹ جارج کی فوجوں نے جو مدراس کے سپہ سالار سرجان بریتھویٹ (Sir John Braithwaie) کی کمان میں تھیں اس پر قبضہ کرلیا اور خود فوج کی کمان لینے کی غرض سے مارکوئس کارنوالس بہ عجلت ممکنہ فورٹ ولیم سے روانہ ہوا لیکن ساحل پر پہنچنے سے قبل ہی وہاں کام مکمل ہو چکا تھا۔ وہاں سے وہ بنگال واپس ہوا بلکہ اگست ۱۷۹۳ء میں انگلستان روانہ ہو گیا۔

کارنوالس کی حکومت پر ایک نظر

برطانوی حکومت کے کاموں میں جو غیر معمولی کامیابی لارڈ کارنوالس کے دور میں حاصل ہوئی اسے بلاشبہ زیادہ تر اس کے مردانہ جوش، اس کے عزم بالجزم اور صحیح قوت فیصلہ پر جو اس کے خصوصیات تھے محمول کرنا چاہئے لیکن

اگر ہندوستان کی سابق تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو اُس کا سب سے بڑا راز ان دیوانی و فوجی اختیارات میں ملتا ہے جو ۱۷۸۴ء کے قانون سے گورنر جنرل کو حاصل ہوئے تھے ان اختیارات کی وجہ سے وہ تفرقوں کو مٹا کر اور منتشر قوتوں کو متحد کر کے حکومت کے ہر شعبے سے فائدہ اٹھا سکا۔ فورٹ سینٹ جارج اور بمبئی کی زبردست حکومتوں پر اس نے براہ راست نگرانی کی اور ان کے معاملات کو اپنے تحت لا کر مثل بنگال کے اُن کے ذرائع پر بھی قدرت حاصل کی۔

(۱۱۵) ہندوستان کے نوابوں اور راجاؤں پر اس کے ذاتی کیریکٹر اور اقتدار کا جو رعب پڑا تھا وہ اُس کے غیر معمولی اختیارات سے اور بھی جم گیا برطانوی قوم کے اعلیٰ اقتدار اور اس کے رعب اور دبدبے کا جیسا سکہ اُن کے دلوں میں اُس وقت بیٹھا تھا ویسا آج تک کبھی نہ ہوا تھا۔ جس خوبی سے اُس نے برطانوی حکومت کی قوت اور اُس کے ذرائع کو ٹیپو کے خلاف استعمال کیا اُس سے خوف و رعب اور تحیر دونوں پیدا ہوئے اور جنگ کی سربری اور حدود کی توسیع اور شہرت و قوت کے اضافے سے ہندوستان کی سب ریاستیں بے ساختہ آفریں پکار اُٹھیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ خوف زدہ بھی ہو گئیں یہ سب حقیقی واقعات کے نتائج تھے۔ ان کے اثرات کو نہ کسی اعتدال سے زائل کرنا ممکن تھا اور نہ مناسب کیونکہ اسی میں برتری اور اعلیٰ اقتدار کی شان تھی اور اسی سے درحقیقت سب گھبراتے تھے۔

برطانوی ہند میں جو اہم انقلابات ظہور پذیر ہو رہے تھے ان کے امکانی نتائج و اثرات سے حکام بالا انگلستان میں غافل نہ تھے۔ انھوں نے (شاید افسوس کے ساتھ) یہ محسوس کر لیا کہ واقعات نے جو اُن کے قابو سے باہر تھے

(۱۱۶) گورنر کو اُس صلح و آشتی اور عدم مداخلت کے مسلک سے منحرف کر دیا جسے وہ قابل عمل سمجھتا تھا اور جس کی پابندی اُس نے اس پر لازم کی تھی۔ اور اپنے مفاد کا جو معیار اور اندازہ انھوں نے خود قائم کیا تھا اُس کے خلاف اُس دور میں ان کے مقبوضات بڑھ گئے اور سیاسی تعلقات وسیع ہو گئے۔

لارڈ کارنوالس کو جن مجبوریوں کی وجہ سے حکومت اعلیٰ کے مسلک اور خواہشات کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنا پڑا، اُن کا اعتراف کر لینے کے یہ معنی نہیں کہ اس قسم کے واقعات سے ایسے ہی نتائج دوبارہ بھی ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ انگلستان میں اس وقت عام خیال یہ تھا کہ کارنوالس کی جد و جہد کی بدولت کمپنی اس پایۂ استحکام پر پہونچ گئی جس کی ایک مدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور اب برطانوی ہند میں فروغ کے اسباب مہیا کرنے اور کامل امن قایم رکھنے کے لئے مقامی حکومتوں کو بجز اعتدال پسند اور صلح کن مسلک اختیار کرنے کے کسی اور چیز کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جب ہم ہندوستانی ریاستوں کی حقیقی حالت پر نظر ڈالتے ہیں جو اُن مراسلات میں درج ہے جن کا حوالہ لارڈ کارنوالس کے دور کی اس مختصر کیفیت میں دیا جا چکا ہے تو یہ غلط فہمی انوکھی اور نرالی معلوم ہوتی ہے۔

تیسرا باب

سر جان شور کی حکومت

سر جان شور، مارکوئیس کارنوالس کی جگہ ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ وہ کمپنی کے ملازمین میں ایک ذی اقتدار سول عہدہ دار تھا۔ اُس کے متعدد خدمات کی وجہ سے نظماء اس سے خوب واقف ہو گئے تھے اور اُس پر اُن کی خاص عنایت بھی تھی۔ اندازہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں حکام (۱۱۸) ۱۷۹۳ء کمپنی کا یہ خیال تھا کہ لارڈ کارنوالس نے جو اہم کام انجام دیئے تھے وہ سب اُس کے جانشین کی مقامی واقفیت اور محنت و قابلیت سے مکمل ہو جائیں گے اور ان میں اضافہ بھی ہو جائے گا۔

ہندوستان کی عام حالت

سر جان شور کے جائزہ لیتے وقت ہندوستان کی مختلف سلطنتوں کی جو حالت تھی اس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے اُس سے یہ توقع نہیں کیجا سکتی تھی کہ کمپنی کو کچھ مدت دراز تک جنگ سے نجات مل سکیگی۔ لیکن دوسری طرف خود کمپنی کے معاملات ہر لحاظ سے صاف تھے اور اُسے کوئی خطرہ درپیش نہ تھا۔ حکومت برطانیہ کی فوجی طاقت اور مالی حالت اس سے بہتر کبھی نہ تھی۔

اس کے خاص دشمن ٹیپو کی طاقت میں بہت کچھ کمی ہو گئی تھی۔ اس کے حلیفوں میں صوبہ دار دکن کا رتبہ سب سے بڑھا ہوا تھا اور وہ اپنے معاہدوں بلحـ

قایم تھا اور کمپنی نے اُس سے جو دوستانہ تعلقات قایم کئے تھے وہ انھیں برقرار رکھنے اور بڑھانے کی طرف راغب تھا اگرچہ مرہٹے حسد کی وجہ سے کمپنی کی نمایاں کامیابی۔ اس کے حدود اور سیاسی تعلقات کی ترقی سے بھڑک رہے تھے تاہم اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور خوف کی وجہ سے اس بات کی احتیاط رکھتے تھے کہ کمپنی کے خلاف کوئی بات نہو۔ اس جگہ یہ غور کرنا ضروری ہے کہ سرجان شور نے اپنا فرض سمجھکر جو مسلک اختیار کیا اُس کا اس حالت پر کیا اثر پڑا اور دیسی ریاستوں میں کمپنی کی جو وقعت قایم ہو گئی تھی اور جس کی اہمیت برطانوی سی شہنشاہی میں فوجی طاقت سے بھی کہیں زیادہ تھی وہ اس کے طرز حکومت سے کس حد تک گر گئی۔ اگرچہ سرجان شور نے کسی جنگ میں شرکت نہیں کی تاہم اس کی حکو (۱۱۹) ۱۷۹۵ء
کی وجہ سے ہندوستان میں اہم سیاسی انقلابات ہو گئے۔ ان انقلابات کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے کیونکہ بغیر اس کے ان واقعات کا کوئی صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا جو ان انقلابات کے بعد یا ان کی وجہ سے واقع ہوئے۔ ان میں سب سے اہم سیاسی واقعہ سلطنت آصفیہ اور مرہٹوں کا باہمی تنازعہ تھا۔ برطانوی حکومت نے اسے رفع دفع کرنے کے لئے جو مداخلت کی اُسے سمجھنے کے لئے اُن تمام انقلابات پر ایک سرسری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے جو دربار حیدر آباد و پونا میں صلح سرنگاپٹم کے بعد سے کرڈلا کے اس شرمناک واقعے تک ظہور پذیر ہوئے جس نے کچھ مدت کے لئے حکومت حیدر آباد کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔

لارڈ کارنوالس نے دربار حیدر آباد اور پیشوا سے جو اتحاد قایم کیا تھا اُسکی تکمیل کے خیال سے ٹیپو سے جنگ ختم ہو جانے کے بعد اُس نے اس امر کی کوشش کی کہ ان تمام دفعات کو واضح طور پر ایک خاص معاہدے کی شکل میں ترتیب دے لیا جائے۔ جن کی رو سے یہ طے پایا تھا کہ فریقین معاہدہ ایک دوسرے کو اس بات کا اطمینان دلائیں کہ اختتام جنگ پر جو علاقے ان کے تحت ہوں گے اُنھیں وہ ٹیپو سلطان کے حملوں سے آئندہ محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گے۔ گورنر جنرل نے پونے کے رزیڈنٹ کو جو خط لکھا[ع] اُس میں اس معاہدے کی خاص اہمیت کو (۱۲۰) ۱۷۹۳ء

ع مورخہ ۷ راگست ۱۷۹۲ء۔

جتلایا اور جن اصول پر وہ اس کی تکمیل مناسب سمجھتا تھا اُنھیں بھی واضح کیا۔ وہ لکھتا ہے کہ فریقین کا یہ فرض ہے کہ جنگ کے بعد ان میں سے ہر ایک کے تحت جو علاقہ ہو اُسے وہ ٹیپو کے حملے سے محفوظ رکھے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیشہ یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ یہ شرط محض وفاعی ہے اور جب تک کہ ٹیپو بغیر کسی معقول وجہ یا اشتعال کے حملہ نہ کرے اس وقت تک اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا لہٰذا اسے معاہدے میں واضح کر دیا جائے کہ اگر فریقین میں سے کسی کا ٹیپو سے کوئی تنازعہ ہو تو دوسرے فریق بجا طور پر یہ توقع رکھیں گے کہ اختلاف کی نوعیت اور تمام متعلقہ واقعات کی انھیں پوری اطلاع دیجاوے گی تاکہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے صلاح دے سکیں اور حتے الوسع اعتدال پسند طریقے سے گفت وشنید کر کے اُسے طے کرا دیں۔ نیز جب تک کہ انھیں اس امر کا یقین نہ ہو جائے کہ ان کا حلیف راہ راست پر ہے اور سمجھوتے کی کوئی توقع نہیں تو اس وقت تک وہ اس کے لئے تلوار اٹھانے پر مجبور نہ سمجھے جائینگے (Separte Para) اگر جنگ اٹل ہو جائے تو اس صورت میں فریقین معاہدہ کے مفاد اور ان کی حفاظت کا اس واقعے سے اس قدر گہرا تعلق ہو گا کہ ان کا محض سمجھوتے کے ذریعے سے تنازع (۱۲۱) ۱۷۹۳ء کو جلد از جلد اور عزت کے ساتھ ختم کرانے تک اپنی کوششوں کو محدود کرنا خلاف مصلحت ہو گا۔ لہٰذا یہ طے کر دینا چاہیئے کہ ایسے موقع پر ہر سلطنت اپنی پوری قوت صرف کر دے گی (Sebante Para) اس طرح جو فریق حملے کی وجہ سے مصیبت اور خطرے میں ہو گا وہ معاہدۂ مذکور کے دیگر فریقوں کی پوری توجہ کا مستحق ہو گا۔ لہٰذا اسے خوب سمجھ لینا چاہیئے اور آئندہ کے واسطے طے کر دینا چاہیئے کہ جملہ فوج کو میدان جنگ کے لئے تیار کرنے میں قطعی تاخیر نہ کی جائے اور جو فوج میدان جنگ کے لئے بروقت تیار ہو اُسے فوراً مدد کے لئے روانہ کر دیا جائے۔

ان اصول پر کارنوالس نے معاہدہ کا مسودہ تیار کیا اور ان کی نقلیں حیدرآباد اور پونا روانہ کیں۔ چونکہ اس کی تکمیل نہ ہو سکی اس لئے اس کی مجوزہ دفعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ان اسباب کا بیان کرنا ضروری ہے جن کی وجہ سے یہ شرائط طے نہ ہو سکے حالانکہ سابق معاہدے میں

لے برطانوی حکومت کو جس تنازعہ کی اطلاع کی گئی اس کا تعلق ان مطالبات سے تھا جو ٹیپو نے حیدرآباد کے ماتحت نواب کرنول سے کئے تھے۔

ان کا ذکر تھا اور ہر لحاظ سے وہ برطانوی حکومت اور اُس کے حلیفوں کے مفاد و استحکام (۱۲۲)
کے لئے ضروری تھے۔ جس زمانے میں دربار حیدر آباد کے سامنے یہ تجویز پہلی مرتبہ سنہ ۱۷۹۳ء
پیش کی گئی تھی اُسی زمانے میں دربار حیدر آباد نے برطانوی حکومت کو ٹیپو سے
اپنے ایک تنازعہ کی اطلاع دی تھی اور اُس طفلانہ کج خلقی سے جو دیسی ریاستوں کا
عام رویہ ہے یہ مطالبہ کیا تھا کہ کارنوالس کی اس تجویز کو اس وقت منظور کیا جاویگا
جب کہ حکومت برطانیہ مداخلت کرکے اُس معاملے کو طے کرانے میں مدد دے گی
لیکن اس مطالبے کو بہت جلد خلاف مصلحت اور نامناسب ثابت کر دیا گیا اور
فرمانروائے دکن نے مجوزہ معاہدے کو بلا کسی شرط کے منظور کرکے اُس کی
پوری تلافی کر دی۔

دربار پونا کا طرز کچھ اور ہی تھا اُس نے انگریزی حکومت کی تجویز کو التوا
میں ڈال دیا اور جواب میں تاخیر کی اور اس طور سے صاف ظاہر کر دیا کہ وہ اس
قسم کے اُن تمام معاہدوں سے علیحدہ ہی رہنا چاہتا ہے جن کی وجہ سے آئندہ
اُسے ٹیپو اور سلطنت آصفیہ کے خلاف اپنے ارادوں میں کوئی رکاوٹ محسوس
ہو۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر سلطنت پونا کے دیوان نانا فرنویس نے اس کے
مقابلے میں اپنے تجاویز رزیڈنٹ کے سامنے پیش کئے جو کچھ بحث کے بعد
ناقابل تسلیم ثابت ہوئے اور رد کر دیئے گئے علاوہ دیگر مطالبات کے ایک
تجویز یہ بھی پیش کی گئی تھی کہ جملہ حلیف ٹیپو پر حکومت پونا کا حق چوتھ تسلیم کریں
یہ شرط عہدنامۂ سرنگاپٹم میں شامل نہیں تھی۔ علاوہ ازیں اگرچہ نواب میر نظام علیخاں
بہادر لارڈ کارنوالس کی پیش کردہ تجاویز کو منظور کرنے کے لئے پوری آمادگی
ظاہر کر چکے تھے تاہم انھوں نے بھی پیشوا کے مجوزہ معاہدے کو قبول کرنے سے (۱۲۳)
قطعی انکار کر دیا۔ سنہ ۱۷۹۳ء

نہایت طویل اور تکلیف دہ گفت و شنید کے بعد اس معاہدے کا خیال
قطعاً ترک کر دیا گیا اور برطانوی حکومت نے صرف اس اعلان پر اکتفا کیا کہ اُسے اعلیحضرت نظام کے

ء آمدنی کا ایک چوتھائی حصہ جو بطور خراج کے وصول کیا جاتا تھا۔

زبانی وعدوں اور حکومت پونہ کے ان موہوم الفاظ پر ہی کافی اعتماد ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے معاہدوں کی پابندی کے لئے مستعد رہے گی۔ نواب میر نظام علیخاں بہادر نے آخر میں علحدہ معاہدے کی بہت زیادہ کوشش کی اور انکی یہ دلیل نہایت بجا تھی کہ اگر فریقین میں سے ایک معاہدے کی پابندی نہ کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے بھی اپنے عہد و پیمان سے پہلو تہی کریں یا اپنے فائدہ کا لحاظ نہ کریں اور اگر حیدرآباد سے معاہدہ ہو گیا تو دربار پونا کو مجبوراً اپنی غرض کیلئے اس میں شرکت کرنی پڑے گی۔

سر جان شور پران دلائل کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اُس نے ان فوائد کو جو گارڈ ولس (۱۲۴)
کے نزدیک حلیفوں کی ریاستوں میں امن قائم رکھنے کے لئے ضروری تھے مرہٹوں کی خفگی کے مقابلے میں نثار کرنا ہی بہتر سمجھا اس کا خیال تھا کہ مرہٹے ایسے معاہدے سے جو حکومت انگریزی اور حیدرآباد کے تعلقات و اتحاد کو مستحکم بنا دے گا اور بھی آگ بگولہ ہو جائیں گے۔

دربار حیدرآباد اور پونا کے انگریزوں سے تعلقات سنہ ۱۷۹۲ء

قبل اس کے کہ حیدرآباد اور مرہٹوں کی جنگ کے اسباب بیان کئے جائیں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں حکومتوں کے اس طرز عمل کا ذکر کر دیا جائے جو لڑائی چھڑنے سے پہلے دولت برطانیہ کے ساتھ تھا۔ دربار حیدرآباد کا طرز عمل تو اس مراسلے سے ظاہر ہوتا ہے جو وہاں کے رزیڈنٹ نے گورنر جنرل کو لکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ”دربار حیدرآباد کا اندازہ لگاتے ہوئے اور وہاں کے بااثر لوگوں کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں اپنا تسلط جمانے کے لئے یہ بہترین موقع ہے اور اس سے فائدہ اُٹھانا اشد ضروری اور نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس طرح آئندہ ہم وہاں کی کارروائیوں پر اثر ڈال سکیں گے اور حسب موقع ریاست کے ذرایع سے پورا فائدہ اٹھا سکیں گے۔“

سر جان کنیاوے (Sir John Kennaway) یہ بھی لکھتا ہے کہ اگر ایسا اتحاد یا اس قسم کی مداخلت خلاف مصلحت سمجھی جائے اور حیدرآباد سے جو کچھ تعلقات اسوقت قائم ہیں وہی کافی تصور کئے جائیں تو بغیر اس اتحاد کے بھی خوش قسمتی سے دربار

حیدر آباد کو ہماری دوستی اور ہماری ذات پر کافی اعتماد ہے اور نظام دکن کو کمپنی پر
بھروسا ہے کہ وہ آئندہ مرہٹوں کے ہر ایک ایسے اتحاد کو روکنے کی کوشش کرے گی
جو اُن کے حقوق اور اُن کے حکومت کے اقتدار کے خلاف ہو۔ میرے نزدیک
(۱۲۵) ان سب باتوں کی وجہ سے نہ تو فرمانروائے دکن کبھی ہمارے مفاد کے خلاف
کوئی کام کریں گے اور نہ کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کریں گے جس پر ہمیں خاص
طور سے اعتراض کرنے کی ضرورت پڑے۔ سیاسی معاملات کے متعلق جو
آخری مراسلہ اس ممتاز عہدہ دار نے لکھا ہے اُس سے دربار حیدر آباد کے
رجحانات کا نہایت صحیح اندازہ ہوتا ہے اور لارڈ کارنوالس کے مسلک کی وجہ
سے دربار حیدر آباد کو مرہٹوں کے حملے کے وقت برطانوی حکومت سے مدد
و اعانت کے جو توقعات ہو گئے تھے ان کی نوعیت بھی اس مراسلے سے
واضح ہو جاتی ہے۔

دربار پونا کا میلان صرف معاہدے کی تکمیل کے انکار ہی سے ظاہر نہیں
ہوتا بلکہ اُس کا پتا مرہٹوں کے اس حسد سے بھی خوب چلتا ہے جو اُنھیں ہمارے
اور حیدر آباد کے تعلقات پر تھا علاوہ ازیں انھیں اسی بناء پر نواب میر
نظام علیخاں بہادر سے جو علانیہ مخاصمت ہو گئی تھی اُس سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے

پونے میں مادھوجی سندھیا کی طوطی بولتی تھی اور ہر شخص اس بات سے
واقف تھا کہ وہ ہندوستان کی امن و آسایش کا دشمن ہے اور سارے ملک
میں مرہٹوں کا راج قائم رکھنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ پونا میں دربار حیدر آباد کے
ایک وکیل سے اثنائے ملاقات میں اُس نے بلا پس و پیش علانیہ طور سے
(۱۲۶) (۱۷۹۲ء) معاہدۂ حفاظت کے خلاف رائے ظاہر کی اور فرماں روائے دکن کو صلاح
دی کہ وہ بھی اس قسم کا کوئی معاہدہ انگریزوں سے ہرگز نہ کریں کیونکہ وہ انکے
ارادوں کو بڑی شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ سر چارلس میلیٹ نے جو
مراسلہ گورنر جنرل کو لکھا اس میں اُس نے مادھوجی سندھیا کی سازشوں کا ذکر
کیا ہے اور اس میں وہ بیان کرتا ہے کہ نانا فرنویس اُس کے ان تمام بد انجام
تدابیر اور بدزبانیوں کے سخت خلاف ہے اور جتنا کہ وہ ہماری روزافزوں طاقت

کے خطرے کو دور کرنے کی فکر میں ہے اتنا ہی وہ مادھوجی کے خلاف پانسہ پلٹنے کی اور اپنا اثر جمانے کی اُدھیڑبن میں لگا ہوا ہے۔

ایک دوسرے مراسلے میں سرچارلس لکھتا ہے کہ "دربار پونا کو دست درازیوں کے لئے کوئی موقع ہرگز نہیں دینا چاہیئے، باوجود ہمارے متواتر صبر و استقلال و اعتدال کے جو میرے دور میں رہا ہے انھیں ہماری طاقت و قوت سے کچھ ایسا بلا وجہ حسد ہے جس کی کچھ انتہا نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں اپنے اصول پر بڑا زعم ہے اور وہ کسی دوسرے کو نیک نیت سمجھتے ہی نہیں۔"

اس رائے کی تائید حکومت پونا کے ہر کام سے اور وہاں کے با اثر لوگوں کی زبان سے ہوتی ہے جیسے رزیڈنٹ نے اپنے مراسلوں میں برطانوی حکومت سے سخت خلاف ظاہر کیا ہے اور اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہماری
(۱۲۷) سنہ ۱۷۹۴ء طاقت میں جو اضافہ ہوا ہے اُس کے تدارک کے لئے[1] مادھوجی سندھیا خاص طور سے ٹیپو پر بھروسا رکھتا ہے۔

متذکرہ بالا واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ مرہٹوں اور حیدرآباد کی جنگ سے قبل نواب نظام علی خاں بہادر کو برطانوی حکومت کے ساتھ بیحد اخلاص تھا اور اُس کی دیانت اور راستبازی پر بھروسا ہونے کی وجہ سے انھیں اس بات کی بے انتہا خوشی تھی کہ واقعات نے ہندوستان کی سیاسیات میں کمپنی کا تسلط قایم کر دیا ہے۔ برخلاف اس کے مرہٹے کمپنی کی کامیابی سے کھٹکتے تھے اور اس کی طاقت دیکھ دیکھ کر ایسا حسد کرتے تھے جسے صریح مخاصمت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ جب مرہٹوں کے یہ خیالات تھے تو وہ اس طاقت کے کم کرنے کے موقع کی تلاش میں ضرور رہتے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ حیدرآباد کی طاقت کم کرنے سے ان کا یہ مطلب بھی حاصل ہو جاتا تھا اور اُن کی طاقت میں بھی اضافہ ہو جاتا تھا۔

حیدرآباد سے مرہٹوں کے تعلقات سنہ ۱۷۹۴ء

جن واقعات کی بنا پر حیدرآباد اور مرہٹوں میں جنگ ہوئی انھیں تفصیل سے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں

[1] مورخہ ۲۴ جولائی سنہ ۱۷۹۴ء

اس قسم کے تنازعات کے لئے مواد اُن کے سیاسی تعلقات کی وجہ سے ہمیشہ
تیار رہتا ہی تھا۔ کچھ نہ کچھ حساب جھمیلے میں پڑا رہتا تھا۔ حیدرآباد پر چوتھ کا کچھ
بقایا تھا۔ مرہٹے اُسے بڑھا کر بتاتے تھے اور شاید دوسری طرف والے اُسے
کچھ کم ہی بتاتے تھے۔ صرف یہی معاملہ فیصلہ طلب نہ تھا بلکہ مرہٹوں نے چالاکی (۱۲۸)
سے دوسری قوتوں کو دبانے کے لئے کچھ اپنے سیدھے سادے اصول بنا لئے ۱۷۹۴
تھے جو ان کی طبیعت اور دماغ کے لئے نہایت موزوں تھے۔ دیگر فاتحین کی طرح
وہ علانیہ طور سے اپنی حکومت یا اپنا وقار قایم کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے
بلکہ مفتوح کے چند اضلاع سے مالگزاری وصول کرنے کا حق حاصل کر لیتے تھے اور
مسلمان فرمانروا اپنی کاہلی اور سلطنت کے زوال کی وجہ سے نیز آئندہ اُن کے
حملوں سے نجات حاصل کرنے کی توقع میں اسے بخوشی منظور کر لیتے تھے۔
لیکن ان مراعات کے بعد اُن کے مطالبات بڑھتے جاتے اور زاید حقوق قایم
ہو جاتے تھے۔ پہلا مطالبہ تو یہ ہوتا تھا کہ مخصوص شدہ اضلاع سے مالگزاری
انھیں کے عامل وصول کریں پھر کسی دوسرے صوبے کی نصف آمدنی مانگ بیٹھتے
اور بعد میں چند صوبوں کی آمدنی پر کچھ محصول لگا دیتے۔ اس طرح حکومت کے
اندرونی معاملات میں وہ بیجا مداخلت کرتے اور اُن کے سرکش عامل طرح طرح
کے مشکلات پیدا کرتے تھے۔

مرہٹوں کی قوم فوجی ریاستوں کے ایک ایسے اتحاد پر مشتمل تھی جس کا
قریب قریب تنہا مقصد لوٹ مار تھا لہٰذا اس قسم کے تعلقات کی پیچیدہ نوعیت
ان کے خصوصیات کے لئے موزوں تھی اور چونکہ اس کی ساخت کی وجہ سے
ان کی طاقت و قوت میں تغیر و تبدل لازم تھا اس لئے یہ ضروری تھا کہ جب کبھی
وہ کمزور پڑیں تو وہ اپنے حقوق تلف کئے بغیر اُن تمام فوائد سے عارضی طور پر
دست کش ہو سکیں جو ان کے آبا و اجداد کو حاصل تھے۔ لہٰذا اکثر ایسا ہوا ہے کہ
اُن کے باہمی نفاق کی وجہ سے اُن کے مطالبات کی کثیر رقمیں برسوں باقی
رہی ہیں اور بعد میں وہ اُن کی وصول یابی کے لئے متحد ہو گئے ہیں۔ (۱۲۹)
تھوڑے عرصے تک تو حیدرآباد میں ان کا اثر چھایا نظر آتا تھا ۱۷۹۴

وہاں کے سابق دیوان[1] رکن الدولہ اپنے آقا کے احکام کے مقابلے میں ان کا

[1] عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ دیگر اسباب کے علاوہ مرہٹوں کا غلبہ بھی ایک خاص سبب تھا جس کی وجہ سے فرمانروائے دکن کو اس دیوان کے قتل کرانے کی ترغیب ہوئی۔

سنہ ۱۱۷۷ ہجری میں میر موسیٰ خاں بہادر احتشام جنگ نے چہار ہزاری منصب سے ہفت ہزاری منصب پر ترقی پائی۔ رکن الدولہ کا خطاب عطا ہوا اور دیوانی کے عہدے پر تقرر عمل میں آیا۔ تمام مالی و ملکی امور کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا اور نیک نامی حاصل کی۔

سنہ ۱۱۸۹ ہجری میں جب حضرت غفراں مآب مودھاجی بھونسلا کے فساد اور فتنہ کو رفع کرنے میں مشغول تھے۔ رکن الدولہ ان کے ہمراہ تھے۔ فتنۂ مذکور کے رفع ہونے کے بعد بندگان حضرت مع اسماعیل خاں صوبۂ برار کے مضاف میں قصبۂ بُنیر کی منزل پر قیام پذیر ہوئے۔ رکن الدولہ کسی ضروری کام کی غرض سے شاہی خیمہ پر حاضر ہوئے اور باریابی حاصل کی اثنائے گفتگو میں فیضو خاں نامی گارڈ نے قنات سے باہر نکل کر کٹار سے ان پر حملہ کیا اور ایک ہی وار میں دل و گردے چاک کر کے زخمی کر ڈالا۔

مؤلف تاریخ گلزار آصفیہ نے اس واقعہ کے دو اسباب بتائے ہیں اوّل یہ کہ حضرت کالی بیگم صاحبہ ہمشیرۂ حضرت غفراں مآب نے اپنی ڈیوڑھی کے ایک پوربیہ کو رکن الدولہ کے پاس بھیجا کہ آج کل روزانہ سفر کرنا پڑتا ہے اور بندگان عالی متواتر کوچ کرتے رہتے ہیں لیکن میری رتھ کے بیل کمزور و لاغر ہیں اور ان کی سواری میں مجھے آرام نہیں ملتا لہذا جوان گجراتی بیلوں کی ایک جوڑی میرے لئے روانہ کرو۔ رکن الدولہ بہادر نے وعدہ کر لیا لیکن اس کا انتظام نہ کیا اور بیگم صاحبہ پوربیہ مذکور کو روزانہ تقاضہ کے لئے روانہ کرتی رہیں۔ ایک روز پوربیہ نے تنگ آ کر سختی سے تقاضہ کیا اور جیسا کہ اکثر ایسے مواقع پر ہوتا ہے اس نے اپنے آپ کو بیگم صاحبہ کا قاصد سمجھ کر زیادہ ادب و لحاظ نہ کیا رکن الدولہ بہادر نے اُسے جھڑک دیا۔ پوربیہ کو سخت رنج ہوا اور وہ وہاں سے خاموش چلا آیا۔ ڈیوڑھی پر آ کر بھی اس کا کچھ ذکر نہ کیا۔

دوسرے روز بیگم صاحبہ اس پر خفا ہوئیں کہ اب تک رکن الدولہ کے پاس سے وہ بیلوں کی جوڑی نہیں لایا۔ اس نے تمام حال عرض کیا اور کہا کہ میں اب رکن الدولہ بہادر

زیادہ لحاظ کرتے تھے اور ان کے جانشین عظیم الامرا کی وزارت کا زمانہ سلطنت کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گا آپ کسی اور غلام کو روانہ کریں۔

جب بندگان عالی محل میں تشریف لائے تو کالی بیگم صاحبہ نے سامنے بیٹھ کر کہا کہ اے برادر تمہاری حکومت اور دولت کے زمانے میں ہمارا یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارا ملازم بھی رکن الدولہ کے سامنے جانا پسند نہیں کرتا تو دوسروں کی غیرت کیسے اجازت دے سکتی ہے۔

حضرت غفران مآب نے فرمایا کہ مرہٹوں کی جنگ وجدل اور فساد کی وجہ سے میں آج کل بے بس ہوں آپ کچھ خیال نہ فرمائیں۔ بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ اگر تم اس قدر ناچار و بے اختیار ہو گئے ہو تو ہمیں اجازت دو کہ ہم سے جو ممکن ہو ہم خود کر لیں۔ بندگان عالی نے جواب دیا کہ آپ مختار ہیں کون شخص مانع ہو سکتا ہے۔ جو چاہیں کریں

اس کے بعد بیگم صاحبہ نے فیضو جوان کو جو زنانی ڈیوڑھی کے پہرے پر مامور تھا طلب کیا اور کہا کہ فیضو اگر ہم ایک ایسا کام تیرے تفویض کریں جس میں تیری جان کا خطرہ ہو تو تو اسے انجام دینے کے لئے آمادہ ہوگا یا نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ اگر غلام کی جان نثار کرنے سے سرکار کا کوئی کام نکل سکے تو میں ہزار جان تصدق کرنے کے لئے آمادہ ہوں گا۔ اس جواب کے بعد بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ اگر تو زندہ رہا تو تجھ سے زیادہ مجھے کوئی عزیز نہ ہوگا اور اگر تو مر گیا تو تیری اولاد سے زیادہ کوئی عزیز نہ ہوگا۔ فیضو نے اسے قبول کیا لیکن جب رکن الدولہ کے قتل کرانے کا خیال ظاہر کیا گیا تو اس نے کہا کہ اگر حضور پرنور اپنی زبان سے ارشاد فرمائیں تو غلام بلا عذر اس کام کو انجام دے گا۔ بیگم صاحبہ نے کہا کہ حضرت اپنی زبان سے خود کچھ نہیں فرمائیں گے لیکن میرے حکم دینے کے وقت حضرت موجود رہیں گے اگر وہ خاموش رہیں تو ان کی خاموشی کو رضامندی سمجھ اور میرے کہنے پر عمل کر فیضو نے یہ بات مان لی اور دوسرے روز شب کے وقت جب حضور اندر تشریف لائے تو بیگم صاحبہ نے ایک اصیل کو بھیجکر فیضو کو طلب کیا۔ درمیان میں صرف ایک باریک پردہ حائل تھا بیگم صاحبہ نے کہا کہ فیضو پردہ میں سے تو مجھے اور حضور کو دیکھ سکتا ہے۔ اس نے کہا دیکھ رہا ہوں۔ بعد ازاں بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ میری بات

سے بے جا اثر سے آزاد کرانے کی کوشش ہی میں گزرا۔ زمانہ نے اُن کا ساتھ دیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سُن۔ حضرت کا حکم یہ ہے کہ رکن الدولہ کو تو قتل کر۔ فیضو نے بسر و چشم اسے تسلیم کیا اور صدق دل سے وعدہ کیا۔

دُوسرا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس زمانے میں حضور پر نور کی بیگمات زیادہ تر مچھلی بندر کی چھینٹ استعمال کرتی تھیں۔ ایک موقع پر ایک مغل تاجر اعلیٰ قسم کی چھینٹ لایا جو محل میں خرید کی گئی۔ کپڑہ کی جملہ قیمت سات سو روپیہ ہوئی اور اس کی چھٹی خود حضور نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر رکن الدولہ کے پاس روانہ کر دی لیکن یہ رقم چھ ماہ تک ادا نہ ہوئی اور تاجر تقاضہ کرتے کرتے تنگ آ گیا۔ اسی زمانہ میں جنگ درپیش تھی فوج کے مصارف بڑھے ہوئے تھے اس لئے رکن الدولہ اس کی طرف توجہ نہیں کر سکے۔ بالآخر تاجر مذکور ایک روز حضور کی سواری نکلنے کے وقت سرِ راہ کھڑا ہو گیا اور خدا و رسول کی دہائی دے کر کہنے لگا کہ حضور میرا کپڑہ واپس کرا دیں یا رقم دلوا دیں۔ اس تاخیر کی وجہ سے غلام کا سخت نقصان ہو رہا ہے۔ حضرت غفران آب نے باوجود رکن الدولہ کی موجودگی کے زبان سے کچھ ارشاد نہ فرمایا محل مبارک میں تشریف لے گئے چھینٹ کے سالم تھان مع تین سو روپیہ کے کشتی میں رکھکر واپس کر دیئے اور فرمایا کہ کپڑہ دوسری جگہ فروخت کر ڈالو۔ تین سو روپیہ تمہارے ہرجانہ کے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد رفتہ رفتہ حضور کی بے التفاتی اور بیگم صاحبہ کی عداوت کے قصے مشہور ہونے لگے اور رکن الدولہ کے قتل کی افواہیں مشہور ہو گئیں ایک روز شب کے وقت جب کہ رکن الدولہ آرام کر رہے تھے صمصام الملک کا ایک رقعہ پہونچا جسے پڑھ کر انھوں نے فوراً شمع کے شعلہ سے جلا دیا اور کہلا بھیجا کہ معلوم ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ان کے چھوٹے بھائی شرف الدولہ پہونچے اور بیدار کر کے کہا کہ آج کل لوگ آپ کی بابت مختلف خبریں مشہور کر رہے ہیں لہٰذا آپ احتیاط سے کام لیں تو مناسب ہوگا۔ آپ نے جواب دیا کہ تم فضول روتے ہو اور پریشان ہوتے ہو میں بکری کا بچہ نہیں ہوں کہ مجھے کوئی ذبح کر ڈالے گا۔ تم خاطر جمع رہو۔

اور ۱۷۸۰ء میں انگریزوں سے دوبارہ تعلقات قائم ہونے سے قبل ہی وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جب بندگان حضرت کوچ کرکے نیرا کی منزل پر پہونچے تو رکن الدولہ حسب معمول آکر کھڑے ہو گئے حضور نے سب کو رخصت کیا اور رکن الدولہ کو بھی اشارہ کیا کہ تم بھی اپنے خیمہ میں جاؤ۔ رکن الدولہ نے عرض کیا کہ غلام کو بعض ضروری مقدمات عرض کرنے میں تنہائی کی ضرورت ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ ابھی ہم منزل پر پہونچے ہیں دوسرے وقت آؤ جب حضور اپنے خیمہ کے قریب پہونچے تو رکن الدولہ نے باصرار تمام باریابی چاہی حضور کا مزاج برہم ہوا اور فرمایا کہ میں چاہتا تھا کہ وقت ٹل جائے لیکن تمھاری سمجھ میں نہیں آتا۔ آؤ بیٹھو اور کہو کہ کیا ضروری کام ہے۔ پس حضور خیمہ میں داخل ہوئے اور ساتھ ہی رکن الدولہ پہونچے۔ اسی اثناء میں فیقو جوان نے جو کہ پہرہ پر کھڑا تھا ہو نکلکر کٹار سے حملہ کیا جو ایک پہلو سے گذر کر دوسرے پہلو سے نکل گیا۔

برہان الدولہ بہادر نے جو رکن الدولہ کے وکیل کی حیثیت سے حضور پر نور کی خدمت میں حاضر تھے اس خیال سے کہ یہ کام حضور کے اشارہ سے ہوا ہے فیقو کا تعاقب کیا اور تلوار کے ایک ہاتھ سے اس کا کام تمام کردیا تاکہ قاتل و مقتول دونوں مرجائیں اور حالات ظاہر ہونے پائیں۔

اس واقعہ کے بعد حضور نے فرمایا کہ آخر ہم جو کہتے تھے وہ تم نے نہ مانا اور تمھارا یہ حال ہوا۔ رکن الدولہ نے جواب دیا "جاں نثاری نوکری کی معراج ہے جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ مبارز الملک بہادر و اسمٰعیل خاں بہادر اس سانحہ سے پریشان ہوں گے لہذا غلام انھیں تسلی دینا اور ان کا اطمینان کرانا چاہتا ہے۔"

اس کے بعد اپنے منشی کو طلب کیا اور خطوط لکھوائے اور اپنے ہاتھ سے دستخط کئے۔ خطوط کا مضمون یہ تھا "یہ امر حضور کی بغیر اطلاع کے وقوع میں آیا ہے۔ خود بدولت کا اس معاملہ میں قطعی دخل نہیں، ہرگز کسی قسم کا کوئی خیال نہ کرنا اور ہر کام میں فرمانبرداری۔ نمک حلالی اور جاں نثاری کا خیال رکھنا۔"

حضور کے حکم سے ہوشیار جراح بلائے گئے جو رکن الدولہ کو ان کے

ایک حد تک کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ لیکن اس بات میں بھی شک نہیں کہ اس دلی مراد کو پورا کرنے کے لئے ہی نواب نظام الدولہ میر نظام علی خاں بہادر نے اُن تمام شکوک اور تعصبات کو اپنے دل سے نکال دیا جو اُنھیں برطانوی حکومت کے ارادوں پر ہو گئے تھے اسی غرض سے انھوں نے اس پر بھروسا کیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) خیمہ پر لیجا کر ان کے زخموں کے سینے میں مشغول ہوئے لیکن کچھ فائدہ نہوا صبح صادق کے وقت انتقال کیا۔

شاہ تجلی علی صاحب مصنف تاریخ تزک آصفیہ نے تاریخ نکالی۔ "سیر جنت نصیب شد باد" (۱۱۸۹)۔

مقبرہ کے کتبہ پر یہ تاریخ درج ہے۔ " داخل آمد از شہیداں با حسین"۔

خلاصۂ واقعات مندرجۂ صفحات ۲۲۳ تا ۲۲۸ تاریخ گلزار آصفیہ مصنفۂ خواجہ غلام حسین۔

تزک آصفیہ میں فیضو کے قتل کی بابت یہ درج ہے کہ اول اس سے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن جب اس میں ناکامی ہوئی اور اس نے کچھ پتہ نہ دیا تو اُسے سخت اذیت کے ساتھ قتل کیا گیا۔

ان دونوں تاریخوں سے سر جان میلکام کے قول کی قطعی تائید نہیں ہوتی۔ نہ مرحوم کے اثر کا ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے اور نہ اس بات کا گمان ہوتا ہے کہ نواب میر نظام علی خاں بہادر ان کے مرہٹوں کے تعلقات کی وجہ سے رکن الدولہ بہادر کے خلاف تھے یا دیگر سیاسی اسباب کی بناء پر ان کے قتل کی انھوں نے کوشش کی۔ برخلاف اس کے تزک آصفیہ میں صاف طور پر درج ہے کہ بندگان حضرت خود ان کے عزیزوں کی تسلی کیلئے تشریف لے گئے اور ان کے بیٹوں اور بھائیوں کو اعلیٰ مدارج عطا کئے۔

" صبح آں روز خود بکمال حزن و ملال بتقریب عزاپرسی بخیمۂ شرف الدولہ تشریف بردہ زادیہ حزن را سر در آگیں نمودند..... مکرر از زبان مبارک دلاسا ارشاد فرمودند۔ حتیٰ کہ بعد رکن الدولہ پرداخت خاطر برادران و رفیقانش بہ ترقی مدارج علیا کہ مزیدے بر آں متصور نیست بعنایت خداوندگی و استحقاق بندگی ادملک مال بحال داشتند۔ در ہیچ ازمنہ و اعصار از ہیچ بادشاہ ذوالاقتدار بظہور نیامدہ کہ بعد مردن شخصے بیازماندگان او یوماً فیوماً در علو مراتب کوشیدہ ہر یک را سر دار عالی مقام سازند.....“ (تزک آصفیہ ص ۲۴۲ و ۲۴۳)

اور اُس کی دوستی سے اُس زبردست اعانت کی خواہش کی جو ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے اُس زمانے میں اُن کی ریاست کی حفاظت اور امن اور آزادی کے لئے ضروری تھی۔ جس اصول پر مارکوئس کارنوالس نے معاہدہ کیا تھا اُسے پیش نظر رکھتے ہوئے اُنھوں نے اس موقع پر مرہٹوں کی زیادتیوں کو روکنے کے لئے حکومت برطانیہ سے مدد چاہی جس کا اندیشہ اُن کی فوجی تیاریوں اور اُن کے طرز عمل سے ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس موقع پر دربار حیدرآباد کے خاص خاص عہدہ داروں نے اُس کمزوری اور غیر یقینی طریقے سے کام کیا جو قریب قریب تمام ہندوستانیوں کے ساتھ مخصوص ہے تاہم اس معاملے کے متعلق جو کچھ ثبوت موجود ہے اُس سے اس بات میں کچھ شبہ نہیں رہتا کہ نواب نظام الدولہ بہادر کے پیشوا سے جو تنازعات تھے اُن میں وہ برطانوی حکومت کے فیصلے پر عمل کرنے کے لئے بآسانی آمادہ ہو جاتے بشرطیکہ اُنھیں یہ اطمینان دلا دیا جاتا کہ پیشوا کی حکومت بھی اُس فیصلے کی وقعت کرے گی۔ برخلاف اس کے مرہٹوں نے انگریزی حکومت کے اُن مصالحت آمیز تجاویز کو شروع ہی سے ٹالا اور اُن کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی اور جس وقت انھیں اس کا پورا اطمینان ہو گیا کہ انگریزوں کا ارادہ اس معاملے میں محض دوستانہ طریقے سے مداخلت کرنے اور فریقین میں مصالحت کرانے کی خواہش کے ماسوا حیدرآباد کو کوئی خاص مدد دینے کا نہیں ہے تو انھوں نے انگریزوں کی اس مداخلت کو ایسی بری طرح ٹالا کہ اُسے ایک حد تک توہین پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ گورنر جنرل کو اس کا احساس تھا کہ اس تنازعے سے اگر اُن اہم سیاسی تعلقات کے خاتمے کی ابتدا ہو گئی جو اُس کے پیشرو نے ہندوستان میں برطانوی مفاد کے استحکام کے لئے قائم کئے تھے تو اس سے سخت نقصان پہنچیگا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ لڑائی کی جو بنا بتائی جاتی ہے اُسے بہ آسانی طے کیا جا سکتا ہے اور وہ محض مرہٹوں کے اُن خاص ارادوں کو چھپانے کے لئے ہے جو انھوں نے حیدرآباد کی طاقت کا قلع قمع کرنے کے لئے کر لئے ہیں۔

سرجان شور کے خیالات

(۱۳۱) سرجان شور کا بیان[1] ہے کہ اگر مرہٹے حیدرآباد کے خلاف زیادتی کریں گے تو میرے نزدیک ان کا مدعا بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ ریاست حیدرآباد کی آزادی کا خاتمہ کر دیں۔ کیونکہ انھیں اپنی طاقت پر کتنا ہی زعم کیوں نہ ہو مگر دونوں ریاستوں میں جن معاملات پر جھگڑے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں جنھیں طے نہ کیا جا سکے اور نہ وہ اتنے اہم ہیں جن کی وجہ سے اسقدر لڑائی کا شور مچایا جائے لیکن حیدرآباد کی تیاریاں بھی کافی ہیں اور پیشوا کو جب ان کا پتا چلے گا تو وہ اپنے ارادوں سے ضرور باز آجائیگا۔

اس گفت و شنید کے دوران میں مادھوجی سندھیا کا انتقال ہو گیا۔ برطانوی حکومت کے لئے مداخلت کرنے کا یہ نہایت ہی مناسب موقع تھا اور پونے کے رزیڈنٹ نے بھی لکھا کہ ایسے مبارک موقع سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے لیکن گورنر جنرل کو مرہٹوں کی خفگی قطعی گوارا نہ تھی اور جو طرز عمل اُس نے اختیار کر لیا تھا اُس میں وہ کسی قسم کی تبدیلی کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ دولت راؤ سندھیا جو اپنے چچا کی جگہ مسند نشیں ہوا اُس نے فوراً ہندوستان کے ہر گوشے سے اپنی فوجیں جمع کرنی شروع کر دیں تاکہ اُسے اپنے ذاتی اقتدار کو تقویت پہونچائے اور حیدرآباد کے خلاف جو اتحاد ہو رہا تھا اُس میں اپنا تسلط جمانے کا موقع مل جائے۔

ٹیپو سلطان اور مرہٹوں کے اتحاد کا امکان

حیدرآباد اور مرہٹوں کے درمیان جنگ شروع ہونے سے کچھ مدت قبل ایک نہایت سخت مسئلہ برطانوی حکومت کے لئے درپیش ہو گیا۔ ٹیپو سلطان کو انگریزوں سے کچھ ایسی مخاصمت تھی کہ صلح سرنگاپٹم کے بعد ہی اس (۱۳۲)
لئے فرانسیسیوں اور دربار حیدرآباد و دربار پونہ سے سازشیں شروع کر دی تھیں۔ اس موقع پر اس نے ایک فوج جمع کی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس

[1] مراسلہ مورخہ یکم اکتوبر ۱۷۹۴ء بنام رزیڈنٹ حیدرآباد۔

جھگڑے میں وہ حیدر آباد کے خلاف مرہٹوں سے بحیثیت حلیف کے ٹکرائیگا اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر ایسا خلاف توقع اور غیر معمولی واقعہ پیش آئے تو برطانوی حکومت کا طرز عمل کیا ہوگا۔ گورنر جنرل نے اس موقع پر غور کرکے یہ طے کر دیا کہ کسی حالت میں بھی حیدر آباد کی مدد نہ کیجائے۔ اُس کے دماغ میں اُس وقت جو دلائل تھے انھیں اس نے اپنے ایک مراسلے میں بیان کیا ہے جسے بغور پڑھنے کی ضرورت ہے[1] کیونکہ اس میں ان اصول کو واضح کیا گیا ہے جن کی بنا پر اُس نے سلطنت کے سیاسی معاملات میں اپنی حکومت کا مسلک قرار دیا تھا۔

یہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ چونکہ قانون کسی ایسے معاملہ میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دیتا جس کا لازمی نتیجہ جنگ ہو لہذا حیدر آباد اور مرہٹوں کے اس جھگڑے میں کوئی دخل نہ دیا جاوے۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ غالباً ٹیپو بھی حیدر آباد کے خلاف شریک ہوگا تو سوال قطعاً بدل گیا جس کے حل کرنے میں گورنر جنرل نے محض معاہدوں پر ہی غور نہیں کیا بلکہ خاص طور سے ان مطالبات پر بھی تبصرہ کیا جو دربار حیدر آباد کو کمپنی کی اعانت و دوستی پر تھے۔ (۱۳۳) ۱۷۹۴ء

برطانوی حکومت کے طرز عمل کے متعلق سر جان شور کی رائے

اُس نے یہ اندازہ کر لیا کہ نواب نظام الدولہ بہادر یہ دلیل پیش کریں گے کہ اگر ٹیپو بلا کسی مناسب وجہ یا اشتعال کے حملہ کرے تو معاہدے کی رو سے وہ کمپنی نیز مرہٹوں کی امداد کے مستحق ہوں گے چونکہ ایک فریق کی غداری سے دوسرے کو کنارہ کشی کا حق حاصل نہیں ہو سکتا لہذا بجائے اس کے کہ انگریز مرہٹوں کے خلاف مدد کرنے سے انکار کریں اُن پر یہ لازم ہے کہ وہ تیسرے فریق کو معاہدے کی تکمیل کے لئے مجبور کریں۔ یہ بھی سوچ لیا گیا تھا کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہیں گے

---

[1] یہ مراسلہ مورخہ ۱۸ فروری ۱۷۹۵ء ضمیمہ عـ۲ میں درج ہے۔

کہ معاہدے کی رو سے کمپنی کو مدد کرنا لازمی ہے کیونکہ یہ شرط تو ایسی صاف ہے کہ اس میں شبہ اور حیلے کی گنجایش ہی نہیں، نیز یہ کہ انھوں نے انگریزوں ہی پر بھروسا کر کے معاہدہ کیا تھا نہ کہ مرہٹوں پر جن کی دغابازی سے وہ بخوبی واقف تھے اور جن کے متعلق وہ برابر شبہ ظاہر کرتے رہتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب انگریزوں نے حیدرآباد سے معاہدہ کرنے کی خواہش کی تھی تو ان کے لئے وہ ایسا نازک وقت تھا کہ اگر نواب نظام الدولہ بہادر زور دیتے تو وہ اقدامی و دفاعی دونوں حملوں کے وقت انھیں امداد دینے پر رضامند ہو جاتے۔ پس اس موقع پر اگر انگریز کسی خاص وقت یا اپنی سیاسی حکمت عملی کی وجہ سے یا اس بنا پر کہ مرہٹوں نے اپنے عہد و پیمان کی خلاف ورزی کی ہے اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتے ہیں تو ہمیشہ کے لئے وہ (۱۳۴) ۱۷۹۵ء
اعتبار جاتا رہتا ہے جس پر کہ معاہدوں کا مدار ہوتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے حیلے تو اہم سے اہم معاہدے سے انحراف کرنے کے لئے بھی تراشے جا سکتے ہیں۔ نواب نظام الملک نہایت بجا طور سے کہہ سکتے ہیں کہ ٹیپو خواہ تنہا حملہ کرے خواہ مرہٹوں کے ساتھ کمپنی کو اُس کا مقابلہ کرنا ہر حالت میں لازم ہے اور اگر وہ پیشوا کے ساتھ مل کر حملہ کرے تو اس وقت تو انگریزوں کو اور بھی زیادہ مستعد ہونا چاہئے، کیونکہ اس سے بڑھکر اس معاہدے کی کوئی توہین نہیں ہو سکتی اور ایسی صورت میں انھیں ہر لحاظ سے اس پر ناخوشی کا اظہار کرنا اپنا فرض سمجھنا چاہئے۔

گورنر جنرل نے برخلاف اس کے یہ پہلو اختیار کیا کہ جس معاہدہ کی بنا پر نواب نظام علیخاں بہادر اپنا حق جتاتے ہیں وہ تین فریقوں کے مابین ہے اور اس میں تینوں کا اتحاد تصور کر لیا گیا ہے اور ہر موقع پر تینوں کی یگانگی ضروری ہے، بغیر اس کے اس کی تکمیل بھی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اگر ان میں سے ایک فریق دوسرے پر حملہ کرتا ہے تو ان تینوں کے تعلقات قطعاً بدل جاتے ہیں۔ سر جان شور کی رائے تھی کہ اگر تینوں فریقوں میں سے کوئی ایک بھی ٹیپو سے اتحاد قایم کر لے تو ایسی صورت میں فریقین معاہدہ کی مخاصمت کے اسباب پر غور کیا جائے

فرض کیجئے کہ سلطنت آصفیہ اور مرہٹوں کی لڑائی میں ایک ہی فریق کی سراسر
ناانصافی ثابت ہو اور دوسرا فریق اپنی طرف سے بغیر اشتعال دلائے اقدامی حملے
کی وجہ سے مجبور ہوا ہو تو ایسی صورت میں مظلوم فریق اپنی حفاظت کی خاطر ٹیپو
سے مل جانے میں حق بجانب ہوگا۔ لیکن اگر اتحاد ثلاثہ کا ایک فریق محض اپنی (۱۳۵) سنہ ۱۷۹۵ء
ملک گیری کی ہوس سے دوسرے فریق کے خلاف ٹیپو سے اتحاد قایم کرے
تو ایسی صورت میں اس کی طرف سے بلاشبہ اس معاہدے کی سخت خلاف
ورزی ہوگی۔ گورنر جنرل نے اس دلیل سے بھی حیدرآباد کے خلاف ہی مطلب
نکالا۔ اور یہ رائے قایم کی کہ حیدرآباد کی فوجوں نے بیدر کی طرف جو کوچ کیا
تھا اگر وہ اقدامی حملے کے خیال سے نہیں تھا تو کم از کم مرہٹوں کی حکومت کے
اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کی نیت سے ضرور تھا۔ برطانوی رزیڈنٹ
دربار حیدرآباد کے وزیر کو اس برے فعل کے نتائج سے متواتر آگاہ کرتا رہا تھا
لیکن اس کا کچھ اثر نہوا۔

سرجان شور نے خیال کیا کہ اگر ٹیپو نے فرماں روائے دکن کو مرہٹوں کے
خلاف مصروف دیکھ کر بلا کسی اشتعال کے حیدرآباد پر حملہ کیا اور انگریزی حکومت
نے حیدرآباد کی مدد کی تو اسے مرہٹوں سے بھی ضرور جنگ کرنی ہوگی اور یہ ایک
ایسا واقعہ ہوگا جس کا کہ اتحاد ثلاثہ قایم کرتے وقت گمان بھی نہوا ہوگا۔ معاہدے
کی جو شرائط انگریزی حکومت کو ایک دوسرے کے دشمنوں کو مدد دینے سے
روکتی ہیں وہی ان دونوں میں جنگ چھڑ جانے کے بعد کمپنی کو سختی سے غیر
جانبداری پر مجبور کرتی ہیں۔ سرجان شور کا خیال تھا کہ اس قسم کی جنگ سے
اتحاد کے اصول میں عارضی طور پر تغیر واقع ہو جائے گا۔ یہ دلیل کہ پانگال کے
سمجھوتے کو ایک جداگانہ عہد نامے کی حیثیت حاصل ہے اور یہ خیال کہ ایک فریق کی
علیحدگی دوسرے فریق کو اس کے عہد و پیمان کی پابندی سے آزاد نہیں
کرسکتی کیونکہ معاہدۂ مذکور میں ایسی کوئی شرط نہیں ہے دونوں سرجان شور
کے نزدیک ناقابل تسلیم تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ معاہدے کے تین فریق میں (۱۳۶) ۱۷۹۵ء
نہ کہ دو۔ ان سب کی متحدہ کوششوں ہی سے وہ قائم رہ سکتا ہے اور اگر ایک

فریق کی علیحدگی دوسرے کو آزاد نہیں کر سکتی تو اس معاہدے کے معنے کچھ اور ہی ہو جاتے ہیں کیونکہ اس حالت میں کسی نہ کسی فریق سے جنگ کا اندیشہ رہیگا اور یہ کبھی اُس معاہدے کا مدعا نہ تھا، نیز یہ امر ان مفروضات کے بھی خلاف ہے جن پر معاہدے کے تمام شرائط قایم ہیں۔ گورنر جنرل کا خیال تھا کہ اثنائے جنگ میں تو معاہدے پر عملدرآمد نہیں ہو سکتا لیکن صلح کے بعد اُس کی حیثیت بدستور قایم رہے گی اُس کا یہ خیال بھی تھا کہ اگر حیدرآباد اور مرہٹوں کی جنگ میں ٹیپو نے ان میں سے کسی کا ساتھ دیا تو وہ دوسرے فریق کو معاہدے کی تکمیل کے لئے مجبور کرے گا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو اُن میں آپس میں صلح ہو جائے گی یا کم از کم انکار کرنے والے فریق کی بابت یہ پتا چل جائیگا کہ ٹیپو نے اس کے مشورے سے حملہ کیا اور اُس کے بعد اپنے حلیف کی مدد سے انکار کر کے معاہدے کی سراسر خلاف ورزی کی لہٰذا اس کے بعد برطانیہ کو حق حاصل ہو جائیگا کہ اس کے ساتھ جو طرز عمل مناسب سمجھے اختیار کرے۔ لیکن سرجان شور کے دماغ میں یہ کبھی نہ آیا کہ اگر حیدرآباد اور مرہٹوں میں صلح نہ ہوئی تو کسی نہ کسی فریق کی مدد کرنا اُس کا فرض ہو جائیگا۔

گورنر جنرل کو اُس امر کا یقین تھا کہ نظام دکن یہ دلائل کبھی تسلیم نہ کرینگے بلکہ اُس بات کا اندیشہ تھا کہ وہ انگریزوں کی اُس غیر جانبداری کو غداری پر محمول کریں گے اور یہ اُس اتحاد اور اُن تعلقات کا صلہ سمجھا جائے گا جو انھوں نے برطانوی حکومت سے قایم کئے تھے اور جن کے بڑھانے کی ہمیشہ خواہش کی تھی نیز اُس کا یہ خیال بھی تھا کہ اگر نواب نظام الملک کے سے والی ملک کے دماغ میں یہ بات سما گئی تو وہ ہمیشہ کے لئے سلطنت برطانیہ کے دشمن ہو جائیں گے۔ سرجان شور اُس بات سے بھی غافل نہ تھا کہ اگر کمپنی نے حیدرآباد کی مدد نہ کی تو ٹیپو اور مرہٹے ملکر اُس ریاست کو کچل ڈالیں گے۔ اور اس صورت میں ٹیپو پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہو جائیگا۔ لیکن جب اس نے یہ سوچنا شروع کیا کہ حکومت حیدرآباد کی بدانتظامی کی وجہ سے کیا کیا دقتیں پیش آئیں گی۔ بغیر ریاست پر قبضہ کئے وہاں کے سیاسیات پر حاوی ہونا اسقدر دشوار

ہوگا۔ مرہٹوں پر رعب جمانا کسقدر مشکل ہوگا اور وہ حکومت برطانیہ کو کس آسانی سے نقصان پہونچا سکیں گے۔ ٹیپو اور مرہٹوں کے متحدہ حملے کی مدافعت کے لئے کسقدر کثیر سامان کی ضرورت ہوگی اور ایک طویل جنگ کی وجہ سے کن کن مصیبتوں کا سامنا ہوگا تو اُسے یہی کہنا پڑا کہ ان تمام خطرات کی موجودگی میں حیدرآباد کی تباہی کے مضر نتائج کے خیال سے نظام دکن کی مدد کرنے کے لئے تو بہت بڑی ترغیب کی ضرورت ہے۔

گورنر جنرل کا خیال تھا کہ اگر ٹیپو اور مرہٹوں نے مل کر حیدرآباد کی طاقت کا خاتمہ کر بھی دیا تو اُس بات کا بھی بڑا امکان ہے کہ کمپنی کی سرحد پر حملہ کرنے سے قبل ہی وہ آپس میں لڑ بیٹھیں گے۔ اُسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ اگر حیدرآباد کو اُس کی قسمت پر چھوڑ دیا گیا تو ہندوستانی طاقتوں کی نگاہ میں کمپنی کی سیاسی وقعت بہت کچھ گھٹ جائے گی۔ اگرچہ سرجان شور یہ بھی خوب جانتا تھا کہ برطانوی حکومت کے لئے ہندوستان میں عوام کی رائے نہایت ضروری ہے تاہم اُس کے نزدیک یہ ایسا موقع نہ تھا کہ اس کی خاطر ٹیپو اور مرہٹوں کے خلاف جنگ کا عذاب مول لیا جائے جس سے کہیں زیادہ خطرات بڑھ جاتے تھے۔ (۱۳۸) ۱۷۹۵ء

اُسے یقین تھا کہ اگر پیشوا سے جنگ جاری رہنے کی حالت میں ٹیپو نے حیدرآباد پر حملہ کر دیا تو اُسے تنہا مدد دینے کا یقیناً یہی حشر ہوگا۔

اس موقع پر سرجان شور کو کمپنی کی عزت و ثروت کا بھی بڑا پاس تھا اُس کا یہ خیال درست تھا کہ جب برطانوی حکومت نے اپنے حلیف راجہ ٹراونکور پر حملہ گوارا نہ کیا اور ٹیپو سے جنگ کی اور صلح کی گفت و شنید میں اس معاملے کے متعلق خاص طرز عمل اختیار کیا تو اُس کی بدولت کمپنی کے حلیفوں کو اُس پر اعتماد ہو گیا اور پورے ہندوستان میں دولت برطانیہ اپنی دیانت داری۔ اپنے استقلال اور اعتدال کے لئے مشہور ہو گئی۔ اس قسم کے خیالات کی اہمیت کو اس نے تسلیم کیا لیکن اُس کے ساتھ ہی ذاتی بچاؤ کا لحاظ رکھنا زیادہ ضروری سمجھا۔

اُسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ اس وقت حیدرآباد اور مرہٹوں کے

باہمی تنازعات خواہ صلح سے طے ہوں یا جنگ سے حیدر آباد میں لازمی طور پر
مرہٹوں کا اثر قایم ہو جائے گا اور مرہٹوں کی طاقت جو اُس وقت بھی بہت زیادہ
ہے اور بھی بڑھ جائیگی نواب نظام علیخاں بہادر برطانوی حکومت سے مایوس ہوکر مجبوراً ٹیپو سے
اتحاد کی کوشش کریں گے لیکن ان دونوں کا اتحاد ناممکن ہوگا۔ اگر ٹیپو نے بغیر
مرہٹوں کی شرکت کے تنہا حیدر آباد پر حملہ کیا تو مرہٹے حیدر آباد سے مصالحت
کرکے ٹیپو کے خلاف انگریزوں سے مل جائیں گے۔ ممکن ہے کہ حیدر آباد کی
کمزوری کی وجہ سے ٹیپو کو حملہ کرنے کی جرأت ہو جائے لیکن گورنر جنرل
کا گمان غالب یہ تھا کہ سلطان کا اصلی مقصد برطانوی حکومت کا تختہ اُلٹنا ہے
لہٰذا انگریزوں کو مرہٹوں سے اتحاد قایم رکھنا سب سے زیادہ مقدم تھا
کیونکہ ان کی مدد سے ٹیپو نیز دیگر یورپین طاقتوں کا مقابلہ کیا جاسکتا تھا لیکن
اور حیدر آباد کے تعلقات سے یہ بات میسر نہ ہو سکتی تھی۔ سر جان شور کا یہ ایما
تھا کہ امن قایم رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنی فوجی طاقت نہایت
اچھی حالت میں رکھی جائے تاکہ ہمسایوں کو امن برقرار رکھنے پر بآسانی مجبور
(۱۴۰) کیا جاسکے۔ یہی نہایت مناسب اور نہایت کم خرچ اصول ہے۔ اس کے
سنہ ۱۷۹۵ء ساتھ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے کارنوالس کی طرح ان خطرات و نقصانات
کا بھی اندازہ تھا جو ۱۷۹۳ء کے ایکٹ کے مطابق ہندوستانی ریاستوں سے
تعلقات محدود رکھنے کے سبب کمپنی کو درپیش تھے۔

اس مذکورۂ بالا قانون کی وہ دفعہ جو کمپنی کو اعلان جنگ کرنے یا لڑائی
چھیڑنے کی محض اُس وقت اجازت دیتی ہے جب کہ حکومت برطانیہ کے
خلاف جنگ چھڑ چکی ہو یا اُس کے شروع کرنے کے لئے فریق مخالف کی تمام
تیاریاں مکمل ہو چکی ہوں، اپنے فیصلہ میں ناطق تھی۔ گورنر جنرل نے اسے
لفظی معنے پہنا کر یہ مطلب نکالا کہ اگر ٹیپو حیدر آباد پر حملہ کرے تو کمپنی اُس کے
مطابق بغیر مرہٹوں کی اعانت کے حیدر آباد کو مدد نہیں دے سکتی اور واقعات
کے لحاظ سے اُس نے اپنی مصلحت بھی اسی میں سمجھی۔ لیکن اُس کے ساتھ
اُس نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ایسے موقع کا بھی آنا ممکن ہے جب کہ ہمیں بغیر

ملک گیری کی ہوس کے اور محض اپنی سلامتی کی خاطر کسی دوسری ریاست کو جنگ میں مدد دینا ہی زیادہ مناسب معلوم ہو۔ لہذا اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں جب کہ کسی سابق معاہدے کی رو سے اُس ریاست کی مدد کرنا ہم پر لازم نہیں ہے تو ہم اُسے مناسب اور ضروری سمجھکر اُس کا ساتھ دے سکتے ہیں یا نہیں۔

سر جان شور کے مذکورۂ بالا خیالات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اُس نے حیدرآباد کو ٹیپو کی مرضی پر چھوڑ دینے کا تہیہ کر لیا تھا اور وہ اپنے اُس فیصلے کو بہ لحاظ دیانت قابل تسلیم اور بلحاظ حکمت عملی مصلحت آمیز اور اُس قانون
کے حرف بہ حرف مطابق تصور کرتا تھا جو مقبوضات ہند کی حکومت کے لئے (۱۴۱) سنہ ۱۷۹۵ء
پارلیمنٹ نے نافذ کیا تھا۔ اُس نے ایک دلیل یہ بھی پیش کی کہ چونکہ مرہٹے اتحاد ثلاثہ کے فریق ہیں لہذا جب تک حکومت حیدرآباد ان کے خلاف جنگ میں مشغول رہے برطانوی حکومت اُس کا ساتھ نہ دینے میں حق بجانب ہو گی۔ یا بہ الفاظ دیگر اگر گورنر جنرل کا یہ شبہ کہ ٹیپو انگریزوں کے حلیفوں میں نفاق کرانے کی فکر میں ہے۔ صحیح نکلے اور ٹیپو اپنی سازشوں میں کامیابی حاصل کرکے مرہٹوں سے اتحاد بھی کر لے تو (اگر چہ مرہٹے معاہدے کی خلاف ورزی کریں گے) حکومت برطانیہ اپنی اُن تمام ذمہ داریوں سے بری ہو جائیگی جن کے لحاظ سے اُس پر حیدرآباد کی مدد کرنا لازمی ہے۔

یہ معلوم ہوتا ہے کہ گورنر جنرل اس موقع پر کمپنی کے اُس نام و ناموس کو بھی ایک حد تک نثار کرنے کے لئے تیار تھا جو کارنوالس نے برطانوی حکومت کے لئے ہندوستان میں پیدا کیا تھا لیکن شرط یہ تھی کہ اُسے اس قربانی سے اُن تمام خطرات و مشکلات سے فوری نجات مل سکے جو اُس کے نزدیک اُس موقع پر ذرا ہمت سے کام لینے اور فیصلہ کن رائے پر عمل کرنے سے حکومت کو لاحق ہو جاتے تھے۔ منجملہ دیگر اسباب کے جن کی بنا پر گورنر جنرل نے حیدرآباد کو مدد دینے کا فیصلہ کیا ایک خاص سبب یہ بھی تھا کہ سلطنت مذکور اُس کے نزدیک اس وقت کمزور تھی اور انگریزوں کی مدد اُسے درکار تھی واضح رہے کہ

تین سال قبل اُس کی اس حالت ہی کو نواب نظام الملک کے لئے برطانوی حکومت سے دوستی قایم کرنے اور تعلقات بڑھانے کا بجا اور مناسب سبب تصور کیا گیا تھا۔

سرجان شور کا حیدر آباد کے خلاف فیصلہ ۱۷۹۵ء

(۱۴۲) گورنر جنرل کے دماغ میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ حیدر آباد کا ساتھ نہ دینے سے مرہٹوں کی اس مخاصمانہ حسد میں کسیقدر کمی ہو جائے گی جو انھیں حیدر آباد سے انگریزی حکومت کے جدید تعلقات کی بنا پر ہو گیا تھا اور نواب نظام الملک کی طاقت کے خاتمہ سے جس اہم اور خطرناک سیاسی انقلاب کے ظہور پذیر ہونیکا اندیشہ تھا اُس کی بابت اُس نے اپنے دل کو یوں بہلا لیا تھا کہ بعد میں ٹیپو اور مرہٹوں میں باہمی نا اتفاقی کا امکان ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مرہٹوں کو برطانوی مقبوضات پر حملہ کرنے کے مقابلے میں اس بات کی زیادہ ترغیب ہو کہ وہ ان چند چھوٹی ریاستوں کی جنھوں نے شمالی ہند میں اب تک اُن کی سرداری تسلیم نہیں کی تھی تسخیر مکمل کر کے اپنی زبردست قوت کو پہلے مستحکم بنالیں۔

ان تمام وجوہ کی بنا پر گورنر جنرل اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگر ٹیپو حیدر آباد پر ایسے وقت حملہ کرے جب کہ وہ مرہٹوں کے خلاف جنگ میں مشغول ہو تو پارلیمنٹ کے قانون کے مطابق نواب نظام الملک کی مدد نہیں کیجا سکتی اس معاملے میں بلحاظ واقعات بھی اسی مسلک کے اختیار کرنے میں مصلحت ہے۔

یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ فیصلہ اس رائے پر مبنی ہے کہ اتحاد ثلاثہ ایک اقدامی و دفاعی معاہدہ تھا اور اگر اس کے فریقوں میں سے ایک فریق علیحدہ ہو جائے اور معاہدے کے فریقین میں سے کسی ایک پر حملہ کرنے کی غرض سے
(۱۴۳) اُس طاقت سے اتحاد کرلے جس کے خلاف یہ معاہدہ ابتدا میں کیا گیا تھا
۱۷۹۵ء تو باقیماندہ فریق اپنی تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور وہ غیر جانبدار رہنے کا بھی مجاز ہو سکتا ہے اگر اس فیصلے کو عام اصول کی حیثیت سے صحیح بھی تصور کر لیا جائے تب بھی اس کا اطلاق زیر بحث معاملے پر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس معاہدہ کی رو سے دربار حیدر آباد اتحاد ثلاثہ کا پابند تھا وہ علانیہ طور پر محض انگریزوں کی ذات پر اعتماد کر کے کیا گیا تھا۔ نواب نظام علی خاں بہادر مرہٹوں کی دغابازی

کا خوف معاہدہ پر دستخط کرنے وقت تک ظاہر کرتے رہے تھے اور یہ خوف محض اس وقت رفع ہوا تھا جب کہ انھیں بار ہا برطانوی حکومت کی دائمی دوستی کا پورے طور پر اطمینان دلایا گیا۔

کارنوالس نے پونہ کے رزیڈنٹ سے کہا تھا[1] گو مرہٹوں سے اس قسم کا کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے تاہم انھوں نے ٹیپو کے خلاف برطانوی حکومت کا ساتھ دیکر اس بات کا حق حاصل کرلیا ہے کہ سلطان کے خلاف اُن سے دفاعی معاہدہ کرلیا جائے۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اس شریف طبیعت شخص کے نزدیک (باضابطہ معاہدہ کے علاوہ) محض جنگ میں ساتھ دینے سے برطانوی حکومت پر کس قسم کی ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ کارنوالس اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ ہندوستان میں کمپنی کی حکومت کا انحصار اُس کی شہرت پر ہے جس کی وجہ سے حد درجہ غدار قومیں بھی اُس کے نمایندوں کی زبان پر اعتبار کرلیتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ انگریزوں کا ایک جنگ میں ساتھ دینے سے انھیں اُن تمام طاقتوں کے (۱۴۴) خلاف جو انگریزوں کا ساتھ دینے کی وجہ سے انسے خار کھائے بیٹھی ہوں برطانوی حکومت کی حفاظت و اعانت کا ایسا حق حاصل ہو جاتا ہے کہ بجز اُن کی بدسلوکی کے اور کوئی چیز اُس میں خلل نہیں ڈال سکتی۔

سر جان شور جانتا تھا کہ اُس کی اس حرکت سے برطانوی حکومت کی ہوا کس طرح اُکھڑ جائے گی اور حیدرآباد کا ساتھ چھوڑنے سے کمپنی کی سیاسی اہمیت اور عزت و شہرت پر کیا بٹہ لگیگا اور اس کے سیاسی نتائج کسقدر مہلک ہوں گے اس نے کہا کہ "میں خوب سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں عوام کی رائے کا ہمارے موافق ہونا کسقدر ضروری ہے لیکن میرے نزدیک (اس موقع پر) ان بڑی مصیبتوں کے مقابلے میں جو ٹیپو سلطان اور مرہٹوں کے خلاف جنگ کرنے سے پیدا ہونگی اُس کی پروا نہیں کیجا سکتی"۔ اس بات کا اندازہ کرنا تو شاید وقت طلب ہوگا کہ ایک سلطنت کو اپنی شہرت اور ذاتی خصوصیات کو برقرار رکھنے کے لئے کس حد تک

[1] مورخہ ۲۸ رفروری ۱۷۹۰ء۔

اور کہاں تک کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہ وہ باتیں ہیں جنکی اہمیت کا صحیح اندازہ
کبھی ہو ہی نہیں سکتا لیکن دنیا کی مختلف اقوام کی تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ جس
قوم نے بھی ترقی کا راستہ اختیار کیا یا عروج حاصل کیا اُس نے ہمیشہ
اس کی پروا کی اور اسی سے صرف اُن ہی قوموں نے غفلت کی جو زوال میں مبتلا
یا فنا ہونے کے قریب تھیں۔ اگر سلطنتوں کے لئے اسے عام اصول کی حیثیت سے
تسلیم کر لیا جائے تو اس کی اہمیت اُس غیر معمولی سلطنت کے لئے اور بھی زیادہ
ہو گی جس کی بنیاد انگریزوں نے مشرق میں ڈالی تھی۔ اس میں تو شبہ کی گنجایش ہی (۱۲۵)
نہیں کہ انگریزوں کی سلطنت کا انحصار عوام کی نیک رائے پر رہا ہے یا بہ الفاظ دیگر
اس کے وجود کا انحصار اُس وقار و رعب و دبدبہ پر قایم ہے جسے ان کی معلومات
ان کی انصاف پسندی اور ان کے طرزِ حکومت کی خوبی و برتری نے اُن کی رعایا کے دلوں پر
نقش کر دیا ہے نیز اس کا مدار کمپنی کی صداقت و راستبازی و فوجی طاقت پر بھی ہے
جس کی ہر ہندوستانی قوم قائل ہو گئی ہے۔

ان احساسات کو اول تو اُس فرسودہ اور ظالم حکومت پر محمول کرنا چاہیئے
جس سے انگریزوں نے اپنی رعایا کو نجات دلائی اور ان کے لئے امن و چین
و خوشحالی کے اسباب مہیا کئے اور دوسرے غداری و بیوفائی کے اُن اصولوں
پر جو ہندوستانی ریاستوں کے باہمی تعلقات میں عام طور سے پائے جاتے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ ہر ہندوستانی ریاست اس قوم کی دوستی کی خواہاں ہوتی ہے
جس نے باوجود مذہب و ملت و زبان کے اختلاف کے دیانت و جرأت کیلئے
ایسا نام حاصل کر لیا ہے جس سے اُس کی دوستی کی بہت قدر بڑھ گئی ہے۔ لہذا
ہندوستان میں انگریزوں کی حالت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس سے زیادہ کوئی
خطرہ ان کے لئے نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی اس نیک نامی میں کسی قسم کا فرق آنے
دیں۔ جس پر کہ برطانوی حکومت کا مشرق میں وجود قایم ہے۔ (۱۲۶)

ہر ملک کا اندازہ اس کے نتائج سے کرنا چاہیئے لہذا اب ہم ان واقعات
پر غور کرتے ہیں جو برطانوی حکومت کے حیدر آباد کے ساتھ اس طرزِ عمل کے اختیار
کرنے سے پیدا ہوئے۔

مرہٹوں کا سلطنت حیدر آباد پر حملہ ۱۷۹۵ء

فروری ۱۷۹۵ء میں حیدر آباد اور مرہٹوں کے درمیان لڑائی اٹل ہو گئی۔ حیدر آباد کی فوجوں پر جو بیدر سے کوچ کر چکی تھیں مرہٹوں کے مقدمۃ الجیش نے جو دولت راؤ سندھیا کی کمان میں تھا حملہ کیا۔[1] ایک جھڑپ کے بعد جس میں دونوں فریق کی افواج درہم برہم ہو گئیں اور جس میں کسی کو فوقیت حاصل نہیں ہوئی تھی نواب میر نظام علیخاں بہادر اپنی بیگمات کی وجہ سے پریشان ہو کر جو میدان جنگ میں ان کے ہمراہ موجود تھیں شب کو کھلے میدان سے واپس ہو گئے اور قلعہ کھرڈلا میں قیام کیا۔ یہ قلعہ تین طرف پہاڑوں سے محصور تھا ایک سمت جو غیر محفوظ تھی اُس پر مرہٹے قابض ہو گئے اور انھوں نے حیدر آباد کی فوج کو اس طرح گھیر کر اُس کے سامان رسد کے تمام وسائل بند کر دیے۔

چند ہفتوں اس طرح محصور رہنے کے بعد آصفجاہ ثانی نے صلح کی جس کی کل شرائط معلوم نہیں ہو سکیں لیکن عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرہٹوں کے اُن تمام مطالبات کو تسلیم کرنے کے علاوہ جو صلح نامۂ اودگیر میں قرار پائے تھے نظام دکن نے پینتیس (۳۵.....) لاکھ سالانہ آمدنی کا علاقہ جس میں دولت آباد کا ضلع اور قلعہ بھی شامل تھا، تین کروڑ روپیہ نقد دشمن کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا۔ اس رقم کا ایک تہائی حصہ نقد اور باقی پچیس لاکھ سالانہ کی قسط سے ادا کرنا قرار پایا۔ ان سب شرایط سے بڑھ کر یہ بات ہوئی کہ اُنھیں اپنے وزیر اعظم الامرا کو بطور ضمانت کے مرہٹوں کے حوالے کرنا پڑا۔ کھرڈلا کے اس واقعے کے بعد نواب نظام الدولہ بہادر حیدر آباد واپس آ گئے اور مرہٹے اپنی اپنی سلطنت کو واپس ہو گئے لیکن یہ ابھی اپنے گھر بھی نہ پہونچے ہوں گے کہ یکایک دو ایسے واقعات پیش آئے جن کا کسی کو گمان تک نہ تھا۔ ادھر تو پیشوا مادھو راؤ کی موت کی خبر پہونچی اُدھر سلطنت حیدر آباد کے ولیعہد کی بغاوت (۱۲۰۷) ۱۷۹۵ء

[1] یہ حملہ ۱۱ر مارچ ۱۷۹۵ء کو ہوا تھا۔
سر جان میلکام نے کھرڈلہ کی لڑائی کے جو واقعات درج کیے ہیں ان کی تائید

ظہور میں آئی۔ ان دونوں واقعات کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک طرف تو انگریزوں کا اثر دربار حیدرآباد میں دوبارہ قایم ہو گیا اور دوسری طرف نواب نظام الملک کا وقار دکن میں بحال ہو گیا۔ ان معاملات پر سرسری نظر ڈالنی ضروری ہے۔ عالیجاہ کی بغاوت سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سلطنت آصفیہ کی کسی تاریخ سے نہیں ہوتی۔ تاریخ گلزار آصفیہ میں جو واقعات درج ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"۱۳ ماہ شعبان ۱۲۰۹ھ ہجری میں قلعہ کہرڑا کے متصل ایک سخت جنگ ہوئی جس میں مرہٹے میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ حیدرآباد کی فوج میں جو جماعت اعظم الامرا بہادر کی مخالف تھی وہ بہادر مذکور کو نیچا دکھانے کی غرض سے مرہٹوں سے مل گئی اور عین جنگ کی حالت میں پیچھے ہٹ گئی جس کی وجہ سے اکثر جاں نثار ہلاک ہوئے۔ اور بعض ممتاز سردار مرہٹوں کے ہاتھوں میں گرفتار بھی ہو گئے۔ رُکن جان بہادر۔ مظفر الملک بہادر و نواب منصور الدولہ بہادر نے انتہائی کوشش کی۔ جنگ کی صورت بدل گئی اور اکثر جاں نثاروں کے ساتھ فتح حاصل کر کے لشکر کو واپس آئے۔ شب میں جب کہ جدال و قتال و آتش باری بند ہو گئی بندگان عالی نے رزمگاہ سے علٰحدہ ہو کر قلعہ کہرڑا میں قیام فرمایا اور سردارن فوج جابجا حفاظت و نگہبانی میں مصروف اور دشمن کی مدافعت میں مستعد ہو گئے۔

ان واقعات کے بعد کشن راؤ بلدل نے پنڈت پردھان کے وکیل کی حیثیت سے صلح کی بات چیت شروع کی جس کی بنا پر پنڈت پردھان سے صلح ہو گئی اسطرح مقدمات نزاع کے تصفیہ کے بعد ۸ رمضان المبارک کو بندگانعالی کے سامنے مسودہ پیش کیا گیا اور ۹ رمضان کو اس پر دستخط ہو گئے۔ جانبین کی قرارداد کے موجب اعظم الامرا مشیر الملک بہادر کو اہل پونا کے حوالہ کر دیا گیا اور ۱۲ ماہ مذکور کو بلدۂ حیدرآباد کو مراجعت عمل میں آئی۔"

مؤلف گلزار آصفیہ نے شرائط صلح تحریر نہیں کیں اور نہ خود سر جان میلکام کو اپنی تحریر کردہ شرائط پر زیادہ اعتماد و وثوق ہے۔ اعظم الامرا کی سوانح سے جن واقعات کا پتہ چلتا ہے انھیں صفحہ (۱۰۷) کے حاشیہ میں درج کر دیا گیا ہے۔

انگریزوں کو بڑا فائدہ پہونچا کیوں کہ اس کی وجہ سے کمپنی اور دربار حیدرآباد کے سابق تعلقات قائم رہ گئے۔

نواب نظام علی خاں بہادر جب بیدر میں مقیم تھے تو انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ دو انگریزی بٹالین جو حیدرآباد کی حفاظت کے لئے مخصوص تھے ان کے ساتھ جنگ میں شریک ہوں لیکن اس مطالبے کو اس خیال سے ٹال دیا گیا تھا کہ ان کی شرکت سے مرہٹوں کو شکایت کا موقع مل جائے گا۔ بہرحال بعد میں یہ قرار پایا کہ دوران جنگ میں یہ بٹالین ان کی سلطنت میں امن قایم رکھنے کے لئے استعمال کئے جائیں۔ (۱۴۸)

جنگ کے بعد آصف جاہ ثانی کا کمپنی کے ساتھ طرز عمل

نواب امیر نظام علی خاں بہادر نے حیدرآباد واپس ہوکر گورنر جنرل کو مطلع کیا کہ اب انھیں ان دونوں کی ضرورت نہیں اور اس کے بعد ہی ان افواج کو کمپنی کے علاقے میں واپس روانہ کردیا۔

بندگان حضرت کو انگریزوں پر بہت غصہ تھا۔ اس غصہ کی وجہ ہی سے انھوں نے یہ کام کیا تھا اور اسی سے متاثر ہوکر انھوں نے اپنی اس معقول اور باقاعدہ فوج کی تعداد بڑھانے اور اس کی تنظیم درست کرنے کیطرف خاص توجہ کی جو فرانسیسی افسروں کی کمان میں تھی۔ اس زمانے میں فرانسیسیوں کو جو کامیابی یورپ میں حاصل ہوئی تھی اس سے یہ لوگ نہایت چالاکی سے بڑھا چڑھا کر ان کے گوش گزار کرتے رہتے تھے[1]

۱۷۹۲ء میں موسیو ریمنڈ کی کمان میں صرف دو بٹالین تھے۔ صلح سرنگاپٹم کے بعد ان میں اضافہ ہو گیا تھا۔ رزیڈنٹ کے بیان کے مطابق تیئیس بٹالین مع بارہ جنگی توپوں کے فرمانروائے دکن کے ساتھ مرہٹوں کے خلاف روانہ ہوئے تھے۔ دارالحکومت پر واپس ہونے کے بعد انھوں نے ان میں مزید اضافہ کرنے کا ہی حکم نہیں دیا بلکہ ان کی باقاعدہ تنخواہ و دیگر

[1] بحوالہ مراسلات برطانوی رزیڈنٹ مقیم دربار حیدرآباد۔

اخراجات کے لئے ایک علاقہ مخصوص کر کے ان کے سپہ سالار کو نہایت وسیع
اختیارات بھی دے دیے۔ برطانوی رزیڈنٹ نے دربار حیدر آباد کو اس قسم
کی کارروائی کے نتائج سے آگاہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی قطعاً پروا نہیں (۱۴۹)
کی گئی اور جب اس فوج کی معقول تعداد کو کڑپہ اور کھم کے علاقوں پر جو کمپنی کی
سرحد سے ملے ہوئے تھے روانہ کرنے کی تجویز ہوئی تو اس پر بھی اعتراض کیا
لیکن اس کا بھی کچھ خیال نہیں کیا گیا۔

اس تجویز سے تو گورنر جنرل کو بھی پریشانی ہوئی اور جن خطرات کا اندیشہ
تھا انھیں اس نے اپنے ایک مراسلے[1] میں پرزور الفاظ میں بیان کیا کہ بندگان
حضرت نے موسیو ریمنڈ کی فوج کو ہماری سرحد کے قریب کڑپہ پر تعین کرنے کا جو
ارادہ کیا ہے اس کی میرے نزدیک حیدر آباد کے رزیڈنٹ نے کافی مخالفت
نہیں کی۔ اسے سختی سے اس کی مخالفت کرنی چاہیئے۔ یہ تجویز شخصی طور پر قابل توجہ
ہی نہیں بلکہ شبہ پیدا کرنے والی ہے اگرچہ ہم بندگان حضرت کی بابت یہ خیال
نہیں کر سکتے کہ وہ خود کمپنی کے خلاف کوئی مخاصمانہ ارادے رکھتے ہیں اور ہمیں انکی
ذات کی بابتہ اس قسم کا خیال کرنے سے گریز بھی کرنا چاہیئے تاہم مجھے
اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ موسیو ریمنڈ اور اس کی فوج کے دوسرے افسر
شمالی سرکار کے خلاف فرانسیسیوں سے ملنے میں کچھ دریغ کریں گے۔ ممکن ہے کہ
یہ بات وقوع میں نہ آئے لیکن اگر ایسا ہوا تو برطانوی مقبوضات کے لئے وہ سخت
مضر ہوگا اس لئے اس بات کی سخت کوشش کرنی چاہیئے کہ نواب میر نظام علیخاں
بہادر ریمنڈ کی فوج کو واپس بلالیں۔ (۱۵۰)

سر جان شور نے اس بارے میں جو مراسلہ نظام دکن کو لکھا اس میں
اشارۃً ان تمام نتائج کو ظاہر کیا جو ایک فوج کو ایسے اشخاص کے تحت رکھنے
سے پیدا ہو سکتے تھے جو علانیہ طور سے انگریزوں کے دشمن تھے اور ان سے
درخواست کی کہ فوج کو واپس بلالیا جائے۔ لیکن رزیڈنٹ کو جو ہدایات اس نے

---

[1] مورخہ ۱۵؍جون ۱۷۹۵ء۔

روانہ کئے اُن میں اُسے اِس معاملے پر صاف صاف گفتگو کرنے کی رائے دی اُس نے اپنے دلائل بیان کئے اور رزیڈنٹ کو صلاح دی کہ انھیں پیش کرکے بندگانِ حضرت کو زیرِ بحث فوج کے واپس بلانے پر راضی کرے اور اپنی تحریر کو ان ہدایات پر ختم کیا۔ "مجھے یقین ہے کہ اگر یہ دلائل صاف لیکن مصالحت آمیز اور اعتدال پسند الفاظ میں پیش کی گئیں تو نظام دکن ہماری درخواست منظور کرلیں گے اور اس فوج کو واپس بلالیں گے۔ میرے نزدیک اس کی بہت اہمیت ہے لیکن اگر وہ اپنے ارادے پر قائم رہیں اور اس فوج کو کڑپہ پر ہی رکھنا چاہیں تو تم اس پر سختی سے اعتراض کرنا اور آخر میں اُنھیں جتلا دینا کہ اس موقع پر مجھے بھی باوجود اپنے تمام پس و پیش کے مجبوراً اپنی سرحد کی طرف کچھ فوج روانہ کرنی پڑے گی۔" اس بات کا بھی پتہ لگتا ہے کہ اسوقت ریمنڈ اُن فرانسیسی افسروں سے بھی خط و کتابت کر رہا تھا جو پانڈیچری میں اسیرانِ جنگ کی حیثیت سے مقید تھے اور لارڈ ہابرٹ جو اسوقت حکومت مدراس کا صدر تھا محض اپنی ہوشیاری سے ان میں سے اکثر کو ریمنڈ تک پہنچنے سے باز رکھ سکا اور انھیں بھاگنے سے پہلے ہی گرفتار کرلیا گیا۔ (۱۵۱)

انگریزوں کی معاونتی فوج کو برخاست کرنا ریمنڈ کی فوج میں اضافہ کرنا اور باوجود برطانوی رزیڈنٹ کی مخالفت و اعتراض کے اس فوج کے ایک حصے کو کمپنی کی سرحد پر متعین کرنا ان سب باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ لارڈ کارنوالس نے اپنی دانائی اور جرأت آمیز مسلک سے جو اثر دربار حیدرآباد میں قائم کیا تھا وہ قطعاً غائب ہوگیا تھا اور برطانوی حکومت اب حیدرآباد سے بھی مدد کی توقع نہیں رکھ سکتی تھی بلکہ اُسے بجا طور پر اس بات کا خوف ہوسکتا تھا کہ وہاں کے ذرائع اب بہت جلد کمپنی کے خلاف استعمال کئے جائیں گے۔ یا تو بااثر فرانسیسی جماعت کے ذریعہ سے حیدرآباد کا پورا علاقہ مرہٹوں کے زیر اثر ہوجائے گا یا اگر اس سے بچنے کی کوشش کی گئی تو وہ انگریزوں کے جانی دشمن ٹیپو سلطان کے ہاتھ میں پھنس جائے گا جو اس وقت اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی سازشوں میں سرگرم تھا اور یہ ترکیب فرانسیسیوں کے موافق بھی تھی کیوں کہ وہ علانیہ طور پر اپنے

(۱۵۲) مفاد کو دکن میں ترقی دینا چاہتے تھے۔

عالیجاہ کی بغاوت اور دربار حیدرآباد سے کمپنی کے دوبارہ تعلقات ۱۷۹۵ء

یہ خطرات جو اُس مسلک کے عمل کے لازمی نتائج نظر آتے تھے خوش قسمتی سے ایک واقعے کی بدولت جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے (یعنے عالیجاہ کی بغاوت سے) رفع ہو گئے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۲۸ر جون کو اُس شہزادے کے فرار ہونے سے برطانوی حکومت اُن سخت مصیبتوں سے بچ گئی جن میں کہ وہ اُس وقت گھر گئی تھی۔

نواب نظام الملک اپنے ولیعہد کے فرار ہونے سے پریشان ہوئے اور انھوں نے انگریزوں کی امدادی فوج کو فوراً حیدرآباد واپس بلانے پر اصرار کیا۔ ریمنڈ کی فوج کو کرڑپہ سے ہٹانے پر رضامندی ظاہر کی اور اُس نازک وقت میں اُس قوم کی مدد و اعانت حاصل کرنے کی پوری کوشش کی جن کی دوستی کو تھوڑے عرصے قبل وہ بری طرح ٹھکرا چکے تھے۔ حکومت انگریزی نے تھوڑے تجربے ہی سے بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ اُس واقعے سے کس قسم کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ انگریزی فوج کو بعجلت ممکنہ ممالک محروسہ کے علاقے میں داخل ہونیکا حکم دے دیا گیا۔ حیدرآباد کی جو فوج عالیجاہ کے خلاف مشغول تھی اس سے ملنے کے لئے یہ فوج بڑھ ہی رہی تھی کہ ولیعہد کی شکست و گرفتاری کی اطلاع ملی۔ مقید ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد عالیجاہ کا انتقال ہو گیا اور نواب میر نظام علی خاں بہادر کو ان کی بغاوت سے جو خوف ہو گیا تھا اُس سے اُنھیں نجات مل گئی۔

اُس موقع پر برطانوی فوج کی اعانت اور توجہ سے انھیں جو فائدہ حاصل ہوا اُس کا انھوں نے پورا پورا اعتراف کیا James Darlympts انگریزی فوج نے اپنے لائق سپہ دار کپتان جیمس ڈارلمپل کی ماتحتی میں رائچور کے قلعہ کی تسخیر اور ایک معقول فوج کی شکست میں جس نے ان کے خاندان کے ایک شہزادہ[1] کے علم کے نیچے بغاوت کی تھی جو جد و جہد اور بہادری ظاہر کی اُس سے اُنھیں
(۱۵۳) امدادی فوج کی اہمیت کا اور بھی اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہوگا۔
۱۷۹۶ء

[1] یہ شہزادہ نظام دکن کے بھتیجے داراجاہ کا بیٹا تھا۔

بندگان حضرت کو اس وقت اس بات کا کتنا ہی اطمینان کیوں نہ ہو کہ انگریزی فوج ملک کے اندر امن برقرار رکھنے کے لئے مفید ہے لیکن اپنے تجربے کی بنا پر وہ اس امر کی ہرگز توقع نہیں کر سکتے تھے کہ اگر ان کے دشمن جن کی دست درازی اور سفاکی کا انھیں ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا ہے حملہ کریں گے تو اس فوج سے مدد مل سکیگی۔ لہٰذا اُن کی خاص توجہ کمپنی کے حریف ہی کی طرف تھی جس کی مدد سے وہ اپنے خیال کے موافق اس حملے کی مدافعت کر سکتے تھے۔ ریمنڈ کی فوج نے عالیجاہ کی شکست میں مستعدی سے کام کیا تھا۔ اس سے اُس کی شہرت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس کی تعداد و تنخواہ میں اضافہ ہوا۔ تنخواہ کی باقاعدہ ادا کرنے کے لئے اُس کے سپہ سالار کو اور زمین عطا کی گئی اس کے ساز و سامان کے لئے توپخانے اور اسلحہ ڈھالنے کے کارخانے تیار کئے گئے۔ اس چھیتی فوج کو تقویت پہونچانے اور مستحکم بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی۔ ریمنڈ نے اپنے مربی کے اس رجحان سے نہایت عقلمندی کے ساتھ فائدہ اٹھایا۔ اپنی فوج کی تنظیم بڑھانے اور دربار کے خاص خاص عہدہ داروں سے تعلقات پیدا کرنے میں خوب کوشش کی لیکن انگریزوں کے خلاف اس کی اور اُس کے
ماتحتوں کی مخاصمانہ روش کا ہر قدم پر اظہار ہوتا رہا۔ اس کی فوجیں فرانسیسی (۱۵۴)
جمہوریت کا (جو اُس وقت انگلستان سے جنگ کر رہی تھی) جھنڈا اٹھاتی سنہ ۱۷۹۶ء
تھیں۔ اُن کی وردی کے بٹنوں پر آزادی کی ٹوپی کی تصویر کھدی ہوئی تھی۔ ہندوستانی سپاہیوں کو انگریزوں کی ملازمت چھوڑنے کے لئے ورغلایا جاتا تھا اور ریمنڈ کی اُس فوج کے چند دستے جو کچھ عرصہ کے لئے سرحد پر مقیم تھے اُن کے افسروں نے مدراس کی فوج میں کسیقدر بغاوت بھی کرادی اور دو ہندوستانی کمیشن افسر مع چند سپاہیوں کے فرانسیسی جماعت سے جا ملے۔

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ اگرچہ انگریزی فوج حیدرآباد واپس بلالی گئی تھی اور ظاہری طور پر دربار حیدرآباد سے دوبارہ تعلقات قایم ہو گئے تھے تاہم یہ فوج محض ضرورتاً دکن میں رکھ لی گئی تھی اور ریاست کے وسائل بتدریج

فرانسیسی جماعت کے ہاتھ میں جا رہے تھے جن کے اغراض و مقاصد علانیہ طور سے برطانوی حکومت کے خلاف تھے۔

نواب نظام الملک نے محض حالات زمانہ سے مجبور ہو کر یہ اختیارات فرانسیسیوں کو دے دیئے تھے لیکن جن خطرات کا اُن سے اندیشہ تھا اُن سے وہ خود بھی ناواقف نہ تھے، اور انھوں نے برابر اس بات کی خواہش کی کہ برطانوی حکومت اُن سے ایک ایسا معاہدہ کر لے جس کے بعد محض حفاظت کی خاطر حیدر آباد کو یہ مہلک راستہ اختیار نہ کرنا پڑے۔

(۱۵۵) ۱۷۹۵ء اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے وعدہ کیا کہ اگر حیدر آباد کی برطانوی فوج میں اضافہ کر دیا جائے تو فرانسیسی فوج برخاست کر دی جائے گی لیکن جن شرائط پر وہ یہ انتظام چاہتے تھے وہ سر جان شور کے نزدیک مرہٹوں کے معاہدوں کے منافی تھیں لہذا کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا۔

اس موقع پر قسمت آزما انگریزوں کو حیدر آباد کی ملازمت میں بھرتی کرا کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی۔ اور باوجودیکہ انھیں برطانوی رزیڈنٹ کی اعانت حاصل تھی لیکن انھوں نے کوئی خاص ترقی نہیں کی اور نہ ان کی جماعت کبھی اس پایہ پر پہونچی کہ اس سے اس بات کی توقع ہو سکے کہ آیندہ وہ کبھی ریمنڈ کی مدمقابل بن سکے گی۔ برخلاف اس کے انگریزی حکومت نے ان ترکیبوں سے اس کی جگہ اپنا اقتدار و اثر قایم کرنے کی جو ناکامیاب کوششیں کیں اُن سے قدرتی طور پر ریمنڈ کی مخاصمت اور جد و جہد میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

واقعات پونہ اور حیدر آباد پر اُن کا اثر

نوعمر پیشوا مادھو راؤ کی موت کی بدولت (جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے) نظام دکن کو بالکل خلاف امید جس کا کبھی خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا ہندوستانی ریاستوں میں ایک حد تک وہی سابق اقتدار و اثر حاصل ہو گیا جو کھرڑلہ کے معاہدے سے ختم ہو گیا تھا۔

اس موت سے جو ۲۷ اکتوبر ۱۷۹۵ء کو واقع ہوئی مرہٹوں کے سرداروں میں جن کے اغراض گدی کی وراثت سے وابستہ تھے بہت

سخت پھوٹ پڑ گئی۔ پونے کے خاص وزیر نانا فرنویس نے حقیقی وارث رگھوبا (۱۵۶)
کے بیٹے باجی راؤ کے بجائے جو سابق پیشوا کا چچا زاد بھائی تھا ایک کمسن بچے کو جو ۱۷۹۵ء
اس کا دور کا رشتہ دار تھا گدی نشین کرانے کی کوشش کی۔

دولت راؤ سندھیا کے وکیل نے اس تجویز کی مخالفت کی اور پیشوا کی موت کی خبر سنتے ہی سندھیا خود باجی راؤ کی مدد کے لئے پونہ روانہ ہوگیا۔ نانا فرنویس نے اس کے مقابلے کے لئے دربار حیدرآباد سے مدد حاصل کرکے اپنی طاقت بڑھانی چاہی اور اعظم الامراء کو رہا کر کے گفت وشنید شروع کی۔ اور ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے اس نے ریاست پونہ کی طرف سے اُن تمام اہم مراعات سے دست برداری کر دی جو اُسے کھرڈلے کے معاہدے سے حاصل ہوئی تھیں۔

اعظم الامراء کو پونہ میں جو اثر حاصل ہوگیا تھا اُسے تقویت پہونچانے اور خود حیدرآباد واپس ہونے کی غرض سے اس نے نہایت ہوشیاری سے کام لیکر اس گفت وشنید کے دوران میں حیدرآباد کے علاقے سے ایک معقول فوج بلالی تھی لیکن دولت راؤ سندھیا اپنی فوج کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور اس طرح اُسے فوقیت حاصل ہوجانے کی وجہ سے یہ ترکیب ایک حد تک کارگر نہ ہوسکی اور سندھیا نے باجی راؤ کو خالی شدہ گدی پر بٹھادیا۔

اس انقلاب کی وجہ سے از سرنو گفت وشنید ہوئی اور یہ طے پایا کہ کھرڈلہ (۱۵۷)
کے معاہدے میں جس رقم اور علاقے کا تصفیہ ہوا تھا اس کا اب صرف ایک چوتھائی ۱۷۹۵ء
حصہ مرہٹوں کو دیا جائے۔ نانا فرنویس سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کے مقابلے میں اگرچہ یہ معاہدہ گراہوا تھا تاہم حیدرآباد[له] کے لئے بہت مفید تھا۔ اس قول وقرار کے بعد اعظم الامراء کو حیدرآباد واپس ہونے کی اجازت مل گئی۔ اور انھوں نے وہاں پہنچکر دوبارہ قلمدان وزارت حاصل کیا۔

له اعظم الامراء کی زندگی کے حالات جو تاریخ گلزار آصفیہ میں درج ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ پونا میں پیشوا مادھوراؤ کے انتقال سے جو انتشار پیدا ہوا اس سے اعظم الامرا

سندھیا کی طاقت اور انگریزوں کی تشویش

اِس موقع پر دولت راؤ سندھیا کو جو کامیابی حاصل ہوئی اُس کی بدولت مرہٹوں کی سلطنت میں اُس کا بول بالا ہو گیا تھوڑے ہی عرصے بعد اُس نے نانا فرنویس کو مقید کیا اور اُس وزیر کو آزاد کرتے وقت اُس نے ایک کثیر رقم وصول کی اور اپنی طاقت مستحکم کرنے کے لئے جن جن باتوں کو وہ ضروری خیال کرتا تھا وہ سب اُس سے منوا لیں۔ اِس موقع پر اُس کے خاندان کے حریف ٹکوجی ہولکر کی موت سے اُس کی طاقت میں اور بھی اضافہ ہو گیا اُس نے ہولکر کے بڑے بیٹے کو قتل کیا اور گدی کے دوسرے وارث کو مقید کرکے اُس کے اکثر مقبوضات پر خود قبضہ کر لیا۔ اِس غصب کے علاوہ اُس نے پیشوا پر جبر کرکے احمد نگر اور اُس کا ملحق علاقہ بھی وصول کیا۔ اِس مقام پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد اُسے محض شہر پونہ پر ہی تسلط حاصل نہ ہو گیا بلکہ صوبہ وار دکن کے علاقوں میں داخل ہونے کا بہترین راستہ بھی ہاتھ آ گیا۔ انگریزوں کو سندھیا کی غیر معمولی طاقت سے جو خوف تھا اُسمیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور اپنی واپسی کا انتظام کر لیا۔ ان سب واقعات کو مؤلف نے مندرجۂ ذیل الفاظ میں ادا کیا ہے۔

"چند روز بعد جب پونے کے سرداروں میں تفرقہ پڑا تو دولت راؤ سندھیا اور باجی راؤ وغیرہ نے مصالحت کرکے اِس تفرقہ کے اسباب دریافت کئے اور بالآخر اِس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ سب فتنہ اعظم الامرا کا پھیلایا ہوا ہے۔ اگر اسی طرح کچھ دن اور گزرے تو بہت سخت خرابی پیدا ہو جائے گی اور پنڈت پردھان کی سلطنت کا سنبھالنا دشوار ہو جائے گا لہذا اب ان کا یہاں قیام مناسب نہیں۔ انھیں حیدرآباد روانہ کرنا بہتر ہوگا۔

دولت راؤ باجی راؤ نے اِس امر پر اتفاق کرنے کے بعد اعظم الامرا سے کہلا بھیجا کہ تمہارا تعلق حضور بندگان عالی سے ہے۔ جس شخص نے تمھیں حضور کی مرضی کے خلاف یہاں رکھا تھا اُسے اپنے اعمال کی سزا مل گئی۔ ہمیں حضور بندگانعالی کی جو درحقیقت ہمارے جد امجد ہیں ہر حال میں خوشنودی منظور و ملحوظ ہے اور حضور کے خط برابر آپ کی

اس کی باقاعدہ پیادہ فوج کی تنظیم و ترتیب سے اس وقت مزید اضافہ ہوگیا کیونکہ اسی فوج کی بدولت ہی اُسے کامیابی حاصل ہوئی تھی اور اسی کے ذریعہ سے وہ اپنی طاقت کو سنبھالے ہوئے تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) طلبی کے لئے آرہے ہیں لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضور کی آستاں بوسی کا ارادہ کریں کوئی شخص مانع نہ ہوگا ہم آپ کو بخوشی رخصت کرنے کے لئے تیار ہیں۔

اعظم الامرا اس خبر سے بہت خوش ہوئے۔ پونا کے سرداروں سے رخصت ہوئے۔ روانگی کے وقت پیشوا باجی راؤ سے ملاقات کی۔ پیشوا مذکور نے قیمتی جواہر اور خلعت فاخرہ عطا کر کے رخصت کیا۔ اسی طرح دولت راؤ سندھیا و رگھوجی بھونسلہ و دیگر اعلیٰ سرداروں سے ملاقات کر کے منزل مقصود کو روانہ ہوئے۔

ابھی دریائے سیونا تک ہی پہونچے تھے کہ نانا فرنویس کا ایک سربمہر خط ملا جس میں اس نے نہایت عجز و انکسار سے یہ تحریر کیا تھا کہ آپ مجھے قلعۂ کوکن میں نامراد اور مقید چھوڑ کر اور اپنا مطلب حاصل کر کے حیدرآباد روانہ ہوگئے۔ مبارک ہو لیکن حالات وقت کے لحاظ سے یہ مناسب نہیں۔ بزرگی و سرداری کا اقتضا یہ ہے کہ باجی راؤ اور دیگر ارکان دولت سے آپ اس عاصی کا تصفیہ کرادیں اور مجھے پونا کی مدارالمہامی پر دوبارہ سرفراز کرا کر فیروزی اور نام آوری کے ساتھ حیدرآباد روانہ ہوں تاکہ اس سلطنت کے قیام تک جناب کا نام یہاں زباں زد خاص و عام رہے۔ .... یہ موقع احسان کرنے کا ہے۔ تغافل و چشم پوشی مناسب نہیں۔ ...... اس عنایت کے معاوضہ میں آپ ایک کرور روپیہ اپنے سفر خرچ اور تین کروڑ روپیہ کی بند گانعالی کی دستاویز مع سند معافی چوتھ صوبۂ بیدر سے کر اور محالات و قلعہ دولت آباد جو اب ہمارے علاقے میں شامل ہیں انھیں واگذاشت کرا کر حیدرآباد تشریف لیجائیے تاکہ جناب کی ناموری اور حضور پرنور کی خوشنودی کا باعث ہو ورنہ اتنے عرصہ بعد خداوند نعمت کی خدمت میں خالی ہاتھ جانے سے کیا لطف حاصل ہوسکتا ہے۔

اعظم الامرا اس اطلاع سے بہت خوش ہوئے۔ باجی راؤ اور سرداران پونا کو خطوط

(۱۵۸) سنہ ۱۷۹۵ء جنرل ڈباؤنی General Debaigne نے جو کثیر فوج ابتدا میں مادھوجی سندھیا کے لیئے تیار کی تھی اُس کی کمان اب جنرل پیرن General Perran کے سپرد ہوئی تھی۔ جوانی میں جو حوصلے ہوتے ہیں اُن کے تقاضے سے دولت راؤ سندھیا نے اپنی اس فوج کو جس کی بدولت اُسے ہندوستان کی دوسری ریاستوں پر نقدر زبردست فوقیت حاصل ہوئی تھی مستحکم بنانے اور تقویت پہنچانے میں ہر ممکن کوشش کی۔ ہر اُس قوت متحرکہ سے کام لیا گیا جو یورپین افسروں کی حرص وطمع

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لکھے اور خود پونا واپس پہنچکر کوشش کی اور سب کو ہموار کرکے نانا فرنویس کے موافق تصفیہ کرادیا اور سب کو نانا فرنویس کی مدارالمہامی پر بھی راضی کرلیا۔ اس کے بعد اپنے خط کے ساتھ پونا کے سرداروں کے خطوط مع باجی راؤ کے عنایت نامہ کے نانا فرنویس کے پاس روانہ کیئے اور قلعہ کوکن سے اُسے بلاکر اپنے پاس ٹھہرایا اور اپنے ساتھ باجی راؤ کے پاس لے جاکر اس کی ملازمت کا تصفیہ کرایا اور دوسرے سرداروں سے بھی اس کی مصالحت کرادی۔

جب باجی راؤ کی مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی تو سب سے پہلے حضور پر نور کی جانب سے قشقہ کی رسم ادا کی گئی۔ بعد ازاں نانا فرنویس کے قول کے مطابق ایک کروڑ روپیہ نقد اور تین کروڑ روپیہ کی حضور کی دستاویز مع سند معافی چوتھ حیدر لے کر اور محال وقلعہ دولت آباد کو واگزاشت کراکر......... دوبارہ سب سرداروں سے رخصت ہوئے اور منزل مقصود کو روانہ ہوکر قلعہ محمد نگر کی عیدگاہ کے میدان میں داخل ہوئے.........

اعظم الامراء کی واپسی اور سرکار دولت مدار کے علاقے میں ان کے داخل ہونے کی خبر سے بندگان عالی کو بے حد مسرت ہوئی"

مذکورۂ بالا بیان سے صاف ظاہر ہے کہ نانا فرنویس نے اعظم الامرا سے جو معاہدہ آخر میں کیا تھا وہ برقرار رہا اور سرجان میلکام نے اس میں ترمیم و تبدیلی کا جو ذکر کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

وہوس اور حوصلوں کو اُبھار سکتی تھی۔ ادنیٰ افسروں کو بھی بڑی بڑی تنخواہیں دیجاتی تھیں
ان کی ادائی پابندی سے ہوتی تھی۔ انھیں صرف معقول تنخواہیں ہی نہیں ملتی تھیں
بلکہ ان کے سپہ سالاروں نے اپنے اثر سے یہ بھی طے کرا لیا تھا کہ ایک معینہ مدت
تک ملازمت کرنے یا جنگ میں زخمی ہونے کے بعد انھیں وظیفے کا حق بھی حاصل
ہوگا۔ اس وظیفے کے قواعد بھی ان کی مرضی اور اُن کے حالات کے موافق رکھے
گئے تھے۔

ہندوستان کے تقریباً تمام اُس علاقے کا انتظام جس پر سندھیا نے
تسلط قایم کر لیا تھا نیز راجپوتانہ کی ریاستوں سے خراج وصول کرنے کا بھی سب
کاروبار اُس نے اپنے فرانسیسی جنرل کے سپرد کر دیا تھا جس کے پاس
اس کی پیادہ فوج کی کمان تھی۔ اس فوج میں پیادوں کی ان متعدد جماعتوں
کے علاوہ جو اُس کے ساتھ کام کرتی تھیں اس وقت متعدد باضابطہ بریگیڈ
موجود تھے۔ ان کی بھرتی زیادہ تر اپنی کے علاقوں سے ہی کیجاتی تھی۔ انگریزی
سپاہیوں کی جو وردی تھی وہی اُن کی تھی۔ جو ہتیار اُن کے پاس تھے وہی انھیں بنا
دیئے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ نہایت عمدہ و باضابطہ اور کثیر تعداد میں توپخانہ
رہتا تھا اور سوار فوج کی بھی ایک معقول تعداد اُن کے ہمراہ رہتی تھی۔

اس فوج کو بلحاظ طاقت و قوت اور تنظیم و ترتیب اور اتفاق و اتحاد (۱۵۹) ۱۷۹۵ء
سندھیا کی تمام دوسری فوجوں پر فوقیت حاصل تھی اور اُس کا سپہ سالار ایک
بڑی حد تک خود مختار ہو گیا تھا۔ لہذا بجا طور پر یہ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے
کہ آئندہ کسی موقع پر (سندھیا اگر اپنے علانیہ حسد کے باوجود خود راغب
نہ ہو تو بھی) اُسے مجبوراً فرانسیسی جماعت کی مرضی کے مطابق ایسی مخاصمانہ روش
اختیار کرنی پڑے جو برطانوی حکومت کے خلاف ہو۔

ٹیپو سلطان کا طرزِ عمل

سر جان شور کے عہد میں ٹیپو سلطان سے بہت کم
مراسلت رہی۔ سلطان کے دو شہزادے جو سرنگاپٹم کے
عہد نامہ کے مطابق بطور ضمانت کے لئے گئے تھے تکمیل معاہدہ کے بعد میسور
پہونچا دیے گئے۔ ایک عہدہ دار انھیں لے کر گیا تھا۔ سلطان اُس کے ساتھ

سرد مہری اور کج خلقی سے پیش آیا۔ اس عہدہ دار کو اختیار دیا گیا تھا کہ اگر وہ سلطان کو انگریزوں کی دوستی حاصل کرنے کی طرف مائل پائے تو تعلقات بڑھانے کی غرض سے گفتگو کرے لیکن سلطان نے اس بارے میں اس کی قطعی ہمت افزائی نہ کی۔ ٹیپو سلطان نے مثل سابق کے اس موقع پر بھی برطانوی حکومت کے خلاف اپنے مخاصمانہ جذبات ظاہر کئے جن سے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ وہ کمپنی پر حملہ کرنے کے لئے صرف موقع کی تاک میں ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جنگ یا صلح کے ذریعے سے دکن کے ذرایع پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد یہ مقصد اچھی طرح پورا ہو سکتا ہے۔

(۱۶۰) ۱۷۹۶ء مرہٹوں سے اتحاد کرنے کی فکر۔ کرنول پر حملے کا ارادہ۔ ۱۷۹۶ء میں گوٹی پر کثیر التعداد فوج کا جمع کرنا۔ اعظم الامرا کی اسیری کے زمانے میں نظام دکن کے بھتیجے امتیاز الدولہ سے سازش کرنا۔ اور اسی زمانہ میں موسیو ریمنڈ سے خط و کتابت کرنا۔ ان سب باتوں کو اس کے خاص مقصد کے حصول کی خواہش پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے پونہ میں ایک انقلاب ہو گیا۔ عالیجاہ کی بغاوت وقوع میں آئی۔ اعظم الامرا دوبارہ اپنے عہدے پر مامور ہو گئے اور انگریزوں کے حیدر آباد سے دوبارہ تعلقات بھی قایم ہو گئے ان سب کی وجہ سے ٹیپو اپنے مقصد میں ناکام رہا۔

سر جان شور کے عہد کے سیاسی معاملات کے اس خاکے کو ختم کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان چند اہم واقعات کا ذکر کیا جائے جو اس زمانے میں نواب کرناٹک اور نواب وزیر اودھ کے دربار میں واقع ہوئے۔

کرناٹک کے معاملات

لارڈ کارنوالس نے نواب کرناٹک سے جو معاہدہ کیا تھا اور بدقسمتی سے جو خراب نتایج اس سے پیدا ہوئے ان کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ نواب محمد علیخاں سے جو معاہدہ کیا گیا تھا، ان کی زندگی میں اسے ترمیم کرانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ان کے انتقال کے بعد جو ۱۳ اکتوبر ۱۷۹۵ء کو واقع ہوا فورٹ سینٹ جارج کے گورنر

لارڈ ہابرٹ نے اس کے جانشین عمدۃ الامرا سے اس میں ترمیم کرانے کی کوشش کو اپنا فرض سمجھا اور گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کو ایک مراسلے[1] کے ذریعہ سے اطلاع دی کہ اس نے انگلستان میں لارڈ کارنوالس اور مسٹر ڈنڈاس سے اس بارہ میں جو کئی مرتبہ مراسلت کی تھی اسی کی بنا پر اس نے گفت وشنید
شروع کر دی ہے۔ حکومت اعلیٰ کی رائے حاصل کرنے تک وہ اس مسئلہ کو ملتوی (۱۶۱)
کرنا اس وجہ سے نامناسب قرار دیتا ہے کہ اکثر خود غرض لوگ اپنے ذاتی اغراض سنہ ۱۷۹۵ء
کی وجہ سے اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ عمدۃ الامرا اس معاہدے میں کوئی ترمیم نہ کریں۔ آخر میں وہ اس بات کی توقع ظاہر کرتا ہے کہ اگرچہ اسے اپنی کوشش میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تاہم انگلستان کو جو کچھ اس نے لکھا ہے اس کے جواب میں وہاں سے ایسی ہدایات موصول ہو جائیں گی جن سے موجودہ انتظام کا خاتمہ ہو جائے گا جو اس کے نزدیک کرناٹک کے ذرایع کے لئے تباہ کن اور برطانوی حکومت کے لئے ایک حد تک باعث ذلت ہے۔

لارڈ ہابرٹ نے جو ترمیمیں[2] پیش کیں وہ یہ تھیں کہ مالی قرضہ کی اقساط کے باقاعدہ ادا کرنے کے لئے جو علاقہ رہن رکھا گیا ہے اسے پورے طور پر کمپنی کے حوالے کر دیا جائے اور نواب نے کمپنی کو پالیگاروں سے خراج کی رقم وصول کرنے کا اختیار دینے کے باوجود ان پر اپنا حق شاہی جو برقرار رکھا ہے اس سے بھی دست برداری دیجائے۔ نیز کرناٹک کے چند قلعے بھی دیدیے جائیں۔

گورنر کا خیال تھا کہ ان میں کی پہلی شرط سے نواب اور کمپنی دونوں کو مساوی فائدہ حاصل ہوگا کیونکہ ان کی وجہ سے اول الذکر کو آئندہ ان قرض
دینے والوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہ رہیگی جن کی بدولت (۱۶۲)
ان کا ملک تباہ ہو گیا ہے نیز دونوں سلطنتوں کے درمیان آئندہ کوئی بحث طلب سنہ ۱۷۹۵ء

[1] مورخہ ۱۵ر اکتوبر۔
[2] عہدنامہ سنہ ۱۷۹۲ء۔

مسئلہ نہ اُٹھ سکیگا' اور آخر میں رہن شدہ علاقے اُس ظلم و تعدی سے محفوظ ہو جائیں گے جن کی بدولت ان کی آبادی بہت کچھ گھٹ چکی ہے اور جس کی وجہ سے عنقریب ان کی آمدنی بھی اسقدر گھٹ جائے گی کہ جس رقم کے لئے انہیں رہن رکھا گیا تھا اُس کی ضمانت کے لئے بھی وہ ناکافی ہو جائیں گے۔

دوسری شرط سے نواب کے اختیار میں محض برائے نام کمی ہوگی مگر کمپنی کے لئے وہ ہنایت ضروری ہے کیونکہ اقتدار شاہی نواب کے ساتھ وابستہ رہنے کی وجہ سے (سرکش پالیگاروں پر) کمپنی کا اثر و اختیار بہت کچھ کم ہو گیا ہے اور کمپنی کی حکومت میں رکاوٹ ہوتی رہتی ہے۔ تیسری شرط یعنے کرناٹک کے چند قلعوں کا قبضہ اس وقت اس خیال سے ضروری سمجھا گیا ہے تاکہ ٹیپو سلطان کے آئندہ حملے کی مدافعت کی غرض سے ملک کی حفاظت کا معقول انتظام کیا جائے۔ نواب کو اس پر راضی کرنے کے لئے لارڈ ہابرٹ بہت کچھ ایثار کرنے کے لئے تیار تھا لیکن سب بے سود ہوا۔ نواب عمدۃ الامرا نے ان سب تجاویز کو قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا اور لارڈ صاحب نے جن دلائل کے ساتھ انھیں پیش کیا تھا ان کے جواب میں لارڈ کارنوالس کے معاہدے پر ہی ثابت قدم رہنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ کیونکہ ان کے باپ نے مرتے وقت انھیں اس پر قایم رہنے کی وصیت کی تھی اور اپنے لئے وہ اسے سب سے زیادہ قابل احترام حکم تصور کرتے ہیں۔ لارڈ ہابرٹ نے اپنے مراسلے عہ

(۱۶۳) سنہ ۱۷۹۵ء میں سنہ ۱۷۹۲ء کے معاہدے کی مکمل ناکامی کو نہایت زوردار الفاظ میں تحریر کیا ہے وہ کہتا ہے کہ "اگر ہم پچھلے واقعات پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس معاہدے کی بنا یہ ہوئی تھی کہ نواب والا جاہ نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ سنہ ۱۷۸۱ء کے عہد نامے میں جن رقوم کا اندراج ہے اُنھیں وہ بغیر رعایا پر بار ڈالے ادا نہیں کر سکتے اور ان کی رعایا کسی مزید بار کے اُٹھانے کے قابل نہیں لیکن کمپنی کو اس رقم میں کمی کرنے پر راضی کرانے اور سنہ ۱۷۹۲ء کے معاہدے سے

عہ مورخہ ۲۴ر دسمبر سنہ ۱۷۹۵ء۔

اُس کی تکمیل ہو جانے کے بعد ہی انھوں نے جو طریقہ ان شرائط کی تکمیل کے لئے اختیار کیا اُس سے ان کی رعایا کی مصائب دس گنی ہو گئیں اور جس مفید اور ہمدردانہ مقصد کا حصول اس کا خاص منشا تھا وہ اس طرح فوت ہو گیا۔

"اُس وقت تو کمپنی کا بجز اس کے کچھ نقصان نہیں کہ کرناٹک کی آبادی کم ہوتی جاتی ہے لیکن جنگ کے زمانے میں بڑی سخت دقتوں کا سامنا ہوگا" آخر میں وہ لکھتا ہے کہ "مجھے سخت افسوس ہے کہ میری منت اور سختی کسی کا بھی نواب پر اب تک اثر نہیں ہوا۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ جو تجاویز میں نے پیش کی ہیں اُن کی مصلحت و منفعت سے وہ ناواقف ہیں بلکہ جیسا کہ انھوں نے اکثر دوران ملاقات میں مجھ سے ذکر کیا ہے اُن میں اس کام کے کرنے کی ہمت ہی نہیں۔ کیونکہ ہندوستانی وزراء اور یورپین مشیر انھیں اس قدر ستاتے اور پریشان کرتے اور دھمکاتے ہیں کہ باوجود اپنی خواہش کے وہ اس کی جرادت نہیں کر سکتے"۔[1] (۱۶۴) ۱۷۹۵ء

حکومت اعلیٰ نے نواب محمد علی خاں کے انتقال کی خبر ملنے کے بعد اور لارڈ ہابرٹ کے خطوط پہونچنے سے قبل ہی حکومت فورٹ سینٹ جارج کو ہدایات روانہ کر دیئے تھے[2] کہ عمدۃ الامراء کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کی جائے کہ وہ اپنی پوری ریاست کمپنی کے حوالے کر دیں۔

اس مراسلے میں حکومت اعلیٰ نے اپنے خیالات ظاہر کئے تھے کہ اُس سے لارڈ کارنوالس کی اُس رائے سے پورا اتفاق ہے جس کا اظہار اس نے نظام کو ایک مراسلہ لکھتے وقت کیا تھا کہ "ملک کی اندرونی حکومت اور مالگزاری کے انتظام کو حفاظت کی ذمہ داری سے علیحدہ کرنے میں جو نقصان و خطرہ ہے اس کا مجھے پورا احساس ہے اور اگر مجھے نواب کی رضامندی حاصل کرنے کی ذرا بھی امید ہوتی تو میں یہ تجویز پیش کرتا کہ ریاست کا کل انتظام اس شرط سے

[1] مورخہ ۲۸ اکتوبر ۱۷۹۵ء۔

[2] مورخہ ۹ جولائی ۱۷۹۳ء۔

کمپنی کے تحت کر دیا جائے کہ نواب کو اس کی آمدنی کا ایک معقول حصہ ملتا رہے۔"
اس کے ساتھ ہی کارنوالس نے یہ بھی لکھا تھا کہ "میرے نزدیک صرف یہی ایک
(۱۶۵) سنہ ۱۷۹۵ء ایسی تدبیر ہے جو نواب صاحب کے حقیقی مفاد اور کرناٹک کی رعایا کی آسائش
اور خوشحالی کے لئے مناسب اسباب مہیا کر سکتی ہے۔"

حکومت اعلیٰ نے آخر میں اس مقصد کی اہمیت پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا کہ "تمھیں اپنی مجلس میں اس مسئلہ پر غور کرنا چاہیے کہ لارڈ کارنوالس نے جن دقتوں کا اظہار کیا ہے کیا وہ اب بھی ایسی ہیں کہ ان کی وجہ سے مذکورہ بالا انتظام میں رکاوٹ ہو سکے۔ اور اگر نواب صاحب کو راضی کرانے کی کوئی ممکن صورت ہو تو ہماری خواہش ہے کہ اس کی ضرور کوشش کی جائے اور ہمیں کامل توقع ہے کہ لارڈ ہابرٹ اپنی قابلیت اور اپنے اثر سے اس انتظام کی تکمیل کر لیں گے جو ملک کی خوشحالی۔ کمپنی کے مفاد اور نواب کے حقیقی آرام و اطمینان کے لئے نہایت اہم ہے۔" حکومت اعلیٰ کے ارکان کو جب لارڈ ہابرٹ کی کارروائی کی اطلاع ملی تو انھوں نے ان میمورل کو نہایت پسند کیا جو اُس نے عمدۃ الاُمرا کے روبرو پیش کی تھیں اور جو
(۱۶۶) سنہ ۱۷۹۵ء درحقیقت ان کی تجاویز کے مقابلے میں نہایت محدود تھیں۔ انھوں نے ہدایت کی کہ حکومت فورٹ سینٹ جارج ان تجاویز کو دوبارہ پیش کرے ممکن ہے کہ نواب کو جب یہ معلوم ہو کہ دونوں حکومتوں کو ان پر پورا اتفاق ہے تو وہ انھیں منظور کر لیں۔ حکومت اعلیٰ نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ نواب کے ذمہ کمپنی کا جو قرضہ ہے (جو توپ خانہ کے قرضہ کے نام سے موسوم ہے) اس کے ادا کرنے کے لئے تناولی کے علاقے کا مطالبہ کرنے اور کرناٹک کے قلعوں پر قبضہ کر لینے سے (جیسا کہ حکومت فورٹ سینٹ جارج نے اپنی دو تجویزوں میں پیش کیا ہے) نواب یہ مطلب نکالیں گے کہ ہم اس طرح سنہ ۱۷۹۲ء کے معاہدے کی ترمیم مجبوراً کرانا چاہتے ہیں اور یہ عہد شکنی ہے! اور چونکہ ہمارے نزدیک انگریزی حکومت کو

ع۵ مراسلہ مورخہ ۳۰ / نومبر سنہ ۱۷۹۵ء۔

مذکورۂ بالا قرضہ کے سلسلے میں نواب کے کسی ایسے علاقے پر قبضہ کا حق حاصل نہیں جس کا اندراج معاہدے میں نہ ہو۔ اور چونکہ ابھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جس کی بناء پر لارڈ کارنوالس کے معاہدے کے مطابق کرناٹک کے قلعوں میں کمپنی کی افواج رکھی جائیں، لہٰذا ہماری رائے میں ان دونوں تجویزوں میں سے کسی کے لئے کوشش نہ کی جائے۔ اسی عرصہ میں سرجان شور نے عمدۃ الامراء کو لکھا کہ "جو تجاویز لارڈ ہابرٹ نے پیش کی ہیں اگر آپ انہیں منظور کر لیں تو وہ آپ کے نیز کمپنی کے لئے نہایت مفید ثابت ہوں گی۔"

گورنر جنرل کی تمام کوششیں اس موقع پر بے سود ثابت ہوئیں۔
نواب نے صاف انکار کر دیا کہ وہ ۱۷۹۲ء کے معاہدے میں کسی قسم کی ترمیم (۱۶۷) ۱۷۹۴ء
کے لئے تیار نہیں اور حسب معمول اس معاہدے کے تحت وہ اپنی بدبخت ریاست کے اضلاع یکے بعد دیگرے سود خواروں کے حوالے کرتے رہے یہی لوگ انہیں برطانوی حکومت کے خلاف ابھارتے رہتے تھے اور مالی معاہدوں کی باضابطہ تکمیل کے لئے انہیں سخت شرح سود پر روپیہ دیتے رہتے تھے۔

رامپور کے روہیلوں کی بغاوت

افغانوں کے ایک سرکش قبیلے نے جو روہیلکھنڈ میں آباد تھا ۱۷۹۴ء میں ایک سخت ہنگامہ برپا کیا جس کی وجہ سے نواب وزیر آصف الدولہ کے علاقے میں بدامنی ہوگئی۔ رامپور کے سردار فیض اللہ خاں کے انتقال کی وجہ سے جو ان روہیلوں کا سردار تھا یہ واقعہ پیش آیا۔ مرحوم کے بیٹوں میں وراثت پر جھگڑا ہوا۔ بڑا بیٹا محمد علی خاں اپنے بھائی غلام محمد کے ہاتھ سے مارا گیا۔ آخر الذکر نے جاگیر پر قبضہ کر لیا اور اپنے اس غصب کی نواب وزیر سے منظوری حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اندازہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب نے اول تو اس پر آمادگی ظاہر کی لیکن انگریزی حکومت سے (جس کے اغراض اس معاملے میں ایک حد تک اس وجہ سے شامل تھے کہ اس نے اس بات کی ضمانت دی تھی کہ رامپوری افغانوں کا جو خاندان نواب کے تحت برسراقتدار ہے وہی وہاں پر برقرار رہیگا) مراسلت کرنے کے بعد باغیوں کو سزا دینے کا

ارادہ کر دیا۔ اس مقصد کے لئے جنرل رابرٹ ایبر کرامبی کی کمان میں فوج روانہ کی گئی (۱۶۸)
اور گورنر جنرل نے فیصلہ کیا کہ اس قصور میں فیض اللہ خاں کے خاندان ہی کو اس
جاگیر سے محروم کر دیا جائے۔ ان ہدایات کے موصول ہونے سے قبل ہی ان سے
ایک جھڑپ ہو چکی تھی۔ رُہیلوں نے برطانوی افواج کو کسیقدر نقصان پہونچا کر
آخر میں شکست کھائی اور اس کے بعد انھوں نے کامل اطاعت قبول کرلی۔ انگریزی
سپہ سالار نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر احمد علیخان کو کمپنی کی نگرانی میں جاگیر کا وارث
قرار دیدیا اور نواب وزیر سے اس کی منظوری حاصل کرلی۔ احمد علی خاں محمد علیخاں کا
کمسن بیٹا تھا جسے غلام محمد نے قتل کیا تھا۔ جب آخرالذکر سردار مع اپنے چند
ساتھیوں کے جنھوں نے اُسے مدد دی تھی برطانوی مستقر پر حاضر ہوا تو ان سب کو
بھی معاف کر دیا گیا۔ اس انتظام سے کامل امن قایم ہو گیا اور جس مصلحت اور انسانی
ہمدردی سے متاثر ہو کر سر ایبر کرمبی نے یہ طرز عمل اختیار کیا تھا اسی کی وجہ سے حکومت
اعلیٰ نے بھی اسے منظور کرلیا۔

معاملات اودھ

لارڈ کارنوالس کو اودھ کے دیوان حیدر بیگ کی قابلیت اور مستعدی کیوجہ سے جن اصلاحات کی توقع ہو گئی تھی وہ دیوان مذکور کے انتقال کے بعد منقطع ہو گئی۔ اسکی جگہ ایک شخص
کا برائے نام تقرر کر دیا گیا۔ لیکن سلطنت کے تمام اختیارات نواب کے چند خاص
دوستوں کے ہاتھ میں رہے جو اول درجے کے اوباش تھے۔ ان میں سے چند
برطانوی حکومت کے تعلقات کے مخالف بھی مشہور تھے۔

(۱۶۹) ۱۷۹۷ء ان حالات سے کمپنی کے مفاد کو جو نقصان پہونچ سکتا تھا اس سے سر جان شور
بخوبی واقف تھا لہذا اس نے ایک موقع پر اودھ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خیالات
کا صاف اظہار کر دیا کہ اگر ریاست کی حکومت کا یہی رنگ رہا تو ہمیں وہاں کی فوجوں
سے بھی مدد کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے اور وہاں بجائے دوستوں کے دشمن ہی
نظر آئیں گے۔

نواب آصف الدولہ نے سر جان شور کے زمانے میں انتقال کیا اور وزیر علی
جسے ریاست کے وارث ہونے کا دعویٰ تھا مسند نشین ہوا۔ مرحوم نواب نے

اپنی زندگی میں ہی اسے اپنا حقیقی بیٹا تسلیم کر لیا تھا لیکن عام طور سے اسے ولدالحرام خیال کیا جاتا تھا اور اس لحاظ سے مسند پر اس کا کوئی حق نہیں تھا لیکن لکھنؤ کے اکثر باوقار اور با اثر لوگ اس کے موافق تھے اور برطانوی حکومت بھی اُس کا حق تسلیم کر چکی تھی۔ اس موقع پر نواب آصف الدولہ کے بھائی سعادت علیخاں نے کمپنی کے اس فیصلے کے خلاف مرافعہ کیا لیکن سر جان شور نے اس کے خلاف فیصلہ کیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے ایک مراسلے میں وہ تحریر کرتا ہے کہ "میں نہایت پس و پیش کے بعد اس نتیجے پر پہونچا ہوں کیونکہ وزیر علی کی بابت جو عام خیال ہے اسے رفع نہیں کیا جا سکتا اور ایسی حالت میں کمپنی کے نام اور انصاف پر بٹہ آنے سے جو خطرہ ہے اس کا بھی مجھے بخوبی احساس ہے۔"

ان خیالات کے ساتھ سر جان شور لکھنؤ روانہ ہوا لیکن اسی مراسلے میں وہ لکھتا ہے کہ "جن انتظامات کا وہاں میرا ارادہ ہے اُن میں وراثت کے فیصلے کو تبدیل کرنے کا قطعاً خیال نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اگر وہاں کی رعایا کو اپنے جدید نواب سے عام نفرت ہوئی، تو مجھے اس معاملے پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت پڑے"[1]۔ ۱۷۹۸ء

سر جان شور کے لکھنؤ پہونچتے ہی وہاں کے دیوان تفضل حسین نے اُس سے ملاقات کی اور اسے مطلع کیا کہ "وزیر علی اور اُس کے ساتھ تمام دوسرے لوگ جو آصف الدولہ کے بیٹے مشہور ہیں ولدالحرام ہیں اور اس میں قطعی شبہ کی گنجایش نہیں۔ لہذا سعادت علیخاں کا مسند پر حق ہے"۔ دیوان مذکور نے یہ بھی بیان کیا کہ "مسند نشینی کے وقت اگرچہ کوئی مخالفت نہیں ہوئی تاہم اس کے بعد سے ہر شخص متحیر اور مایوس ہے اور عام خیال یہ ہے کہ وزیر علی کو مسند نشین کرانے میں عجلت سے کام لیا گیا ہے اور معاملے پر کافی غور نہیں ہوا۔ اور چونکہ برطانوی حکومت نے اسے تسلیم کر لیا ہے اسوجہ سے کسی کی ہمت علانیہ مخالفت کرنے کی نہیں پڑتی" اس بیان نے گورنر جنرل کے دل میں اور بھی شبہات پیدا کر دیئے۔ اور وہ یہ سوچنے لگا کہ اُس کا سابق فیصلہ کس حد

[1] مورخہ ۳ر جنوری ۱۷۹۸ء

تک صحیح ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے وزیر علی کے صحیح النسب ہونے کے متعلق مزید تحقیقات شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اوس کا ولدالحرام ہونا پورے طور سے ثابت ہو گیا۔ ۱۷۹۸ء (۱۷۱)

وزیر علی نے مسند نشینی کے بعد سے جو اپنا طرز عمل رکھا تھا اس پر گورنر جنرل اپنے ایک دوسرے مراسلے میں بحث کرتا ہے اور کثیر مواد کی بنا پر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ وہ ایک تند مزاج غیر مستقل اور ظالم شخص ہے اور اس کے دماغ میں کمپنی کے مفاد کے خلاف سخت مخاصمانہ تدابیر ہیں اور اسے اختیارات سے محروم کرنے کے بعد ہی ان سب باتوں کو علانیہ طور پر ظہور میں آنے سے روکا جا سکتا ہے۔ وزیر علی کی بابت عوام کے جو خیالات تھے اُنھیں بیان کرنے کے بعد وہ اُس عام رائے کی طرف رجوع ہوتا ہے جو اودھ کے باشندے کمپنی اور وزیر کے سیاسی تعلقات کی نوعیت کی بابت رکھتے ہیں۔ نیز دیگر ریاستوں کے ان خیالات کو بھی وہ ظاہر کرتا ہے جو وراثت سلطنت اودھ کے معاملے میں وہ کمپنی کے حقوق کی بابت رکھتی ہیں۔

اس کا بیان ہے کہ اودھ کے باشندے نیز باہر والے یہ خیال کرتے ہیں کہ اودھ سے کمپنی کے معاہدے کچھ ہی ہوں وہ درحقیقت اُس کی ایک تحتانی ریاست ہے۔ سندھیا کا خیال ہے کہ نواب وزیر علی کو شہنشاہ شاہ عالم کی منظوری گورنر جنرل ہی کی بدولت حاصل ہوئی۔ اہل ہند تو یہ سمجھتے ہیں کہ شجاع الدولہ کو سلطنت کمپنی کی طرف سے بطور عطیے کے ملی تھی۔ اور ان کی نگاہ میں نواب وزیر کی حیثیت ایک تحتانی نواب کی سی ہے۔ ان باتوں کے بیان کرنے سے میرا مدعا یہ ہے کہ وزیر علی نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے اُس کا مقابلہ اُس کے پیشرو کے طرز عمل اور عوام کے خیالات سے کیا جائے تاکہ اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ اگر اودھ میں ہمارا اثر جاتا رہا تو سیاسی حلقوں میں ہماری کس قدر سُبکی ہوگی"۔ ۱۷۹۸ء (۱۷۲)

اسی سلسلے میں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ مجھے یہ معلوم کر کے سخت ندامت ہوئی کہ کمپنی کی شہرت کو میرے ایک ایسے فعل سے صدمہ پہونچا ہے جو تمام ذی مرتبہ

لوگوں کے نزدیک محض ناانصافی پر ہی مبنی نہیں بلکہ کمپنی کے لئے باعث ذلت بھی ہے۔ ان خیالات کو اس دلیل سے نہیں ٹالا جاسکتا کہ کمپنی نے وراثت کے فیصلے میں براہ راست مداخلت نہیں کی۔ اب تو وزیر علی کی مسندنشینی کی ذمہ داری کمپنی پر ہی ڈالی جاتی ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی مرضی اور اعانت کے بغیر نواب اپنی مسند پر اب تک برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔"

سر جان شور آخر میں لکھتا ہے کہ میں اس امر سے بھی بخوبی واقف ہوں کہ وزیر علی کو باضابطہ طور پر نواب تسلیم کر لینے سے اور اس کی مصالحت آمیز مراسلت اور اس خط وکتابت سے جو میں نے بعد میں اس سے کی ہے معاملے کی صورت بہت کچھ بدل گئی ہے لیکن میرے نزدیک پہلے اعتراض کے جواب میں تنجور کی وراثت کا مقدمہ بطور مثال کے پیش کیا جاسکتا ہے جس میں امر سنگھ کی گدی نشینی کے گیارہ سال کے بعد نظما کی منظوری سے وراثت (۱۷۲۳ ۱۷۹۸ء
کا سوال اٹھایا گیا اور امر سنگھ کے خلاف فیصلہ کیا گیا۔ دوسرے اعتراض کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ مجھ سے کوئی بات کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے میں انصاف اور عوام کے مفاد کے مقابلے میں اپنے ذاتی احساسات کا لحاظ نہیں کر سکتا۔"

اس کے بعد سر جان شور اپنی تمام دقتوں اور پریشانیوں کو پرزور الفاظ میں تحریر کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ "معاملے پر بخوبی غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ اول تو وزیر علی بلاشک وشبہ ایک فراش[1] کا بیٹا ہے' لہٰذا مسند پر اس کا کوئی حق نہیں۔ یہ فیصلہ تحریری واقعات مختلف خبروں۔ عوام کی رائے اور ان بیانات پر مبنی ہے جو اس کی پیدائش کے متعلق پیش کئے گئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی مسندنشینی کی تائید کرنے سے کمپنی کے نام پر ایسا حرف آئے گا جو مٹائے نہ مٹ سکیگا۔ یہی نہیں بلکہ اغلب یہ ہے کہ وہ ریاست کی تباہی اور کمپنی کے مفاد کی بربادی کا بھی موجب ہوگا۔

تیسرے عدل وانصاف اور کمپنی کی عزت وشہرت اور سیاسی مفاد کا اقتضا بھی یہی ہے کہ حقیقی وارث کو مسندنشین کرایا جائے۔

---

[1] فارسی زبان میں فراش سے وہ ملازم مراد ہے جو خیمہ نصب کرنے اور مکان کی صفائی اور اسی قسم کے دیگر کام انجام دینے کیلئے رکھا جا

چوتھے۔ چونکہ آصف الدولہ کے تمام نام نہاد بیٹے ولد الحرام ہیں لہٰذا اودھ کی مسند کو شجاع الدولہ کے خاندان میں منتقل کر دینا چاہیئے۔

پانچویں۔ وزیر علی کو معزول اور سعادت علی کو مسند نشین کر دیا جائے۔

(۱۴۴) ۱۷۹۸ء اس فیصلے کے بموجب گورنر جنرل نے فوراً وزیر علی کی معزولی اور سعادت علی خاں کی مسند نشینی کا انتظام کیا۔ برطانوی فوج جمع کی گئی اس کی قوت اور نواب مذکور کی عام ناپسندیدگی کی وجہ سے یہ کام بہ آسانی انجام پاگیا۔

سر جان شور نے معاہدے[1] کا حسب ذیل مسودہ مسٹر چیری کے پاس اس ہدایت کے ساتھ بنارس روانہ کیا کہ اسے سعادت علی خاں کی منظوری کے لیئے پیش کیا جائے۔ سعادت علی خاں اس وقت بنارس میں ہی مقیم تھا۔

---

[1] اس معاہدے میں تینتیس دفعات تھیں۔ ریاست کی حفاظت کمپنی کے ذمہ کی گئی جس کے معاوضہ میں سعادت علی خاں سے چھتر ۷۶ لاکھ روپیہ سالانہ کا مطالبہ کیا گیا۔ اگر اس کی کوئی قسط مقررہ وقت پر ادا نہ ہو تو اودھ کا ایک علاقہ جس کی آمدنی دس لاکھ سالانہ ہو کمپنی کے حوالہ کیا جائے اور جب تک کہ جملہ رقوم ادا نہ ہو کمپنی اس پر قابض رہے۔ اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ نواب سعادت علی خاں ان تمام مصارف کو بھی ادا کرینگے جو کمپنی انھیں مسند نشین کرانے میں برداشت کرے گی۔ الہ آباد کا اہم قلعہ کمپنی کے حوالہ کیا جائے اور اس کی مرمت کے واسطے آٹھ لاکھ روپیہ کا وعدہ کیا جائے اور تین لاکھ روپیہ قلعہ فتح گڑھ کی مرمت کے واسطے بھی دیا جائے۔

اس معاہدہ کی رو سے یہ بھی قرار پایا کہ آئندہ سے ریاست اودھ پورے طور سے کمپنی کی حفاظت میں رہے گی۔ اور نواب صاحب محض اس کی حفاظت پر بھروسہ کریں گے۔ لہٰذا وہ ریاست کے اندرونی انتظام کے لئے تینتیس ہزار پیادہ اور دس ہزار سوار فوج سے زیادہ رکھنے کے مجاز نہ ہونگے۔ کمپنی کو اختیار ہوگا کہ وہ ریاست کی معقول حفاظت کی غرض سے جس جگہ مناسب سمجھے اپنے افواج رکھے۔ اس طور سے اس چھاؤنی تبدیل کرنے میں جو مصارف ہوں وہ بھی نواب وزیر ادا کریں۔ کمپنی کی فوجیں جو ریاست میں رکھی جائیں گی ان کی تعداد بعد میں متعین کیجائیگی لیکن اگر کسی وقت ان کی تعداد بارہ ہزار سے زائد ہو جائے تو

۱۷۹۸ء گورنر جنرل نے اس سلسلے میں چیری کو جو ہدایات روانہ کئے[1] ان سے یہ صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ اس نے اس معاملہ میں کوئی قطعی فیصلہ کر لیا تھا جس پر وہ عمل کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ لکھتا ہے کہ "ممکن ہے کہ میں نے سعادت علی خاں کے موافق جو فیصلہ کیا ہے اس میں اب بھی کوئی تبدیلی ہو جائے۔ اس نے سعادت علی خاں سے درخواست کی کہ جو معاہدہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے اسے آپ فوراً بلا کسی شرط واپس و پیش کئے تسلیم کر لیں یا اسے قطعاً رد کر دیں اسی خیال سے اسے رزیڈنٹ کو ہدایت روانہ کی کہ نواب صاحب کو بتلا دیا جائے کہ جس شکل میں معاہدہ روانہ کیا گیا ہے اسی شکل میں اس کی تکمیل ہوگی۔ کیونکہ حالات زمانہ کے لحاظ سے اس میں نہ تاخیر کی گنجائش ہے اور نہ بحث کی۔ سعادت علی خاں نے گورنر جنرل کی پیش کردہ شرائط فوراً قبول کر لیں اور چیری کو یقین دلایا کہ اگر اسے مسند نشین کرا دیا گیا تو وہ نہایت پابندی اور وفاداری سے ان سب کی تکمیل کرے گا۔ اس معاہدہ سے کمپنی اور اودھ کے سیاسی تعلقات چند اہم معاملات میں بالکل بدل
(۱) ۱۷۹۸ء گئے۔ اس کی رو سے ریاست کی حفاظت کمپنی کے ذمہ ہو گئی ریاست کی قوت کم کر دی گئی اور اس کے ذمہ اب صرف پولیس کا کام باقی رہ گیا۔ اودھ والی فوج کے مصارف کے لئے رقم میں جو اضافہ کیا گیا تھا وہ امن کے زمانہ کے لئے کافی تھا اور اگر ریاست کی حفاظت کی غرض سے کسی وقت اس فوج میں اضافہ ضروری ہو تو معاہدہ کی ایک مخصوص دفعہ کی رو سے نواب کو زاید مصارف کی ادائی کے لئے بھی جو اس اضافہ سے لاحق ہوں ذمہ دار قرار دے دیا گیا تھا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ نواب وزیر محض ان کے حقیقی مصارف ماہ بماہ ادا کرے گا۔

لہ۔ مورخہ ۱۴ جنوری ۱۷۹۸ء۔

یہ دفعہ نہایت وسیع تھی لیکن بدیہی طور پر اس کا مقصد یہ تھا کہ کمپنی نے اپنی فوجوں سے نواب کی سلطنت کی حفاظت کرنے کا جو بالکلیہ ٹھیکہ لیا ہے اس میں کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہ ہے، اس دفعہ کی شرائط نہایت صاف اور مکمل تھیں اور معاہدے کے اصول کے مطابق برطانوی حکومت کو تنہا اس بات کا حق تھا کہ وہ یہ اندازہ کرے کہ بیرونی خطرات سے ریاست کو محفوظ رکھنے کے لئے فوج میں کس قدر اضافہ کی ضرورت ہے اس اصول کی تائید صاف طور پر دوسری شرط سے بھی ہوتی ہے جس کی رو سے نواب وزیر بغیر برطانوی حکومت کی اجازت یا علم کے بیرونی طاقتوں دیگر ریاستوں سے تعلقات رکھنے یا کسی قسم کی مراسلت کرنے کا مجاز نہ تھا اس شرط سے صاف ظاہر ہے کہ نواب کو ان معاملات میں کسی قسم کی رائے دینے کا حق نہیں ہو سکتا تھا۔

سنہ ۱۷۹۸ء (۱۷۷۱) سعادت علی کے فیصلے کا علم ہونے سے قبل ہی گورنر جنرل نے چیری کو ہدایات بھیجدیں کہ اگر نواب صاحب مجوزہ شرائط منظور کریں تو انھیں فوراً کانپور روانہ ہو جانا چاہیئے۔ وہاں اُن کی مسند نشینی کے لئے انتظام کیا جائیگا اور اگر وہ اُنھیں قبول نہ کریں تو انکو بتلا دیا جائے کہ اگرچہ میں اودھ کی مسند پر ان کا حق تسلیم کرتا ہوں تاہم انھیں ہمد دیگر جنگ کے خطرے کو اس وقت تک مول نہیں لے سکتا جب تک کہ اُس خطرے کی مناسبت سے کمپنی کو اپنے سیاسی مفاد کی ترقی کی توقع نہ ہو۔ گورنر جنرل کی خواہش کے مطابق سعادت علی فوراً کانپور جا پہنچے اور وہاں سے یورپی فوج کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ لکھنؤ پہونچا دئے گئے اور وہاں ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء کو اُن کی نوابی کا اعلان کر دیا گیا۔

مسند نشینی کے بعد برطانوی حکومت کا ان سے ایک اور معاہدہ ہوا جو چند باتوں میں اُس معاہدے سے مختلف تھا جس پر انھوں نے بنارس میں دستخط کئے تھے۔ دو اہم دفعات جن میں سے ایک کا تعلق ریاست کی آیندہ حفاظت سے تھا جسے کمپنی نے اپنے ذمہ لے لیا تھا اور دوسری کا اس حفاظت کے معاوضہ کی ادائی سے تھا جو نواب کے ذمہ تھی۔ اصولاً بدستور قائم رہیں۔ البتہ ان کی چند ذیلی شرائط میں تبدیلی کر دی

گئی۔

اس معاہدے[2] میں سعادت علیخاں نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ وزیر علی کے لئے بطور وظیفہ کے مقرر کیا۔ وزیر علی گورنر جنرل کی جمع کی ہوئی فوج سے مرعوب ہوگیا اور چونکہ تمام جماعتیں اس سے علیحدہ ہوگئیں تھیں اس لئے وہ اس انتظام کی مخالفت نہ کرسکا۔ اس کے بعد وزیر علی کو بنارس پہونچا دیا گیا۔ سرجان شور نے طے کیا کہ وہ بنارس میں سکونت اختیار کرے۔ اور وہاں آرام سے رہکر اپنا مقررہ وظیفہ خرچ کرے۔ (۱۷۸) ۱۷۹۸ء (۱۷۹

---

[1] سابق معاہدہ کی رو سے یہ قرار پایا تھا کہ اودھ میں کمپنی کی فوج کبھی دس ہزار سے کم نہوگی۔ نواب نے وعدہ کیا کہ اگر کسی وقت اس فوج کی تعداد تیرہ ہزار سے زائد کرنے کی ضرورت ہو تو معینہ تعداد سے زاید کے وہ حقیقی مصارف ادا کرینگے۔ اور اگر بلحاظ ضرورت کسی وقت کمپنی کی فوج آٹھ ہزار سے کم ہو تو انھیں حق حاصل ہوگا کہ جو تعداد اس طرح کم ہو اس کے حقیقی مصارف وہ چھتر لاکھ سالانہ کی رقم میں سے (جو انھوں نے کمپنی کو دینے کا وعدہ کیا تھا) کم کرلیں۔

[2] اس معاہدہ میں نواب نے اپنی گدی نشینی کے مصارف کے لئے بارہ لاکھ روپے دینے کی رضامندی ظاہر کی۔ سابق معاہدے کی ایک دفعہ کی رو سے یہ طے پایا تھا کہ اگر اقساط پابندی سے ادا نہوں تو کمپنی کو ریاست کے کسی علاقہ پر قبضہ کرنے کا حق حاصل ہوگا اور لکھنو والے معاہدے کی ایک دفعہ سے نواب کی فوج کی تعداد معین کردی گئی تھی اب ان دونوں دفعات کے بجائے یہ قرار پایا کہ اقساط کے ناغہ ہونے کی صورت میں نواب اپنے بقایا کی رقم کے لئے اور آیندہ پابندی سے اقساط ادا کرنے کے واسطے ایسی معقول ضمانت پیش کریں گے جو انگریزی حکومت کے نزدیک قابل اطمینان ہوگی۔ نیز یہ بھی طے ہوا کہ مددگار فوج کا معاوضہ بڑھ جانے اور ریاست کی آمدنی پر دیگر مستقل بار پڑ جانے کے باعث نواب اپنے غیر ضروری مصارف اور ملازموں میں مناسب تخفیف کریں تاکہ جملہ مصارف آمدنی سے نہ بڑھنے پائیں ساتھ ہی ساتھ یہ فیصلہ بھی ہوا کہ نواب اس مسئلے میں کمپنی کی حکومت سے مشورہ کریں گے اور اس کی رائے سے تخفیف کے اصول اور انھیں عمل لانے کے تدابیر پر غور کرینگے۔

کمپنی وظیفے کی ضامن بنی اور اس کی معرفت ہی اس کا ادا کیا جانا قرار پایا۔

لاہور پر افغانوں کا حملہ ۱۷۹۷ء

اس جگہ اس اہم خطرہ کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے ہندوستان اور خصوصاً نواب وزیر کی سلطنت میں بدامنی واقع ہونے کا اندیشہ ہو گیا تھا۔ یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ گورنر جنرل نے اس زمانے میں نواب اودھ سے جو معاہدہ کیا اس میں ایک بڑی حد تک اس خطرے کا اثر بھی شامل تھا۔

زماں شاہ والی کابل جو تیمور شاہ کا بیٹا اور مشہور ابدالی کا پوتا تھا ۱۷۹۶ء میں لاہور تک آپہونچا۔ شمالی ہند کے مسلمانوں کے سرکش طبقہ میں اس کی آمد کی خبر سے جوش پھیل گیا، اور ان کے حوصلے بڑھ گئے۔

چونکہ ایک سبک رفتار فوج لاہور سے دہلی بیس منزل میں پہونچ سکتی ہے۔ اس لئے دہلی پر حملے کا خوف ہوا۔ عام خیال یہ تھا کہ چونکہ شاہ مذکور کا تیمور کے شاہی خاندان سے رشتہ ملتا ہے لہذا اس کا حقیقی مقصد اس خاندان کے گرے ہوئے اقتدار کو دوبارہ قایم کرنا تھا۔ اس وجہ سے اُسے اس طبقے کی پوری ہمدردی حاصل ہو گئی۔ اور مرہٹوں میں جو اس موقع پر اس قدر بڑے حملے کے مقابلے کے لئے قطعی تیار نہ تھے بیچینی پھیل گئی۔

شاہ افغانستان کی نقل و حرکت اور مرہٹوں کی کمزوری کی وجہ سے برطانوی حکومت نے اس خطرے کے مقابلے کے لئے تیاری کرنا مناسب تصور کیا۔ اگرچہ یہ یقینی خطرہ نہیں تھا تاہم اس سے چشم پوشی بھی نہیں کیجا سکتی تھی۔

(۱۸۰) کاہنور اور فتحگڈھ کی فوجوں کی تیاری کا حکم دیدیا گیا۔ اور اس بات کا انتظام کر دیا گیا کہ جس جگہ بھی ان فوجوں کی ضرورت پیش آئے انھیں فوراً روانہ کیا جاسکے۔

زماں شاہ کو اپنے ایک بھائی کی بغاوت کی وجہ سے اپنی سلطنت کو واپس ہونا پڑا اور اس کی مراجعت سے تمام خطرہ رفع ہو گیا لیکن جس آسانی سے زماں شاہ لاہور پہونچ گیا تھا اس سے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ سکھوں کی طاقت یا اُن کے اتحاد پر مطلق بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقی واقعات

اور دیگر ذرائع سے یہ ثابت ہوگیا کہ اس قوم میں ایسی پھوٹ ہے جسکی وجہ سے نہ وہ کسی موقع پر متحد ہو سکتی ہے اور نہ افغانوں کے خلاف جن کے آیندہ حملے کا اس واقعہ سے بہت زیادہ امکان ہوگیا تھا حدفاصل کا کام دیسکتی ہے۔

سر جان شور نے اپنے مراسلے مورخہ ۱۴ جولائی ۱۷۹۶ء میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ زماں شاہ اپنے ساتھ جو فوج لاہور لایا تھا اس کی تعداد تینتیس ۳۳ ہزار سے زائد نہ تھی اور اس میں سب کے سب سوار تھے اسلئے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس موقع پر اس کا مقصد ہندوستان پر حملہ کرنے کا نہیں تھا۔ یہ مہم محض تجربہ کے طور پر کی گئی تھی اور اس سے وہ آیندہ حملے کے لئے اندازہ کرنا چاہتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی گورنر جنرل کو اس بات کا یقین تھا کہ اگر زماں شاہ بڑھا چلا آتا تو وہ ضرور دہلی پہونچ جاتا کیونکہ مرہٹوں میں مقابلے کی طاقت نہ تھی اور وہ بہت خوف زدہ تھے۔ اس کا بیان ہے کہ مرہٹوں نے بعد میں کچھ معقول فوج جمع کرلی تھی اور شاہ کے اخراج کے لئے کمپنی سے اتحاد کرنیکی درخواست بھی کی تھی ممکن تھا کہ اس فوج سے وہ دہلی پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لئے اس سے ایک جھڑپ کرلیتے یا اس کی مراجعت کے وقت اُسے کسی قدر نقصان پہنچا لیتے لیکن اسے آگے بڑھنے سے روکنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتے تھے۔ (۱۸) ۱۷۹۶ء

افغانوں کے حملہ کا اَودھ پر اثر

ان خیالات کی بنا پر سر جان شور اس واقعہ کے نتائج پر غور کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ نواب وزیر علی کی ریاست پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ شمالی ہند میں "بیشمار قسمت آزما لوگ ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے ہیں یہ لوگ یا تو محض لوٹ مار کی غرض سے شاہ کی فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں یا اس کے حملے سے فائدہ اُٹھا کر خود ہر قسم کی زیادتیاں کرنے لگتے ہیں"

غلام قادر خاں کے بھائی بمبھو خاں نے بوریا گھاٹ کے قریب ایک بڑی فوج جمع کرلی تھی اور یہ مشہور کر دیا تھا کہ مجھے زماں شاہ سے اس کے متعلق

احکام وصول ہو چکے ہیں، اُس نے رام پور کے متعدد روہیلہ سرداروں کو شرکت
کے لئے خطوط لکھے اور بجز ایک تنہا مثال کے سب سرداروں نے اس واقعہ
کو نصر اللہ خاں سے پوشیدہ رکھا۔

سر جان شور لکھتا ہے کہ "اس واقعہ سے جو معنی اخذ کئے جا سکتے ہیں اُنپر
بحث کی ضرورت نہیں۔ ہمیں رُہیلوں کی طبیعت کا خوب اندازہ ہو گیا ہے
اور ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جب کبھی انھیں موقع ملیگا وہ بغاوت
کر بیٹھیں گے۔ اور اگر زماں شاہ دہلی پہونچ جاتا تو اُس کے لئے یہ نہایت ہی (۱۸۲)
اچھا موقع ہوتا ضلع فرخ آباد کے پٹھان اگرچہ اتنے آزاد نہیں تاہم سرکشی اور غارتگری
میں وہ بھی ان سے کم نہیں۔ اور اگر زماں شاہ ان کے شہر تک پہنچ جاتا تو بجز
کمپنی کی قوت کے کوئی دوسری طاقت نواب وزیر کی ریاست کو بدامنی سے محفوظ
نہیں رکھ سکتی تھی۔ میرا تو خیال ہے کہ ساری ریاست پر قزاق چھا جاتے۔ کچھ عرصہ
کے لئے مالگزاری کی وصولیابی قطعی بند ہو جاتی۔ اور اگر اس کا جلد تدارک نہ کیا
جاتا تو عام بغاوت کا علم بلند ہو جاتا"

اسی سلسلے میں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "اس موقع پر حکومت اودھ کی نااہلی اور
اس کی فوج کی کمزوری کا مزید ثبوت ملگیا۔ الماس کی فوجیں تو غنیمت تھیں لیکن
ریاست کی باقی افواج بلا تخصیص بجائے مدد کے برطانوی فوج کے لئے بارگراں
ثابت ہوئیں۔ اور سخت تاکیدوں اور دھمکیوں کے بغیر نواب وزیر سے بھی کسی قسم
کی جد و جہد یا سامان رسد کی فراہمی کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔

ان واقعات کی بنا پر سر جان شور صحیح نتیجہ نکالتا ہے کہ برطانوی حکومت
کو اپنے مفاد کی خاطر شاہ افغانستان کے آیندہ ارادوں کیطرف سخت توجہ کرنی
چاہیئے اور اس خیال کو پیش نظر رکھ کر وہ اس کے آیندہ حملے کے امکان پر بحث
کرتا ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ "میرے نزدیک زماں شاہ باوجود اپنے تمام ارادوں کے ۱۷۹۶ء ۸۲۱
اس قسم کے حملے کا غالباً خیال نہیں کر سکتا۔ تاہم ممکن ہے کہ اس کے بلند حوصلے
دربار دہلی کی منتوں اور غلط بیانیوں سے مشتعل ہو جائیں اور وہ اپنے دادا کی

تقلید کر کے شمالی ہند کو مشرکوں کے تسلط سے پاک کرنے، یا اپنے سابق ناکام حملے کی ذلت کو مٹانے۔ یا سکھوں سے جنھوں نے اس کی مراجعت کے وقت اس پر حملہ کر دیا تھا اپنی شکست کا انتقام لینے کی غرض سے مشرق کی طرف فوج کشی کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے۔" اسی مراسلے میں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے عام رائے یہ ہے کہ زماں شاہ راست شمالی ہند پر حملہ کرے گا اور سب سے پہلے پنجاب پر اپنا تسلط جمانے کا خیال نہیں کرے گا۔ یہ خیال کتنا ہی بعید از امکان کیوں نہ معلوم ہو لیکن اس کی نوعیت ایسی ہے کہ اسے قطعی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سر جان شور کی یہ رائے ہرگز نہیں تھی کہ زماں شاہ کے ارادوں کو روکنے کے لئے کوئی ایسا انتظام کیا جائے جس کے لئے روپیہ خرچ کرنا پڑے۔ مرہٹوں نے خوف زدہ ہو کر کمپنی سے اتحاد کی جو درخواست کی تھی اس کے متعلق بھی اس نے ابھی یہ طے نہیں کیا تھا کہ یہ مسلک کمپنی کے لئے کس حد تک مفید ہو گا اور آیا کمپنی اور اس کے حلیف نواب وزیر کے مفاد کی خاطر مرہٹوں سے اتحاد کرنا یا انھیں ان کی قسمت پر ۱۸ اگست ۱۷۹۶ء
چھوڑ دینا زیادہ مناسب ہو گا۔ گورنر جنرل کے نزدیک یہ مناسب تھا کہ ہندوستان میں اس قوم کی طاقت کم ہو جائے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی جگہ زماں شاہ کہیں ان سے زیادہ خطرناک ثابت نہ ہو گا۔ اگر زماں شاہ دہلی آ پہونچا تو نواب وزیر کے لئے بڑی دقتوں کا سامنا ہو گا۔ اور اگر افغان اس کی ریاست پر حملہ نکریں تو بھی وہاں امن قایم رکھنے کے لئے خاص جد و جہد درکار ہو گی۔ اس سلسلے میں گورنر جنرل کو روہیلوں کی طرف سے بڑا خدشہ تھا اور اس نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ اگر اس قوم کے چند برگزیدہ اشخاص کو جبراً بطور ضمانت کے گرفتار کر لیا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان تمام باتوں کا اندیشہ ضرور تھا۔ کابل اور قندھار کے شمالی قبائل کو ہمیشہ سے ہندوستان پر حملہ کرنے کا شوق رہا ہے اور ان کے باہمی تنازعات کی وجہ سے ان میں جو کمزوری رہتی ہے اس کے علاوہ اور کوئی دوسری وجہ انھیں اپنے اس ارادہ سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اٹک سے لیکر جمنا تک ملک کی حالت ایسی ہے کہ کوئی

چیز بھی اسکے آگے بڑھنے میں مانع نہیں ہوسکتی۔ ان وحشیوں کو اپنی طاقت پر مبالغہ آمیز ناز ہے۔ اور ان کے بزرگ ہندوستانیوں کو ہمیشہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں لہٰذا وہ ان وقتوں کے خیال سے کبھی حملے سے باز نہیں آسکتے جو ان کے آبا و اجداد کو پیش آچکی ہیں اور جن پر وہ ہمیشہ حاوی آتے رہے ہیں۔ اور سنہ ۱۷۹۷ء (۱۵۵) نہ یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی صحیح طاقت کا اندازہ کرکے وہ اپنے ارادوں کو ترک کردیں گے اول تو انھیں اس کے متعلق صحیح خبر ملنا ہی ناممکن ہے اور اگر انھیں اس کا علم ہو بھی گیا تو وہ اپنی بھدی سمجھ اور اپنے وحشیانہ غرور کی وجہ سے ان فوجوں کی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے جن کی تنظیم کے اصول ان کے اصولوں سے قطعی مختلف ہیں۔

سر جان شور کی رائے بھی کہ ان کے حملے سے مسلمان سرداروں میں اشتعال پھیلنا ضروری ہے اور اگر افغان ان سے مل گئے تو مرہٹوں کو ان کا پسپا کرنا دشوار ہوگا اور خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ انھیں اپنی ان باقاعدہ فوجوں پر بھروسہ کرنا پڑے گا جن میں زیادہ تر ہندوستانی اور فرانسیسی شامل ہیں۔ ان لوگوں کو مرہٹوں سے کوئی خاص ہمدردی نہیں محض اپنی عارضی اغراض کی بنا پر وہ ان سے ملے ہوئے ہیں اور اس خیال کے لئے کافی گنجائش ہے کہ زماں شاہ کو اسلامی سلطنت قائم کرنے کی غرض سے جو اس کا خاص مقصد ہے ان فوجوں کو رشوت دیکر غداری پر آمادہ کرلے میں کوئی دقت نہ ہوگی اور ان فوج والوں کا ایک آقا کو چھوڑ کر دوسرے کی ملازمت اختیار کرنے سے کچھ نقصان نہ ہوگا بلکہ ان کے افسروں کو اپنی حالت سنبھالنے کے علاوہ اپنے بلند حوصلوں کو پورا کرنے کے مواقع حاصل ہونگے اور برطانوی حکومت کی ترقی کے خلاف ان کے جو ارادے ہیں ان کی تکمیل سنہ ۱۷۹۷ء (۱۶۶) کے لئے تو اس طرح انھیں خاص طور پر معقول ذرائع مل جائیں گے۔

مجموعی حیثیت سے ان تمام واقعات پر غور کیا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ شاہ افغانستان کے حملے سے جو خوف برطانوی حکومت اور اس کے حلیفوں کو ہوگا اسکی مدافعت کے لئے مرہٹوں کی طاقت پر کافی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا اور یہ بات بھی بعید از امکان نہیں ہے کہ دولت راؤ سندھیا کی فرانسیسی فوجیں جنگ کے

سپرد شمالی ہند کی حفاظت کیجائے گی وہ زماں شاہ سے ملجانے میں اپنا فائدہ دیکھیں اگر فرانسیسی زماں شاہ سے نہ ملے اور اُن کے سپہ سالار نے ہمت سے کام کیا۔ اور اپنی فوج اور اپنے وسائل سے جو اُسے حاصل ہیں ہوشیاری سے کام لیا اور زماں شاہ کو شکست دیدی تو خود اُس کی نیز اُس کی جماعت کی شہرت بڑھ جائے گی اور فرانسیسیوں کے اثر اور اُن کی طاقت میں اس قدر غیر معمولی اضافہ ہو جائیگا کہ وہ بہت جلد مرہٹوں اور افغانوں سے زیادہ خطرناک ہمسایہ ثابت ہونگے۔

یورپی غنیموں کے خلاف مہمات

سرجان شور کے دور حکومت میں ہندوستان سے چند مہمات یورپین غنیموں کے مشرقی مقبوضات کے خلاف روانہ کی گئیں لیکن یہ سب مدراس سے بھیجی گئیں اور وہاں کے گورنر لارڈ ہابرٹ کی مستعدی اور قابلیت اور شاہی بیڑے کے امیر البحر آڈمیرل رینیر[1] کی پر جوش اعانت کی بدولت برطانوی حکومت نے جزائر لنکا اور ملاکا[2] کے ولندیزی مقبوضات اور ایمبائنا[3] کے دولت خیز جزائر کی تسخیر مکمل کرلی۔ ان سے بھی زیادہ اہم مہمات کی تیاریاں فرانسیسیوں کے مقبوضات ماریشس[4] اور ہسپانیوں کے مقبوضات منیلا[5] کے خلاف کی گئیں تھیں لیکن یہ مکمل نہ ہوسکیں۔ ۱۷۹۷ء میں آخرالذکر مقام کے خلاف ایک فوج روانہ کی گئی اور وہ پینانگ[6] کے خاص بندرگاہ تک پہونچ بھی گئی لیکن یورپ سے کچھ ایسی خبریں وصول ہوئیں کہ اُن کے بعد ٹیپو سلطان کے رویئے اور ہندوستانی ریاستوں کی عام حالت کو پیش نظر رکھ کر حکومت فورٹ سینٹ جارج نے اس مہم کا ارادہ ترک کردیا۔

سرجان شور کی واپسی کے وقت ہندوستانی سلطنتوں کی حالت

اس مدت میں سرجان شور کو لارڈ ٹینماؤتھ[7] کا خطاب مل گیا تھا اور وہ اوائل ۱۷۹۸ء میں انگلستان روانہ ہوگیا۔ سرجان شور کے جائزہ لیتے وقت

---

[1] Admiral Rainier [2] Malacca [3] Amboyna
[4] Mauritius [5] Manilla [6] Penang [7] Teignmouth

مختلف ہندوستانی ریاستوں کی جو حالت تھی اس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اب یہ معلوم کرنا کارآمد ہوگا کہ اس کے دورِ حکومت میں ان ریاستوں میں کس قسم کے تغیرات پیدا ہوئے اور ان کے کیا اسباب تھے اور اس کے واپس جانے کے بعد ان کی کیا حالت رہی۔

میسور

ٹیپو سلطان کی مخاصمانہ روش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنے وسائل بڑھا لئے تھے اور وہ مرہٹوں اور فرانسیسیوں اور دربار حیدرآباد (۱۸۸)
کی برگشتہ جماعت سے سازش کرنے میں مشغول تھا۔

حیدرآباد

حضور شہریارِ دکن کی شہرت اور طاقت میں کمی ہو گئی تھی۔ انھیں اب مثل سابق برطانوی حکومت پر کوئی بھروسہ نہ تھا۔ انھوں نے انگریزی حکومت سے اخلاص و اتحاد قائم کرنے کی جو خواہش کی تھی وہ محض فوری مفاد یا منفعت کی خاطر نہ تھی بلکہ ان کا مقصد انگریزوں سے تعلقات بڑھا کر اپنی سلطنت کی فلاح و بہبودی اور خوشحالی کا مستقل انتظام کرنا تھا لیکن ان میں انھیں مایوسی ہوئی اور لارڈ کارنوالس نے اپنے زبانی وعدوں سے انھیں جو امیدیں دلائی تھیں وہ ختم ہو گئیں۔ اس طور سے مجبور ہو کر انھوں نے فرانسیسی جماعت کا اثر قبول کیا جو اپنی ساخت اور نوعیت کے لحاظ سے برطانوی حکومت کے لئے سب سے زیادہ خطرناک تھی۔

سندھیا کی سلطنت اور عدم مداخلت کے مسلک کے نتائج

اس زمانہ میں دولت راؤ سندھیا کی طاقت نہایت خطرناک طریقے پر بڑھ رہی تھی۔ مرہٹوں کی سلطنت میں وہ ہر لحاظ سے برگزیدہ تصور کیا جاتا تھا۔ اسلئے پیشوا کی آزادی کا خاتمہ کر دیا تھا اور اب پیشوا سندھیا کے دربار کے ایک معمولی عہدہ دار کی نگرانی میں پونا کے شہر پر برائے نام حکومت کر رہا تھا۔

لارڈ کارنوالس کی واپسی کے وقت دکن کی جو حالت تھی وہ اس انقلاب سے بالکل بدل گئی تھی۔ پونا کی فوج اور اس کے وسائل پر اب اُس سردار کا اختیار تھا جو انگریزی حکومت کا دشمن مشہور تھا اور سندھیا کے بلند حوصلوں۔ اس کی

سلطنت کے حدود - اسکی باقاعدہ فوجوں کی تنظیم - اور ان فوجوں کے کمانداروں کے اصولوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن کمپنی کے علاقے پر حملہ کر دے گا -

برطانوی حکومت کو ایسے چند موقعے پیش آچکے تھے جن سے فائدہ اٹھا کر وہ سندھیا کی زبردست طاقت کو بڑھنے سے روک سکتی تھی یا اُس خاندان سے اتحاد کر کے اس بات کا انتظام کر سکتی تھی کہ اس کی طاقت و قوت سے کمپنی کے خلاف کام نہ لیا جائے - ۱۷۹۴ء

پونا میں سندھیا کے تسلط قایم ہونے سے قبل ہی نانا فرنویس کو اُس کی روز افزوں طاقت سے حسد پیدا ہو گیا تھا اور اسنے ہری پنت کی معرفت لارڈ کارنوالس کو پیشوا سے معاونتی معاہدہ کرنے کے لئے پیغام بھیجا تھا لیکن جب مادھو راؤ پیشوا کی موت کے بعد دولت راؤ سندھیا پونا آپہونچا تو اس کا حسد خوف و ہیبت سے مبدل ہو گیا - اس موقع پر نانا فرنویس مرہٹوں کی سلطنت کے اس خاندان کی آزادی برقرار رکھنے کی غرض سے جس کا پونا سے تعلق تھا انگریزوں سے ہر قسم کا معاہدہ کرنے کے لئے بخوشی آمادہ ہو جاتا - اور اس میں کچھ شک نہیں ہو سکتا کہ برطانوی حکومت کی مداخلت اُس کے اس مقصد کو پورا بھی کر دیتی -

کمپنی کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ پیشوا کی گدی کے لئے جو تنازعہ درپیش تھا اُس کا وہ خاطر خواہ فیصلہ کر دیتی اور اپنی طاقت اور اپنے اثر کے زور سے فریقین کو اس فیصلے پر مجبور بھی کر لیتی اور اس طرح کمپنی کی غیر جانبداری سے عوام کے مفاد کو جو صدمہ پہونچنے کا اندیشہ تھا وہ بھی رفع ہو جاتا اور کمپنی کی شہرت میں بھی بہت کچھ اضافہ ہو جاتا - ۱۷۹۵ء

مادھوجی سندھیا نے کئی مرتبہ برطانوی حکومت سے مدد کی خواہش کی تھی اور ایک موقع پر وہ امدادی فوج بھی لینے کے لئے آمادہ تھا - اس کے جانشین دولت راؤ نے بھی کئی مرتبہ یہی خیال ظاہر کیا تھا اور غالباً وہ اپنی گدی نشینی کے موقع پر یا اس وقت جبکہ وہ باجی راؤ کی مدد کے لئے پونا

روانہ ہو رہا تھا یا اُس وقت جبکہ افغانوں کے حملے کی خبر تھی اور اُسے اپنی سلطنت کے لالے پڑے ہوئے تھے ایک۔ ایسے معاہدہ کے لئے بآسانی آمادہ ہو جاتا جس کی رو سے فرانسیسی جماعت کو جو اس کے یہاں اپنا اثر اور رسوخ قائم کر رہی تھی علیحدہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن عدم مداخلت کے مسلک کی وجہ سے جو حکام کمپنی نے انگلستان میں بنا دیا تھا اور جس کی پابندی گورنر جنرل سختی سے کر رہا تھا نہ تو پونا کے انقلاب میں تغیر پیدا کرنے کی کوشش ہو سکی اور نہ اس پر کوئی اثر ڈالا جا سکا۔ اور نہ سندھیا کے خاندان سے تعلقات بڑھانے کی کوئی تدبیر ہو سکی۔ اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ اُس وقت یہ بھی تسلیم کیا جاتا تھا کہ کمپنی کی اس غیر جانب داری سے برطانوی حکومت کے مفاد کے لئے سخت مضر نتائج پیدا ہوں گے۔

(۱۹۱) سنہ ۱۷۹۸ء عدم مداخلت کے مسلک کے جو حامی ہیں انھوں نے بارہا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ پارلیمنٹ نے ہندوستان کی حکومت کے لئے جو قانون نافذ کیا ہے اس کا صحیح منشا محض اسی ایک طریقہ سے پورا ہو سکتا ہے لیکن اس بات کا یقین کرنا اگر نا ممکن نہیں تو کم از کم دشوار ضرور معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت کے قانون سازوں نے جب اپنی عقل سے کام لے کر کمپنی کے حوصلوں پر قیود عاید کئے تھے اور فتوح و ملک گیری کے مسلک کو ممنوع قرار دیا تھا تو (جن قانونی اصطلاحات میں اس مدعا کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے لفظی معنی کچھ ہی ہوں) اُن کا منشا یہ تھا کہ اُن کی ہندوستانی حکومت کو ترقی کی راہ میں جو خطرات پیش آئیں اُن کی مدافعت کا اُسے کوئی اختیار نہ رہے اور ایک ایسی بڑی مملکت کے لئے ایک ناطق حکم صادر کیا جائے کہ وہ اپنے ہمسایوں سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ یا بالفاظ دیگر برطانوی حکومت کو اُس تمام طاقت و اقتدار سے محروم کر دیا جائے جو خود اس نے اپنی عقل و ہمت سے حاصل کیا تھا اور جو درحقیقت ملک میں امن و امان قائم رکھنے کا بہترین و مناسب ترین ذریعہ تھا۔ اس طریقۂ عمل کا سر جان شور کے دور حکومت میں خوب امتحان ہو گیا۔ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے نہایت صدق دلی اور دیانت داری

سے اس بات کی کوشش کی کہ اس کا ہر کام قانون کے مطابق اور اُس کے اعلیٰ حکام کی مرضی کے موافق ہو اور ہر موقع پر اس نے اپنی اعلیٰ قابلیت اور دیرینہ تجربہ کو ان حکام کے احکام کی تعمیل میں صرف کیا۔ اس امتحان کا نتیجہ اُن سب اشخاص کے (۱۹۲)
لئے جن کا برطانوی حکومت ہند سے تعلق ہے خوب سبق آموز ہے۔ اس دور ۱۷۹۸ء
کے واقعات سے یہ بخوبی ظاہر ہو گیا کہ کوئی سیاسی مفاد ایسا نہیں جسے کمپنی چھوڑ دے اور اس کے دشمن اُس پر قابو نہ پالیں۔ ذاتی اثر و اقتدار سے دست بردار ہونا صرف طاقت و قوت ہی کو ہاتھ سے کھو دینا نہیں بلکہ اُسے برطانوی حکومت کے دشمنوں کے ہاتھ میں دیدینا ہے۔ سیاسی معاملات میں ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھ جانے سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ بھی ظاہر ہیں۔ گورنر جنرل صاف طور پر بیان کرتا ہے کہ اُس کے دَور میں بجز سعادت علی کی مسند نشینی کے کوئی اہم کام ایسا نہیں ہوا جسکی انجام دہی پر وہ مجبور ہوا ہو۔

حکومت کے معاملات کو ایک خاص حالت پر رکھنے کے بجائے جو اس مسلک کا خاص مقصد تھا یہ نتیجہ نکلا کہ برطانوی حکومت کی ترقی تو رک گئی۔ اور اس کے ہمسائے آگے بڑھ گئے اور ان کے انقلابات سے اُس کے لئے خطرات میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اور حالات و واقعات کی تبدیلی کے لحاظ سے اُسے کسی خاص مسلک کے اختیار کرنے کا حق باقی نہ رہا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔

چھ سال کے کامل امن کے زمانے میں نہ تو برطانوی ہند کی سلطنت کو کوئی خاص تقویت پہونچی اور نہ اس کے استحکام میں اضافہ ہوا۔ برخلاف اسکے ایک لحاظ سے وہ معرض خطر میں آگئی۔ اگرچہ برطانوی حکومت کی طاقت میں کوئی خاص کمی نہیں ہوئی تھی تاہم دیگر ہندوستانی ریاستوں کی طاقت و ذرائع میں اضافہ ہو گیا تھا۔ حلیفوں کے اعتقاد و اعتبار کا اگر خاتمہ نہیں ہوا تو اس میں بہت کچھ کمی ضرور ہو گئی تھی۔

(۱۹۳) ہندوستان کے بڑے بڑے فرمانرواؤں کے خیالات اور مخاصمانہ جذبات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ برطانوی حکومت کے اس طریقۂ عمل کو اس کی

اعتدال پسندی پر محمول نہیں کرتے تھے بلکہ اُسے اُس کی خاص کمزوری یا خود غرضی پر مبنی تصور کرتے تھے۔

اس عدم مداخلت کے مسلک سے برطانوی مقبوضات ہند کے لئے جو خطرات پیدا ہو گئے تھے اور اُس کے دشمنوں کو اس سے جو فائدہ پہونچا تھا اس کا صحیح اندازہ تو کچھ مدت تک نہ ہو سکا، لیکن جنھیں واقعات کا علم تھا وہ سر جان شور کی واپسی کے وقت باوجود ظاہری امن کے کمپنی کو خطرے سے خالی نہیں سمجھتے تھے۔ اور کرۂ ارض کے اس حصے میں برطانوی مقبوضات کو جن متعدد خطرات سے اندیشہ تھا اُن کا حکام انگلستان کو بھی احساس تھا۔ وہ ان سب خطرات سے خوف زدہ تھے اور انھوں نے بالآخر اپنے اس خوف کا اظہار بھی کیا۔

چوتھا باب

مارکوئس ویلزلی کا دورِ حکومت

۱۷۹۸ء میں ہندوستان کی عام حالت (۱۹۴)

لارڈ ٹینماؤتھ کی جگہ برطانوی ہند میں مارکوئس ویلزلی برسرِ حکومت آیا۔ اس باوقار شخص کو اپنے ذاتی اعزاز اور اپنی دماغی قابلیت کے سبب سے ان اہم خدمات کی بجا آوری میں جو اس کے سپرد کیے گئے تھے بہت سی سہولتیں حاصل تھیں۔ ۲۶ اپریل ۱۷۹۸ء کو وہ ہندوستان پہونچا۔ کرۂ ارض کے اس حصے میں برطانوی مفاد اس زمانے میں نہایت نازک حالت میں تھا۔ ٹیپو سلطان کی مخاصمانہ تدبیریں
اور سازشیں تقریباً مکمل ہو چکی تھیں۔ شہر یار دکن اور سندھیا کے دربار میں فرانسیسی (۱۹۵)
جماعت اپنا سکہ جما چکی تھی۔ دربار پونہ بالکل سندھیا کے رحم و کرم پر تھا راجہ برار بھی جو ایک زمانے سے برطانوی عروج و ترقی کو حاسدانہ نظر سے دیکھتا تھا اب علی الاعلان مخالف سمجھا جاتا تھا۔

ریاست اودھ کی حکومت میں جو تبدیلیاں کی گئیں تھیں اور ان سے جو اشتعال پیدا ہو گیا تھا اس میں اب تک کوئی کمی نہیں ہوئی تھی اور وہاں امن قائم رکھنا جدید فرمانروا سعادت علی خاں کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ برابر اپنے خوف کا اظہار کر رہا تھا اور چونکہ برطانوی حکومت نے مداخلت کر کے اُسے مسند نشین کرایا تھا لہٰذا اپنی حکومت کی اعانت و حفاظت کے لئے وہ برابر اسی سے مدد طلب

کررہا تھا۔

کرناٹک کی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہ تھی لارڈ کارنوالس کے معاہدے میں ترمیم کرانے کی بے سود کوششوں سے عمدۃ الامرا خفا ہو گئے تھے اور اپنی ریاست کی آمدنی قبل از وقت حاصل کرنے کی غرض سے مختلف علاقے سود خواروں کے حوالے کئے جا رہے تھے اور ایسے زمانے میں جبکہ صاف نظر آرہا تھا کہ ریاست کی حفاظت کے لئے روپیہ کی سخت ضرورت پیش آنے والی تھی اس کے وسائل اس طرح تباہ ہو رہے تھے۔

ان مشکلات کے علاوہ ولندیزیوں کے مشرقی مقبوضات اور جزیرۂ لنکا کی (۱۹۶)
تسخیر کی غرض سے حسب ضرورت ایک معقول فوج تیار کرنی پڑی جس کی وجہ سے مالی حالت کمزور ہو گئی تھی۔ ساحل کارومنڈل کی فوج کا ایک بہت بڑا حصہ اب تک اس مہم پر تھا۔

لارڈ ولزلی کو بنگال پہونچتے ہی ٹیپو سلطان کی ایک صریح مخاصمانہ حرکت اور حیدرآباد میں فرانسیسی جماعت کی زبردست سازشوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنی پڑی اگرچہ اُسے ان اہم معاملات پر فوراً رائے قائم کرنی پڑی تاہم اُس نے اُن فریب آمیز سیاسی چالوں سے کام نہ لیا جو عموماً فوری خطرات سے عارضی نجات حاصل کرنے کے لئے اختیار کی جاتی ہیں اور جن پر بھروسہ کر کے مستقل استحکام کو نثار کر دیا جاتا ہے۔ اُس نے کل معاملے کو اچھی طرح سمجھ لیا اور اول اُن تدابیر پر غور کیا جن کی واقعات کے لحاظ سے فوری ضرورت تھی نیز ساتھ ہی برطانوی مقبوضات ہند کی حالت پر ایک وسیع نظر ڈالی اور اپنے مسلک کے ان اصول کو دھیان میں لیا جو اُس کے نزدیک ملک کی خوشحالی اور مستقل امن کے لئے ضروری تھے بعد ازاں اُس نے اپنی حکومت کے ہر شعبے میں اُنھیں جاری کیا اور ساتھ ہی ساتھ فوری خطرات کی مدافعت کے لئے تدابیر اختیار کیں۔

قبل اس کے کہ ویلزلی کے دور کے واقعات بیان کئے جائیں یہ ضروری
معلوم ہوتا ہے کہ ان عام حالات پر غور کیا جائے جن کی بنا پر اُس نے اپنا (۱۹۷)
مسلک طے کیا تھا۔ اس لئے کہ جملہ سیاسی تدابیر کے لئے اول اُن واقعات

و حالات کا مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے جن کی بنا پر پہلے پہل وہ اختیار کی گئیں کیونکہ ایسی تدبیروں کے قرین مصلحت اور معتدل اور مبنی بر انصاف ہونے کا صحیح معیار وہ واقعات و حالات ہی ہو سکتے ہیں۔ جب ان پر عمل کیا جاتا ہے تو صدہا قسم کے واقعات ایسے پیش آجاتے ہیں جن کا نہ پہلے سے وہم و گمان ہوتا ہے اور نہ جن پر کسی طرح عبور حاصل کیا جا سکتا ہے اور نہ جن کے خلاف کوئی حفظ ماتقدم کی تدبیر ہی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔"

ٹیپو سلطان کے خیالات و جذبات کا خوب اندازہ ہو گیا تھا۔ اس میں قطعی شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ ہر ایسی سازش میں شرکت کرنے کے لئے نہایت ذوق و شوق سے تیار تھا جس کا مقصد برطانوی حکومت ہند کا تختہ الٹنا ہو۔ جس حد تک کہ واقعات سے پتا لگتا تھا فرانسیسی اپنی سازشوں میں پہلے سے بھی زیادہ سرگرم تھے انھوں نے جو ذرائع حصول مقصد کے لئے اختیار کئے تھے وہ بھونڈے ضرور تھے اور جس اتحاد کی وہ فکر میں تھے اس کا عمل میں آنا بھی دشوار تھا تاہم یہ سب باتیں ایسی نہ تھیں کہ انھیں حقیر سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ اس زمانے میں فرانسیسی افراد نے حیدر آباد اور سندھیا کے خاص خاص فوجی ذرائع پر قابو پاکر ان دونوں کے درباروں میں اپنا جو اثر قائم کر لیا تھا۔ اس سے بجا طور پر یہ خیال ہو سکتا تھا کہ جب کبھی فرانسیسی کوئی سازش کرینگے تو ان لوگوں کی جدوجہد سے انھیں نہایت معقول مدد ملے گی۔ اس بات میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ افراد بھی اپنے ملک والوں کی تدابیر کو کامیاب بنانے میں سرگرم تھے اور ان کے اثر و اقتدار کا جو حال اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے بجا طور پر نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انھیں اپنی مرضی کے موافق کام کرنے کے لئے معقول ذرائع بھی حاصل تھے۔ (۱۹۸)

اس زمانے میں دیگر حالات بھی ٹیپو سلطان اور فرانسیسیوں کے مطلب کے موافق تھے۔ لارڈ کارنوالس نے ٹیپو کی ہوس اور اولوالعزمیوں کے روکنے کی غرض سے جو اتحاد ثلاثہ قائم کیا تھا اس کا خاتمہ سر جان شور اپنے عدم مداخلت کے مسلک سے کر چکا تھا اور جن واقعات کا اوپر ذکر ہو چکا ہے ان سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر ٹیپو سلطان سے جنگ چھڑی تو دربار حیدر آباد و پونہ انگریزوں کا ساتھ

دینے کے بجائے ان کے خلاف ہی کام کرینگے

اس موقع پر دولت راؤ سندھیا کا شمالی ہند سے غائب ہونا برطانوی مفاد کے لئے اتنا ہی مضر تھا جتنا کہ اس کا پونہ میں قیام کرنا کیونکہ جب تک وہ دکن میں مقیم تھا پیشوا کی طاقت اگر معدوم نہیں تو اس کی محکوم ضرور تھی۔ علاوہ ازیں اس کے پاس فرانسیسی افسروں کی کمان میں ایک زبردست پیادہ فوج موجود تھی اور اس فوج کے سپہ داروں کے قومی جوش اور سندھیا کی اولوالعزمیوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس بات کا امکان نظر آتا تھا کہ برطانوی حکومت سے اس کی ایک جھڑپ ضرور ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ خوف بھی لگا ہوا تھا کہ اگر سندھیا کی غیر موجودگی میں زماں شاہ نے شمالی ہند پر حملہ کر دیا تو اس علاقے کی حفاظت کا پورا بار کمپنی پر پڑ جائے گا۔ سندھیا کی سلطنت کی غیر محفوظ حالت کی وجہ سے اس وقت اس حملے کا امکان اور بھی زیادہ معلوم ہوتا تھا۔

ان حالات میں لارڈ ویلزلی نے ٹیپو سلطان اور فرانسیسیوں کی سازشوں ۱۷۹۹ء
کا خاتمہ کرنے اور برطانوی حکومت کو ہندوستان میں مستحکم بنانے کی غرض سے چند سیاسی اصول قائم کئے ان مقاصد کے حصول کے لئے اس نے جو ذرائع اختیار کئے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ ٹیپو کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی کئے بغیر اس کی اور فرانسیسیوں کی جد وجہد کے خلاف معقول انتظام ہو جائے گا اور جنگ لازم آنے کی صورت میں کامیابی بھی یقینی طور پر حاصل ہوگی۔

حیدرآباد کے مدار المہام عظیم الامرا پونہ سے واپس ہو چکے تھے وہ انگریزوں کے موافق اور اپنی فوج کی فرانسیسی جماعت کے دل سے مخالف تھے تاہم بغیر کمپنی کی مدد کے وہ اسے برخاست بھی نہیں کر سکتے تھے اور نہ مصلحت اس کی مقتضی تھی لہذا جب تک کہ انگریزوں کی اعانت حاصل نہ ہوتی اور مرہٹوں کی دست درازیوں کے خلاف معقول انتظام نہ ہوتا وہ اپنے آقا کے مفاد کا لحاظ کرتے ہوئے شہریار دکن کو فرانسیسی افواج کی علیحدگی کی صلاح نہیں دے سکتے تھے۔

نو عمر پیشوا باجی راؤ بھی اس وقت دولت راؤ سندھیا کی غلامی سے

(۲۰۰) نجات حاصل کرنے کی فکر میں تھا اور برطانوی حکومت کی مداخلت کا خواستگار تھا۔ پونہ کے رزیڈنٹ نے اپنی تحریر مورخہ یکم جون میں خیال ظاہر کیا تھا کہ "برطانوی افواج کے پہونچتے ہی پونہ میں پیشوا کا اقتدار دوبارہ قایم ہو جائے گا اور ٹیپو نے جو حملہ کر دیا ہے اُس کی وجہ سے سندھیا کو ہماری نوجوں کی نقل و حرکت پر کچھ اعتراض بھی نہیں ہو سکتا اور نہ اُس کی اس وقت یہ حیثیت ہے کہ وہ ہمارا مقابلہ کر سکے"۔

لارڈ ویلزلی کے خیالات

ہندوستان کی اصلی حالت یہ تھی جسکا لحاظ کر کے ویلزلی نے جدید مدافعانہ معاہدوں کے ذریعہ سے حیدرآباد اور پونہ کی امداد حاصل کرنے کا ارادہ کیا یا بالفاظ دیگر یہ انتظام کیا کہ ان سلطنتوں کی طاقت وقوت اور اُن کی آمدنی کے وسائل برطانوی حکومت کے خلاف استعمال نہ ہو سکیں۔ اُس نے یہ طے کر لیا تھا کہ جب تک ان مقاصد کے حصول کے لئے خط و کتابت جاری رہے اور جس حد تک کہ اُس کی حکومت کی حفاظت وعزت اُسے اجازت دے ٹیپو سلطان کے ساتھ اعتدال سے کام لیا جائے۔ اُسے اس امر کا بھی یقین تھا کہ اگر اُسے دربار حیدرآباد اور پونہ میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو گئی تو برطانوی حکومت کو ایک ایسی غیر معمولی حیثیت حاصل ہو جائے گی کہ خود ٹیپو سلطان اُس کے خلاف اپنی تمام کوششیں بے سود تصور کریگا اور بالآخر اپنا رویہ بدل دے گا اور فرانسیسی حلیفوں کو چھوڑ دیگا اور اپنے مقبوضہ علاقے پر قناعت کر کے (اور اپنے حقیقی مفاد کا لحاظ کر کے) انگریزوں اور ان کے حلیفوں سے تعلقات قایم کر لے گا۔

(۲۰۱) مذکورۂ بالا واقعات سے ظاہر ہے کہ جن خیالات کی بنا پر ویلزلی نے یہ طرز عمل اختیار کیا تھا وہ جسقدر اعتدال و انصاف پر مبنی تھے اسی قدر وسیع اور صحیح بھی تھے اور اس نے یہ طریقہ محض مدافعانہ طور پر اور امن و امان قایم کرنے کی غرض سے اختیار کیا تھا کہ نہ حرص و طمع اور ملک گیری کی ہوس سے۔ لارڈ ویلزلی کے زمانے میں جو اہم سیاسی واقعات پیش آئے اُن کا جب مختصراً ذکر کیا جائے گا تو یہ بات اور بھی زیادہ صاف ہو جائے گی۔

اگرچہ اُس کی آمد کے وقت دربار حیدرآباد کے حالات برطانوی مفاد کے خلاف تھے لیکن چند واقعات ایسے پیش آگئے تھے جن کی وجہ سے ویلزلی کو اپنی کارروائی میں کامیابی کا یقین ہوگیا تھا۔ عظیم الامرا کے یہ عروج کا زمانہ تھا اور وہ ہر ایسے معاہدے کے لئے آمادہ تھے جس کی بدولت حیدرآباد کو مرہٹوں کی دست درازیوں اور حملوں کے خلاف جن سے حیدرآباد کی طاقت کو کافی نقصان پہونچ چکا تھا آیندہ کے لئے نجات مل سکے۔ چونکہ اُن کی اسیری کے زمانے میں اُن کے حریفوں نے ٹیپو سے سخت سازشیں کی تھیں لہذا وہ سلطان مذکور کی جدو جہد اور اس کے حوصلوں سے بھی بہت کھٹکتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ اپنے تجربے کی بنا پر اس امر سے بھی خوب واقف تھے کہ فرانسیسی سپہ داروں
کی کمان میں جو فوج ہے اُس سے سلطنت کی فوجی طاقت میں کتنا ہی اضافہ (۲۰۲)
کیوں نہ ہو جائے وہ حیدرآباد کو اُن حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے جن کا کہ ہمیشہ اندیشہ لگا رہتا ہے ہرگز کافی نہیں ہوسکتی۔ مزید براں وہ اس بات سے بھی غافل نہ تھے کہ اگر اس فوج کی تعداد میں اضافہ کیا گیا اور اُس کی تنظیم اعلےٰ پیمانہ پر کی گئی تو اس سے برطانوی حکومت کو حسد ہوگا اور اس طور سے ممکن ہے کہ علانیہ طور پر اُس کے مفاد سے تصادم ہو جائے اور دربار حیدرآباد کو ہندوستان کی اُس تنہا طاقت سے بھی جنگ کرنی پڑے جو معقول طریقے سے اُس کی حفاظت کرسکتی ہے اور اُس کے اقتدار کو سنبھال سکتی ہے۔

حیدرآباد سے مراسلت اور معاہدہ

ان خیالات کی بنا پر عظیم الامرا اس وقت انگریزوں کے ان مراسلوں پر التفات کرنے کے لئے آمادہ تھے جن میں انھوں نے حیدرآباد سے تعلقات بڑھانے کی خواہش ظاہر کی تھی اور چونکہ ان کے نزدیک حیدرآباد کو تمام خطرات سے بچانے کا بہترین ذریعہ یہی تھا اس لئے وہ خود بھی اس بات کے خواہاں تھے کہ اس سلطنت کے انگریزوں سے قریبی تعلقات قائم ہو جائیں لیکن اپنے آقا کے تعصبات پر حاوی آنا اُن کے لئے کوئی آسان کام نہ تھا۔ شہریار دکن یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ فریقین کی طاقت و قوت میں اس قدر زیادہ فرق ہے

کہ اُن کی حکومت آیندہ اپنی سلطنت کی حفاظت کے لئے کلیتاً برطانوی حکومت کی محتاج ہو جائے گی۔ عظیم الامراء نے اسے تسلیم کیا لیکن اس کا یہ جواب دیا کہ ایسی طاقت پر بھروسہ کرنا جس کے قول و قرار پر اعتبار ہو اور جس کی قوت ہماری حفاظت کے لئے کافی ہو مرہٹوں کے لامتناہی مطالبات اور ٹیپو سلطان کے زبردست حوصلوں اور اولوالعزمیوں کے شکار بنے رہنے سے بہتر ہے۔ (۲۰۳)
علاوہ ازیں یہ بھی ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں سلطنت حیدرآباد ان مملکتوں میں سے کسی ایک سے اتحاد قائم کئے بغیر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔ لہذا دانشمندی اس میں ہے کہ ایسی سلطنتوں کی برائے نام دوستی کے مقابلے میں جن کا مقصد محض ملک گیری اور غارت گری ہو اور جن کے متعلق بارہا یہ تجربہ ہو چکا ہو کہ وہ اپنے قول اور معاہدوں کی کبھی پابندی نہیں کرسکتی ہیں اُس حکومت کے تعلقات کو ضرور ترجیح دینی چاہیئے جو ہماری حفاظت بھی کرسکے اور امن و امان کی نعمتیں بھی مہیا کرسکے۔ بالآخر فرمانروائے دکن کے شبہات و تردوات ان دلائل سے رفع ہو گئے اور انھوں نے فرانسیسی افواج کی علٰحدگی اور انگریزوں کی امدادی فوج میں اضافہ کرنے کے متعلق کمپنی سے مراسلت کرنے کی اس شرط پر اجازت دے دی کہ برطانوی حکومت سلطنت حیدرآباد کو مرہٹوں کے ناانصافانہ مطالبات سے محفوظ رکھنے کا صریح وعدہ کرے۔

جن واقعات کی وجہ سے گورنر جنرل کو حیدرآباد سے تعلقات بڑھانے کی فکر ہوئی تھی وہ اتنے اہم تھے اور برطانوی مقبوضات کی بقا کا اُن پر اسقدر مدار تھا کہ اس وقت وہ یہ خیال نہیں کرسکتا تھا کہ اس مسلک کا دربار پونہ پر کیا اثر پڑے گا۔ واقعات کا لحاظ کرتے ہوئے فرانسیسی افواج کی علٰحدگی اور دربار حیدرآباد میں انگریزوں کا کامل اثر قایم ہو جانے کے مقابلے میں ان خیالات کی قطعی پروا نہیں کیجا سکتی تھی۔

(۲۰۴) یہ نہایت اہم معاملات تھے کیونکہ ان کی بدولت ایک نازک وقت میں اُن تمام خطرات کا جو اس وقت کمپنی کے مقبوضات کو درپیش تھے محض ازالہ ہی نہیں ہو جاتا تھا بلکہ کمپنی کو اس قدر ممتاز حیثیت حاصل ہو جاتی تھی کہ ٹیپو سلطان

غالباً اُس سے مرعوب ہو کر اپنی تمام مخاصمانہ سازشوں سے باز آجاتا اور اس انجام بد سے بچنے کی غرض سے جس کا وہ اپنے افعال کی وجہ سے مستحق ہو گیا تھا بہت جلد مراعات حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔

جب فریقین کے مفاد و اغراض اس اتحاد سے اس قدر زیادہ وابستہ تھے تو ظاہر ہے کہ گفت و شنید میں زیادہ دقتیں پیش نہیں آسکتی تھیں لہذا معاہدہ طے ہو گیا جس کی رو سے برطانوی فوج حیدرآباد میں مستقل کر دی گئی اور سابق معاہدے سے جو دو بٹالین طے پائے تھے اُن میں چار کا اضافہ کیا گیا۔ شہریار دکن نے وعدہ کیا کہ وہ فرانسیسی فوج کو اپنی ملازمت سے علیحدہ کر دیں گے اور جب سلطنت میں قیام کرنے والی جملہ انگریزی افواج [۵۴] دارالحکومت پہونچ جائیں گی تو فرانسیسی افسر بھی برطانوی حکومت کے حوالے کر دئے جائیں گے۔ دوسری طرف برطانوی حکومت نے وعدہ کیا کہ وہ غیر جانب داری اور انصاف کے اصول پر حیدرآباد اور پونہ کے تنازعات کو بہ حیثیت ثالث کے طے کرے گی اور اپنے فیصلے پر پونہ کی رضامندی حاصل کرے گی اور رضامندی حاصل نہ ہونے کی صورت میں وہ حیدرآباد کو مرہٹوں کے نامناسب اور بیجا مطالبات سے محفوظ رکھے گی۔ فرانسیسی (۲۰۵) افواج کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ معاہدے میں اُس کی علیحدگی کے متعلق کوئی دفعہ شامل کر دینا تو بہت آسان تھا لیکن اُس کی تکمیل بہت زیادہ دقت طلب معلوم ہوتی تھی لیکن اتفاق سے اس کی تکمیل کے لئے ایک نہایت اچھا موقع مل گیا۔ ریمنڈ جس نے یہ فوج ابتدا میں تیار کی تھی نہایت قابل شخص تھا اور اسے نہایت معقول اثر بھی حاصل تھا۔ معاہدہ طے پانے سے چند ماہ قبل اُس کا انتقال ہو گیا اور اُس کے جانشین کے انتخاب پر جھگڑا ہوا اور فوج میں نفاق پھیل گیا۔ اگرچہ

---

[۵۳] بتاریخ یکم ستمبر ۱۷۹۸ء

[۵۴] فوج کا معاوضہ بجائے ستاون ہزار سات سو تیرہ (۵۷۷۱۳) روپیہ ماہانہ کے دو لاکھ ایک ہزار چار سو پچیس (۲۰۱۴۲۵) روپیہ ماہانہ یا چوبیس لاکھ سترہ ہزار ایک سو (۲۴۱۷۱۰۰) روپیہ سالانہ قرار پایا۔

ظاہری طور پر اس کا فیصلہ ہو چکا تھا اور جنرل پیرون (Perron) اس کی جگہ مقرر ہو گیا تھا لیکن اس شخص میں اتنی قابلیت نہ تھی اور نہ اس کا اتنا اثر تھا کہ وہ کامیابی کی توقع کے ساتھ کوئی خاص طرزِ عمل اختیار کرتا جیسا کہ اس موقع پر ایک قابل سپہ سالار کو اپنی فوج کی علٰحدگی کو روکنے کی لیئے اختیار کرنا چاہئے تھا

فرانسیسی فوج کی حیدرآباد سے علٰحدگی ۱۷۹۸ء

گورنر جنرل نے اس معاہدے کی تکمیل کرانے کے لیئے جو ذرائع اختیار کیئے وہ ایسے زبردست تھے اور ایسی پھرتی سے کام لیا گیا کہ اُن کی کامیابی میں کچھ شبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا فوج کی چار بٹالین اور توپیں جو گفت وشنید کے دوران میں حیدرآباد کی سرحد پر جمع کر دی گئی تھیں فوراً حیدرآباد روانہ کر دی گئیں اور یہ فوجیں وہاں کے سابق دو بٹالین سے جا ملیں[۱] ان کے وہاں پہونچتے ہی معاہدے کی اس دفعہ کی تعمیل کا مطالبہ کیا گیا جس کے مطابق فرانسیسی (۲۰۶)
افواج کی علٰحدگی طے پائی تھی لیکن دربار حیدرآباد نے خواہ کسی سازش کی وجہ سے یا محض مرعوب ہو کر اس کی تعمیل میں پس وپیش کیا اور عظیم الامرا بھی جو کسی قدر کمزور واقع ہوئے تھے خود اپنی تجاویز کی تکمیل سے پیچھے ہٹنے لگے لیکن برطانوی رزیڈنٹ کے احتجاج کے بعد شہریار دکن اور اُن کے وزیر دونوں نے اپنے معاہدے کی پابندی کا پاس کیا رزیڈنٹ[۲] نے اُنھیں صاف الفاظ میں مطلع کر دیا کہ گورنر جنرل کے احکام کے بموجب ایسی حالت میں جبکہ معاملات اس حد تک پہونچ گئے ہیں وہ جملہ شرائط کی پوری تکمیل کے علاوہ جو حیدرآباد نے برطانوی حکومت سے طے کی ہیں کسی اور بات پر راضی نہیں ہو سکتا اور ایسی حالت میں جب کہ فرانسیسی افواج کی علٰحدگی کا فیصلہ مشہور ہو چکا ہے اُسے قلیل سے قلیل مدت کے لئے بھی برقرار رکھنا کمپنی کے مفاد کے لئے سخت مضر ہوگا لہذا اگر اس معاملے میں پس وپیش جاری رہا تو مجبوراً انگریزی فوجوں کو فرانسیسی افواج پر حملہ کرنے کا

---

[۱] بتاریخ ۱۰ / اکتوبر ۱۷۹۸ء

[۲] میجر جیمس اکیلس کرکپیٹرک Major James Achilles Kirkpatrick

حکم دے دیا جائے گا اور اُس سے جو برے نتائج پیدا ہونگے اُن کی ذمہ داری دربارِ حیدرآباد پر ہوگی اور اُنھیں اس کی کمزوری اور بے وفائی پر محمول کیا جائے گا اس مراسلے کے ساتھ ہی فوجوں نے کوچ شروع کردیا[1] اور اس طرح رزیڈنٹ کا

---

(۲۰۷) [1] اکتوبر کی ۹ تاریخ سے ۲۲ تک فوجوں کی نقل وحرکت جاری رہی - چونکہ اس معاہدے کی تکمیل میں پابندی معاہدے سے زیادہ ان فوجوں کا دخل تھا اس لئے ان کا تھوڑا سا ذکر ضروری ہے۔ ۹ر تاریخ کو کرنل رابرٹس کی چار بٹالین مع توپ خانے کے سواد حیدرآباد میں جا پہنچیں - اُسی دن فرانسیسی فوج کی چھ بٹالین اپنی چھاؤنی میں داخل ہوئیں - یہ دونوں فوجیں موسیٰ ندی کے دائیں کنارے پر مقیم تھیں - عظیم الامراء کو خوف ہوا اور غالباً اس خیال سے کہ ان میں آپس میں کہیں جھڑپ نہ ہو جائے یہ تجویز پیش کی کہ کرنل رابرٹس ندی کے بائیں کنارے پر چلا جائے - رزیڈنٹ نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ انگریزی فوج کی دو بٹالین کرنل ہنڈمن (Hyndman) کی کمان میں بائیں کنارے پر موجود ہیں اور وہ وہیں مقیم رہیں گی -

اکتوبر کی ۹ تاریخ سے ۱۹ر تک ہرممکن تدبیر کی گئی اور معاہدے کی تکمیل سے بچنے کی ہرممکن کوشش کی گئی - نواب نظام علی خاں بہادر اپنی حفاظت کے خیال سے حیدرآباد سے قلعۂ گولکنڈہ میں منتقل ہوگئے فرانسیسی جماعت کے ساتھی بے شمار تھے - پایگاہ کی فوج کو جس کا سپہ سالار فرانسیسیوں کے موافق تھا دارالحکومت پر کوچ کرنے کا حکم دے دیا گیا - جب معاملے نے یہ رنگ اختیار کیا تو ۱۹ر تاریخ کو رزیڈنٹ نے وزیر سے ملاقات کی اور اُس کا یہ شبہ کہ وزیر معاہدے کی اس دفعہ کی تعمیل سے جس کا تعلق فرانسیسی افواج کی علیحدگی سے ہے بچنا چاہتا ہے یقین کی حد تک پہونچ گیا لیکن اب یہ موقع پیچھے ہٹنے کا نہ تھا - فرانسیسی صفوں پر حملہ کرنے کا فوراً انتظام کیا گیا - کرنل ہنڈمن ایک ایسے مقام پر پہونچ گیا جہاں سے وہ فرانسیسی فوج کے عقب پر گولہ باری کرسکتا تھا اور ضرورت کے وقت ایک سخت ضرب سے اُس کے گودام اور بارود خانے میں آگ بھی لگا سکتا تھا کرنل رابرٹس چند ایسے بلند مقامات پر قبضہ کرنے کے لئے تیار تھا جہاں سے وہ اُس فوج کے قلب پر حملہ آور

(۲۰۸) عزم ظاہر ہوگیا اور ساری کشمکش ختم ہوگئی۔ فرانسیسی فوجوں کو احکام روانہ کر دیے گئے کہ شہریار دکن نے یورپی افسروں کو برخاست کر دیا ہے اور سپاہیوں پر اُنکی اطاعت لازم نہیں ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ہوسکتا تھا۔ ان تمام تیاریوں سے جن کا صحیح اندازہ کرنل ہنڈرسن کے کوچ سے ہوگیا تھا دربار حیدرآباد کو واضح ہوگیا کہ بجز معاہدے کی تکمیل کے یا علانیہ طور پر فرانسیسی جماعت کا ساتھ دینے کے اب کوئی چارہ نہیں۔ موجودہ حالت میں فرانسیسی توپخانہ حرکت نہیں کرسکتا تھا اور ایک آدھ وار ہی میں اُس کا خاتمہ ہوجانا بعید از امکان نہ تھا حیدرآباد کی جن فوجوں کی اعانت پر اس جماعت کا اب مدار تھا وہ اس وقت تک شہر حیدرآباد میں داخل نہیں ہوئی تھیں۔ انگریزوں کا ارادہ تھا کہ ان کے پہونچنے سے قبل ہی حملہ شروع کر دیا جائے۔

اور عظیم الامرا کا سارا پس وپیش محض خوف کی وجہ سے تھا لیکن معاہدے کی عدم بجا آوری سے اب جو نتائج ظہور پذیر ہوئے ان کا خوف اُن نتائج سے کہیں زیادہ تھا جو فرانسیسی فوج کی علیحدگی کی دفعہ کی تعمیل سے پیدا ہو سکتے تھے لہٰذا فرانسیسی افسروں کی یک لخت علیحدگی کا حکم دیدیا گیا ان کی تعداد بیعتالیس تھی۔ ان سب کو اسیران جنگ کی حیثیت سے انگریزوں کے حوالے کرنے کا حکم ہوگیا۔ فرانسیسی فوج کے سپاہیوں کو چار مختلف دستوں میں تقسیم کرنے اور انھیں ہندوستانی افسروں کی کمان میں رکھنے کی ہدایت ہوئی۔ جب یہ احکام فرانسیسی صفوں میں پہونچے تو سپاہی اور افسر دونوں میں سخت طوفان اور بدنظمی برپا ہوگئی۔ فرانسیسی سپہ سالار موسیو پیرون نے رزیڈنٹ سے کہلا بھیجا کہ علیحدگی کے احکام ملنے کے بعد سے اُس کی اور دیگر افسروں کی خواہش ہے کہ وہ برطانوی حکومت کی حفاظت میں پہونچ جائیں اور اُنھیں اُس سے اُس رحم وکرم کی پوری توقع ہے جو تہذیب یافتہ قوموں کا شعار رہا ہے۔ اس کے جواب میں ان افسروں کو اطمینان دلادیا گیا کہ ان کے ساتھ ہر لحاظ سے نرمی کا برتاؤ کیا جائے گا۔ ۱۲ مارچ کو پیرون نے درخواست کی کہ رزیڈنسی کے کسی عہدہ دار کو فرانسیسی چھاؤنی میں بھیجا جائے تاکہ تمام سرکاری نیز ذاتی مال و اسباب اس کے حوالے کر دیا جائے۔ مددگار رزیڈنٹ کپتان میلکام کو روانہ کیا گیا لیکن اُس کے وہاں پہونچنے سے قبل ہی بلوہ ہوگیا اور میلکام بھی باغیوں کے ہاتھ میں پڑ گیا۔ اُس کی خوش قسمتی سے فوج میں چند سپاہی ایسے موجود تھے جو چار سال قبل کمپنی کے انتیسویں[۲۹] رسالے میں ملازم رہ چکے تھے

اور جو اُن کی اعانت کرے گا وہ باغی تصور کیا جائے گا اور سزا کا مستحق ہوگا۔ اس فرمان (۲۰۹)
کے ساتھ ہی برطانوی فوجوں کی دھمکی اور فرانسیسی جماعت کے باہمی نفاق کی وجہ
سے اس فوج میں بلوہ ہوگیا، اس سے فوراً فائدہ اُٹھایا گیا۔ حیدرآباد کی زبردست
سوارہ فوج نے انگریزوں کی جملہ فوج سے مل کر فرانسیسی چھاؤنی کا محاصرہ کرلیا۔ (۲۱۰)
جن سپاہیوں نے بلوہ کیا تھا اُن سے وعدہ کیا گیا کہ اگر وہ ہتیار ڈال دیں گے تو
اُن کی تنخواہ بھی ادا کردی جائے گی اور اُنھیں ملازمت بھی ملے گی۔ تھوڑی بحث
کے بعد وہ اس بات پر راضی ہو گئے اور اس طور سے کل فوج سے جس کی تعداد چودہ
ہزار تھی اور جس کے پاس معقول توپ خانہ بھی تھا اور جس کے بارود خانے بھرے
ہوئے تھے اور جس کے گودام میں ہر قسم کا فوجی سامان موجود تھا ہتیار ڈلوا لئے
گئے اور ایک جان بھی ضائع نہ ہونے پائی۔

اس اہم سیاسی معاملے کی یہ مختصر تاریخ ہے جس حکمت عملی سے سب کام ترتیب
دیا گیا تھا اور جس تیزی اور سختی سے اُس کی تکمیل کرائی گئی اُس سے برطانوی حکومت

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ اور محض تنخواہ کے اضافے کے لالچ سے فرانسیسی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ اپنے
سابق افسر کو مصیبت میں دیکھ کر اُن کی وفاداری نے جوش کیا اور اُنھوں نے کوشش کر کے اُس کی جان
بچالی اور میلکام نے ان سے اصرار کیا کہ وہ اُس کے ساتھ رزیڈنسی میں چلیں اور اُن سے محض معافی
کا ہی نہیں بلکہ انعام و ترقی کا بھی وعدہ کیا لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہمارا مقصد محض آپ کی
جان بچانا تھا۔ اور پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مل گئے۔

۲۱ کی تمام رات اور تمام دن ایک عام ابتری برپا رہی اور ادودھم مچا رہا۔ پہر دن اور
تقریباً تمام یورپی افسر بچ کر رات کو انگریزوں کے خیموں میں پہونچ گئے۔ ان کی حفاظت
کا جو انتظام کیا گیا اور جو سلوک اُن کے ساتھ ہوا اُس سے کم از کم اُس وقت تو ان کے
تمام مخاصمانہ خیالات فراموش ہو گئے۔ ۲۲ اکتوبر کو دن نکلتے ہی فوج کا محاصرہ کرلیا
گیا۔ کرنل رابرٹس نے اپنے اعتدال اور خوبی انتظام سے شام تک اس کثیر تعداد اور باقاعدہ
اور مسلح فوج سے ہتیار ڈلوا لئے اور ایک جان تک ضائع نہ ہونے دی۔

کے حریفوں میں خوف اور اُس کی رعایا اور حلیفوں میں خوشی ہوئی اور مزید اعتماد پیدا ہوگیا۔ اس قسم کے خیالات سے ویلزلی کو آیندہ اپنے کاموں میں کامیابی حاصل کرنے میں معقول مدد ملی۔

دربار پونہ سے مراسلت اور ناکامی

اسی مدت میں اور اسی تیزی سے حیدرآباد کی طرح دربار پونہ میں بھی معاہدے کے لئے کارروائی جاری رہی لیکن وہاں اس کا نتیجہ کچھ اور ہی ہوا حیدرآباد میں جو کارروائی کی گئی تھی اُس کی اطلاع باضابطہ طور پر پیشوا کو کردی گئی تھی لیکن اس فرمانروا نے خواہ اپنے کمزور مشیروں کی صلاح سے یا دولت راؤ سندھیا کے اثر سے برطانوی حکومت کو اپنے اور دربار حیدرآباد کے معاملات میں ثالث تسلیم کرنے پر رضامندی ظاہر نہ کی۔

سندھیا شمالی ہند سے غائب اور دکن میں مقیم تھا۔ اس طرح برطانوی حکومت کو
اس سے دہرا نقصان پہونچ رہا تھا لہذا کمپنی کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اسے پونہ (۲۱۱)
چھوڑنے پر مجبور کرے نیز شمالی ہند میں اس وقت انگریزی فوج کی جو طاقت و قوت تھی اور اس علاقہ میں سندھیا کی جو کمزور حالت تھی اُس سے ظاہر تھا کہ اگر برطانوی حکومت چاہتی تو اُس کے زرخیز ترین علاقوں پر بہ آسانی قبضہ کرلیتی لہذا انگریزوں نے اس موقع پر اُس کا جو لحاظ کیا اس میں نہ کسی غلط فہمی کی گنجایش تھی اور نہ اُس میں کوئی خاص مقصد پنہاں تھا اُس کا مطلب صاف نمایاں تھا۔

اس زمانے میں سندھیا کے دربار میں کسی قدر تبدیلی ہوئی اور ایک موقع پر اس بات کی توقع ہوگئی تھی کہ پونہ میں جو بحث جاری ہے اُس کا خاطر خواہ فیصلہ ہوجائے گا لیکن اس میں مایوسی ہوئی اور کچھ گفت و شنید کے بعد جس میں پیشوا کی طرف سے کمزوری اور التواء کا اظہار ہوتا رہا اور سندھیا اپنی سازش کے ساتھ دوغلے پن سے کام لیتا رہا۔ برطانوی حکومت نے مجبوراً سلطان کے خلاف کارروائی شروع کردی اور ان دونوں سرداروں میں سے کسی ایک سے بھی خاطر خواہ

لہ اگست ۱۷۹۹ء

سمجھوتہ نہ ہوسکا بلکہ اس بات کا شبہہ ہوگیا کہ اس وقت ان کا (اور خصوصاً سندھیا کا) رجحان زیادہ تر غنیم سے مل جانے کا ہے۔

اب ہم ان واقعات پر بحث کریں گے جن کی وجہ سے ٹیپو سلطان سے (۲۱۲)
جنگ ہوئی اور مارکوئس ویلزلی نے اس موقع پر نیز جنگ چھڑنے سے قبل جو طرز عمل اختیار کیا اُس پر بھی غور کریں گے۔

لارڈ کارنوالس نے ٹیپو سلطان سے جو معاہدہ کیا تھا اُس کے بعد ہی سے سلطان کے ہر فعل سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ برطانوی حکومت سے سخت انتقام لینا چاہتا ہے اور اُس سے اخلاص پیدا کرنے اور اُسے منانے کی جو مسلسل کوششیں کی گئیں اُن سے اُس کے انتقامی جذبے میں بجائے کمی کے اضافہ ہی ہوتا رہا۔ حیدرآباد میں اُس نے جو سازشیں کیں پونہ۔ ماریشس۔ کابل اور ترکی کو اپنے جو سفیر اُس نے روانہ کئے وہ سب اسی مخاصمت کے نتائج تھے۔ برطانوی حکومت کا ہندوستان میں خاتمہ کرنا اُس کا خاص مقصد تھا اور وہ ہمیشہ اسی ادھیڑبن میں لگا رہتا تھا۔ اگرچہ اُس کے خیالات اور ارادوں کا انکشاف بہت پہلے ہوچکا تھا اور اس سے برطانوی مفاد کو سخت نقصان پہونچنے کا بھی اندیشہ تھا تاہم (ویلزلی کی آمد سے قبل) اُس سے علانیہ مخاصمت کی کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی تھی۔ لارڈ ویلزلی کے آنے کے بعد ہی والئ ناڈ (Wynad) کے سرحدی تنازعہ کے متعلق اُس سے مراسلت ہوئی لارڈ موصوف نے اس موقع پر اُس کی فوجوں کی نقل و حرکت کو نظرانداز کیا اور تنازعات کو آپس میں نہایت نرم و صلح آمیز شرائط طے کرنے کے لئے پیش کئے۔ اس طور سے سلطان کو انگریزوں کے خلاف کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملا اور درحقیقت اُس نے کبھی کوئی شکایت کی بھی نہیں تھی بلکہ وہ تو اپنے خطوط میں برابر کمپنی کے طرز عمل پر اطمینان اور اوس کی دوستی پر کامل اعتماد ظاہر کرتا رہا تھا۔

ان واقعات کے بعد گورنر جنرل کو یہ معلوم کرکے سخت تعجب[1] ہوا کہ سلطان (۲۱۳)
کے سفیر جزیرۂ فرانس پہونچے ہیں اور وہاں اُن کی مرضی اور شرکت سے ٹیپو کی ملازمت میں رضاکاروں کی بھرتی کے لئے اعلان شائع کیا گیا ہے اور اس اعلان میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ سلطان عنقریب فرانسیسی حکومت سے مل کر انگریزوں پر حملہ کرے

[1] ۱۸ جون ۱۷۹۸ء

والا ہے۔ اس مخاصمت پر علانیہ طور سے احتجاج کرنا نامناسب اور قبل از وقت خیال کیا گیا اور جب پہلی مرتبہ اس کی خبر ملی تو اس کے باور کرنے میں بھی تامل ہوا۔ گورنر جنرل نے یہ مناسب سمجھا کہ صبر سے اس کی تحقیقات کی جائے اور جب تک کہ اس کے ثبوت میں مواد فراہم نہ ہو کسی قسم کی کارروائی نہ کی جائے حتیٰ کہ احتیاط کے خیال سے دفاعی تدابیر بھی نہ اختیار کی جائیں۔

ان تحقیقات کے نتائج کو لارڈ ویلزلی نے اپنے مراسلے[۱] میں وضاحت سے بیان کیا ہے اور سلطان کے سفیروں کا جزیرۂ فرانس پہونچنا اور اُن کی جملہ کارروائی کی پوری کیفیت وہ مندرجۂ ذیل الفاظ میں تحریر کرتا ہے۔

ٹیپو نے اپنے دو سفیر روانہ کئے جو راستے میں منگلور اُترے اور وہاں سے اواخر جنوری ۱۷۹۸ء میں جزیرۂ فرانس پہونچے۔

پورٹ نورد آوسٹ (Port Nord Ouest) کے بندرگاہ میں داخل (۲۱۴)
ہوتے ہی انھوں نے ٹیپو سلطان کا جھنڈا بلند کیا۔ فرانسیسی حکومت نے علانیہ اور باضابطہ طور پر ان کا نہایت شاندار طریقے سے استقبال کیا اور وہاں وہ سرکاری مہمان ہوگئے۔ ان کے وہاں پہونچنے سے قبل نہ تو فرانسیسیوں کو کسی طرح ٹیپو کی مدد کرنے کا خیال تھا اور نہ اُنھیں یہ خبر تھی کہ وہ کمپنی کے خلاف جنگ کرنے والا ہے۔

ان کے پہونچنے کے دوسرے دن ایک اشتہار شایع کیا گیا جس کا مضمون تقریباً وہی تھا جو سرکاری اعلان کا تھا۔ اکثر مقامات پر یہ اعلان چسپاں کر دیا گیا اور شہر میں اس کی فوراً اشاعت ہوگئی۔ ایک شخص ترکی لباس میں منگلور سے ان سفیروں کے ساتھ ہو لیا تھا۔ یہ شخص غیر معمولی طور سے فرانسیسی و انگریزی زبان نہایت صحیح و تیز بولتا تھا۔ وہ نہایت قابل اور ذی علم شخص تھا۔ ہندوستان کی اکثر زبانیں بھی جانتا تھا۔ وہ بصرے میں عبداللہ کے نام سے، سورت میں درویش کے نام سے اور جزیرۂ فرانس میں طلماش کے نام سے مشہور تھا۔ بنگال میں بھی

---

[۱] مورخہ ۱۲ اگست ۱۷۹۸ء۔

وہ کچھ مدت رہا تھا اور وہاں بھی طلماش ہی کے نام سے مشہور تھا۔ سفیروں نے سرکاری اعلان کی قطعی مخالفت نہ کی بلکہ علانیہ طور پر اور صاف الفاظ میں انھوں نے بھی یہی بیان کیا کہ ہندوستان میں عنقریب برطانوی مقبوضات کے خلاف (۲۱۵) ایک اقدامی جنگ ہونے والی ہے ان کی قیام گاہ سے بھی اشتہارات تقسیم ہوئے اس پر بھی انھوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ طلماش کی گفتگو کسی قدر گول مول اور مائل بہ احتیاط تھی لیکن اس کا بھی خلاصہ یہی تھا۔ ان سب باتوں سے وہاں عام خیال یہ پیدا ہو گیا کہ ٹیپو برطانوی مقبوضات پر عنقریب حملہ کرنے والا ہے اور یہ خبر اس قدر زیادہ مشہور ہو گئی کہ جو لوگ اس وقت جزیرۂ فرانس سے ہندوستان پہو نچے اور جنھوں نے یہ واقعات بیان کئے ان کا خیال تھا کہ ان کے یہاں پہو نچنے سے قبل ہی ٹیپو سے جنگ چھڑ گئی ہوگی لیکن ان سب نے متفقہ طور پر یہ بھی بیان کیا کہ ٹیپو کے ان تمام خیالات کا وہاں خوب مضحکہ اوڑایا جا رہا ہے۔ فرانسیسی حکومت نے سفیروں کی موجودگی ہی میں اعلان کی تعمیل شروع کر دی اور انھوں نے سلطان کی طرف سے وعدے کر کے حکومت کو رضا کاروں کی فراہمی میں مدد دی۔ ان سفیروں نے یہ بھی کہا کہ جتنے آدمی بھی فراہم ہو سکیں انھیں روانہ کر دیا جائے اور رضا کاروں کی بھرتی میں انھیں وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ اعلان کے مقاصد اور شرائط کے بموجب سفیروں کی مدد سے ننّو افسر اور پچاس سپاہی ٹیپو کی ملازمت کے لئے فراہم کئے گئے۔ ان افسروں میں سے نہ تو کسی کو فوجی تجربہ حاصل تھا اور نہ ان میں کوئی خاص قابلیت تھی۔ سپاہی جزیرے کے ذلیل ترین طبقے کے آدمی تھے۔ ان میں چند تو اپنی مرضی سے بھرتی ہوئے تھے اور کچھ جیل خانے سے نکال کر جبراً جہاز پر لاد دئے گئے تھے اور چند حبشی اور دوغلے (۲۱۶) تھے یہ تھی وہ فوج اور اس کے رضا کار جن سے سفیروں نے سلطان کی طرف سے معاہدے کئے۔

۷ مارچ ۱۷۹۸ء کو سفیر یہ فوج اپنے ہمراہ لے کر فرانسیسی جنگی جہاز پری نیوز (Preneuse) پر روانہ ہوئے اور اپنے اسی مقصد کے لئے مزید رضا کار حاصل کرنے کی غرض سے انھوں نے علانیہ طور پر بوربن جانے کا خیال ظاہر کیا۔

گورنر جنرل کا بیان ہے کہ "محض سفیروں کے پہونچنے سے جزیرۂ فرانس میں اس قسم کا اعلان کیا گیا۔ اُن کے ناموں سے اشتہارات تقسیم کئے اور جو کچھ ان اشتہاروں میں درج تھا اُس کی لفظ بہ لفظ اُنھوں نے اپنے بیانات سے تائید کی اور بالآخر اُن کی اعانت اور شرکت سے اُس کی تعمیل ہوئی۔"

"اعلان کی عبارت ہی سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ سفیروں نے اُس کی خاص خاص شرائط سے کامل اتفاق کیا۔ اُس میں جو خاص خاص باتیں درج تھیں وہ ذیل میں بیان کی جاتی ہیں:-

ٹیپو سلطان نے اپنے دو سفیروں کی معرفت جزیرۂ فرانس کی مجلس نوآبادیات اور وہاں کے سپہ داروں اور فرانس کی ڈائرکٹری کے عہدہ داروں کے نام خطوط روانہ کئے اور مندرجۂ ذیل تجاویز پیش کیں۔ (۲۱۷)

(۱) وہ فرانس سے ایک اقدامی و دفاعی معاہدہ کرنا چاہتا ہے اور جب تک کہ ہندوستان میں جنگ جاری رہے گی وہ اُن تمام فرانسیسی فوجوں کے جملہ مصارف برداشت کرے گا جو اُس کی مدد کے لئے روانہ کی جائیں گی اور (بجز چند خاص سامان کے) باقی تمام ضروری سامان جنگ بھی اُن کے لئے مہیا کیا جائے گا۔

(۲) اس نے انھیں اس امر کا بھی یقین دلایا تھا کہ اُس کی تمام تیاریاں مکمل ہیں اور سپہ داروں اور دیگر افسروں کے لئے ہر قسم کا سامان ضروری جو ہندوستان کی دیسی سلطنتوں کی لڑائیوں میں درکار ہوتا ہے اور جس سے یورپین واقف نہیں ہوتے تیار ملے گا۔

(۳) "اُسے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کرنے میں صرف فرانس کی مدد کا انتظار ہے اور اُس کی دلی خواہش ہے کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے۔"

ان واقعات کی بنا پر اعلان مذکور میں ٹیپو کے واسطے رضاکاروں کی ضرورت ظاہر کی گئی تھی اور جزیرے کے باشندوں کو امید دلائی گئی تھی کہ سلطان اُنھیں مناسب تنخواہ اور معقول بھتہ دے گا جو اُس کے سفیروں سے طے کیا جا سکتا ہے اور سفیر اپنے بادشاہ کی طرف سے اس بات کا بھی

وعدہ کرتے ہیں کہ جو فرانسیسی فوج میں بھرتی ہو گئے اُنھیں اُن کی مرضی کے خلاف وہاں نہیں روکا جائے گا اور جس وقت بھی وہ اپنے وطن واپس ہونے کی خواہش ظاہر کریں گے انھیں اجازت دے دی جائے گی۔

ٹیپو کے خلاف تیاریاں

(۲۱۸) اس اعلان کے مقاصد پر بحث کرنے کے بعد گورنر جنرل ٹیپو کی اُس تمام مراسلت سے جو اُس نے جزیرۂ فرانس کی حکومت سے کی تھی اُس کی مخاصمانہ روش ثابت کرنے کے لئے واقعات و دلائل پیش کرتا ہے اور ان واقعات سے ایسے مسلسل نتائج اخذ کرتا ہے کہ اُن کی تردید ناممکن معلوم ہوتی ہے اور بجا طور پر وہ اپنا یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ سلطان کی مخاصمانہ روش کی تائید تو اُس خط و کتابت کی نوعیت ہی سے ہوتی ہے جو اُس نے دوسرے فرمانرواؤں کے ساتھ کی تھی۔ ان خیالات کے اظہار کے بعد آخر میں وہ یہ رائے قائم کرتا ہے کہ سفیروں کو جزیرۂ فرانس روانہ کرنے سے سلطان کا بجز اس کے اور کوئی مقصد نہیں ہو سکتا جو اُس نے خود اپنے مراسلوں میں غنیم کو بتایا ہے اور جس کا اعلان اُس کے سفیروں کے روبرو کیا گیا تھا یعنی "برطانوی قوم کو ہندوستان سے نکال لینے کی دلی تمنا۔"

گورنر جنرل کو جب سلطان کے ارادوں کا اس طرح یقین ہو گیا تو اُس نے مجلس نظما کو ایک مراسلہ روانہ کیا اور لکھا کہ ٹیپو سلطان کے بلند حوصلوں کا خاتمہ کرنے اور اُس کی انتقامی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے جو بلا کسی خاص سبب یا اشتعال کے جاری ہیں انصاف اور مصلحت کے صحیح اصولوں کا اقتضاء یہ ہے کہ اب اُس پر فوراً حملہ کر دیا جائے۔ اسی مراسلے[۱] میں وہ یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ ٹیپو سلطان کے سفیروں کی کارروائی جسکی خود سلطان تائید کر چکا ہے اور جس کے بعد فرانسیسی سپاہی (۲۱۹) اُس کی فوج میں بھرتی ہو چکے ہیں بلاشبہ اور بدیہی طور پر اعلان جنگ کے مساوی ہے اگرچہ اُس کی مخاصمانہ جد و جہد کا علانیہ اظہار ہو گیا ہے تاہم خوش قسمتی

[۱] مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۷۹۹ء۔

سے اُس کی تکمیل کے لئے جو ذرایع اُسے میسر ہیں وہ اُس کی تمناؤں اور اُس کے جوش و خروش کے لئے مایوس کن ہیں"

لارڈ ویلزلی کے نزدیک سلطان کے مقبوضات پر فوری حملہ کرنے کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ اُس کی تیاریاں نامکمل تھیں اور شروع میں اُس کا ارادہ بھی یہی تھا لیکن ساحل کارومنڈل پر فوج جمع کرنے میں وقت درکار تھا۔ وہاں بہت تھوڑی فوج تھی اور جو تھی وہ بھی نہایت منتشر اور بے سروسامانی کی حالت میں تھی لہذا مجبوراً اسے اپنا ارادہ تبدیل کرنا پڑا[۱] اور جب تک کہ مدراس اور بمبئی دونوں جگہ کی فوجی تیاریاں مکمل ہوگئیں اور جب تک کہ مذکورۂ بالا واقعات کے سلسلہ میں شہریار دکن سے معاہدہ طے نہ ہوا اور اُس کی رو سے اُن کے تمام وسائل پر اُسے کامل اختیار حاصل نہ ہوا اُس وقت تک اُس نے ٹیپو سلطان سے اس بارے میں کسی قسم کی کوئی مراسلت نہ کی[۱]

ٹیپو سے مراسلت

جب یہ تمام کارروائیاں جو بغرض احتیاط ضروری تھیں مکمل ہوگئیں تو لارڈ ویلزلی نے ٹیپو سلطان کو خط لکھا اُس میں اول اُس نے نہایت صلح آمیز اور نرم الفاظ میں اُس کے مراسلے کا جواب دیا جو اُس نے چند دیہات کے متعلق تحریر کیا تھا۔ یہ گاؤں راجہ کورگ کے قبضہ میں تھے اور سلطان کو اُن کی مالگزاری پر دعویٰ تھا۔ بعد میں اُس نے سلطان کے جدید معاہدے کی نوعیت پر بحث کی جو اس نے فرانسیسی حکومت سے حال میں کیا (۲۲۰)

---

[۱] اس موقع پر ٹیپو سلطان کے طرز عمل اور ہندوستانی ریاستوں کی عام حالت اور جدید انقلابات کے متعلق جو رائے لارڈ ویلزلی نے قائم کی وہ قابل توجہ ہے۔
اُس کے مراسلہ مورخہ ۱۲ راگست ۱۷۹۸ء سے اُن تدابیر کی جو اُس نے فوری خطرات کی مدافعت کے لئے اختیار کی تھیں محض تائید ہی نہیں ہوتی بلکہ اُس کے مطالعہ سے اُس کے عام مسلک کا ایک صحیح اندازہ بھی ہو جاتا ہے نیز اُن اصولوں کی تشریح بھی ہو جاتی ہے جن پر کہ اُس کے دور میں عمل درآمد رہا۔
(ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۳)

تھا اور نہایت صاف و پرزور الفاظ میں اُس کے نتائج بیان کئے۔ آخر میں وہ تحریر کرتا ہے کہ "اُن تعلقات سے محض آپ کے اور کمپنی کے اخلاص واتحاد ہی میں فرق نہ آئے گا بلکہ اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ آپ کی سلطنت میں بغاوت و بدامنی کے آثار پیدا ہو جائیں گے۔ آپ کے اقتدار کو صدمہ پہونچے گا۔ آپ کی رعایا کی اطاعت میں فرق آجائے گا اور جس مذہب کا آپ احترام کرتے ہیں اُس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔"

اسی سلسلے میں ٹیپو سلطان کی صلح آمیز باتوں کا ذکر کرتے ہوئے ویلزلی اُسے جتلاتا ہے کہ کمپنی کی حکومت نے کس کس طرح اخلاص و اتحاد اور امن وامان
قائم رکھنے کی خواہش کا ثبوت دیا ہے اور بعد میں وہ اُن اسباب کو واضح کرتا (۲۲۱)
ہے جن سے مجبور ہو کر اُس کی حکومت اور اُس کے حلیفوں نے بہ الفاظ احتیاط محافظانہ تدابیر اختیار کئے ہیں۔ اس میں وہ اپنا اضافہ کرتا ہے کہ یہ تیاریاں کسی طرح اُن کے مختلف معاہدوں کے منافی نہیں اور اُن کا بجز اپنی اپنی سلطنت کی حفاظت اور عام امن برقرار رکھنے کے اور کوئی مقصد نہیں ہے آخر میں وہ تحریر کرتا ہے کہ "آپ اس مراسلے پر خاص توجہ کریں۔ میں میجر ڈاوٹن کو (جس سے آپ بخوبی واقف ہیں) آپ کے پاس روانہ کرتا ہوں۔ وہ آپ کو اُن تمام تجاویز اور ذرایع سے آگاہ کردیگا جن سے ہمارے نزدیک ہر قسم کے شبہات وشکوک رفع ہونے اور امن وامان اور باہمی سمجھوتے کی دیرپا بنیادیں قائم ہو جانے کا امکان معلوم ہوتا ہے۔"

لارڈ ویلزلی اپنے اس خط کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے "مجھے قوی اُمید ہے کہ آپ کا جواب ہمارے حلیفوں کی صلح وآشتی کے خواہشات و توقعات کے مطابق ہوگا اور خود آپ کو بھی اس امر کا یقین ہو جائے گا کہ آپ کی حقیقی بہتری بھی اسی میں ہے کہ جن امور کی بابت آپ کے یا ہمارے اور ہمارے حلیفوں کے دل میں کوئی شبہ یا کسی قسم کی تشویش باقی ہو اُسے آپ خاطر خواہ طریقے پر طے کرنے کے لئے ہمارے ان اعتدال پسند اور مخلصانہ مطالبات کو بہ خوشی تسلیم کرلیں۔"

اسی مدت میں فرانسیسی افواج کے مصر پہونچنے کی اطلاع ملی اور یہ بھی معلوم

ہوا کہ ان فوجوں کا ہندوستان کے حملے سے قریب یا بعید تعلق ضرور ہے لہٰذا اس
خبر کے بعد لارڈ ویلزلی کا یہ ارادہ اور بھی مصمم ہو گیا کہ یا تو ٹیپو کو مجبور کر کے فرانسیسی (۲۲۲)
مفاد سے جدا کیا جائے یا اُسے ان تمام وسائل سے محروم کر دیا جائے جن کے
باعث وہ برطانوی حکومت کے خلاف اس قوم کی کسی مخاصمانہ کارروائی میں شریک
ہو سکے۔

لارڈ نیلسن فرانسیسی بیڑے پر ایک عظیم الشان فتح حاصل کر چکا تھا۔ (اسکی خبر ۲۱ اکتوبر کو بنگال پہونچ چکی تھی) حیدرآباد میں کمپنی کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ مدراس اور بمبئی میں فوجی تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے لارڈ ویلزلی کو یقین ہو گیا تھا کہ سلطان اس کی مصالحانہ تجاویز منظور کرے گا۔ اور برطانوی قوت کے رعب کی وجہ سے فوجوں سے کام لینے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی لیکن باوجود اس توقع کے اُس نے ہر موقع کے لئے تیار رہنا ضروری سمجھا اور خود مدراس پہونچا تا کہ نزدیک رہ کر تاخیر کے بے شمار برے نتائج کو روک سکے۔ اور جو فوجی یا سیاسی معاملہ پیش آئے اسے مستعدی سے جلد از جلد طے کر سکے۔ اُس نے سلطان کو اپنے ارادوں سے آگاہ کیا[1] اور درخواست کی کہ اس کے مراسلے پر غور کر کے بہ عجلت ممکنہ جواب دیا جائے۔

۳۱ دسمبر کو لارڈ ویلزلی مدراس پہونچا۔ وہاں پہونچ کر اُسے معلوم ہوا کہ کلکتے
سے روانہ ہونے سے قبل اُس نے جو مراسلہ روانہ کیا تھا اُس کا جواب سلطان (۲۲۳)
کے پاس سے موصول ہو چکا ہے۔ ٹیپو نے اپنے جواب میں حسبِ سابق کے یہ
یقین دلایا تھا کہ اُس کی دوستی میں اب تک قطعی کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ فرانسیسیوں
کے خلاف اپنی رائے ظاہر کی تھی اور سفیروں کے ماریشس جانے کی بابت یہ
تحریر کیا تھا کہ وہ محض ایک افواہ ہے۔ دراصل سلطنت کے چند باشندوں نے اُنھیں
تجارتی اغراض کے لئے روانہ کیا تھا ان کا فرانسیسی جزائر سے گزرنا محض ایک اتفاقی

۱؎ مورخہ ۸ نومبر ۱۷۹۸ء

۲؎ مراسلہ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۷۹۸ء

امر تھا۔ جو جہاز روانہ کیئے گئے تھے اُن میں البتہ چالیس اشخاص آئے تھے۔ ان میں سے بارہ تو دستکار تھے اُنھیں ملازمت دیدی گئی۔ باقی ماندہ سلطنت سے واپس چلے گئے فرانسیسیوں نے جو پہلے درجے کے چالاک اور فتنہ پرداز ہیں غالباً جہاز کی روانگی سے فائدہ اُٹھاکر دونوں حکومتوں کو پریشان کرنے کی غرض سے یہ افواہیں اڑادی ہیں۔

گورنر جنرل نے اپنی تحریر میں جنگ کا جو اشارہ کیا تھا اُس پر سلطان نے سخت تعجب کا اظہار کیا اور اسی بنا پر میجر ڈاوٹن کے تقرر کے متعلق جو تجویز کی گئی تھی اُسے ٹالدیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ برطانوی حکومت اور اُس کے حلیفوں سے اُس کے تعلقات اس قدر استوار ہیں کہ اُنھیں مستحکم بنانے یا اخلاص بڑھانے کے لئے کسی مزید کارروائی کی ضرورت نہیں۔

(۲۲۴) اس ٹال مٹول کے جواب میں لارڈ ویلزلی نے اپنے تجاویز کو مدلل اور واضح طور پر بیان کیا۔ جو سفیر ماریشس روانہ کیٔے گئے تھے ان کی تمام کارروائیوں کو دُہرایا اور سلطان کو آگاہ کیا کہ آپ کے طرز عمل ہی نے متحدین کو اس بات پر مجبور کردیا ہے کہ گزشتہ چند سال سے جن پریشانیوں میں وہ مبتلا ہیں اور جن شکوک میں وہ پڑے ہوئے ہیں اُن سے اب نجات حاصل کریں اور وہ اب اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کرسکتے کہ جنگ کی متواتر تیاریاں اور غنیموں سے آپ کی مخاصمانہ مراسلت ہوتے ہوئے دیکھیں اور خود صلح اور امن کا زمانہ سمجھ کر تمام خطرات اور دقتوں کا سامنا کریں اور جنگ کے مصارف برداشت کریں سلطان نے اپنے جواب میں ویلزلی کے مطالبات کو جو ٹالا تھا اس کی بابت اُس نے لکھا کہ "غنیم سے جدید معاہدہ کرلینے کی وجہ سے آپ کے لئے کمپنی اور اُس کے حلیفوں سے بھی ایک جدید معاہدہ کرنا ضروری ہوگیا ہے کہ اُس نے سلطان کی دوبارہ منت کی کہ وہ صدق دلی سے ان اعتدال پسند اور مخلصانہ تجاویز کو قبول کرکے معاملات طے کرلے اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر کیا کہ اب تاخیر کی گنجائش نہیں ہے لہذا اس تحریر کے ملنے کے دوسرے ہی روز اس کا جواب روانہ کردیا جائے۔

اس خط پر ۹/ جنوری کی تاریخ پڑی تھی اور ۱۵/ جنوری کو وہ سلطان کو ملا۔ ۱۳/ فروری کو اس کا ایک مختصر جواب ملا جس میں ویلزلی کی تحریر کا جواب سرسری طور پر ان الفاظ میں تھا کہ "مجھے شکار کا بہت شوق ہے۔ اس وقت بھی شکار کو جا رہا ہوں۔ آپ مہربانی فرما کر میجر ڈاوٹن کو (جن کی بابت آپ بارہا لکھ چکے ہیں) روانہ کر دیجئے لیکن اُن کے ساتھ آدمی کم ہوں۔" (۲۲۵)

۹/ جنوری کی تحریر کے جواب میں جو تاخیر ہوئی اُس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ صلح کی تجاویز کو سلطان نے مسترد کر دیا اور وہ اس معاملے کو التواء میں ڈالنا چاہتا ہے تاکہ اس کے دار الحکومت پر حملہ کرنے کا وقت نکل جائے۔ ان خیالات کی بناء پر جن کی تائید جزیرۂ فرانس کو دوبارہ سفیر روانہ کرنے سے ہو گئی تھی برطانوی افواج کو جو جنرل ہیرس کی کمان میں تھیں نیز حیدر آباد کی فوج کو جس کی کمان میر عالم کے پاس تھی ۳/ فروری کو میسور پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

بہر حال لارڈ ویلزلی نے سلطان کے مختصر خط کی رسید لکھ کر اُسے مطلع کر دیا کہ "اس قدر اہم معاملے میں آپ نے جو سکوت اختیار کیا اُس کی وجہ سے مجھے مجبوراً یہ سب کارروائی کرنی پڑی۔ میجر ڈاوٹن کو اب آپ کے پاس روانہ کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا لیکن چونکہ اب بھی کمپنی اور اس کے حلیفوں کو معاملات سلجھانے کی خواہش ہے لہٰذا جنرل ہیرس کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ اگر آپ کا کوئی سفیر پہنچے تو وہ اُس سے ملاقات کرے اور اُسے اختیار دے دیا گیا ہے کہ آپ سے ایک نیا معاہدہ اُن شرائط پر کرے جنھیں ہمارے حلیف امن و امان قایم رکھنے کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔"[1]

ٹیپو کے خلاف ویلزلی کے ارادے

ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ ہونے کے واقعات بیان کرنے سے پیشتر اُن شرائط پر غور کرنا ضروری ہے جو مختلف اوقات میں لارڈ ویلزلی نے مصالحت کرنے کی غرض سے سلطان کے روبرو پیش کئے کیونکہ ان کے حوالے سے لارڈ ویلزلی (۲۲۶)

---

[1] مراسلہ مورخہ ۲۲/ فروری ۱۷۹۹ء۔

کے مسلک سے کے اُن اصولوں کا صحیح اندازہ ہو جائے گا جن پر کہ اُس نے اس اہم
اور دقت طلب کارروائی میں عمل کیا۔

گورنر جنرل نے نظام کو جو مراسلہ[1] روانہ کیا تھا اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب
ویلزلی کو اس بات کا اندازہ ہوا کہ سلطان کو شکست دینے کے لئے نہ تو کافی فوج
(اول) ہے اور نہ فوری اور اچانک حملہ کرنے کے ذرائع ہیں تو اس نے سلطان کو صرف
فرانسیسیوں سے جدا کرنے کا خیال کیا اور اس مقصد کے لئے جو سمجھوتہ بھی ہو جائے
اُس پر اکتفا کرنا مناسب سمجھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر سرنگاپٹم میں ایک رزیڈنٹ رکھدیا
جائے اور فرانسیسیوں کو سلطان کی ملازمت سے علیٰحدہ کر کے ہمیشہ کے لئے
اُن کا اُس کی فوج اور سلطنت میں داخلہ بند کر دیا جائے تو یہ مقصد حاصل ہو جائیگا۔

ساتھ ہی ساتھ اسے یہ خیال بھی تھا کہ اگر سردست فرانسیسیوں کا مقصد مصر پر
حملہ کرنے سے ٹیپو کو مدد دینا نہیں ہے تو آیندہ کسی موقع پر اس سے یہ کام لیا جا سکتا
(۲۲۷) ہے اسی وجہ سے سلطان کی طاقت کا کم کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا اور حیدر آباد
میں کامیابی حاصل ہونے اور مدراس و بمبئی میں فوجی تیاریاں مکمل ہو جانے کی
وجہ سے یہ کام کسی قدر آسان بھی نظر آنے لگا لہذا اس امکان کا احساس ہوتے ہی
لارڈ ویلزلی نے اپنے ارادے وسیع کر دیئے اور ۸ نومبر کو سلطان کو خط لکھتے وقت
(دوم) اُس نے اپنے پیش کردہ شرائط میں اتنا اور اضافہ کر دیا کہ کنارا (Canara) کا
صوبہ کمپنی کے کسی علاقے سے بدل لیا جائے (ساحل پر یہی ایک علاقہ ٹیپو کے
قبضہ میں باقی رہ گیا تھا) اس طور سے ٹیپو کو فرانسیسیوں سے آیندہ سازش کرنے کا
کوئی موقع نہ رہے گا اور میسور سے ان کی خط و کتابت قطعاً بند ہو جائے گی۔ ان شرائط
پر بحث کرنے کا اُسے کوئی موقع نہ ملا۔ سلطان نے فرانسیسیوں سے تعلقات برقرار
رکھنے پر اصرار کیا اور باہمی سمجھوتے کی صلح پسند تجاویز کو نظر انداز کر دیا۔ اس وقت
حیدر آباد اور کمپنی دونوں کی فوجی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں لہذا گورنر جنرل نے مدراس
(سوم) پہونچ کر اپنے مطالبات میں مزید اضافہ کیا اور سابق شرائط کے ساتھ اُس نے ایک

[1] بحوالۂ مراسلہ مورخہ ۳ر اگست ۱۷۹۹ء۔

کثیر رقم بطور تاوان جنگ اُن اخراجات کے معاوضے میں طلب کی جو اُس کی مخاصمانہ سازشوں کی وجہ سے کمپنی اور اُس کے حلیفوں کو برداشت کرنے پڑے
تھے۔ (۲۲۸)

ٹیپو کی سلطنت پر فوج کشی

گورنر جنرل کو مصالحت ہو جانے کی جو کچھ توقعات تھیں وہ سب ۹ر فروری ۱۷۹۹ء تک ختم ہو گئیں لہٰذا اُس نے مجبوراً برطانوی افواج کو میسور پر حملہ کرنے کا حکم دیدیا لیکن ساتھ ہی سپہ سالار جنرل ہیرس کو یہ اختیار دے دیا کہ اگر سلطان صدق دل سے مصالحت کی خواہش ظاہر کرے تو اُس سے وہ سلسلہ جنبانی کر سکتا ہے۔ جب صلح کی گفت و شنید شروع ہو تو شرائط صلح اُس وقت کی حالت کا اندازہ کر کے پیش کی جائیں۔ اگر یہ گفت و شنید اُس وقت شروع کیجائے جب کہ برطانوی افواج نے کوئی فیصلہ کن فتح حاصل کر لی ہو یا سلطان کے دارالحکومت پر گولہ باری شروع کر دی ہو تو اُس سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ اپنی سلطنت کا نصف حصہ اور دو کروڑ روپیہ متحدین کے حوالے کر دے اور ان شرائط کی تکمیل تک کے لئے اپنے چار بیٹے اور چار اعلےٰ عہدہ دار بطور ضمانت کے روانہ کرے۔

جنرل ہیرس کی کمان میں جو فوج تھی وہ حیدرآباد والی فوج سے مل کر ۳ر مارچ کو بغیر کسی مقابلے کے سلطنت میسور کے حدود میں داخل ہو گئی۔ سلطان ان فوجوں کو بڑھتا ہوا دیکھ کر تیزی سے کمپنی کی اُس فوج سے مقابلہ کرنے کے لئے بڑھا جو جنرل اسٹوارٹ کی کمان میں علاقۂ کورگ میں متعین کی گئی تھی اور جو دارالحکومت کی تسخیر میں حصہ لینے کے لئے بڑھ رہی تھی۔ یہاں اُسے سخت نقصانات کے
ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ اس کے بعد اُس نے جنرل ہیرس کی طرف رخ کیا اور ۲۷ر مارچ (۲۲۹)
کو سلطان پیٹ اور ملاوَلی کے درمیان اُس کا مقابلہ کیا۔ یہاں بھی اُسے شکست ہوئی اور اس کے بعد اُس نے فوراً سرنگاپٹم کی راہ لی۔ چند روز کے بعد برطانوی اور حیدرآبادی فوجوں نے مل کر قلعے کا باقاعدہ محاصرہ کر لیا۔

اس وقت تک سلطان نے جنرل ہیرس سے کسی قسم کی مراسلت نہیں کی تھی۔ ۹ر اپریل کو اُس نے ایک مختصر سا خط لکھا اور برطانوی فوج کی حملہ آوری

کا سبب دریافت کیا۔ اس کا یہ جواب دیا گیا کہ "آپ وہ خطوط ملاحظہ کریں جو گورنر جنرل نے اس بارے میں آپ کو تحریر کیے ہیں۔ ان میں اس کی تشریح موجود ہے" ۲۰ / اپریل تک سلطان نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جب محاصرے کی تیاریاں تقریباً مکمل ہوگئیں تو اس نے جنرل ہیرس کو لکھا کہ "صلح کی غرض سے آپ اپنا ایک وکیل مقرر کریں"۔ اس کے جواب میں جنرل ہیرس نے اُن شرائط صلح کا مسودہ روانہ کر دیا جن کے ایسے وقت میں پیش کرنے کی آسے ہدایت کی گئی تھی۔

اس کی رسید تک نہ آئی۔ محاصرہ جاری رہا اور ۴ / مئی کو قلعہ فتح ہوگیا۔ ٹیپو سلطان مردہ پایا گیا اور اس طور سے حیدر علی کے خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔

فتح میسور ۴ / مئی ۱۷۹۹ء

(۲۳۰) اس جنگ کا یہ خلاصہ ہے۔ اس کے شروع ہونے سے قبل جس اعتدال اور دانشمندی سے کام لیا گیا اور جس قابلیت اور جرارت سے اسے جاری رکھا گیا اور جو اہم سیاسی نتایج اس سے پیدا ہوئے اُن کی مثال برطانوی ہند کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ چند ماہ کی قلیل مدت میں ایک ایسے حریف کا خاتمہ ہوگیا جس کی بابت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے از ابتدا تا انتہا اپنی پوری طاقت و قوت ہندوستان میں انگریزوں ہی کے خلاف صرف کی تھی[۱]۔

اگرچہ فتح میسور برطانوی مفاد کے لئے نہایت اہم تھی تاہم مستقل وحقیقی مفاد کا انحصار مفتوحہ علاقے کے انتظام پر تھا۔ از روئے انصاف اور میدان جنگ کی کامیابی کے لحاظ سے کمپنی اور نظام دکن کو اس بات کا پورا حق حاصل تھا کہ وہ جس طور سے چاہیں اسے آپس میں

---

[۱] سلطنت میسور اڑتیس سال قائم رہی۔

تقسیم کرلیں لیکن اس حق کے طریقۂ استعمال پر ہی نہ صرف ان دونوں کی شہرت بلکہ تمام جنوبی ہند کے آیندہ امن کا انحصار تھا۔

نواب میر نظام علی خاں بہادر نے تو جنگ کے ابتدائی زمانے ہی میں گورنر جنرل کو ہر قسم کی مراسلت کرنے کا پورا اختیار دے دیا تھا اور بعد میں اپنے سپہ سالار کو ہدایت کردی تھی کہ لارڈ ویلزلی جو انتظام بھی مناسب سمجھیں وہ اُس سے اتفاق کرلے۔ اس طور سے اعتدال وانصاف کے جن اصول سے جنگ کی ابتدا ہوئی تھی انہی کے
(۲۳۱) مطابق اس قابل فخر اعتماد کی بدولت گورنر جنرل کو مفتوحہ سلطنت کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا کامل اختیار مل گیا۔

سلطنت میسور کی تقسیم کا مسئلہ

اس کے بعد لارڈ ویلزلی نے جو انتظام کیا اور جن باتوں کا اس نے اس اہم موقع پر خاص طور سے لحاظ رکھا ان پر ایک سرسری نظر ڈالنا کافی ہوگا۔ لیکن اُنھیں بیان کرنے میں کہیں کہیں اُن مراسلوں سے اقتباس ضرور دینے پڑیں گے جو اس نے اپنی جملہ کارروائی کے مقاصد واضح کرنے کے لئے اپنے حکام کے پاس انگلستان روانہ کئے تھے اور جن سے اس موضوع پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے نظام کو جو خط[۵۱] اس نے تحریر کیا تھا اُس میں وہ لکھتا ہے کہ "فتح سے جو اختیار ہمیں حاصل ہوا ہے اُس کے استعمال کے لئے میرے نزدیک بہ لحاظ انصاف کوئی اصول اس سے زیادہ مناسب نہیں ہوسکتا کہ جن مقاصد سے جنگ کا آغاز ہوا تھا انہی پر صلح کی جائے اور انہی کے لحاظ سے ہم اپنے مفتوحہ علاقہ کی تقسیم کریں ہمارے حلیف اس بات کا بارہا اعلان کرچکے ہیں کہ وہ ان مقاصد کے حصول کو اپنے مصارف کا معقول معاوضہ تصور کرتے ہیں اور جس خطرے کی وجہ سے ہمیں تلوار اُٹھانی پڑی اُس کی

---

۵۱ مورخہ ۳ر اگست ۱۷۹۹ء

دائمی مدافعت بھی ان مقاصد سے اچھی طرح ہو جاتی ہے۔
اسی سلسلے میں ویلزلی یہ بھی لکھتا ہے کہ ان اہم اور منصفانہ مقاصد میں سے ہر ایک کا لحاظ کرتے ہوئے یہ امر ضروری سمجھا گیا کہ مفتوحہ علاقے کا زیادہ حصہ کمپنی اور نظام دکن کے تحت رہے لیکن تقسیم کا صحیح اصول قرار دینے اور ہر ایک کے علاقے کے (۲۳۴) حدود کا تعین کرنے میں بہت سی اور باتوں کا بھی خیال رکھنا پڑا۔ جنگ اس لئے نہیں کی گئی تھی کہ ہم فتوحات حاصل کریں یا اپنے اپنے علاقوں کو وسعت دیں اور اُن کی آمدنی بڑھائیں۔ اپنی فتح و نصرت کی شان و عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس بات کو یاد رکھیں کہ جو صلح ہوا و ہوس کو پورا کرنے کی غرض سے کی جاتی ہے وہ نہ تو کبھی مفید ثابت ہوتی ہے اور نہ کبھی باعث فخر یا دیرپا ہو سکتی ہے۔
برطانوی قوم کی حکمت عملی اور اُس کے اعزاز و مفاد کا یہ اقتضاء تھا کہ جو وسیع سلطنت ہمارے قبضے میں آ گئی ہے اُس کا ایسا انتظام کیا جائے جو وہاں کی رعایا کی مرضی کے مطابق اور ملحقہ ریاستوں کے لئے ازروئے انصاف مائل بہ صلح ہو اور ہماری اس فتح سے دوسرے جو لوگ متاثر ہونے والے ہوں اُن کا بھی لحاظ اُس میں شامل ہو۔ اگر کل علاقہ کمپنی اور نظام دکن میں برابر برابر تقسیم کر دیا جاتا تو مرہٹوں کو حسد کرنے کا بہت بڑا سبب مل جاتا اور حیدرآباد کی قوت میں کئی گونہ اضافہ ہو جاتا جو کسی لحاظ سے بھی مناسب نہ تھا۔ جس طور سے بھی یہ تقسیم کی جاتی میسور کی شمالی سرحد کے متعدد قلعے نظام دکن کے قبضے میں چلے جاتے اور اس سمت سے ہماری سرحد پر بہ آسانی حملہ ہو سکتا تھا۔ ایسی تقسیم سے محض مرہٹوں اور حیدرآباد کے درمیان ہی نہیں بلکہ ان دونوں طاقتوں اور کمپنی کے درمیان بھی ہمیشہ کے لئے مخالفت کی بنیاد پڑ جاتی۔"

(۲۳۲) اگر اسے تین مساوی حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ مرہٹوں کو (جنھوں نے جنگ کے مصارف یا مصائب میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا) دے دیا جاتا اور اس طور سے انھیں اتحاد ثلاثہ کے دوسرے دو حلیفوں کے ساتھ صلح کے فوائد میں شریک کر لیا جاتا تو وہ فرمانروائے دکن کے ساتھ سخت ناانصافی ہوتی اور یہ طریقہ کمپنی کے لئے بھی خلاف مصلحت ہوتا اور ہندوستان میں ہمارے حلیفوں کے واسطے ایک بُری مثال قائم ہو جاتی اور مرہٹوں کی سلطنت میں جو اضافہ ہوتا وہ کمپنی اور حیدرآباد دونوں کے لئے سخت مضر ثابت ہوتا۔ اس تقسیم سے چتل درگ (Chittledroog) اور اس کے ساتھ چند اور اہم شمالی قلعے مرہٹوں کے ہاتھ میں چلے جاتے اور اسی سمت کے باقی قلعے حیدرآباد کے قبضے میں ہوتے اور اس طرف سے ہماری کھلی ہوئی غیر محفوظ سرحد کو ہمیشہ ان دونوں طاقتوں کی بے قاعدہ فوجوں کی دست درازیوں کا خدشہ لگا رہتا۔

مرہٹوں کا دراصل مفتوحہ علاقے کے کسی حصے پر کوئی حق نہ تھا اور ان کی سلطنت میں جو اضافہ بھی ہوتا (اور خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ہمارے سرحدی قلعے اُن کے قبضے میں چلے جاتے) وہ قابل اعتراض سمجھا جاتا لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ کسی طرح انھیں اپنے موافق کر لیا جائے اور ایک ایسا علاقہ دیدیا جائے جس سے اس جدید انتظام میں دلچسپی ہو جائے اور نواب نظام علی خاں بہادر کو نہ یہ بات ناگوار گزرے اور نہ اس سے انھیں کچھ نقصان پہونچے اور ساتھ ہی کمپنی کے مقبوضات کی سرحد کے لئے کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ علاوہ ازیں جو علاقے کمپنی اور نظام دکن کے (۲۳۴) حوالے کئے جائیں اُنھیں بہ لحاظ اعتدال اس قدر محدود کر دینا چاہیئے کہ ان دونوں کے جنگ میں جو مصارف ہوئے ہیں اُن کی تلافی ہو سکے اور آیندہ کے لئے ان کی سلطنتوں کی حفاظت کا معقول انتظام ہو جائے۔"

ان خیالات کے اظہار کے بعد لارڈ ویلزلی اس موضوع کو اپنے اس بیان پر ختم کرتا ہے کہ "ان اہم امور کے ہر پہلو پر نظر غائر ڈالنے اور تحقیق کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر میسور میں ایک جدا سلطنت کمپنی کی نگرانی میں قائم کردیجائے اور مرہٹوں کو مفتوحہ علاقے کی تقسیم میں شریک کرلیا جائے تو نہایت مناسب ہوگا اور اس ترکیب سے فریقین کے مفاد میں تصادم بھی نہ ہوگا اور کمپنی کو ایک ایسا حصہ مل جائے گا جس سے دوسروں کو حسد بھی کم ہوگا اور جو آمدنی۔ وسائل آمد و رفت تجارت اور فوجی قوت نیز دیگر فوائد کے لحاظ سے اسکے لئے نہایت معقول ہوگا۔ یہ بات کمپنی کو دوسری تقسیم سے حاصل نہیں ہوسکتی ہے اور نہ ہندوستان میں مستقل طور پر امن و امان قائم کرنیکا اس سے بہتر کوئی طریقہ ہوسکتا ہے۔"

بعدازاں اسی تحریر میں وہ ان اصولوں کو بیان کرتا ہے جن کی بنا پر مفتوحہ ملک کی تقسیم کی گئی تھی اضلاع کنارا مع ساحل ملابار اور ساحل میسور کے ان علاقوں کے جو کمپنی کے مقبوضات سے ملحق تھے۔ انگریزی حکومت کو دیئے گئے۔ کرناٹک تو بلاشبہ کمپنی کے قبضے میں رہنا ہی چاہیئے تھا۔ اس کے ساتھ وہ تمام قلعے اور چوکیاں جو میسور کے مختلف راستوں پر واقع تھیں کمپنی کو دی گئیں۔ علاوہ ازیں سرنگاپٹم اور اس کا قلعہ (۲۲۵)
بھی کمپنی کو دیا گیا۔ کیونکہ ساحل کارومنڈل اور ساحل ملابار کمپنی کے جو مقبوضات تھے ان کے درمیان وسائل آمد و رفت برقرار رکھنے اور حفاظت کے خیال سے مختلف راستوں کو ایک دوسرے سے ملانے کے لئے ان مقامات کا اس کے تحت رہنا ضروری تھا۔

اضلاع گورم کنڈہ۔ گوٹی اور دیگر علاقے جو سلطنت حیدرآباد سے ملحق تھے اعلیٰحضرت نظام دکن کو دئے گئے۔ متحدین کے فوجی کارناموں اور مصارف میں حیدرآباد کا جو حصہ رہا تھا معاہدے کے مطابق اسی کی مناسبت سے دو تین جنگ کے فوائد میں حصہ ملنا چاہیئے تھا تاہم لارڈ ویلزلی نے یہ مناسب سمجھا کہ جو علاقہ کمپنی کے قبضے میں رہا اس کی آمدنی مصارف منہا کرنیکے بعد اس علاقے کی آمدنی کے مساوی ہو جو حیدرآباد کو دیا جائے لیکن اسکے ساتھ ہی اس نے یہ فیصلہ کیا کہ جنگ اور اسکے مصارف میں کمپنی کا جو حصہ زیادہ رہا ہے اس کی ازروئے انصاف تلافی یوں ہونا چاہیئے کہ میسور کی جدید

سلطنت سے جو معاہدہ ہو اور اس سے جو فوائد حاصل ہوں وہ سب کمپنی کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں۔

تقسیم ملک میں حکومت پونہ کے لئے جو حصہ رکھا جائے اس کی آمدنی (لارڈ ویلزلی (۲۳۶)
کے فیصلے کے مطابق کمپنی کے حصے کی آمدنی کے ۲/۱ ۱۱ سے نہ زائد ہو اور نہ نصف سے کم۱۲) اس میں ہرپونلی (Harponelly) سوندھا (Soondah) اناگندی (Amagoondy) اور دیگر علاقے جو اسی سلسلے میں پیشوا کے مقبوضات سے ملحق تھے شامل کئے گئے۔ چونکہ حکومت پونہ نے جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا اس لئے اسے ایک رعایت سمجھنا چاہیے لہذا ویلزلی نے اس خیال سے یہ طے کیا کہ یہ حصہ بلا کسی شرط کے نہیں دینا چاہیے بلکہ اسے ایک جدید معاہدے کی بنا پر قرار دینا چاہیے۔

ٹیپو کے خاندان کو محروم کرنیکے وجوہ

لارڈ ویلزلی نے جن وجوہ کی بنا پر میسور کے قدیم ہندو حکمران خاندان کو گدی نشین کرانے کا فیصلہ کیا تھا انھیں اس نے اپنی مذکورۂ بالا تحریر میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ خاندان ٹیپو کو برقرار رکھنا قطعاً مصلحت کے خلاف تھا۔ دولت برطانیہ کی مخالفت ان کے خمیر میں پڑی تھی جو ان کے آبا و اجداد سے چلی آتی تھی۔ خواہ ان کے ساتھ کیسا ہی معاہدہ کیا جاتا وہ اپنی سابق عظیم الشان طاقت و قوت اور آزادی و خود مختاری کو ہرگز نہیں بھول سکتے تھے۔ ویلزلی نے اس مسئلے کے متعلق اپنے خیالات حسب ذیل پرزور الفاظ میں ادا کئے ہیں:-

ٹیپو سلطان کے ولیعہد کو جنھیں اصول کی تعلیم دی گئی ہوگی وہی تعصبات و جذبات اس میں بھر گئے ہوں گے سلطنت میسور کے تخت و تاج کی شان اور آن بان کے متعلق اس کے ویسے ہی خیالات ہوں گے۔ اس جنگ کے نتائج کا اس پر لازمی
(۲۳۷) اثر پڑے گا اور اس سے یہ جذبات اور بھی زیادہ زور پکڑینگے اس بے نظیر فتح سے

علہ۔ اس علاقے کی آمدنی ۶۳ ہزار کنترائی پگوڈا (Cantrai Pagoda) تھی۔ جدید ریاست میسور کا علاقہ ۱۳ لاکھ پگوڈا کی آمدنی کا تھا۔ حیدر علی کے غصب سے قبل جو میسور کا علاقہ تھا اس سے یہ بڑا تھا۔

اس کے باپ کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا گیا ہے اور ہمیں تمام دیوانی و فوجی اختیارات
حاصل ہو گئے ہیں اب ہمارے ہی لطف و کرم اور ہماری ہی نگرانی میں اس کا تخت نشین ہونا
اس کے لئے اس قدر سخت کمزوری اور ذلت و توہین کا باعث ہو گا کہ کوئی غیرت مند
تاجدار اسے گوارا نہیں کر سکتا۔ اس انتظام میں بھی ہمیں اپنی حفاظت کی خاطر کم از کم اس
علاقے پر ضرور قبضہ رکھنا پڑے گا جو ہمیں میسور کی تقسیم کے معاہدے سے ملا ہے۔ اس
طور سے جو علاقہ بھی ہم اپنے قبضے میں رکھیں گے۔ اسے وہ اپنے شاہی ورثے کا مغصوبہ
حصہ تصور کرے گا اور یہ اس کی ذلت و توہین کا مزید ثبوت ہو گا۔ اس کے ملک اور اسکے
اقتدار میں جو کمی ہو گی اس کا لحاظ کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی موقع پر وہ اپنے
باپ کی سلطنت واپس لینے کے لئے جنگ کرے گا تو اس کا کچھ زیادہ نقصان نہ ہو گا اسکی رگوں
میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا خون ہے۔ اس کے سامنے اس کے باپ دادا کے کارہائے
نمایاں اور ہمت و جرأت و شجاعت کی مثال موجود ہے۔ اسے اب تک اپنی عظیم الشان
خود مختار سلطنت پر جس کے ساتھ فوجی عظمت وابستہ ہے حکومت کرنے کا خیال رہا ہے۔
ان سب باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ بات بعید از امکان نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اپنی ایک
ایسی شاندار آبائی سلطنت کو واپس لینے کے قابل فخر مقصد کے لئے جس کے نام سے سارا
کرناٹک سالہا سال تک لرزتا رہا ہو اور جس سے تمام جنوبی ہند کا علاقہ خوف کھاتا رہا ہو (۲۳۸)
اس باقی ماندہ حقیر حصے کو نثار کرنے کے لئے بہ آسانی آمادہ نہ ہو جائے گا۔ اگر محدود نقطۂ نظر
سے بھی اس معاملے پر غور کیا جائے تو یہ بات تسلیم کرنی پڑیگی کہ ٹیپو سلطان کا بیٹا اس انتظام
کو (جس سے اس کی باپ کے سلطنت کے ٹکڑے ہو گئے ہیں اور اس کی آزادی مفقود
ہو گئی ہے) درہم برہم کرنا اپنا فرض سمجھے گا لہذا اس خاندان کے شہزادے کو تخت نشین
کرانے ہی سے جدید انتظام کے خاتمے کی ابتدا ہو جاتی ہے ایسے فرمانروا سے نہ کوئی
معاہدہ صحیح معنوں میں ہو سکتا تھا اور نہ کبھی اتفاق رائے یا باہمی اخلاص و اتحاد قائم ہو سکتا
ہے اس کے ظاہری اخلاص و تعلقات سے برابر دھوکہ رہتا اور اگر اس کی اطاعت و وفاداری
فریب پر مبنی نہ ہوتی تو کم از کم با دل ناخواستہ ضرور ہوتی۔ اسکے ذاتی مفاد و عادات و خصائل
تعصبات و جذبات و خیالات حتیٰ کہ خود اس کی خوبیاں اسے بالاتفاق اس بات پر مجبور کرتیں کہ
وہ ہماری قوت اور ہمارے نام سے ہمیشہ دلی نفرت رکھے اور ہماری بیخ کنی کی فکر میں مشغول

رہے اور برطانوی قوم کے ہر غنیم کو ہمارے خلاف اُبھارنے اس کا ساتھ دینے اور خود اس سے اعانت حاصل کرنے میں ہمیشہ مصروف رہے۔ حکومت میسور کو جو کچھ طاقت و قوت دی جاتی یا اقتدار حاصل ہوتا وہ ایسے فرمانروا کے دور میں ہمیشہ ہمارے خلاف استعمال ہوتا میسور کی مخاصمانہ قوت کمزور ضرور ہو جاتی لیکن تباہ نہ ہوتی اور ہمارے جنوبی مقبوضات کے وسط میں ایک ایسی طاقت کا وجود باقی رہ جاتا جو اپنے خاندان کی نکبت و فلاکت دور کرنے کے مواقع کی تاک میں رہتی اور ہندوستان کی ہر باغی جماعت اور فرانس کے ہر ایک جاسوس سے ہمیشہ سازش کرنے کی فکر میں لگی رہتی"۔ (۲۳۹)

ان خیالات کی بنا پر اس نے ٹیپو کے خاندان کو قطعاً محروم کرنے اور میسور کے قدیم حکمراں ہندو خاندان کو گدی نشین کرانے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کے نزدیک حکمت عملی۔ انسانی ہمدردی اور (انصاف) کا اقتضا بھی یہی تھا۔

قدیم حکمراں ہندو خاندان کو گدی نشین کرانے کے وجوہ

لارڈ ویلزلی اس سلسلے میں یہ تحریر کرتا ہے کہ میسور کے اس خاندان نے انتہائی ذلتیں برداشت کی ہیں اور خصوصاً ٹیپو سلطان کے سفاکانہ دور میں مختلف مصیبتیں برداشت کی ہیں لہذا یہ خاندان ہمارا ضرور احسان مند ہوگا اور اس طاقت کے ساتھ اسے حقیقی اخلاص ہوگا جس نے اسے محض قعر مذلت ہی سے نہیں نکالا۔ بلکہ اعلیٰ مدارج پر پہنچا کر ممتاز کیا ہے۔ اس کے برطانوی حکومت سے ہمیشہ دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔ اپنی انتہائی مصیبت کے زمانے میں بھی اس خاندان نے ہمارے دشمنوں سے کسی قسم کے تعلقات نہیں رکھے لہذا انہیں بر سر حکومت کرنا عین فیاضی کا کام ہوگا اور وہ محض ہماری اعانت ہی سے ٹیپو کے خاندان والوں اور دیگر دعویداروں کے مقابلے میں اپنے تخت و تاج کو برقرار رکھنے کی توقع کر سکتے ہیں انہیں خاندان سابق غاصب خاندان کے تمام ہی خواہوں سے عداوت ہوگی لہذا وہ فرانسیسیوں نیز (۲۴۰) ان تمام طاقتوں کے خلاف ہونگی جنھیں ٹیپو کے خاندان سے ہمدردی ہونیکی وجہ

عله۔ بنام مجلس نظماء۔

سے برطانوی حکومت سے مخاصمت ہوگی۔ راجہ میسور کا وارث اگر مسند نشین ہوگیا تو اسے ہمیشہ اس بات کا احساس رہے گا کہ اس کے شاہی وقار کا انحصار اس جدید انتظام کے قیام ہی پر ہے لہذا اس کے استحکام اور استقلال کے لئے جس قدر کوشش بھی درکار ہوگی اس میں نہایت جوش و خروش اور اخلاص کے ساتھ وہ ہم سے متفق و متحد ہونے میں اپنا فائدہ محسوس کریگا میسور کے معاملات کا اس طرح انتظام ہوجانے سے اس مخالف طاقت کا جو ہمارے درپئے آزار تھی محض خاتمہ ہی نہیں ہوجائے گا بلکہ اس کی جگہ ایک ایسی سلطنت قائم ہوجائے گی جس کے مفاد و اغراض اور وسائل دراصل ہمارے ہی ہونگے اور میسور کی وہ سلطنت جسکے نام سے سارا کرناٹک تھرآتا تھا اب ہماری پشت پناہ ہوگی اور وہ کمپنی اور اس کی رعایا اور اس کے حلیفوں کے لئے دولت و قوت کا سرچشمہ ہوگی۔"

اس طور سے ان معاملات کا فیصلہ ہوتے ہی ان کی تکمیل کے لئے احکام جاری کردیئے گئے سلطان کی اولاد کو ویلور پہنچا دیا گیا جہاں اس کے آرام و آسائش و قیام کا معقول انتظام کردیا گیا تھا۔ ان کے لئے وظائف مقرر کردیئے گئے۔ انکے منصب و مرتبے کے مطابق ان کے ساتھ سلوک کیا گیا البتہ صرف اس بات کی نگرانی رکھی گئی کہ وہ قلعے سے (۲۴۱)
باہر نہ نکل سکیں سلطان کے خاص خاص مسلمان سرداروں[1] کے بھی وظائف مقرر کیئے گئے اور حتی الوسع اس بات کی کوشش کی گئی کہ سلطان مرحوم کے خاندان والے اور اس کے ملازمین و متعلقین اس جدید انتظام سے مانوس ہوجائیں۔

سلطان کے بیٹے جب سرنگاپٹم سے روانہ کردئے گئے تو قدیم حکمران ہندو خاندان کے وارث کرشنا راج ادویور کو گدی نشین کردیا گیا اس کی عمر اس وقت صرف تین سال تھی اسکے مورث کو حیدر علی خاں نے سنہ ۱۷۶۱ء میں معزول کیا تھا ٹیپو سلطان کے دیوان پورنیا برہمن کو جو قابلیت و شہرت میں یکتا تھا اس کمسن فرمانروا کا دیوان مقرر کیا گیا راجہ سے دو عہدنامے کیئے گئے جن میں سے ایک تقسیمی معاہدے[2] کہلاتا ہے اور دوسرا اعانتی معاہدے[3] کے نام سے مشہور ہے

عہ۱۔ یعنی خاص خاص عہدے دار
عہ۲۔ مورخہ ۲۲ جون سنہ ۱۷۹۹ء
عہ۳۔ مورخہ ۸ جولائی سنہ ۱۷۹۹ء

پہلا عہدنامہ انگریزی حکومت اور دربار حیدرآباد و دربار میسور کے درمیان تھا اس میں حیدرآباد اور کمپنی کے علاقوں کا فیصلہ درج تھا۔ سلطان کی اولاد اور اس کے خاص خاص عہدہ داروں کے وظائف کے رقوم اور ان کے ادا کیئے جانے کے طریقے بھی اس میں تحریر تھے اور اسی معاہدے کی رو سے یہ قرار پایا تھا کہ جو علاقہ حکومت پونہ کے لیئے تجویز کیا گیا ہے اگر اسے وہ ایک مہینے کے اندر تسلیم کرلے اور چند فیصلہ طلب امور کو کمپنی اور حکومت حیدرآباد کے اطمینان کے قابل طے کردے تو وہ اس کے حوالے کردیا جائے اور اگر وہ ان شرائط کو تسلیم نہ کرے تو مجوزہ علاقہ کمپنی اور حیدرآباد میں تقسیم کردیا جائے جس کا حصہ (۲۴۲)
اعلیٰحضرت نظام دکن کو ملے گا۔"

میسور کی جدید سلطنت سے معاہدہ سنہ ۱۷۹۹ء

اماتی معاہدے[۱] میں فرمانروائے دکن کی شرکت نہ تھی یہ معاہدہ میسور کی جدید سلطنت اور برطانوی حکومت کے باہمی تعلقات طے کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا۔ اس کی شرائط کے بموجب میسور کا جدید راجہ سیاسی معاملات میں کمپنی کا ماتحت بن گیا۔

---

[۱] اس معاہدے کی رو سے یہ قرار پایا کہ ریاست میسور کی حفاظت کے لیئے کمپنی ایک فوج تیار کرے گی جس کے مصارف کے واسطے راجہ ساتھ لاکھ پگوڈا سالانہ ادا کرے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی طے پایا کہ جب کبھی فریقین کے علاقوں کی حفاظت یا غنیم کے خلاف جنگی تیاری میں غیر معمولی مصارف کمپنی کو برداشت کرنے پڑیں تو گورنر جنرل ریاست کی آمدنی اور اس کی مالی حالت کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد ان مصارف کا ایک حصہ راجہ کے ذمہ عائد کرے گا۔

اس خیال سے کہ میسور کی حفاظت کے لیئے کمپنی جو فوج رکھے گی اس کی وجہ سے کسی موقع پر اسے کوئی نقصان نہ پہونچے یہ طے کرلیا گیا کہ جب کبھی اس بات کا اندیشہ ہوگا تو کمپنی کو حق حاصل ہوگا کہ وہ میسور کی حکومت میں مناسب اصلاحات کرے یا کسی خاص علاقے کا انتظام جس سے فوج کے مصارف بہ آسانی وصول ہوسکیں اپنے ذمہ لے لے۔ اس سلسلے میں برطانوی حکومت نے وعدہ کیا کہ اس طور سے جس علاقے کا انتظام وہ اپنے ذمہ لے گی اس کی آمدنی و مصارف کا باقاعدہ حساب (بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

حیدرآباد سے جدید معاہدہ سنہ ۱۸۰۰ء

مرہٹوں کی مخاصمانہ و حاسدانہ روش جو انھوں نے ٹیپو کی جنگ (۲۴۳)
کے بعد سے اختیار کی تھی نیز حکومت پونہ کی کمزوری کے باعث اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کمپنی اور حیدرآباد کے درمیان جو تعلقات قائم ہوئے ہیں انھیں ہر عملی طریقے سے مستحکم کیا جائے تاکہ جنوبی ہند میں کسی قسم کی بدامنی کا اندیشہ باقی نہ رہے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے حیدرآباد کی اعانتی فوج میں اضافہ کرنا ضروری خیال کیا گیا اور دربار حیدرآباد کی تلون مزاجی اور کمزوری کی وجہ سے انگریزی حکومت کو جن خطرات کا اندیشہ ہو سکتا تھا ان کی مدافعت کی تدابیر پر غور کرنا لازم سمجھا گیا۔

اس اہم کام کی تکمیل کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسری ترکیب نہیں ہو سکتی
تھی کہ معاونتی فوج کے معاوضہ کی ماہانہ ادائگی کے بجائے کمپنی سلطنت حیدرآباد کا (۲۴۴)
ایک علاقہ مستقل طور پر حاصل کر لے۔ اس انتظام سے جو متعدد فوائد حاصل ہو سکتے تھے وہ صاف ظاہر ہیں سب سے پہلے تو اس بدمزگی کی گنجائش نہیں رہتی جو رقم کی ادائیگی کے ہر موقع پر ایک کمزور اور فضول خرچ دربار سے ہونا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں آمدنی کے جن ذرائع پر انگریزی فوج کا انحصار تھا وہ ان غیر آدمیوں کے ہاتھ میں ہونے کے بجائے جو اپنی ناعاقبت اندیشی بے وفائی یا کم ہمتی سے کسی نازک وقت میں دھوکہ دے کر انگریزی حکومت کو معرض خطر میں ڈال سکتے تھے اب برطانوی حکومت کے ہاتھ میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وہ راجہ کو پیش کرے گی یہ بھی طے پایا کہ کسی حالت میں راجہ کے ذاتی مصارف کی رقم ایک لاکھ پگوڈا سالانہ اور اس کے مقبوضہ علاقے آمدنی کے ۱/۵ حصے سے ہرگز کم نہ ہوگی۔

اس معاہدے میں راجہ نے اس بات کا بھی وعدہ کیا کہ نہ تو وہ کسی غیر سلطنت سے کسی قسم کے تعلقات قائم کرے گا اور نہ اجنبی یورپینوں کو اپنی ملازمت میں داخل کرے گا اور برطانوی حکومت کو اختیار ہوگا کہ ریاست کی حفاظت کے لئے وہ جس قلعے میں چاہے اپنی فوج رکھے۔

ہوں گے اور آیندہ سے کوئی فرمانروائے دکن انگریزوں سے تعلقات منقطع کرنے کا خیال بھی نہ کر سکے گا کیوں کہ سلطنت اپنا علاقہ دے کر برطانوی حکومت کی اعانت کا معاوضہ ہمیشہ کے لئے پیشگی ادا کر چکی ہوگی۔

لارڈ ویلزلی نے جدید معاہدے کے لئے حیدرآباد سے مراسلت شروع کی جو ۱۲/ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو طے ہوگیا۔[۱] (۲۴۵)

---

[۱] اس معاہدہ کی رو سے برطانوی حکومت نے اس بات کا بیڑہ اٹھایا کہ آیندہ سے وہ کسی طاقت کو بے باکانہ اور علانیہ طور سے سلطنت حیدرآباد پر فوج کشی نہ کرنے دیگی اور نہ اس کے خلاف کسی قسم کی مخاصمانہ جدوجہد کو روا رکھے گی لہذا اس ذمہ داری کو خوبی سے انجام دینے کے لئے سابق معاونتی فوج میں ہندوستانی سپاہیوں کے دو بٹالین اور ایک توپ خانہ کا مستقل طور پر اضافہ کیا گیا جس کے مصارف حیدرآباد کے ذمہ قرار پائے فوج میں اس طرح اضافہ ہو جانے کی وجہ سے اعلیٰحضرت نظام دکن نے اپنا تمام علاقہ جو انھیں ۱۷۹۲ء کے معاہدہ سرنگاپٹم اور ۱۷۹۹ء کے عہدنامہ میسور میں ملا تھا مستقل طور پر کمپنی کے حوالے کردیا تاکہ اس فوج کی تنخواہ بروقت اور باضابطہ طور پر ادا ہوتی رہے اس علاقے کی حدبندی کرنے کی غرض سے اس میں کسی قدر تبدیلی کردی گئی اعلیٰ حضرت نظام دکن نے کپل ۔ گوجندر گڈہ وغیرہ اپنے قبضے میں لے کر ادونی کا علاقہ کمپنی کو دے دیا جو دریائے تمبھدرا کے جنوب میں واقع ہے ۔ اور از روئے معاہدہ یہی دونوں سلطنتوں کی حد قرار پائی ۔

اسی سلسلے میں یہ بھی طے پایا کہ اگر فریقین کو کسی موقع پر کسی غیر طاقت سے جنگ کرنی پڑے تو اعلیٰحضرت نظام دکن کے پاس مذکورۂ بالا فوج کے دو بٹالین چھوڑ دیئے جائیں گے اور باقی تمام فوج سے غنیم کے خلاف کام لیا جائے گا اور ایسے موقع پر سلطنت کی چھ ہزار پیادہ اور نو ہزار سوار فوج بھی معاونتی فوج کے ساتھ شریک رہے گی ۔ فرمانروائے دکن سے یہ بھی طے پایا کہ وہ بغیر کمپنی کے مشورے کے کسی سلطنت سے کسی قسم کی مراسلت نہیں کریں گے اس کے ساتھ ہی کمپنی نے وعدہ کیا کہ وہ اُن کی اولاد۔ ان کے اعزہ اور ان کی رعایا کے معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گی اور ان امور میں بندگان عالی کو کامل اختیارات حاصل ہوں گے ۔

اعلیٰحضرت نظام دکن سے یہ بھی قرار پایا کہ وہ کسی ریاست کے خلاف اعلان جنگ نہیں کریں گے اور اگر کسی طاقت سے ان کا کوئی تنازعہ پیش آئے گا تو کمپنی کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آیندہ)

(۲۴۶) اس معاہدے سے کمپنی کو جو علاقہ ملا اس کی سالانہ آمدنی تقریباً سالانہ ستر لاکھ اٹھاون ہزار پگوڈا تھی لیکن سیاسی و فوجی نقطۂ نظر سے اس علاقے کی اہمیت کہیں زیادہ تھی اس سے کمپنی کے مقبوضات کارومنڈل اور جدید ریاست میسور کی اور زیادہ حفاظت ہوگئی اور فوجی نقطۂ نظر سے ان دونوں کی معقول اور محفوظ سرحد بھی قائم ہوگئی۔

برطانوی حکومت نے (جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے) ٹیپو سلطان کے مفتوحہ علاقے کا ایک حصہ پیشوا کے لئے اس شرط سے مخصوص کردیا تھا کہ اس کے عوض میں وہ امن و امان برقرار رکھنے کے لئے ایک جدید معاہدہ کرے۔ پیشوا نے دولت راؤ سندھیا کے اثر میں آکر (جو اپنی ایک کثیر اور تقریباً کل فرانسیسی فوج کے ساتھ پونا میں مقیم تھا) ان مناسب تجاویز کو مسترد کردیا لہٰذا مخصوص شدہ علاقہ تقسیمی معاہدے کے بموجب انگریزی حکومت اور سلطنت حیدر آباد میں تقسیم ہوگیا۔

ہولکر اور سندھیا کے باہمی تنازعات سنہ ۱۸۰۱ء

(۲۴۷) سنہ ۱۸۰۱ء کے اوائل میں جسونت راؤ ہولکر اور سندھیا میں جنگ چھڑ گئی اور سندھیا کو پونا چھوڑنا پڑا۔ مرہٹوں کی سلطنتوں کا یہ رنگ دیکھ کر لارڈ ویلزلی نے یہ خیال کیا کہ دربار پونا سے اپنا کام نکالنے اور وہاں برطانوی اثر قائم کرنے کا یہ اچھا موقع ہے اس کی خواہش تھی کہ پیشوا سے ایک ایسا معاہدہ ہوجائے جس کی بدولت ایک طرف تو پیشوا کا دوبارہ اقتدار قائم ہوجائے اور دوسری طرف اس کے باجگذار سرداروں کے مقبوضات یا واجبی حقوق میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہو اس کا خیال تھا کہ اگر مرہٹوں نے اس معاہدے کی مخالفت کی تو اس کی ایک یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ اس کے بعد ان کی ملک گیری اور دست درازیوں کے لئے گنجائش باقی نہ رہے گی لیکن برطانوی حکومت نے مجبوراً اپنی اور اپنے حلیفوں کی بقا کے لئے جو طرز عمل اختیار

(بقیۂ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) اسے بطور ثالث کے طے کرے اور وہ اس کے فیصلے سے اتفاق کریں گے۔

اس معاہدے میں یہ بھی قرار پایا کہ اگر پیشوا یا دولت راؤ سندھیا یا رگھو بھونسلا اس اتحاد میں شریک ہونا چاہیں تو انھیں شریک کرلیا جائے۔

کیا ہے اس کا اقتضا بھی یہی ہے کہ وہ اس قسم کی زیادتیوں کا سد باب کرنا اپنا فرض اولین سمجھے۔

ایک موقع پر خود پیشوا نے دفاعی معاہدے کے لیئے اپنی تجاویز پیش کی تھیں لیکن ان شرائط کی نوعیت اور پونہ کی اس وقت کی حالت کا لحاظ کر کے گورنر جنرل نے انھیں مسترد کر دیا تھا اس وقت پیشوا کا یہ مقصد معلوم ہوتا تھا کہ اس طرح وہ اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیئے انگریزوں کی مدد حاصل کر لے لیکن انھیں اپنی اور اپنے حلیفوں کی حفاظت کے لیئے اس کے دربار میں جس قسم کے اثر کی ضرورت تھی وہ انھیں حاصل نہ ہو سکے۔

(۲۴۸) پونے میں اس وقت جو گفت و شنید ہو رہی تھی اس کے نتیجے کی گورنر جنرل کو اطلاع بھی نہ ملنے پائی تھی کہ صلح امینیس[1] (Peace of Amiens) کی خبر آ پہونچی لہذا اب فرانسیسیوں کے لیئے سازش کا میدان کھلا ہوا تھا۔ سندھیا کو ہولکر سے جو شکست ہوئی تھی اگر اس سے وہ سنبھل جاتا (جس کا کہ واقعات کے لحاظ سے امکان نظر آتا تھا) تو وہ پیشوا نیز کل مرہٹہ سلطنت پر جو دریائے گنگا سے ساحل ملابار تک پھیلی ہوئی تھی اپنا سکہ بہ آسانی جما لیتا سندھیا کی فوجوں کی حالت اور اس کے فرانسیسی افسروں کے اثر و اقتدار سے جو شخص ذرا بھی واقف تھا وہ ایک لمحہ کے لیئے بھی اس بات میں شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ فرانسیسی قوم اپنے معاہدے کی کسی شرط کے خلاف ورزی کیئے بغیر سندھیا کی فوجی طاقت و قوت کو اس قدر زبردست بنا دیتی کہ اس کی وجہ سے برطانوی حکومت ہند کا وجود تک معرض خطر میں آ جاتا۔ فرانسیسی جو چالیں چل رہے تھے ان سے سندھیا واقف ہو گیا تھا اور ان سے اسے کسی قدر حسد بھی ہو گیا تھا لیکن باوجود اس کے اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ فرانسیسیوں کو اپنے تدابیر پر عمل کرنے میں کوئی دقت ہو گی۔ خود سندھیا اور اس کے پیشرو کو انھیں لوگوں کی بدولت یہ رتبہ حاصل ہوا تھا لہذا وہ ہر موقع پر ان کے کہنے پر چلتا تھا۔

(۲۴۹) مادھو راؤ کی موت کے بعد سے پیشوا کی سلطنت تو باہمی تنازعات کا اکھاڑہ بن گئی تھی اور اس کی حالت اس قدر خراب و خستہ ہو گئی تھی کہ مرہٹہ سلطنت کی

عله ۔ جون سنہ ۱۸۰۲ء

سرداری کا بزور شمشیر فیصلہ کرنے کے لئے لٹیروں کے جو جتھے ہر روز مالوے اور شمالی ہند سے پونہ میں وارد ہوتے رہتے تھے انھیں چند ماہ کے لئے بھی یہاں سے سامان رسد نہیں مل سکتا تھا۔

اس واقعے کی وجہ سے جس کی تردید نہیں کی جا سکتی یہ بات صاف ظاہر تھی کہ اگر سندھیا، ہولکر اور رگھوجی بھونسلا نے پونہ میں اپنا اپنا اکھاڑہ جما لیا تو انکی فوجیں اگر ارادۃً نہیں تو (رسد کی قلت کی وجہ سے) مجبوراً انگریزوں یا ان کے حلیفوں کے علاقوں پر حملہ آور ہونگی لہٰذا لارڈ ویلزلی نے اس موقع پر جو تدابیر اختیار کیں وہ محض مصلحت وقت کے لحاظ سے مناسب ہی نہ تھیں بلکہ ان حالات کے لحاظ سے اشد ضروری تھیں۔

پیشوا کا کمپنی سے معاہدہ ۱۸۰۲ء

سنہ ۱۸۰۲ء میں دولت راؤ سندھیا اور ہولکر میں جو جنگ ہوئی اس میں پیشوا نے سندھیا کا ساتھ دیا۔ اس کی فوجوں کو پونا کے قریب ۲۵ اکتوبر کو شکست فاش ہوئی۔ اس لڑائی کے شروع ہونے سے قبل ہی باجی راؤ اپنے دارالحکومت سے ساحل کی طرف فرار ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دیوان کے ہاتھ ایک مراسلہ اپنی مہر لگا کر برطانوی رزیڈنٹ[1] کے پاس روانہ کیا اور اپنی سلطنت میں (۲۵۰) معاونتی فوج رکھنے اور اس کے مصارف کے لئے گجرات یا سلطنت کے جنوبی علاقے میں چھبیس لاکھ سالانہ آمدنی کا ایک علاقہ مخصوص کرنے کا وعدہ کیا۔ ان تجاویز کو پیش کرتے وقت دیوان مذکور نے رزیڈنٹ کو یقین دلایا کہ اس کے آقا کا مصمم ارادہ ہے کہ جن اصولوں پر حیدرآباد سے کمپنی کا معاہدہ ہوا ہے انہی کے مطابق وہ بھی کمپنی سے ایک دفاعی معاہدہ کرے۔ گورنر جنرل کے پاس جب پیشوا کی تجاویز منظوری کی غرض سے پہنچیں تو اس نے فوراً ان کی توثیق کر دی اور پیشوا کو یقین دلایا کہ برطانوی حکومت اس کا اقتدار دوبارہ قائم کرانے کے لئے اپنی پوری قوت صرف کرے گی۔ رزیڈنٹ کو ہدایت کی گئی کہ وہ ان شرائط کو ایک دفاعی معاہدے کی صورت میں مرتب کرے اور برطانوی مفاد کے

[1] کرنل کلوز (Colonel Close)

لئے جو مزید شرائط ضروری ہوں ان کی پیشوا سے منظوری حاصل کرے۔
پیشوا نے ساحل پر پہنچ کر حکومت بمبئی سے ایک جہاز طلب کیا اور پناہ چاہی ان سب باتوں کو منظور کر لیا گیا اور وہ انگریزی جہاز ہرکیولین (Herculian) پر سوار ہو کر ۶ ار دسمبر کو بسین پہونچا۔ یہاں برطانوی رزیڈنٹ نے اس سے ملاقات کی اور برطانوی حکومت اور اس کے درمیان ایک وفاقی معاہدہ باضابطہ طور پر طے ہو گیا۔

عہد نامۂ بسین سنہ ۱۸۰۲ء

۳۱ ر دسمبر سنہ ۱۸۰۲ء کو اس معاہدہ پر دستخط ہو گئے۔ انگریزی حکومت نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی ہندوستانی پیادہ فوج کے چھ بٹالین اور ایک توپ خانہ جس میں یورپی توپچی ہوں گے پیشوا کو دے گی۔ پیشوا نے اس امدادی فوج کے مصارف کے لئے چھبیس لاکھ سالانہ آمدنی کا ایک علاقہ کمپنی کے حوالے کیا سورت اور گجرات کے (۲۵۱) انگریزی مقبوضات کے متعلق حکومت پونہ اور کمپنی کے درمیان جو تنازعات تھے وہ بھی طے ہو گئے۔ کمپنی نے گیکواڑ سے جو معاہدے کئے تھے انھیں بھی پیشوا نے تسلیم کر لیا۔ حیدرآباد اور پونہ کے درمیان جو تنازعات تھے ان میں کمپنی کو ثالث مان کر اس کے فیصلے پر عمل کرنے کا بھی وعدہ کیا علاوہ ازیں پیشوا نے اس بات کا بھی وعدہ کیا کہ وہ تمام ایسے اشخاص کو جن کا تعلق انگریزوں کی مخالف یورپی اقوام سے ہو یا جو برطانوی قوم کے مفاد کو نقصان پہونچانے میں یا اس کے خلاف کسی سازش میں مشغول ہوں اپنی ملازمت سے خارج کر دے گا۔

اس عہد نامے کے یہ خاص شرائط تھے اس کی تکمیل میں سہولت بہم پہونچانے اور برطانوی حکومت کے لئے تمام متوقعہ فوائد حاصل کرنے کے لئے جو تدابیر اس وقت اختیار کی گئیں انھیں بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

قلعۂ سینٹ جارج میں جو فوج جنرل اسٹوارٹ کی کمان میں موجود تھی وہ اس معاہدے کی تکمیل میں مدد دینے کے خیال سے جس میں پیشوا کو پونہ کی گدی پر دوبارہ بٹھانا بھی شامل تھا ساحل تمبھدرا پر پہنچ گئی۔

اس مقصد کے لئے جنرل ویلزلی کو ایک چیدہ فوج کی کمان دے کر روانہ کیا گیا جو پیشوا کی سلطنت کے جنوبی علاقے سے گزر کر اور دکن کی اعانتی فوج سے ملکر

(۲۵۲) جو کرنل اسٹی ونسن (Stevenson) کی کمان میں تھی ۲۰/اپریل کو پونہ پہنچ گیا۔ اس کے پہنچتے ہی ہولکر کی فوج فرار ہوگئی اور باجے راؤ جو برطانوی فوج کی آمد کی خبر سنکر بسین سے روانہ ہو چکا تھا پونہ پہنچا اور ۱۳/مئی کو اسے مسند نشین کرا دیا گیا۔

اس معاہدہ کا پہلا ثمرہ تو یہ ملا کہ ہولکر فرار ہوگیا اور اکثر باجگذار رئیسوں نے پیشوا کی اطاعت بہ خوشی قبول کرلی۔ اس سے پیشوا کو اطمینان ہوا اور انگریزی حکومت کو اس بات کی خوشی ہوئی کہ یہ اہم مسئلہ بغیر جنگ کے طے ہوگیا لیکن یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی اور جب دولت راؤ سندھیا اور بھونسلا نے اس کے حلیف نظام دکن کی سرحد کا رخ کیا اور برطانوی رزیڈنٹ کی پیش کردہ مختلف تجاویز کے جواب میں تاخیر کی اور انھیں ٹالنا شروع کیا تو تھوڑے ہی عرصے میں تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔

دولت راؤ سندھیا کا اس موقع پر طرز عمل سنہ ۱۸۰۳ء

(۲۵۳) دولت راؤ سندھیا نے رزیڈنٹ سے کئی مرتبہ مراسلت کرنے کے بعد یہ تسلیم کرلیا تھا کہ عہدنامہ بسین کے ضامن ہونے کی حیثیت سے اسے پیشوا اور برطانوی حکومت کے کسی معاہدے کی مخالفت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے نیز اس نے اس بات کا بھی اقبال کیا کہ جسونت راؤ ہولکر کے اخراج اور باجے راؤ کی مسند نشینی سے اسے فائدہ پہنچا ہے۔ اور اس نے صاف الفاظ میں تحریر کردیا کہ "پیشوا اور برطانوی حکومت کے درمیان جو جدید معاہدہ ہوا ہے اس کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا کرنے کا میں قطعی کوئی ارادہ نہیں رکھتا بلکہ میری تو یہ خواہش ہے کہ پیشوا اور برطانوی حکومت کے جو تعلقات اس وقت میری سلطنت سے قائم ہیں وہ اور بھی زیادہ مستحکم ہو جائیں۔"

اس اعلان کے پانچ دن بعد ہی سندھیا کے وزیر نے رزیڈنٹ سے دریافت کیا کہ برطانوی افواج پونہ کی طرف کیوں بڑھ رہی ہیں۔ اس کے جواب میں اسے مطلع کردیا گیا

علہ۔ جب جنرل ولزلی پیشوا کے جنوبی علاقے میں پہنچا تو وہاں کے بڑے جاگیرداروں نے جو پیشوا کے پرانے باجگذار تھے اطاعت قبول کرلی اور اس کے ہمراہ پونہ پہنچے۔ برسوں سے انھیں اطاعت قبول کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں ہوا تھا۔

کہ پیشوا سے جو معاہدہ ہوا ہے اس کی یہ ایک شرط ہے لہٰذا ان فوجوں کو نہیں روکا جا سکتا
اس کے ساتھ ہی اسے یاد دلایا گیا کہ وہ خود بھی اس معاہدے سے پورا اتفاق کر چکا ہے۔

۲۷ فروری کو رزیڈنٹ سندھیا کے مستقر برہان پور پہنچا۔ وہاں پہنچکر اسے خفیہ
طور پر اطلاع ملی کہ مرہٹے سردار برطانوی حکومت کے خلاف آپس میں ایک اتحاد قائم
کرنے میں سرگرم ہیں۔ جب راجہ برار کی فوجیں سندھیا کی افواج سے شرکت کرنے کے لئے
بڑھیں اور ساتھ ہی یہ پتہ چلا کہ ہولکر سے بھی مراسلت ہو رہی ہے تو ایک حد تک اس (۲۵۴)
خبر کی تصدیق ہو گئی لیکن جب دوسرے پہلو پر غور کیا گیا اور ان سلطنتوں کی نوعیت
کا اندازہ کیا گیا تو صاف ظاہر ہو گیا کہ چند ایسے اسباب اس وقت موجود ہیں جنکی وجہ
سے ان کا آپس میں متحد ہونا مشتبہ ہے اور اگر بہ فرض محال ان میں اتحاد ہو بھی
گیا تو ان کی باہمی مخاصمت اور ایک دوسرے کے مفاد کے تصادم کی وجہ سے کوئی
خاص خطرہ اس سے نہیں ہو سکتا۔

حقیقت حال یہ ہے کہ جب تک سندھیا کو اس بات کا خوف رہا کہ جسونت راؤ
ہولکر پونہ میں اپنا تسلط قائم کر سکتا ہے اس وقت تک وہ پیشوا کی مسند نشینی کے مسئلے میں
برطانوی حکومت کی مداخلت پر معترض نہیں ہوا بلکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ انگریزوں کے
اس مسلک کے باعث اسے اپنے اس حریف کا خاتمہ کرنے میں مدد ملے گی جس نے
پونہ میں فتح حاصل کر کے اپنی شہرت و قوت میں معقول اضافہ کر لیا تھا لیکن جیسے ہی اس
نے یہ دیکھا کہ برطانوی حکومت نے اپنی قوت اور فراست سے کام لے کر بغیر اس کی
اعانت کے ہولکر کو پونہ سے نکال باہر کیا اور پیشوا کو مسند نشین کرا دیا تو اس نے فوراً اپنی
تمام تدبیریں بدل دیں اور جس عہدنامے کو اس نے بلا کسی شرط کے تسلیم کر لیا تھا اس کی
مخالفت پر تل گیا۔

اس مقصد کے حصول کی غرض سے اس نے پہلے پونہ پہونچنا ضروری سمجھا۔ اگرچہ
اس کے وہاں پہنچنے سے پیشوا کا جدید معاہدہ منسوخ نہیں ہو سکتا تھا تاہم بدامنی کا اندیشہ
ضرور تھا لہٰذا گورنر جنرل نے اسے روکنے کا فیصلہ کیا اور اس کے دربار کے رزیڈنٹ کو
ہدایت کی کہ وہ سندھیا سے اس بات کا مطالبہ کرے کہ حیدرآباد دکن کی سرحد پر جو
خطرناک صورت اس نے پیدا کر دی ہے اس سے باز آئے اور نربدا عبور کر کے وہاں (۲۵۵)

سے واپس ہو جائے یا اس بات کا کامل ثبوت پیش کرے کہ اسکی نیت قطعی مخاصمانہ نہیں ہے۔

چونکہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ سندھیا بغیر جنگ کے اپنے ارادوں سے ہرگز باز نہ آئے گا لہذا میجر جنرل ویلزلی کو ہر موقع کے لئے تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا اور وہ حیدر آباد کی اعانتی فوج سے شرکت کرنے کی غرض سے پونہ سے چند میل شمال میں بڑھ گیا اور دولت راؤ سندھیا کے پڑاؤ پر اس وقت جو برطانوی رزیڈنٹ مقیم تھا اس سے قریب قریب روزانہ مراسلت کرنے کا وہاں سے انتظام کر لیا گیا۔

۲۷ مئی کو رزیڈنٹ نے سندھیا سے ملاقات کی اور عہدنامۂ بسین کی تفصیلی شرائط اس کے سامنے پیش کیں۔ سندھیا اور اس کے دیوان نے ایک دفعہ پر غور کرنے کے بعد کہا کہ "اس میں تو ہمارے جائز حقوق کے خلاف ایک بات بھی نہیں" لیکن اس بیان کے بعد بھی اس نے رزیڈنٹ کو اپنے ارادوں سے مطلع نہ کیا اور جب دوران ملاقات ہی میں اس نے اصرار کیا تو وہ یہ کہکر کھڑا ہو گیا کہ "راجہ برار سے ملاقات کرنے کے بعد میں تمھیں اطلاع دوں گا کہ ہم صلح چاہتے ہیں یا جنگ"۔

اس غیر معمولی دھمکی کے بعد کہ راجہ برار سے ملاقات کرنے کے بعد صلح یا جنگ کا فیصلہ کیا جائے گا معاملات کو مصالحت کے ذریعہ سے طے کرنے کی توقع اور بھی کم ہو گئی (۲۵۵)
بھونسلا جس کی مرضی پر اب فیصلے کا انحصار تھا اب تک کبھی انگریزی حکومت کے موافق نہیں رہا تھا۔ اس خیال کے لئے بھی وجہ موجود تھی کہ جس کام سے بھی پیشوا کی قوت میں اضافہ ہو گا اس سے اُسے حسد ہو گا۔ کیونکہ چند حقوق کے لحاظ سے مرہٹہ سلطنت کی سرداری کا وہ بھی دعویدار تھا اور اس وقت وہ اس کا خواب بھی دیکھ رہا تھا۔ گورنر جنرل اس کے ان تمام خیالات و جذبات سے واقف تھا اور وہ اسے اپنا ہم خیال بنانے کی ہر ممکن کوشش کر چکا تھا اور پونہ میں جو کارروائی ہوئی تھی اس کی تفصیل اور اس سلسلے میں اس کے جو مقاصد اور ارادے تھے ان سب کی اطلاع وہ اپنے ایک خط میں اسے دے چکا تھا لیکن جس طریقے سے اس نے اس تحریر کو وصول کیا اس سے اندازہ ہو گیا کہ وہ صلح کا حامی نہیں بن سکتا برخلاف اس کے اس بات کے تعین کے لئے معقول وجہ موجود تھی کہ بھونسلا اس موقع پر سندھیا اور ہر ایک سردار کو جو اس کے زیر اثر تھا جنگ پر آمادہ کرے گا۔ اگرچہ وہ خود بالطبع جنگجو نہ تھا لیکن

دوسرے مرہٹہ سرداروں کی طرح اسے بھی ہر لڑائی میں کامیابی نظر آتی تھی۔ ان سب کی تحریروں اور بیانوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ سابق موقع پر ان کی جو لڑائی انگریزوں سے ہوئی تھی اسی کے واقعات سے وہ اس وقت بھی نتائج اخذ کر رہے تھے۔ گزشتہ بائیس سال کی مدت میں جو انقلابات ہو چکے تھے انھیں وہ فراموش کیے ہوئے تھے انکے جتھے کو گذشتہ موقع پر ہمارے خلاف جو کامیابی ہوئی تھی اس کا وہ برابر حوالہ دیتے تھے اور اپنی جہالت و تکبر کی وجہ سے اس بات کے سمجھنے سے قاصر تھے کہ اس کے بعد
سے ہماری قوت میں جو اضافہ ہوا ہے اس کا کیا اثر ہو سکتا ہے لہٰذا جو شخص بھی (۲۵۷)
اس وقت کی مراسلت سے واقف تھا وہ بدیہی طور پر سمجھ سکتا تھا کہ باوجود ان تمام کوششوں کے جو اس غرض سے کی جا رہی تھیں کہ معاملات حد سے تجاوز نہ کرنے پائیں یہ سردار اپنے ارادوں سے باز نہ آئیں گے اور جنگ کرنے پر تلے رہیں گے۔

سندھیا سے جو گفت و شنید ہو رہی تھی اس کی بابت غیر تشفی بخش اطلاع ملنے کے بعد ہی لارڈ ویلزلی نے شمال ہند اور دکن کی فوجوں کے سپہ سالاروں کو ان کے علاقوں میں کامل دیوانی و فوجی سیاسی اختیارات عطا کر دئے اور میجر جنرل ویلزلی کو خاص طور پر اس بات کا اختیار دے دیا کہ وہ اس ابتدائی حالت ہی میں سندھیا اور ہولکر اور راجہ برار سے خود ذاتی طور پر یا وہاں کے مقامی انگریزی رزیڈنٹ اور کارندوں کی معرفت مراسلت کرے اور اپنے انتظامات یا معاہدوں کے ذریعہ سے انھیں اس بات پر آمادہ کرے کہ یا تو وہ اپنے اپنے علاقوں کو واپس ہو جائیں یا اس بات کی معقول ضمانت پیش کریں کہ وہ برطانوی حکومت اور اس کے حلیفوں کے ساتھ امن سے رہیں گے۔ ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی گئی کہ وہ سندھیا سے اس کے ارادے معلوم کرے اور ایک معینہ مدت کے اندر جواب حاصل کرنے پر اصرار کرے۔ مدت کا تعین جنرل ویلزلی کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا گیا تھا لیکن یہ ہدایت تھی کہ اس کا تعین کرتے وقت موسمی حالت کا لحاظ رکھا جائے تاکہ اگر حملہ کرنے کی نوبت آئے تو برطانوی حکومت کو فوقیت حاصل ہو سکے اور اگر تشفی بخش جواب نہ ملے تو رزیڈنٹ کو سندھیا کے مستقر سے واپس بلا لیا جائے اور اگر جنگ اٹل ہو جائے تو نہایت مستعدی سے اسے جاری رکھا جائے اور جب تک کہ مخالف سردار کی طاقت کو اچھے طور سے نہ کچل دیا جائے صلح کے کسی پیغام کا

کوئی لحاظ نہ کیا جائے۔ جنرل ویلزلی کو یہ اختیار بھی دیدیا گیا تھا کہ وہ مصلحت وقت کے لحاظ سے اپنی مرضی کے مواقق سندھیا اور راجہ برار سے خواہ دو جدا جدا معاہدے کرے یا ایک ہی مشترک معاہدہ۔

شمالی ہند میں ایک کثیر فوج لارڈ لیک (Lord Lake) کی کمان میں تھی اسے بھی ہدایات روانہ کی گئیں اور جنگ چھڑنے کے بعد جن جن مقاصد کا حاصل کرنا ضروری تھا انکی تفصیل بھی اسے تحریر کردیگئی۔ وہ مقاصد یہ تھے۔ شمالی ہند میں فرانسیسیوں کو جو زبردست اختیارات حاصل ہو گئے ہیں اور وہاں جو آزادی انھیں حاصل ہے انکا پورے طور پر خاتمہ کردیا جائے۔ پورے دوآبہ یعنے گنگا اور جمنا کے درمیان کمایوں پہاڑ تک جو علاقہ واقع ہے اس پر قبضہ کیا جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی دہلی و آگرہ اور دریائے جمنا کے دائیں کنارے پر کمایوں پہاڑ سے علاقہ بھیلکھنڈ تک قلعوں کا جو سلسلہ قایم ہے ان پر بھی قبضہ حاصل کیا جائے۔[ا]

(۲۵۹) گورنر جنرل نے اپنی ان ہدایات میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ نام نہاد مغل باشاہ اور اس کے اقتدار کو فرانسیسی جماعت کے اثر سے آزاد کرایا جائے اور بندھیلکھنڈ پر ہاتھ مارنے کا بھی اشارہ کیا کیونکہ بنارس کا علاقہ اور کمپنی کے دیگر چند اہم مقبوضات اس کے قرب میں واقع ہیں۔ اس خیال سے اس کا دشمنوں کے ہاتھ میں چھوڑنا خطرناک ہوگا۔

[ا] ۔ ان ہدایات کے سلسلہ میں گورنر جنرل نے لارڈ لیک کو لکھا کہ میرا مقصد یہ ہے کہ کمپنی کے مقبوضات کے حدود دریائے جمنا و شہر آگرہ و دہلی اور ان قلعوں کے سلسلہ سے آگے نہ بڑھیں جو اس دریا میں جہازرانی کی حفاظت کے لئیے ضروری ہیں۔ جمنا کے جنوب یا مغرب میں ان حدود سے آگے جو تعلقات بھی قایم ہوں اور وہ دفاعی اصول پر ہوں اور معاہدہ کرنے والوں کی حیثیت ماتحت باجگذاروں کی ہو تاکہ برطانوی حکومت اور مرہٹہ سلطنت کے درمیان ادنیٰ ریاستوں کی ایک حد فاصل قایم ہوجائے اور ان ریاستوں کو اپنے اپنے علاقہ میں آزادی حکومت کے اختیار حاصل رہیں لیکن وہ کمپنی کی حلیف رہیں اور اسی کی حفاظت کی محتاج ہوں۔

ان ہدایات کو عمل میں لانے کے لیے گورنر جنرل کے نزدیک جو تدبیریں ضروری تھیں ان کی تفصیل بھی لارڈ لیک کو لکھ دی گئی تھی لیکن حالات و واقعات کے لحاظ سے ان میں مناسب ترمیم یا تبدیلی کرنے کا اسے پورا اختیار دے دیا گیا تھا۔ بہر حال جنرل ویلزلی اور دولت راؤ سندھیا کے درمیان جو مراسلت ہو رہی تھی اس کے انجام پر جنگ شروع کرنے کا انحصار تھا۔

میجر جنرل ویلزلی کو جو ہدایات ملے تھے ان کے بموجب اس نے دولت راؤ سندھیا کو ایک مراسلہ روانہ کیا اور عہد نامہ بسین کے صلح آمیز مقاصد بیان کئے اور اس عہد نامہ کے بعد سے مرہٹہ سرداروں نے جو مخاصمانہ روش اختیار کی تھی ان کا ذکر کرنیکے بعد اس بات کا مطالبہ کیا کہ سندھیا اور راجہ برار کی فوجیں ایک دوسرے سے جدا ہو کر نربدا عبور کریں۔ اس کے ساتھ ہی اپنی طرف سے اس نے یہ یقین دلایا کہ اگر مرہٹہ (۲۶۰)
سردار اس تجویز پر عمل کریں گے تو برطانوی فوجیں بھی اپنے اپنے مستقر پر واپس ہو جائیں گی۔

سندھیا سے بحث و مباحثہ سنہ ۱۸۰۳ء

جب جنرل ویلزلی کو گورنر جنرل کی مزید ہدایات مورخہ ۲۶ جون موصول ہوئیں تو اس نے سندھیا کو دوسرا خط لکھا اور جو وسیع اختیارات اسے حاصل تھے ان کی اسے اطلاع دی اور ساتھ ہی ساتھ رزیڈنٹ کو ہدایت کی کہ وہ اس بات پر اصرار کرے کہ سندھیا راجہ برار سے علحدگی اختیار کرے اور ان دونوں کی فوجیں اپنے اپنے قدیم مستقر کو واپس ہوں اور اگر اس کی تعمیل نہ ہو تو وہ فوراً مرہٹوں کے پڑاو سے واپس ہو جائے۔

دولت راؤ سندھیا نے شروع میں تو جنرل ویلزلی کی تجاویز قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی لیکن راجہ برار سے صلاح کرنے کے بعد ۲۵ جولائی کو رزیڈنٹ کو مطلع کیا کہ "ہماری فوجیں اپنے اپنے علاقوں ہی میں ہیں اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ نہ ہم اجنتی پہاڑ سے آگے بڑھیں گے اور نہ پونہ کا رخ کریں گے۔ ہم نے گورنر جنرل کو بھی اپنی طرف سے اس بات کا اطمینان دلانے کے لیے تحریر روانہ کر دی ہے کہ عہد نامہ بسین کی منسوخی کے لیے ہم کوئی کوشش نہیں کریں گے۔"

ان باتوں کے جواب میں رزیڈنٹ نے میجر جنرل ویلزلی کے مطالبات کو دہرایا

اور اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ جبتک آپ اس پڑاؤ پر مقیم رہیں گے آپ کی ان باتوں پر
اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وہاں آپ کا قیام آپ کی حفاظت کے لیے ضروری نہیں ہے
برخلاف اس کے وہاں سے ہمارے حلیف حضور نظام دکن کی سرحد پر حملہ کا خوف ہے" (۲۶۱)
ان دلائل کے سننے کے بعد ان سرداروں نے قطعی جواب دینے کیلئے ۲۸ جولائی تک مہلت
مانگی چونکہ رزیڈنٹ کو ذاتی طور سے اس بات کا علم تھا کہ گورنر جنرل حتی الوسع جنگ سے
بچنا چاہتے ہیں۔ اسلیئے اس نے جنرل ویلزلی کی ہدایات کے خلاف انھیں مزید مہلت دیدی۔

۲۸ تاریخ کو رزیڈنٹ نے ان کے وعدہ کے بموجب آخری جواب کا مطالبہ کیا اسکے
جواب میں یہ پیغام ملا کہ آج دولت راؤ سندھیا اور راجہ آپس میں بات چیت کرنے والے ہیں
اسمیں آپکی شرکت ضروری نہیں اسکے بعد آپ سے ملاقات کرنیکے لیئے وقت مقرر کیا جائے گا۔

اس کے جواب میں رزیڈنٹ نے دولت راؤ سندھیا پر وعدہ خلافی کا الزام لگایا۔
اور اسے آگاہ کیا کہ "اگر کل دوپہر تک تشفی بخش جواب نہ ملا تو میں اپنے خیمے اورنگ آباد
روانہ کردوں گا۔ اور دوسرے دن خود بھی چل دوں گا۔"

ان سرداروں کی طرف سے ٹال مٹول ہوتی رہی لیکن باوجود اس کے رزیڈنٹ
سندھیا اور بھونسلا سے ۳۱ جولائی کو ایک مرتبہ اور ملاقات کرنے کے لیئے راضی ہوگیا
ان دونوں کی طرف سے معاملات طے کرنے کے لیئے اس کے سامنے متعدد تجاویز پیش
کئے گئے اور آخر میں انھوں نے کہا کہ وہ برہان پور واپس ہونے کے لئے اس شرط پر آمادہ ہیں
کہ جنرل ویلزلی پہلے اپنی فوجیں اپنے قدیم پڑاؤ پر لے جائے۔ اس کا رزیڈنٹ نے یہ
جواب دیا کہ "یہ تجویز ہرگز تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ آپ کو اس کے بعد بھی اپنی مرضی (۲۶۲)
کے موافق اپنے تدابیر پر عمل کرنے کا موقع رہے گا۔ اور کمپنی کو اس وقت آپ کو روکنے
کے جو مواقع حاصل ہیں ان سے وہ محروم ہو جائے گی"۔ اس جواب کے بعد انھوں نے
یہ تجویز پیش کی کہ ان کی فوجوں کی واپسی کے لیئے رزیڈنٹ خود ایک دن مقرر کردے
اور برطانوی حکومت کی طرف سے اس بات کا وعدہ کرے کہ اسی روز جنرل ویلزلی
کی فوجیں بھی اپنے قدیم مستقر کی طرف کوچ شروع کردیں گی۔ اگرچہ ان تجاویز کو جنرل
ویلزلی کی ہدایات کے بموجب قبول نہیں کیا جا سکتا تھا تاہم اس کی خواہش تھی کہ ابتک
جو گفت و شنید وہ نہایت خوش اسلوبی اور قابلیت سے کرتا رہا ہے وہ صلح پر ختم

ہو جائے اس لیئے وہ اس بات پر راضی ہوگیا کہ سمجھوتے کے لیئے جو تجاویز پیش ہوئے تھے وہ اپنے خط کے ساتھ جنرل ویلزلی کے پاس روانہ کردے گا اور اس کا جواب آنے تک خود وہیں مقیم رہے گا۔ اس گفت وشنید میں ان سرداروں نے ہر موقع پر ٹال مٹول جھوٹ اور فریب سے کام لیا تھا۔ آخر میں یہ سب باتیں صاف ظاہر ہوگئیں سندھیا اور بھونسلا نے جنرل ویلزلی کو جو خطوط روانہ کئے تھے وہ رزیڈنٹ کے پاس بھیجدئیے گئے ان میں بجائے اس تجویز کے جو انھوں نے اس سے طے کی تھی صرف یہ درج تھا کہ اگر جنرل ویلزلی اپنے مستقر کو واپس ہو جائے گا تو ان کی متحدہ فوجیں بھی برہان پور
(۲۶۳) واپس چلی جائیں گی چونکہ رزیڈنٹ اس تجویز کو قطعی طور پر مسترد کرچکا تھا۔ لہٰذا ان کی اس کارروائی کو اس نے اپنی توہین اور ان کی بیوفائی پر محمول کیا اور جس بات کے باور کرنے میں اسے اب تک تامل ہو رہا تھا اس کا اب اسے کامل یقین ہوگیا یعنی یہ کہ ان سرداروں کا یہ مصمم ارادہ ہے کہ اگر وہ برطانوی حکومت کا خاتمہ نہ کرسکیں تو اسکی سلطنت پر اور اس کے حلیفوں پر حملہ کرکے اس کی قوت کم کرنے کی انتہائی کوشش کریں اور یہ سب ٹال مٹول محض اس غرض سے ہے کہ اس مدت میں وہ اپنے تمام وسایل یکجا کرلیں اور مراسلت وسازش کے ذریعہ سے اپنے اتحاد کو جو برطانوی قوت کے خلاف وہ قایم کرنا چاہتے ہیں مستحکم کریں۔

سندھیا اور راجہ برار کے خلاف جنگ ۱۸۰۳ء

کرنل کالنس (Colonel collins) ۳ اگست کو سندھیا کے پڑاؤ سے روانہ ہوگیا اور ۸ اگست کو جنرل ویلزلی نے احمد نگر پر حملہ کرکے جنگ شروع کردی۔

جنگ سے قبل اسی قسم کی گفت وشنید جاری رہی، اس جنگ کے انصاف اور اس کی حقیقی ضرورت سے صرف وہی لوگ انکار کرسکتے ہیں جو اس حکمت عملی کی دانشمندی ہی کے منکر ہوں جس کے ذریعہ سے ٹیپو سلطان جیسے غنیم کا جسے انگریزوں کے نام سے عداوت تھی خاتمہ کیا گیا۔ لارڈ ویلزلی نے اپنی حکمت عملی کے خاص مقصد میں فرمانروائے دکن کی اعانت حاصل کرنے کی غرض سے جو معاہدے حیدرآباد
(۲۶۴) سے کئے تھے ان کی تکمیل ریاست پونہ کے دربار میں معقول اثر قایم کئے بغیر ہرگز

نہیں ہوسکتی تھی۔ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اگر انگریز جنگ کے برے نتائج سے عارضی نجات حاصل کرنے کی غرض سے اس سلطنت کے مفاد یا استحکام کو کسی خطرے میں ڈال دیتے تو ان کی یہ ایک نہایت ذلیل حرکت ہوتی۔

سندھیا اور اسکے حلیف کی ناکامی سنہ ۱۸۰۳ء

سندھیا اور راجہ برار سے برطانوی حکومت کی جو جنگ ہوئی اس کے واقعات تفصیل سے بیان کرنا اس کتاب کے موضوع کے خلاف ہوگا۔ یہ جنگ صرف پانچ مہینے جاری رہی لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کو متعدد نمایاں اور فیصلہ کن فتوح حاصل ہوئے۔ دہلی۔ لسواڑی۔ اسائی۔ ارگاؤں کی لڑائیاں اس قلیل مدت میں فتح ہوئیں۔ علیگڑھ۔ آگرہ گوالیار۔ احمدنگر۔ اسیرگڑھ۔ گوال گڑھ اور کٹک کے مستحکم قلعے اور دیگر متعدد معمولی قلعے بھی اسی زمانہ میں تسخیر ہوئے۔ جب ان سرداروں کی پیادہ فوجوں اور توپ خانوں کا خاتمہ ہوگیا۔ ان کے بہترین قلعے ان کے ہاتھ سے نکل گئے اور جن قلعوں پر انھیں ناز تھا وہ تسخیر ہوگئے تو مجبوراً انھوں نے علٰحدہ علٰحدہ صلح کی درخواست کی۔ سندھیا کی باقاعدہ فوج کی تباہی دراصل اس جنگ کا ایک نہایت اہم واقعہ تھا۔ اس میں تقریباً چالیس ہزار قواعد داں سپاہی تھے جن کے پاس ایک زبردست توپ خانہ تھا۔ فرانسیسی سپہ سالار کے پاس ان کی کمان تھی ان کے مصارف کے لئے ہندوستان کے زرخیز ترین علاقوں کی آمدنی مخصوص تھی اس فوج کی شکست کے بعد ہی سندھیا نے جنگ جاری رکھنے کا خیال ترک کیا اور (۲۶۵)
وہ برطانوی حکومت کے فیض و کرم پر بھروسہ کرنے پر مجبور ہوا۔

سندھیا اور راجہ برار سے معاہدے سنہ ۱۸۰۳ء

راجہ برار نے اس معاملہ میں پیشقدمی کی اور گوال گڑھ کے اہم قلعے کی تسخیر کے بعد ہی جنرل ویلزلی سے معاہدہ[1] کرلیا۔ اس کے بعد ہی جنرل ویلزلی نے سندھیا سے بھی اسی اصول پر صلح کی بات چیت شروع کی کہ پہلے وہ اپنی مکمل شکست تسلیم کرلے۔ سندھیا کو جو

[1] ۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۰۳ء کو یہ معاہدہ طے پایا جس میں رگھوجی بھونسلا نے کٹک کا علاقہ دیا۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

(۲۶۶) شرائط[لہ] پیش کی گئیں وہ اس کے حالات کے لحاظ سے نہایت معقول تھیں۔ ان سے بہتر کی
وہ ہرگز توقع نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے دیوان نے اس بات کو تسلیم بھی کیا۔ چند چھوٹے
صوبے[عہ] چند دیہات کے جو اس کے خاندان کے موروثی مقبوضات تھے اسے واپس
دیدیئے گئے اور ان کی وجہ سے ایک حد تک دیگر نقصانات کا تدارک ہوگیا۔
سندھیا کے جن باجگزار راجاؤں اور رئیسوں سے کمپنی نے معاہدے کرلیئے تھے
ان سب سے اس نے اس عہد نامہ کی ایک دفعہ کے مطابق بجز چند مستثنیات کے
(۲۶۷) دست برداری دیدی۔ اسی سلسلہ میں قلعۂ گوالیار اور علاقۂ گوہد کے متعلق تنازعہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور واردہا کے مغرب میں صوبہ برار کے علاقہ سے دست برداری دی۔ اس علاقہ کی آمدنی میں وہ حضور نظام دکن کے ساتھ شریک تھا۔ فرمانروائے دکن کے لیئے مالی فایدے کے مقابلہ میں سرحد کی حفاظت کے خیال سے اس کی فوجی اہمیت بہت زیادہ تھی علاوہ ازیں ایک علاقہ میں دوسرے کے دخل و اختیار سے مالگذاری وصول کرنے میں جو تنازعات رہتے تھے ان سے بھی نجات ملگئی۔
کمپنی نے راجہ برار صوبہ دار دکن اور پیشوا کے باہمی تنازعات کو آیندہ بحیثیت ثالث طے کرنے کی ذمہ داری لی اور راجہ نے وعدہ کیا کہ وہ کسی فرانسیسی اور یوروپ و امریکہ کی کسی ایسی قوم کی رعایا کو جو انگلستان کے خلاف جنگ میں مصروف ہو اپنے یہاں ملازم نہیں رکھے گا۔ یہ بھی طے پایا کہ فریقین کے دربار میں ایک دوسرے کا وزیر مقیم رہے گا۔
عہ۔ سندھیا کے عہد نامہ پر ۳۰ دسمبر ۱۸۰۳ء کو دستخط ہوئے جس کی رو سے اس نے شمالی ہند میں اپنے تمام مقبوضات جو جے پور، جودھ پور اور گوہد کے شمال میں واقع تھے کمپنی کے حوالے کئے۔ بھروچ کا علاقہ اور وہاں کا قلعہ بھی دیدیا۔ اجنٹا کے جنوب کی تمام اراضی بھی دیدیں اور برطانوی حکومت۔ اس کے حلیف صوبہ دار دکن، پیشوا، اور گیکواڑ پر اس کے جو مطالبات تھے۔ ان سب سے بھی دست برداری دے دی۔
اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اگر آیندہ سندھیا برطانوی حکومت سے کوئی دفاعی معاہدہ کرے تو انگریزی فوج کے مصارف جو اس کی خدمت کے لیے رکھی جائے اس علاقہ سے وصول کئے جائیں گے جو عہد نامۂ ہذا سے اس نے کمپنی کو دیا ہے۔
سندھیا کے دربار اور فوج کے خاص خاص عہدہ داروں کو شمالی ہند کا علاقہ نکل جانے سے جو نقصان پہنچا تھا اس کا لحاظ کرتے ہوئے کمپنی نے وعدہ کیا کہ وہ سندھیا کی پیشکردہ فہرست کے مطابق انہیں پندرہ لاکھ سالانہ کے وظائف دیگی۔

ہو گیا اور صلح کے بعد فریقین میں جو یگانگت ہونی چاہیے تھی اس میں اسکی وجہ سے عارضی طور پر خلل آگیا۔ برطانوی حکومت بلاشبہ حق بہ جانب تھی لیکن باوجود اس کے سندھیا اور اس کے وزراء اس مسئلہ پر برابر شور مچاتے رہے۔ انھیں مجبوراً اس وقت خاموش ہونا پڑا۔ لیکن برطانوی حکومت نے فتح کے بعد جو صلح آمیز روش اختیار کی تھی اس کی وجہ سے وہ برابر کامیابی کی توقع کرتے رہے۔ اگرچہ ان کے اس دعویٰ کو قطعی طور پر رد کر دیا گیا تھا تاہم جب بھی انھیں موقع ملتا تھا اور وہ حالات اپنے موافق دیکھتے تھے اپنا مطالبہ پیش کر دیتے تھے۔

اس عہد نامہ پر ۳۰ دسمبر ۱۸۰۳ء کو دستخط ہوئے اور ۲۷ فروری ۱۸۰۴ء کو سندھیا کے دربار والے برطانوی ریزیڈنٹ[۱] نے اس سے ایک دفاعی معاہدہ[۲] کیا جس کی وجہ سے اتحاد اور بھی مستحکم ہو گیا۔

ہولکر کا طرز عمل سنہ ۱۸۰۴ء

(۲۶۸) سندھیا اور راجہ برار کی جنگ کے دوران میں جسونت راؤ ہولکر نے جو روش اختیار کی وہ مرہٹہ سرداروں کی طبائع اور خصوصیات کے مطابق تھی۔ اس نے انگریزوں کے خلاف اتحاد میں محض شرکت ہی کا وعدہ نہیں کیا تھا بلکہ راجہ برار کے توسط سے سندھیا کے ساتھ ایک علٰحدہ معاہدہ بھی کیا تھا اور اس معاہدے میں سندھیا نے اسے ملا لینے کی غرض سے ترغیب کے طور پر اسے معقول مراعات دئے تھے اس طور سے شروع میں تو اس نے ہر بات کا وعدہ کر لیا لیکن جب جنگ چھڑ گئی تو اپنے ساتھیوں کو مدد دینے کا نام تک نہ لیا۔ اس بات کے یقین کرنے کے لئے بھی وجہ موجود ہے کہ ابتداء میں اس کے حریف سندھیا کو جو شکستیں ہوئیں

[۱]۔ لفٹنٹ کرنل میلکام۔

[۲]۔ اس معاہدہ کے مطابق سندھیا کی مدد کے لئے ہندوستانی سپاہیوں کے چھ بٹالین تیار کئے گئے سندھیا کو اختیار دیا گیا کہ انھیں وہ خواہ اپنے مقبوضہ علاقے میں رکھے یا کمپنی کے کسی ملحقہ سرحدی علاقے میں تعینات کرے۔ کمپنی کو جو علاقہ اس نے دیا تھا اس کی آمدنی میں سے انکے مصارف کی ادائگی قرار پائی۔ اس دفاعی معاہدہ کی باقی تمام شرائط وہی تھیں جو کمپنی نے حیدرآباد اور پونہ سے طے کی تھیں۔

ان سے وہ بہت خوش ہوا اور اگر اس کے خیالات میں کچھ تبدیلی ہوئی (جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہوئی) تو اس وقت جبکہ اس نے سندھیا کو بالکل تباہ ہوتے دیکھا لیکن انگریزوں کی فتوحات کچھ ایسی تیزی سے اور اس قدر فیصلہ کن ہوئیں کہ اسے مداخلت کا قطعی موقع نہ مل سکا تاہم صلح ہونے سے قبل ہی اس نے شمالی ہند کا رخ کیا اور راجہ جے پور کی سرحد پر جو اس وقت کمپنی کی حفاظت میں تھا جا پہنچا۔

باوجود اس کے کہ جسونت راؤ ہولکر ہمیشہ انگریزوں کی دوستی کا دم بھرتا رہا تھا۔ اس وقت اس کا کچھ اور ہی رنگ تھا۔ لہذا گورنر جنرل نے لارڈ لیک کو ہدایت کی کہ وہ اس سے مراسلت کرے اور اس کے ارادوں کا ٹھیک اندازہ لگائے تاکہ کمپنی
کو اس کی فوج کے لیٹروں سے نجات ملے جو اس کی یا اس کے حلیفوں کی سرحد پر اس کی (۲۶۹)
کمان میں جمع ہو گئے ہیں اور ان کی وجہ سے اسے مصارف برداشت نہ کرنے پڑیں۔

لارڈ لیک نے ۲۹ جنوری ۱۸۰۴ء کو ہولکر کے نام ایک خط روانہ کیا اور اس میں چند شرائط تحریر کیں جن کی تعمیل کی صورت میں برطانوی حکومت اسے آزاد و خود مختار چھوڑ سکتی ہے۔ وہ شرائط یہ تھیں کہ اپنی وفاداری اور صداقت کے زبانی وعدوں کی تائید کے لحاظ سے وہ اپنی فوج کو اپنی موجودہ قیام گاہ سے ہٹا کر جہاں اس نے خطرناک صورت پیدا کر دی ہے اپنے علاقے کو واپس ہو جائے اور اس بات کا وعدہ کرے کہ آئندہ کبھی برطانوی حکومت کے حلیفوں سے خراج وصول نہیں کرے گا۔

چند روز بعد ہولکر نے برطانوی سپہ سالار کے پاس اپنے وکیل بھیجے جنہوں نے اپنے آقا کی طرف سے مندرجہ ذیل شرائط پیش کیں:-

اول۔ ہولکر کو اپنے اسلاف کے رواج کے مطابق چوتھ وصول کرنے کا حق دیا جائے۔

دوم۔ جو علاقے اس کے بزرگوں کے قبضے میں تھے وہ اسے واپس دیے جائیں (ان میں دوآبے اور بندیلکھنڈ کے نہایت زرخیز بارہ ضلع شامل تھے)

سوم۔ علاقہ ہوریانا جو پہلے اس کے خاندان کے قبضے میں تھا اسے

واپس دیا جائے ۔

چہارم ۔ ان سب علاقوں پر اس کی حکومت تسلیم کرلی جائے اور سندھیا کی شرائط پر اس سے بھی ایک معاہدہ کر لیا جائے ۔

(۲۸۰) ان بیجا مطالبات کو فوراً مسترد کر دیا گیا۔ ان کی نوعیت اور ان کے پیش کرنے کے طریقے سے لارڈ لیک کو جسونت راؤ کے ارادوں کا صحیح اندازہ ہوگیا اور بعد میں اس نے جو خطوط شمالی ہند میں برطانوی حکومت کے باجگزار اور ماتحت سرداروں کو ابھارنے اور بغاوت پر آمادہ کرنے کے لیے روانہ کیے ان سے ان ارادوں کا اور بھی زیادہ پتہ چل گیا اس نے اس معاملہ میں ہر ممکن کوشش کی اور ہر قسم کے دلایل پیش کیے اور ان سرداروں کو مطلع کیا کہ وہ بہت جلد کمپنی پر حملہ کرکے اس کے مقبوضات کو تاخت وتاراج کرنے والا ہے۔ اسی عرصہ میں جنرل ویلزلی نے ہولکر کی ایک تحریر (جو غالباً فروری میں لکھی گئی تھی) لارڈ لیک کے پاس روانہ کی۔ اس میں ہولکر نے دکن کے چند علاقے اس بنا پر طلب کیے تھے کہ وہ پہلے اس کے خاندان کے قبضے میں تھے اور اس تحریر کو اس نے مندرجہ ذیل الفاظ پر ختم کیا تھا۔

"کمپنی کے ملک کو سو سو کوس تک لوٹ کر تباہ کر دیا جائیگا لارڈ لیک کو ایک لمحہ کے لیے دم لینے تک کی مہلت نہ ملے گی۔ میری فوج مثل سمندر کی موجوں کے بے شمار ہے۔ جب وہ ٹوٹ پڑیگی تو لاکھوں انسانوں پر آفت وبلا نازل ہو جائے گی"۔

اس توہین اور دھمکی کے ساتھ ہی اس نے اقدامی حملے کی علانیہ کارروائی بھی شروع کردی۔ اپنا ایک وکیل سندھیا کے دربار میں بھیجا اور برطانوی حکومت پر حملہ کرنے میں اس سے مدد چاہی اور راجہ جے پور کی ریاست پر دھاوے بھی شروع کر دیے۔

ہولکر سے جنگ سنہ ۱۸۰۴-۵ء

(۲۸۱) برطانوی سپہ سالار اس کی ان تمام حرکات کو بجز اعلان جنگ کے اور کسی بات پر محمول نہیں کرسکتا تھا لہذا اس نے ہولکر کی طرف رخ کیا ہولکر فوراً اپنے اڈے سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور برطانوی فوج نے کچھ دور تک اس کا تعاقب کیا۔

اس طور سے جنگ چھڑ گئی۔ اس میں جو نمایاں فتوحات حاصل ہوئیں وہ چند ناکامیوں کی وجہ سے پھیکی پڑ گئیں۔ اگرچہ کرنل مانسن کی مراجعت اور محاصرۂ بھرت پور سے جس میں سپاہیوں اور افسروں کی بہت جانیں تلف ہوئیں کمپنی کو بہت سخت زک پہونچی تاہم لارڈ ویلزلی کے دور کے ختم سے قبل ہی ہولکر کی طاقت کا خاتمہ ہو گیا۔ ڈیگ کی لڑائی میں تو اس کی باقاعدہ پیادہ فوج اور توپ خانے کو نقصان پہونچا اور فتح گڑھ کی لڑائی میں اس کی سوار فوج کی ہمت پست ہو گئی۔ اس کے خاندان کے دو مستحکم قلعے چندور (Chandour) اور گولناہ (Guelnah) بھی لے لئے گئے۔ اپریل ۱۸۰۵ء میں اس مفرور قزاق نے دریائے چمبل کیطرف مراجعت کی۔ اسوقت اسکی سوارہ فوج چالیس ہزار سے گھٹ کر آٹھ یا دس ہزار اور پیادہ فوج بیس ہزار میں سے چار یا پانچ ہزار رہ گئی تھی اور سو توپوں میں سے صرف بیس تیس توپیں اس کے پاس باقی رہ گئی تھیں۔ اگرچہ ان واقعات کے بعد اس سے فوری صلح نہ ہوئی تاہم اس کی بعد کی کوششوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کس قدر مغلوب ہو چکا تھا۔

ایران میں برطانوی سفیر کی کامیابی ۱۸۰۰ء

۱۷۹۹ء و ۱۸۰۰ء میں زمان شاہ کے حملے کا خوف رہا اس خطرے کی مدافعت (۲۶۲)
کے لئے لارڈ ویلزلی نے جو مختلف تدابیر اختیار کیں ان کے ساتھ ہی اس نے اپنا ایک سفیر ایران بھی روانہ کیا۔ اس سے قبل ہی اس نے ایک ہندوستانی سفیر وہاں روانہ کیا تھا جس کا وہاں اچھی طرح استقبال ہوا تھا۔ اور ایک حد تک اسے کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی۔ اب جو سفیر[1] دربار طہران کو روانہ کئے گئے ان کی شان و شوکت شاہ ایران اور اسکی رعایا کے رسم و رواج اور خصوصیات کے مطابق اور جس سلطنت کی طرف سے وہ بھیجے گئے تھے اس کی دولت و اقتدار کے شایان شان تھی۔ اس وفد کو اپنے ہر مقصد میں پوری پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ برطانوی وفد کی کوششوں سے شاہ ایران نے خراسان پر حملہ کرنے کی آمادگی ظاہر کی جس کی وجہ سے زمان شاہ کو ہندوستان کا خیال ترک کرنا پڑا مزید براں ایران سے سیاسی

[1] لفٹننٹ کرنل میلکام۔

وتجارتی تعلقات قائم ہوئے جن کی بہ دولت فرانسیسی ایران سے خارج کر دیئے گئے اور انگریزوں کو خاطر خواہ فایدہ پہونچا اس بات میں قطعی شبہ کی گنجایش نہیں کہ جس دور اندیشی اور خوش اسلوبی سے یہ تعلقات قایم کئے گئے تھے اگر اسی طرح انھیں بڑھانے اور برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی تو اس علاقہ میں انگریزوں کا معقول اثر قایم ہو جاتا۔ اور وہ ان تمام خطرات سے محفوظ ہو جاتے جن کا کہ ہمیشہ انھیں اس سمت میں کھٹکا لگا رہتا ہے۔

مصر کیلئے مہم سنہ ۱۸۰۰ء

سنہ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی نے ایک مہم مصر کے لیے تیار کی اور سر ڈیوڈ بیرڈ Sir David Bird ہندوستان سے ایک کثیر التعداد فوج لے کر سوئز کے راستے سے اسکندریہ روانہ ہوا۔ بحر روم (۲۰۳)
(Mediterranean sea) پر اس برطانوی فوج کا جس میں زیادہ تر ہندوستانی سپاہی شامل تھے کچھ عجیب ہی سماں تھا۔

مارکوئس ویلزلی کے زمانہ میں چند متعدد معمولی کام اور انجام پائے۔ ان سب کا بھی وہی رنگ تھا اور وہی آغاز اور وہی اختتام تھا۔ اور ان میں کبھی ویسی ہی کامیابی حاصل ہوئی جیسی کہ مذکورہ بالا واقعات میں ہوئی تھی۔[1] یہ سب معاملات کتنے ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں اس جگہ ان کا بیان کرنا اس کتاب کی ضخامت بڑھائے بغیر ممکن نہیں لہذا اب ہم صرف وہ انقلابات بیان کریں گے جو برطانوی حکومت اور اودھ و کرناٹک کی تحتانی ریاستوں کے تعلقات میں واقع ہوئے۔

اودھ کے معاملات سنہ ۱۷۹۹ء

جب لارڈ ویلزلی ٹیپو سلطان کی قوت کا خاتمہ کرکے مدراس سے بنگال واپس ہوا تو سب سے اہم کام جس کی اسے فکر دامنگیر ہوئی

[1] جب وزیر علی انگریزی رزیڈنٹ مسٹر چیری کے دردناک قتل کے بعد جو اس سے دوستانہ ملاقات کرنے کے لیے گیا تھا بنارس سے فرار ہوا تو لارڈ ویلزلی کو اس معاملہ میں اپنی پوری طاقت وقوت صرف کرنی پڑی۔ قاتل نے راجہ جے پور کے یہاں پناہ لی۔ ویلزلی نے راجہ مذکور کو مجبور کیا کہ وہ اسے برطانوی حکومت کے حوالے کرے تاکہ خون کا بدلہ لیا جائے اس کے بعد قاتل کو اسیر کی حیثیت سے فورٹ ولیم میں رکھ گیا۔

یہ تھا کہ نواب وزیر اودھ کی فوج کے سرکش اور بیکار سپاہیوں کو علیحدہ کیا جائے اور اس کی سلطنت کی حفاظت کے لئے کمپنی کی باقاعدہ فوج میں اضافہ کیا جائے۔
گورنر جنرل کے نزدیک سلطنت اودھ کو اندرونی بد امنی اور بیرونی حملے کا جو خوف لگا ہوا تھا اس کی وجہ سے اسے اس کام کی طرف توجہ کرنے اور جن اصولوں پر کہ نواب وزیر سے اتحاد قائم تھا انہیں بہتر بنانے کی فکر ہوئی۔

ان فوجوں کے متعلق جو انتظامات نواب وزیر کے سامنے پیش کئے گئے (۲۷۶)
انہیں اس نے پہلے تو تسلیم کر لیا لیکن جب اسے یہ محسوس ہوا کہ اس طور سے اس کا اثر خود اس کے ماتحتوں پر بھی کم ہو جاتا ہے تو وہ اپنی رضامندی ظاہر کرنے پر پچھتایا اور ان انتظامات کی تکمیل کو ٹالنے کی کوشش کی۔

۱۷۹۹ء میں نواب موصوف نے مسند سے دست بردار ہونے کا ارادہ ظاہر کیا برطانوی ریذیڈنٹ نے اس کے خلاف ہر ممکن دلیل پیش کی لیکن وہ اپنی اس انوکھی تجویز پر اصرار کرتا رہا۔ نواب وزیر نے اس سلسلہ میں جو وجوہ پیش کئے تھے وہ یہ تھے کہ ریاست کی حالت خراب ہے۔ حکومت کے افراد نا اہل ہیں رعایا سے میرے تعلقات اچھے نہیں اور دونوں کو ایک دوسرے سے سخت نفرت ہے اور میں ان سب حالات سے بیزار ہوں۔ یہ سب باتیں پہلے سے مشہور تھیں۔ لہذا ان کی صداقت کی وجہ سے لارڈ ویلزلی کو یقین ہو گیا کہ نواب وزیر اپنے ارادہ میں پکا ہے اور اسے جب یہ اطلاع ملی کہ جو کچھ روپیہ اس نے جمع کیا ہے اسے لیکر وہ روانہ ہونا چاہتا ہے تو ان سب باتوں کی مزید تائید ہو گئی کیونکہ نواب کی یہ خواہش اس کی کمزوری اور حرص و طمع کے مطابق تھی۔

بعد میں یہ پتہ چلا کہ یہ سب دھوکہ تھا اور دراصل وہ اس طریقے سے فوجی
تنظیم کی اصلاح میں تاخیر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ اصلاحات اس قدر ضروری تھیں (۲۷۵)
اور برطانوی حکومت ہند کے عام مفاد اور استحکام سے ان کا اس قدر قریبی تعلق تھا کہ لارڈ ویلزلی ان کمزور دلایل اور طفلانہ حیلوں کی وجہ سے ان کی تعمیل میں تاخیر روا نہیں رکھ سکتا تھا۔ بلکہ اسے یہ خیال پیدا ہو گیا کہ نواب نے اس اہم موقع پر جو طرز عمل اختیار کیا ہے اس کی وجہ سے اس انتظام کی تکمیل اور بھی زیادہ ضروری ہے

سرجان شور نے اس کی سند نشینی کے وقت جو معاہدہ اس سے کیا تھا اسکی دفعہ سات[۷] کی رو سے کمپنی کو حق حاصل تھا۔ کہ اگر دونوں سلطنتوں کی حفاظت کے لیے اودھ والی انگریزی فوج میں اضافہ ضروری ہو تو وہ کر سکتی ہے اور گزشتہ دو سال میں اس قسم کی ضرورت کے لیئے متعدد ناقابل تردید ثبوت مل چکے تھے۔

ان حالات کا لحاظ کرتے ہوئے لارڈ ویلزلی نے ایک زاید فوج روانہ کرنے کا فیصلہ کر دیا اور پچاس لاکھ سالانہ اس کے مصارف مقرر کئے سابق چہتر لاکھ ملا کر اب جملہ رقم ایک کروڑ چھبیس لاکھ سالانہ ہو گئی[۱]۔

گورنر جنرل کی خواہش تھی کہ کمپنی کی جو فوج اودھ میں مقیم ہے اسمیں تو اضافہ کر دیا (۲۷۶)
جائے اور نواب وزیر کی بے کار بلکہ خطرناک فوج میں کمی کی جائے تاکہ اس انتظام سے جو ریاست کی حفاظت کے لیے نہایت ضروری ہے اودھ پر زاید بار نہ پڑے۔ لیکن سعادت علیخاں نے خواہ اپنی کمزوری یا خودغرض فتنہ پرداز مشیروں کی سازشوں کی وجہ سے اسکی تکمیل میں سخت دقتیں پیدا کر دیں۔ اس کے سابق طرز عمل اور اس موقع کی علانیہ مخالفت اور ریاست کی روز افزوں ابتری اور بد انتظامی کا لحاظ کرتے ہوئے لارڈ ویلزلی نے اس انتظام کی ضرورت اور بھی زیادہ محسوس کی تاکہ اس ذریعہ سے کمپنی کو اودھ کی سرحد پر جو

[۱] معاونتی فوج کے مصارف کے علاوہ نواب وزیر سے دیگر مصارف کے لیئے علٰحدہ رقم لی جاتی تھی۔ نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں جملہ مقررہ رقم پچاس لاکھ تھی لیکن لارڈ کارنوالس کے بیان کے مطابق اس رقم کے علاوہ ۱۷۸۶ء تک تقریباً چونتیس (۳۴) لاکھ سالانہ روپیہ دیگر غیر معمولی مصارف کے نام سے زاید وصول کیا گیا تھا۔ لارڈ ٹین ماؤتھ کے معاہدہ کے مطابق کمپنی کو اودھ کی اس فوج میں اضافہ کرنیکا حق حاصل تھا اس سلسلہ میں یہ بحث چھڑی کہ اضافہ کرتے وقت نواب کی رضامندی حاصل کرنی ضروری ہے اور معاہدہ کے الفاظ کا بھی یہی منشا معلوم ہوتا ہے اسکا جواب دیا گیا کہ جس قابل شخص نے یہ معاہدہ کیا تھا اگر اسنے اس دعوی کی تردید نہیں کی تو اسکی محض یہ وجہ ہوگی کہ یہ ایک نہایت ہی مہمل دعویٰ ہے۔ کیونکہ اضافہ کے لیے بیرونی خطرے کی شرط ضروری قرار دی گئی ہے۔ جس کے فیصلہ کا صرف ایک ہی فریق مجاز ہو سکتا ہے۔ اس معاہدہ کی ایک دوسری دفعہ کی رو سے نواب وزیر کو غیر ریاستوں سے مراسلت کرنے یا تعلقات قایم کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

فوجیں رکھنی پڑیں۔ ان کے مصارف کا نواب وزیر سے کچھ تعلق نہ رہے اور آئندہ کیلئے کمپنی نیز نواب وزیر کو ان تمام دقتوں سے نجات مل جائے جو ایک بڑی رقم کے ماہانہ اداکرنے کی وجہ سے پیش آتی رہتی ہیں۔

لارڈ ویزلی نے یہ بھی خیال کیا کہ نواب وزیر کے مجموعی طرز عمل سے (یعنی مسند سے دست بردار ہونے کا خیال ظاہر کرنا[1] اپنی نااہلی کا اقبال۔ بیرونی حملہ کی صورت میں اپنی فوج کی طرف سے خوف ظاہر کرنا۔ اور اسمیں کمی کرنے پر اول راضی ہونا بعد میں نہایت نامناسب طریقوں سے اسے ٹالنے کی کوشش کرنا اور ریاست کی تباہ حالت جو اس کی بد انتظامی کی بہ دولت ہورہی تھی) اس بات کی ضرورت لاحق ہوگئی ہے کہ وہ اب لازمی طور سے ایک ایسے معاہدے پر اصرار کرے جس سے آئندہ کے لیئے تمام جھگڑے طے
(۲۷۷) ہوجائیں اور امکانی حد تک ریاست کی حفاظت کا معقول انتظام اور اس کے لیئے جو فوج درکار ہو اس کے مصارف کا باقاعدہ اور مستقل انصرام ہوجائے۔ لہذا ان خیالات کے بموجب اس نے اپنے بھائی ہنری ویلزلی کو اودھ میں تعینات کرکے ہدایت کی کہ نواب وزیر سے معاہدہ طے کیا جائے اور ریاست کا ایک ایسا علاقہ حاصل کرلیا جائے جس کی آمدنی اودھ کی اضافہ شدہ معاونتی فوج کے مصارف کے لیے کافی ہو۔

نواب وزیر نے بالآخر اور بدقت تمام معاہدہ منظور کر لیا۔ غالباً یہ سب باتیں ظاہرداری کے لیے تھیں تاکہ بہ خوشی آمادگی ظاہر کردینے سے اس کے ماتحت ومتعلقین جو اس علاقے سے اب تک فایدہ اٹھاتے رہے تھے برگشتہ نہ ہوجائیں[2]۔

---

[1] نواب وزیر نے ایک موقع پر خود یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ فوجیں محض دشمن کے لیے کارآمد ہوسکتی ہیں اور اسی خیال سے خاص اپنی حفاظت کے لیے برطانوی فوج کا ایک دستہ طلب کیا تھا۔ سر اے۔ کلارک Clarke اور سر جیمس کریگ Sir James craig نوں کے خطوط سے بھی اس بیان کی تائید ہوتی۔ انھوں نے لکھا کہ "یہ تو ایک باقاعدہ فوج ہے ضرورت کے وقت بجائے کسی مدد کی توقع کے خود اس کی نگرانی اور اسے مرعوب کرنے کے لیے ایک علحدہ فوج درکار ہوگی"۔

[2] یہ خیال نواب کے خصایل کا لحاظ کرتے ہوئے صحیح معلوم ہوتا ہے اور بعد میں اس کا جو طرز عمل رہا اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے

اس معاہدے[1] کی رو سے کمپنی کے مقبوضات نواب وزیر اور تمام دشمنوں کی سلطنتوں کے (۲۷۸)
درمیان (جو اس سمت سے حملہ آور ہونا چاہیں) حدِ فاصل بن گئے۔

اس علاقے سے نواب وزیر کے خزانے میں جو رقم داخل ہوتی تھی وہ کبھی اس (۲۷۹)
رقم سے زاید نہ تھی جو ریاست کی معاونتی فوج کے مقررہ مصارف کے لیے ادا کیجاتی تھی کیونکہ سرجان شور کے معاہدے کی رو سے جو رقم اس پر واجب تھی اس سے یہ کہیں کم تھی کیونکہ کمپنی کی فوج ضرورتاً بڑھاکر تیرہ ہزار کر دی گئی تھی جس کی محض تنخواہ میں (جو نواب وزیر کے ذمہ عاید کی گئی تھی) مقررہ معاوضے سے پچاس لاکھ سالانہ زاید صرف ہوتے تھے۔

اس قلیل اور عارضی مالی نقصان کے عوض میں کمپنی کا بہت بڑا فایدہ یہ ہوا کہ دربار لکھنؤ سے جو اشتعال انگیز تنازعات رہتے تھے ان سب کا خوش اسلوبی سے تصفیہ ہو گیا۔ اور کمپنی کی بہتر حکومت کی وجہ سے ان علاقوں میں جو بد انتظامی اور ظلم و تعدی کی بہ دولت خستہ حالت میں تھے اضافہ آمدنی کی بھی توقع ہو گئی اور جس تنہا

---

[1] اس معاہد کی خاص شرط (جیسے ہنری ولزلی اور لکھنؤ کے رزیڈنٹ کرنل اسکاٹ نے طے کیا) یہ تھی کہ اودھ کے تمام سرحدی علاقے کمپنی کے حوالہ کر دیئے جائیں۔ ان کی سالانہ آمدنی کا اندازہ ایک کروڑ پینتیس لاکھ تیئیس ہزار چار سو چوہتر روپیے آٹھ آنے ۹ پائی لگایا گیا۔ (۱،۳۵،۲۳،۴۷۴ - ۸ - ۹) اور طے پایا کہ حکومت اودھ کی حفاظت کے لیے جو فوج رکھی جائے (خواہ اس کی تعداد کچھ ہی ہو) اس کا یہ معاوضہ قرار دیا جائے۔

باقی تمام شرائط معمولی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ بجز ایک مقررہ تعداد کے نواب وزیر اپنی کل فوج برخاست کریں اور آیندہ انھیں ہر حالت میں اور ہر موقع پر برطانوی فوجوں کو اپنی ضرورت کے لیے طلب کرنے کا حق حاصل ہوگا اور اس قسم کی مدد کے لئے نہ کوئی جداگانہ رقم طلب کی جائے گی اور نہ اس کا کوئی معاوضہ لیا جائے گا۔

نواب نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ اپنے باقی ماندہ علاقے میں (اپنے عہدہ داروں کی نگرانی میں) ایسے معقول انتظامات کریں گے جو ان کی رعایا کی فلاح و بہبودی اور جان و مال کی حفاظت کیلئے ضروری ہوں اور اس معاملہ میں وہ کمپنی کے عہدہ داروں سے مشورہ حاصل کرینگے اور ان پر عمل کرینگے۔

سرحد سے دونوں سلطنتوں کو کسی قسم کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ اس پر بجائے نواب وزیر کی فوجوں کے کمپنی کی فوجیں متعین ہو گئیں اور ان کے مصارف کا انتظام بھی کمپنی کے ہاتھ میں آگیا۔

بعد میں نسبتاً چند غیر اہم اور معمولی شرائط اور طے پائیں۔ نواب وزیر کو ابتدا میں جو کچھ رنج ہوا تھا وہ بہت جلد رفع ہو گیا۔ اور اس معاہدہ کی بدولت خود انھیں اور ان کی رعایا کو خاطر خواہ آرام و اطمینان میسر ہو گیا اور اس کے بعد انھوں نے ہر موقع پر اور اپنے قول و فعل دونوں سے برطانوی حکومت کے ساتھ اخلاص (۲۸۰) ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

جب مرہٹوں سے لڑائی شروع ہوئی تو نواب نے از خود مدد دینے کی خواہش ظاہر کی اس سے لارڈ ولزلی کو بہت مسرت ہوئی۔ نواب نے خاص اپنے اصطبل سے توپ خانہ کے لیے اعلیٰ قسم کے گھوڑے دیئے اور مصارف جنگ کے لیئے اپنے خزانے سے ایک کثیر نقد رقم بھیجی جس سے جنگ کی کامیابی میں معقول مدد ملی جو لوگ نواب وزیر کی طبیعت سے ذرا بھی واقف تھے انھیں اس کے ظاہر و باطن دونوں سے اس امر کا یقین ہو گیا کہ گورنر جنرل نے جو کچھ بھی انتظام کیا ہے اس سے اب وہ مطمئن ہے اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ اس آخری انتظام کی بدولت اس کی ذات اور اس کی رعایا دونوں کو آرام و اطمینان حاصل ہو گیا تھا دونوں سلطنتوں کے درمیان جو ناگوار مسائل پیش رہتے تھے ان کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اودھ کی حفاظت کے لیئے جو برطانوی افواج متعین کی گئی تھیں ان کے مصارف کا بھی مستقل انصرام ہو گیا تھا اور ہر قسم کی غیر معمولی ضروریات بھی اسی سے پوری ہو سکتی تھیں۔

نواب وزیر کی فوج میں جو کمی کی گئی تھی اس سے مجلس نظماء کی راز دار کمیٹی نے پورا اتفاق کیا اور اپنے مراسلہ مورخہ ۴ نومبر ۱۸۰۱ء میں تحریر کیا کہ ہم گورنر جنرل (۲۸۱) کی ان خدمات کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہمارے نزدیک ان اصلاحات کی بدولت محض نواب وزیر کی سلطنت ہی کا معقول انتظام نہیں ہوا بلکہ پچاس لاکھ سالانہ کی مقررہ رقم میں اس طرح کثیر اضافہ ہو جانے سے کمپنی کو ان افواج کے مصارف کی ادائی میں بھی معقول مدد ملے گی جو اس سمت میں زماں شاہ اور برطانوی مفاد

کی دیگر مخالف طاقتوں سے اپنے مقبوضات کو محفوظ رکھنے کی غرض سے ضرورتاً بڑھانی پڑتیں۔"

نواب وزیر سے جو معاہدہ[1] بعد میں ہوا اسے بھی اس مجلس نے پسند کیا لیکن جب تک کہ نظماء کو اس معاہدہ کی گفت و شنید کے تمام متعلقہ واقعات سے آگاہی نہ ہوئی اس وقت تک انہوں نے اس کی منظوری نہ دی۔ اس طور سے اس میں پورے دو سال لگ گئے جن اسباب کی بناء پر اس انتظام کو خاص اہمیت حاصل تھی ان کا راز دار مجلس نے نہایت صحیح اندازہ کیا اس لیے انھوں نے جو تعریف کی اسکی قدر بہت بڑھ گئی۔

انھوں نے لکھا[2] کہ "حال ہیں گورنر جنرل نے نواب وزیر سے جو معاہدہ کیا ہے اور جس کی توثیق اس نے ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۰۱ء کو کی ہے اس پر ہم نے غور کیا اور ہم اسکی جملہ شرائط کو منظور کرتے ہیں۔"

(۲۸۲) ہمارے نزدیک نواب وزیر اور کمپنی دونوں کے مفاد کی ان شرائط سے حفاظت ہوگئی ہے اور اس کی ترقی کے اسباب بھی مہیا ہو گئے ہیں اور اودھ کی بہتر حکومت و فلاح و بہبود کا بھی انتظام ہوگیا ہے جس سے وہاں کی رعایا بھی لازمی طور پر خوشحال ہو جائے گی کمپنی نے اس معاہدہ سے جو علاقہ حاصل کیا ہے اگرچہ اس کی آمدنی جو نواب کو اب تک وصول ہوتی رہی ہے اس فوج کے مقررہ معاوضے اور دیگر متعلقہ ضروری مصارف کی رقم سے زائد نہیں ہے جو ضرورت کے لحاظ سے مستقل طور پر اودھ میں رکھی گئی تھی تاہم گورنر جنرل کی اس تجویز سے ہم اختلاف نہیں کرتے کہ اودھ کی اندرونی و بیرونی حفاظت کی غرض سے کمپنی کو جو غیر معمولی مصارف برداشت کرنے پڑیں اور جن کی ادائی سنہ ۹۸ء کے معاہدے کے مطابق نواب وزیر کے ذمہ ہوتی ہے آئندہ وہ اس پر عائد نہ کئے جائیں اور ان مصارف کے معاوضے میں ہم اس اضافۂ آمدنی سے مطمئن ہیں

۱؎ مورخہ ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۰۱ء

۲؎ بحوالہ مراسلۂ مورخہ ۱۹ نومبر سنہ ۱۸۰۳ء بنام گورنر جنرل۔

جس کی توقع بجا طور پر اس علاقہ میں کمپنی کی بہتر حکومت قائم ہوجانے کی وجہ سے
کی جاسکتی ہے۔ ہم اس قسم کے معاوضے کو زیادہ پسند کرتے ہیں کیونکہ ان کا مدار
تنہا وہاں کی خوش حالی اور ترقی پر ہوگا اور نواب وزیر کو اس سلسلہ میں کوئی اختیار
نہیں رہ جائیگا۔ کیونکہ اس کی تباہ کن اور ظالم حکومت اور طریقۂ مالگذاری سے
تو اس علاقے کی آمدنی میں کمی ہونے ہی کی توقع تھی جیسا کہ ابتک ہوتا رہا تھا۔"
(۲۸۳) چونکہ نواب وزیر کو اب مختلف قسم کی پریشانیوں اور اپنی بیکار اور بدکردار
فوج کے بےجا مصارف سے نجات حاصل ہوگئی ہے اور اس سرکش اور بے وفا فوج
کا ایک بڑا حصہ برخاست بھی ہوگیا ہے۔ جو ہمیشہ رعایا کے ایک سربرآوردہ طبقے
کے تابع رہتی تھی اور جس کی وجہ سے انھیں نہایت معیوب طریقے سے ہر کام میں دبنا
پڑتا تھا۔ لہٰذا ہمیں پوری توقع ہے کہ وہ ہماری باقاعدہ اور تنظیم یافتہ فوج کی
حفاظت میں رہ کر اندرونی حکومت کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں گے"۔
لکھنؤ کے معاہدے کے بعد گورنر جنرل کے بھائی ہنری ویلزلی نے بہ حیثیت
لفٹننٹ گورنر کے اس جدید علاقے کی مالگزاری کا انتظام کیا تھا اور جس خوبی سے
اس نے یہ اہم اور دشوار کام انجام دیا تھا وہ ہر لحاظ سے اس کی خصوصیات کے
شایان شان اور عوام کے مفاد کے موافق تھا لہٰذا اس مراسلے میں اس کی خدمات
کا بھی نہایت بجا طور پر اعتراف کیا گیا تھا۔
لکھنؤ کے یہ تمام واقعات اس قدر تفصیل کے ساتھ محض اس مجبوری سے
بیان کئے گئے ہیں کہ اہم اور ضروری واقعات فروگذاشت کئے بغیر اختصار ممکن
نہ تھا۔ لہٰذا کرناٹک میں جو واقعات لارڈ ویلزلی کے زمانہ میں پیش آئے انھیں
بھی اسی وجہ سے کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا ضروری ہے تاکہ ان مقاصد اور
(۲۸۴) اصول کا صحیح اندازہ ہوجائے۔ جو ان ماتحت ریاستوں کے ساتھ گورنر جنرل
کے مسلک کے محرک تھے۔
۱۶ر اکتوبر ۱۷۹۵ء کو نواب عمدۃ الامراء مسند نشین ہوئے۔ ۱۷۹۲ء میں
مارکوئیس کارنوالس نے ان کے باپ سے جو معاہدہ کیا تھا اسی کی شرائط کے
مطابق انھوں نے مسند قبول کی۔ چونکہ وہ نواب محمد علی خاں کے بڑے فرزند

اور ولی عہد تھے لہٰذا اس حیثیت سے انھیں بھی بطور فریق کے اس معاہدے میں شریک کر لیا گیا تھا۔ اور اس کے سرنامے میں بھی انکا نام خاص طور پر درج تھا۔

حکومت ہند اور حکام انگلستان کو ۱۷۹۲ء کے معاہدہ سے جو توقعات تھیں وہ بہت کم پوری ہو سکیں۔ نواب محمد علی خاں نے معاہدے کے بعد جو طرز عمل اختیار کیا وہ نہ صرف کمپنی اور اس کے مفاد کے لیے مضر تھا بلکہ ان کی رعایا اور ریاست کی خوشحالی کے لیے بھی تباہ کن تھا۔[1]

اس بات کا اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ جب لارڈ ہاربرٹ فورٹ۔ سینٹ جارج کا گورنر مقرر ہوا تھا تو مجلس نظماء نے اسے ہدایت کی تھی کہ لارڈ کارنوالس والے معاہدے کی ترمیم ایک ایسے اصول پر کی جائے جو کمپنی کے مفاد کے موافق ہو اور جس سے کرناٹک کی رعایا کی حالت بہتر ہو سکے یا بہ الفاظ دیگر ریاست تباہی سے بچ جائے اور ان تکلیف دہ تنازعات کا خاتمہ ہو جائے جو نواب اور ان کے اعلیٰ عہدے داروں کے خصائل کی وجہ سے ۱۷۹۲ء کے معاہدے کی اہم ترین شرائط کی تکمیل میں پیش آتے رہتے ہیں۔

(۲۸۵) گورنر نے معاہدہ میں ترمیم کرانے کے لیے جو کوشش کی اس کی نواب نے سختی سے مخالفت کی اور اس معاملہ میں اس قدر سخت ضد کی کہ اس کے حل کی کوئی صورت ممکن نہ ہو سکی۔ کم ظرف اور خود غرض مشیروں کے اثر پر اسے مجہول کیا گیا لیکن ان لوگوں کا نواب پر اس قدر زیادہ اثر نہ تھا کہ وہ باوجود شاہی وزراء اور مجلس نظماء و حکومت فورٹ سینٹ جارج کے اصرار کے ان تجاویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے جو کسی لحاظ سے بھی ان کے ذاتی مفاد یا اقتدار کے لیے مضر نہیں ہو سکتی تھیں۔ علاوہ ازیں جب تک کہ ان کے تعلقات کمپنی سے قائم تھے ان باتوں کا کوئی اندیشہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

جب مارکوئیس ویلزلی ۱۷۹۸ء میں مدراس پہنچا تو اس نے کلکتہ واپس

---

[1] کرناٹک کی حالت اور اس معاہدہ کی تکمیل کے واقعات لارڈ ہاربرٹ کے مراسلہ مورخہ ۲۴ نومبر ۱۷۹۵ء میں تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔

ہونے سے قبل چند دن اسی کوشش میں صرف کیے لیکن کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا ان تجاویز کے سلسلے میں نواب نے جو طرز عمل اختیار کیا اس سے گورنر جنرل کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ اس مبحث پر مزید گفتگو بالکل بے سود ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہر لمحہ اسے اس امر کا بھی یقین ہوتا گیا کہ ایک ایسے جدید انتظام کی سخت ضرورت ہے جس کے ذریعہ سے کمپنی نقصان سے نواب تباہی سے اور اس کی رعایا مصیبت
سے بچ سکے اور اس نے اپنی یہ رائے بھی ظاہر کی کہ زیر بحث معاہدے سے (۲۸۶)
جو حالات پیدا ہو گئے ہیں ان سب کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔

جب لارڈ ویلزلی ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ شروع کرنے کے لیے ۱۷۹۹ء میں دوبارہ مدراس پہونچا تو اسے اس معاہدے کی کمزوریوں اور دقتوں کا جن میں نواب کی طرز عمل کی وجہ سے مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اور بھی زیادہ احساس ہو گیا۔ اس اہم اور نازک موقع پر نواب بجائے دوست کے دشمن کی طرح کام کر رہا تھا۔

ایسی حالت میں جبکہ جنگ کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور سامان رسد مہیا کیا جا رہا تھا نواب کے ملازم تساہل سے کام لے رہے تھے اور اکثر موقعوں پر دقتیں بھی پیدا کرتے تھے۔ ان سب باتوں سے گورنر جنرل کے دل میں مختلف قسم کے شبہات پیدا ہوئے اور جب نواب نے اپنی ایک حرکت سے جنگ کی پہلی مہم ہی میں رکاوٹ پیدا کی تو ان شبہات کی تائید بھی ہو گئی میسور پر جو فوج کوچ کرنے والی تھی اس کی فوری ضروریات کے لیے نواب نے تین لاکھ پگوڈا دینے کا وعدہ کیا تھا اور اس کی تکمیل کے لیے اس نے جو تجاویز پیش کی تھیں گورنر جنرل نے ان سب کو منظور بھی کر لیا تھا۔ علاوہ ازیں نواب نے اس اہم معاملہ میں اپنے اخلاص کا اس قدر زبردست ثبوت دیا تھا کہ گورنر جنرل کو اس رقم کی وصولیابی کا کامل یقین ہو گیا تھا اور خزانہ میں جو روپیہ موجود تھا وہ اس نے دوسرے کاموں پر صرف کر دیا لیکن جس دن فوج نے کوچ شروع کیا تو اس نے روپیہ دینے سے
قطعاً انکار کر دیا) اگر بنگال سے روپیہ نہ آ جاتا تو اس نازک وقت میں اس (۲۸۷)
وعدہ خلافی سے کمپنی کو جو نقصان پہنچتا اسکا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لارڈ کلائیو نے اس

بدنما کارروائی کے متعلق جو مراسلہ لکھا ہے اسے وہ ان الفاظ پر ختم کرتا ہے "میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ نواب نے ارادۃً بے وفائی کی لیکن اس کے ساتھ ہی اس غیر معمولی طرز عمل کی اسکے میں کوئی دوسری وجہ معلوم بھی نہیں کر سکا۔"

سرنگاپٹم پر قبضہ ہونے کے بعد سلطان کے صیغۂ راز کے دفتر میں چند کاغذات ملے[1]

---

[1] ان کاغذات کی جانچ کی گئی اور گورنر جنرل کے احکام کے بموجب فارسی کے مترجم ایڈمنسٹن Edmonstone نے اس کی مفصل کیفیت لکھی جس سے حسب ذیل باتوں کا ثبوت ملا۔

۱۔ ۱۷۹۲ء کے معاہدے کے خلاف نواب محمد علی خان نے اپنے بڑے بیٹے عمدۃ الامراء کی رائے اور صلاح سے غلام علی اور علی رضا وکیلوں کی معرفت ٹیپو سلطان سے بصیغۂ راز مراسلت کی۔ اور یہ کارروائی کمپنی کے مفاد کے خلاف تھی لہذا وہ معاہدے کے بنیادی اصولوں کے بھی خلاف تھی۔

۲۔ نواب محمد علی خاں اور عمدۃ الامرا نے ٹیپو سلطان سے سیاسی معاملات پر مراسلت کی جس کا مقصد اپنے مفاد کو ترقی دینا اور کمپنی کو زک پہنچانا تھا۔

۳۔ نواب محمد علی خاں نے غلام علی اور علی رضا سے خود بھی مراسلت کی اور عمدۃ الامرا کی معرفت بھی کی اور اتحاد ثلاثہ کے خلاف (جو نظام دکن۔ مرہٹوں اور انگریزوں کے مابین ہوا تھا) اپنی رائے ظاہر کی کہ اس اتحاد ہی سے سلطان کی طاقت کو زک پہنچی ہے۔

اس سلسلے میں انھوں نے حضور نظام دکن پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے اس موقع پر احکام شریعت کے خلاف کام کیا حالانکہ ہر دین دار مسلم کا فرض ہے کہ جس کام کا بیڑا سلطان نے اٹھایا ہے اس میں وہ شرکت کرے۔

۴۔ والاجاہ اور عمدۃ الامراء نے ٹیپو سلطان سے جو مراسلت کی تھی اس کی سازشی نوعیت کا پتہ ایک معمے سے چلا جو سلطان کے صیغۂ راز کے کاغذات میں ملا۔ ان مراسلوں کا خط ان تحریروں کے خط سے مشابہ تھا جو والاجاہ اور عمدۃ الامراء برطانوی حکومت کو لکھا کرتے تھے علاوہ ازیں ان کے حاشیوں پر خاص ٹیپو کے منشی کے ہاتھ سے یہ لکھا ہوا تھا کہ (بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

ان کاغذات سے اس بات کا قطعی ثبوت مل گیا کہ نواب والاجاہ اور عمدۃ الامراء دونوں نے ٹیپو سلطان سے کمپنی کے مفاد کے خلاف مراسلت کی۔ (۲۸۹:۲۸)

ان واقعات سے یہ بات پورے طور پر ثابت ہو گئی کہ اس طریقے سے محض ۱۷۹۲ء کے معاہدے کے منشاء کے خلاف ہی کام نہیں کیا گیا بلکہ اس کی ایک اہم دفعہ کی بھی خلاف ورزی ہوئی جس میں یہ بات صاف الفاظ میں درج ہے کہ "نواب کمپنی کی منظوری حاصل کئے بغیر کسی یورپی یا دیسی طاقت سے سیاسی یا کسی اور قسم کی مراسلت ہرگز نہیں کرے گا" بین الاقوامی قانون یہ ہے کہ اگر معاہدے کی کسی ایک شرط کی بھی خلاف ورزی کی جائے اور خصوصاً ایک ایسی دفعہ کی جس پر کہ دیگر تمام شرائط کا انحصار ہو تو کل معاہدہ فسخ ہو جاتا ہے لہذا ۱۷۹۲ء کے معاہدے کو منسوخ سمجھنا چاہیے اور جس فریق کے خلاف یہ کارروائی کی گئی ہے اسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنی حفاظت اور اپنے مفاد و اتحاد کی نوعیت کے لحاظ سے جو طرزِ عمل مناسب سمجھے اختیار کرے

نواب کے برطانوی حکومت سے جو تعلقات تھے ان کی رو سے ان کی حیثیت ایک تحتانی حلیف کی سی تھی۔ اس کی حکومت اور اس کے اقتدار کو اب تک جو برقرار رکھا گیا تھا وہ کسی خاص حکمت عملی یا مصلحت کی وجہ سے نہیں بلکہ محض

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یہ مراسلے عمدۃ الامراء کے ہیں اور جن معموں کا پتہ لگا تھا وہ اکثر تحریروں کی عبارت میں بھی پائے گئے۔ اگر محض معموں کا ایجاد کرنا اور ٹیپو سے مراسلت کرنا عمدۃ الامراء کی بے وفائی ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتے تو اس بات کا بھی ثبوت مل گیا کہ ان معموں سے انگریز اور ان کے حلیف ہی مراد تھے۔ انگریزوں کے لئے "تازہ وارد" نظام دکن کے لئے "ہیچ" اور مرہٹوں کے لئے "پوچ" (کم ظرف) لکھا جاتا تھا۔

۵۔ سلطان کے کاغذات میں ایک خط ملا جس سے یہ ثابت ہے کہ عمدۃ الامراء نے ۱۷۹۶ء تک اس قسم کی خط و کتابت جاری رکھی۔ اگرچہ اس خط پر نہ کسی کے دستخط تھے اور نہ کوئی مہر تھی اور آخر میں غلام حسین لکھا ہوا تھا تاہم ناقابل تردید تحریری مواد سے یہ بات ثابت ہے کہ جب نواب مذکور اپنے ہاتھ سے کوئی خط لکھتا تھا تو اس میں یہی فرضی نام ڈالا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں دوسرا ثبوت یہ ہے کہ یہ خط بھی نواب کے دیگر خطوط کے ساتھ ٹیپو کے دفتر میں ملا اور اس کا مضمون بھی انسے ملتا ہوا تھا

انصاف کی خاطر تھا۔ انگریزی قوم نے ہمیشہ اپنے معاہدوں کی نہایت قابل فخر طریقہ (۲۹۰)
پر پابندی کی اگرچہ اکثر موقعوں پر وہ اس کے مفاد کے منافی ثابت ہوئے۔ اسی فیاضی
کی ... نواب عمدۃ الامرا مسند نشین ہو سکے اور اسی کے طفیل میں ان کے باپ اس مسند
پر برقرار رہے تھے۔

نواب مذکور نے اپنی مسند نشینی کے بعد جو طرز عمل اختیار کیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ برطانوی حکومت نے کس قدر ایثار سے کام لیا ہے اور اس نے کبھی کسی معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کی۔ ہمیشہ اپنی بات کی پابندی کی اور اس کی خاطر اکثر موقعوں پر اپنے مفاد تک کو اس نے معرض خطر میں ڈال دیا۔ برخلاف اس کے نواب اپنے محسن کو جن پر نہ صرف ان کے بلکہ کمپنی کے وجود کا بھی انحصار تھا برباد کرتے رہے اور اپنی بدانتظامی سے اپنی رعایا کو مفلس بنا دیا اور اپنی ریاست تباہ کر دی۔

اس سازش کی گرفت سے قبل بھی نواب کا طرز عمل کئی موقعوں پر ٹھیک نہیں رہا تھا اگرچہ کمپنی اس کی وجہ سے معاہدے کی اُن ذمہ داریوں سے بری نہیں ہو سکتی تھی جو خود اس نے اپنے اوپر لی تھیں تاہم نواب عمدۃ الامرا اپنی بے وفائی کے بعد اس اعتماد و فیاضی کا مستحق نہیں ہو سکتا تھا جس سے وہ اب تک بے جا فائدہ اٹھاتا رہا تھا۔

راز دار کمیٹی کے ایک حکم[1] سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان میں حکام کمپنی کے (۲۹۱)
نزدیک نواب کا رویہ اس گرفت سے قبل ہی ایسا رہا تھا کہ کمپنی بجا طور پر ۱۷۹۲ء کے معاہدے کے خلاف عمل کر سکتی تھی کیونکہ اس معاہدے کی ایک خاص شرط یہ تھی کہ بجز چند صورتوں کے (جن کا متعاقب ذکر کیا جائے گا) اختتام جنگ پر نواب کی ریاست اُسے واپس دے دی جائے گی اور مجلس مذکور نے جس وقت یہ تحریر لکھی تھی اس وقت تک ایسی کوئی صورت پیش نہیں آئی تھی۔ اس وقت گورنر جنرل کے زیر غور جو معاملہ تھا اس پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا تاہم لارڈ ویلزلی کو اس تحریر سے

---

[1] ٹیپو سلطان سے جنگ ہونے کی صورت میں نواب کرناٹک اور راجہ تنجور کے علاقے بلاشبہ کمپنی کے زیر انتظام رہیں گے اور جب تک کہ ہم سے یا مجلس نظماء سے اجازت حاصل نہ کر لی جائے اور اُن فرمانرواؤں کے وسائل آمدنی پر جو بار ہے اسکی ادائی کا معقول انتظام نہ ہو جائے ان کے علاقے انھیں واپس نہ دیئے جائیں (مراسلہ بنام لارڈ ویلزلی مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۷۹۹ء)

یہ اندازہ ہوگیا کہ نظام نواب کے ساتھ کس اصول پر کام کرنا چاہتے ہیں۔
اس اہم اور نازک معاملے میں تاخیر کرنے سے جن نقصانات کا اندیشہ ہو سکتا تھا لارڈ ویلزلی ان سب سے بخوبی واقف تھا اور فورٹ سینٹ جارج کے گرد و نواح کے علاقوں کی منتشر حالت کی وجہ سے خطرات اور بھی بڑھ گئے تھے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اس معاملے میں برطانیہ کی عزت و شہرت کا سوال ہے لہذا عجلت سے کام کرنے کے بجائے اس قسم کے خطرات کا مقابلہ کرنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ اس اصول پر کاربند ہو کر اس نے حکومت مدراس کو صرف یہ
(۲۹۲) حکم روانہ کر دیا کہ غلام علی اور رضا خاں وکیل اور مرحوم ٹیپو سلطان کے دیگر ملازموں کی شہادتیں لی جائیں اور ان سے جرح کرکے نواب کے طرز عمل کی بابت تحقیقات کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تمام کاغذات جو سرنگاپٹم میں برآمد ہوئے تھے مع فارسی مترجم کی رائے کے انگلستان روانہ کر دیئے اور اس سلسلے میں اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ زیر بحث معاملہ میں جو ثبوت بہم پہنچا ہے اس سے ہمیں اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ ہم نواب کو آئندہ کمپنی کی حفاظت اس قسم کا بیجا فائدہ نہ اٹھانے دیں تاہم میں نے یہ غرض احتیاط ایک اور اعتدال پسند راستہ اختیار کیا ہے جو میرے نزدیک برطانوی حکومت کی خصوصیات اور اس کے نیک نامی کے شایان شان ہوگا۔"

کرناٹک کی مسند نشینی کا مسئلہ

لارڈ ویلزلی نے اپنے مراسلے مورخہ ۲۸ مارچ سنہ ۱۸۰۱ء میں حکومت مدراس کو ہدایت دی کہ نواب کے انتقال تک اس معاملے میں کوئی فیصلہ کن کارروائی نہ کی جائے (نواب کی صحت نہایت خراب تھی اور موت یقینی معلوم ہوتی تھی) ان کے انتقال کے بعد عمدۃ الامراء کے بیٹے علی حسین کو یا عظیم الامراء کے بیٹے عظیم الدولہ کو اس شرط سے مسند نشین کرایا جائے کہ وہ ریاست کا تمام دیوانی و فوجی انتظام کمپنی کے حوالے کر دے اور اپنے واسطے سالانہ وظیفہ قبول کرے۔
گورنر جنرل کی ان ہدایات سے ظاہر ہے کہ ان صاحبزادوں کو مسند نشین کرانا محض مصلحت کی خاطر تھا نہ کہ ان کے حقوق کی بنا پر گورنر جنرل کے نزدیک

عمدۃ الامراء کے طرزِ عمل کی وجہ سے اس کے خاندان کے تمام حقوق تلف ہو چکے تھے (۲۹۳)
لارڈ ویلزلی کی ہدایت یہ تھی کہ اول عمدۃ الامراء کے بیٹے سے معاملہ کیا جائے اور اگر
وہ یہ شرائط قبول نہ کرے تو عظیم الدولہ سے گفتگو کی جائے اور اگر وہ بھی راضی نہ ہو
تو حکومت مدراس گورنر جنرل سے مزید ہدایات حاصل کرے۔

اس مراسلہ سے ایک اور عجیب بات ظاہر ہوتی ہے کہ مسند نشینی کا سوال
پیدا ہونے سے قبل ہی گورنر جنرل کی رائے یہ تھی کہ اگر اس خاندان کا حق وراثت باقی
رکھا جائے تو وہ عظیم الدولہ کو ملنا چاہیئے۔ کیونکہ عمدۃ الامراء کے نام نہاد بیٹے علی حسین
کی مسند نشینی سے مسلمان برگشتہ ہو جائیں گے اور اسے معزول کرانے کی کوشش
کی جائے گی۔

گورنر جنرل نے اپنے اس مراسلے میں علی حسین کو ترجیح دینے کی جو وجوہ تحریر
کئے ہیں ان کا مسند نشینی کے حق سے کوئی قطعی تعلق نہیں ہے۔

گورنر جنرل کے احکام کے بموجب لارڈ کلائیو نے جو تحقیقات کی اس سے
والاجاہ اور عمدۃ الامراء دونوں کی بے وفائی ثابت ہو گئی۔ غلام علی اور علی رضا
کی شہادتیں لی گئیں۔ اگرچہ ان کے بیانات سے چند باتیں غلط بھی ثابت ہوئیں تاہم
جن واقعات سے ۱۷۹۲ء کے معاہدہ کی خلاف ورزی ثابت ہوتی تھی ان کی مزید
تصدیق و تائید ہو گئی۔ (۲۹۴)

لارڈ کلائیو نے ان بیانات اور شہادتوں کے تمام ضخیم کاغذات مع کرنل
کلوز (Colonel close) اور مسٹر ویب (Mr. Webb) کی رائے کے (جنہوں
نے تحقیقات کی تھی) گورنر جنرل کے پاس روانہ کر دیئے اور ان کے ساتھ ہی اپنا
مراسلہ مورخہ ۲۳ رمئی بھی روانہ کیا۔ اس مزید تحقیقات کا لارڈ کلائیو پر جو اثر ہوا تھا
اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل عبارت سے بہ خوبی ہو جائے گا جس پر اس نے اپنی
تحریر کو ختم کیا تھا۔

کرناٹک میں ہمارے جو اغراض و مفاد عہد نامے کے ذریعے سے قائم
ہیں ان کے خلاف خفیہ سازش اور علانیہ مخالفت کا ہمیں نہایت زبردست ثبوت
مل چکا ہے۔ مزید براں نواب اور کمپنی کے درمیان جو اتحاد قائم ہے اس کے

منشا نیز اس کی خاص خاص شرائط کی نواب نہایت بیوفائی کے ساتھ خلاف ورزی کرتا رہا ہے۔ اور اب بھی کر رہا ہے۔ لہٰذا ایسی حالت میں میرے نزدیک تو ۱۷۹۲ء کے معاہدہ کی حرف بہ حرف پابندی کرنا وفاداری کے عام اصول کے خلاف اور ہمارے جائز حقوق و مفاد دونوں کے لیے بدیہی طور پر مضر ہو گا۔"

ان وجوہ کی بنا پر مجھے آپ کے سامنے اس تجویز کے پیش کرنے میں مطلق تامل نہیں کہ آپ کرناٹک کا تمام دیوانی و فوجی انتظام اپنی حکومت کی ماتحتی میں لے لیں اور نواب اور اس کے خاندان اور اس کی ریاست کے خاص خاص عہدہ داروں کے لیے اپنی مرضی کے موافق انتظام فرما دیں۔

(۲۹۵) اس مراسلے کے موصول ہونے کے بعد گورنر جنرل نے خیال کیا کہ ان معاملات کو طے کرنے اور کرناٹک میں کمپنی کے مفاد کی حفاظت کرنے کے لیے اسے خود جلد از جلد مدراس پہنچنا چاہیئے اور اسی وجہ سے اس نے مارچ ۱۸۰۱ء تک لارڈ کلایو کو اس مسئلہ کے متعلق کوئی مزید ہدایت روانہ نہیں کی لیکن جب اودھ کے معاملات اور شمالی ہند کے عام حالت کی وجہ سے بنگال چھوڑنا تقریباً ناممکن ہو گیا تو اس نے لارڈ کلایو کو ہدایت کی کہ وہ مسٹر ویب کو جو حکومت مدراس کا ایک اعلیٰ عہدہ دار تھا بنگال روانہ کرے تا کہ کرناٹک کے انتظامات اور دیگر متعلقہ امور کی بابت احکام نافذ کرنے سے قبل تمام واقعات پر اس سے مفصل گفتگو کر لی جائے۔

مسٹر ویب کی عدم موجودگی میں جو مذکورۂ بالا حکم کے بموجب بنگال پہنچ چکا تھا نواب کی حالت نازک ہو گئی۔ اور لارڈ کلایو نے پریشان ہو کر گورنر جنرل سے دریافت کیا کہ اگر اس عرصے میں نواب کا انتقال ہو جائے تو وہ کیا طرز عمل اختیار کرے۔

(۲۹۶) لارڈ کلایو اپنے مراسلہ مورخۂ ۱۲ مئی ۱۸۰۱ء میں تحریر کرتا ہے کہ اگرچہ گورنر جنرل نے اپنے مراسلہ مورخہ ۲۶ مارچ ۱۸۰۱ء میں مجھے ہدایت لکھ دی ہیں کہ اگر مزید احکام موصول ہونے سے قبل یہ واقعہ پیش آ جائے تو مجھے کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ تاہم میرے نزدیک اس تحریر کے لکھے جانے کے بعد سے جو واقعات پیش آئے ہیں ان سے معاملے کی نوعیت اس قدر زیادہ بدل گئی ہے کہ

ان سے پوری واقفیت ہونے کے بعد گورنر جنرل کے پیش نظر جو مقاصد لازمی طور پر ہوں گے ان کی تکمیل ان ہدایات سے نہ ہوسکے گی بلکہ مجھے تو اندیشہ ہے کہ یہ انکے خلاف ہی پڑیں گی لہٰذا اب یہ میری رائے ہے کہ مزید احکام موصول ہونے سے قبل ہی نواب کا انتقال ہوجائے تو میں گورنر جنرل کی مذکورہ بالا ہدایات پر عمل نہ کروں بلکہ کرناٹک کے تمام دیوانی و فوجی انتظامات کو کمپنی کی جانب سے اپنی نگرانی میں لے لوں اور جب تک کہ ان کی بابت کوئی باضابطہ فیصلہ نہ ہو وہاں کی حکومت پر اپنا قبضہ برقرار رکھوں"۔

لارڈ کلائیو کے اس مراسلے کے پہنچنے کے بعد ہی لارڈ ویلزلی کے پاس مجلس نگراں کے صدر کا بھی ایک خط پہنچا مجلس مذکور نے سرنگاپٹم کے کاغذات سے نتائج اخذ کر کے جو رائے قائم کی تھی وہ بجنسہ لارڈ کلائیو کے خیالات اور فیصلے کے مطابق تھی جس پر اس نے عمل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اسی عرصے میں مجلس نظماء کی رازدار (۱۹۷)
کمیٹی کا بھی ایک مراسلہ موصول ہوا جس میں نظماء نے گورنر جنرل کی اس تجویز سے پورا اتفاق کیا تھا کہ کمپنی اپنے اطمینان کے موافق نواب عمدۃ الامرا کی وفاداری کے متعلق اس سے معقول ضمانت طلب کرے۔ اس مراسلہ میں انھوں نے یہ بات بھی صاف الفاظ میں تحریر کردی تھی "کہ لارڈ ویلزلی نے جو واقعات پیش کئے ہیں انکے علاوہ اور واقعات بھی پیش کئے جاسکتے ہیں جن سے ہمارے نزدیک اس اشتباہ کی کافی گنجائش موجود ہے کہ نواب نے کمپنی کے معاہدوں کے خاص خاص شرائط کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم خاص طور پر چاندگری والے قلعے کا واقعہ پیش کرتے ہیں۔ ۱۷۹۲ء میں جس طریقے سے نواب نے اس قلعے کو خالی کیا تھا وہ محتاج بیان نہیں۔ اس واقعہ کے بعد کمپنی کے خلاف اس کی بیوفائی ثابت کرنے کے لیے ہمارے نزدیک کسی مزید شہادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی"۔

گورنر جنرل کو اب ہر قسم کی اطلاع مل چکی تھی جس جس کی رائے کا اس اہم اور نازک معاملے میں اثر پڑ سکتا تھا وہ حاصل ہوچکی تھی لہٰذا اس بے وفا نواب کے ساتھ ان حالات میں جو سلوک ہونا چاہیے تھا اس کی بابت اس نے آخری احکام نافذ کردیئے۔

جملہ امور پر غور کرنے کے بعد وہ اس بات کے ثبوت میں ناقابل تردید دلائل پیش کرتا ہے کہ نواب نے خود اپنی حرکات سے اپنی حیثیت ایک غنیم کی بنا لی ہے اور اب کمپنی اس پر کسی قسم کا اعتبار نہیں کر سکتی لہٰذا انجام بینی و دانشمندی کا اقتضا (۲۹۸)
یہ ہے اور انصاف و مصلحت بھی اسی کی مؤید ہے کہ اب نواب کو صرف اس قدر وسائل حاصل ہوں جن کی بدولت وہ کرناٹک میں محض اپنا ذاتی وقار برقرار رکھ سکے۔ اسی قسم کی ہدایات اس نے لارڈ کلائیو کو روانہ کیں اور اسے حکم دیا کہ وہ نواب کے سامنے یہ تجویز پیش کرے کہ وہ دیوانی و فوجی حکومت سے دست برداری دیں اور (اگر وہ یہ خاص تجویز اور اس کے ساتھ چند اور شرائط بھی منظور کر لیں تو) اپنے لیے سالانہ وظیفہ قبول کر لیں جو نہ تو دو لاکھ پگوڈا سالانہ سے کم ہوگا اور نہ تین لاکھ سے زاید لیکن اس میں ان کے دوسرے رشتہ داروں اور ریاست کے اعلیٰ عہدداروں کے وظائف شامل نہ ہوں گے ان کا انتظام ریاست کی آمدنی سے علیحدہ کیا جائے گا۔

لارڈ کلائیو کو یہ بھی ہدایت تھی کہ اس اصول پر نواب سے جدید معاہدہ کیا جائے اور مجوزہ شرائط کی ان سے منظوری حاصل کی جائے اور ان کی بے وفائی کا جو ثبوت برطانوی حکومت کے پاس موجود ہے اس سے بھی انھیں آگاہ کر دیا جائے"

لارڈ ولزلی نے یہ بات صاف طور پر تحریر کر دی تھی کہ "اس موقع پر معاہدے کی جو تجاویز پیش کی جا رہی ہیں وہ محض برطانوی حکومت کا وقار برقرار رکھنے کی خواہش سے ہیں۔ ان سے یہ مطلب نہ نکالا جائے کہ کمپنی نواب محمد علی خاں اور نواب عمدۃ الامرار کو کسی رعایت یا فیاضی کا مستحق تصور کرتی ہے۔ ان بدماغ نوابوں (۲۹۹)
نے جس بے وفائی اور احسان فراموشی کا کمپنی کے ساتھ سلوک کیا ہے جو ہمیشہ انکی محافظ و معاون رہی ہے اور جو شرمناک ثبوت اس کے متعلق ہم پہونچے ہیں ہمیں تو ان کے اظہار کرنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے"۔

لارڈ کلائیو کو اس بات کا بھی اختیار دے دیا گیا تھا کہ اگر نواب اس عہد نامے کو منظور نہ کریں تو ایک اعلان کے ذریعے سے (جو ان ہدایات کے ساتھ روانہ کر دیا گیا تھا اور جس میں تمام واقعات وضاحت سے درج تھے) وہ

ریاست پر قبضہ کر لے لیکن اگر یہ انتہائی صورت پیش آئے اور اگر اس کے بعد نواب مجلس نظما کے سامنے مرافعہ پیش کرنے کی خواہش ظاہر کریں تو اس کی قطعی پروا نہ کیجائے کیونکہ ایسی حالت میں جبکہ راز دار کمیٹی کی رائے معلوم ہو چکی ہے جو نواب کی بیوفائی کا ثبوت ملنے کے بعد قائم کی گئی ہے۔ اس کا لحاظ کرنا نہ صرف بیکار بلکہ خلاف مصلحت بھی ہو گا۔ مزید براں نواب کو مرافعہ کرنے کی اجازت دینے کے یہ معنی ہونگے کہ اس پر باضابطہ طور پر مقدمہ چلایا جائے لیکن اس وقت معاملہ کی نوعیت۔ اس سے بالکل جدا ہے یہ موقع تو ان تمام حقوق و اختیارات کے استعمال کا ہے جو بین الاقوامی قوانین کے مطابق ہر حکومت کو اپنے بے وفا حلیف کی سازشوں سے محفوظ رہنے کے لیے حاصل ہوتے ہیں۔ بہر حال لارڈ کلائیو کو اس کے ساتھ یہ بھی ہدایت تھی کہ اگر ریاست کے دیوانی و فوجی انتظامات پر قبضہ کرنے کی نوبت آئے تو وہ نواب اور ان کے خاندان اور خاص خاص عہدہ داروں کے وظائف بھی مقرر
کردے اور اس میں فیاضی سے کام لے۔ (۳۰۰)

جب یہ ہدایات مدراس پہنچیں تو نواب کی حالت نہایت نازک تھی اور لارڈ کلائیو ان پر فوری عمل نہ کر سکا۔ جب نواب کے مرض نے ترقی کی اور جان بری کی کوئی امید باقی نہیں رہی تو اس کے خاندان والوں میں سازش کا بازار گرم ہو گیا اور محل میں ابتری برپا ہو گئی۔ نواب کے بھائی حسام الملک نے خفیہ طور سے اپنے چند ساتھی محل کے اندر پہنچا دیئے اور سب سے زیادہ اپنی مسند نشینی کا غل مچایا۔ ان حالات سے مجبور ہو کر لارڈ کلائیو نے کمپنی کی فوج کا ایک دستہ محل کے خاص دروازے پر جما دیا تاکہ اس کی چار دیواری میں امن قائم رہ سکے اور محل کے خزانہ اور مال پر کوئی ہاتھ نہ ڈال سکے۔ لارڈ کلائیو کو خیال پیدا ہو گیا تھا کہ نواب کے انتقال کے وقت اس قسم کی حرکت ضرور کی جائے گی۔

یہ سب کام ایسی خوبی اور اس قدر احتیاط کے ساتھ انجام پایا کہ نواب کو بھی اس بات کا یقین ہو گیا کہ جو کچھ مقصد ان کا بتایا گیا ہے اس کے علاوہ کمپنی کا اور کچھ ارادہ نہیں ہے۔ لارڈ کلائیو کے بیان اور اس کے سپاہیوں کے طرز عمل سے اسے مزید اطمینان بھی ہو گیا۔ البتہ جن لوگوں کی ناپاک کوششوں پر اس انتظام سے

پانی پھر گیا تھا۔ ان کے لیے تو اس کی ضرورت اور مصلحت پر اعتراض کرنا لازمی تھا۔

(۳۰۱) ۱۵ر جولائی سنہ ۱۸۰۱ء کو نواب نے انتقال کیا۔ محل میں خطرناک سازشیں جاری تھیں حکومت فورٹ سینٹ جارج کے چند تحتانی صوبوں کی حالت خراب تھی[1] اور دیگر معقول وجوہ بھی ایسے موجود تھے جن سے متاثر ہو کر لارڈ کلائیو نے خیال کیا کہ ریاست کے انتظام میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ ہونی چاہیے لہٰذا اس نے نواب کے انتقال کی خبر ملنے کے چند ساعت کے بعد ہی مسٹر ویب (Mr. Webb) اور کرنل کلوز (Colonel close) کو ریاست کے خاص خاص عہدہ داروں سے کرناٹک کے فوری انتظامات کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے متعین کر دیا۔

ان دونوں اصحاب نے نوعمر شہزادے علی حسین کے اتالیقوں سے گفتگو شروع کی جس کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ جب ان اتالیقوں[2] نے اس اصول پر گفتگو کرنے سے قطعاً انکار کر دیا کہ کرناٹک کا تمام سیول و فوجی انتظام کمپنی کے ہاتھ میں رہے تو انھوں نے مجبوراً اس بات کی خواہش ظاہر کی وہ راست علی حسین سے گفتگو کر کے جواب حاصل کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اس معاملہ کا اس کے مفاد سے گہرا تعلق ہے۔

(۳۰۲) اس قسم کی ملاقات پر اتالیقوں نے چند اعتراضات پیش کیے منجملہ ان کے ایک خاص اعتراض یہ تھا کہ ولیعہد کم سن اور ناتجربہ کار ہے لیکن یہ سب مسترد کر دیئے گئے اور انھیں مجبوراً اس کی اجازت دینی پڑی۔

۹ر جولائی کو کرنل کلوز اور مسٹر ویب نے شہزادہ علی حسین[3] سے ملاقات کی اتالیقوں سے ان کی جو گفتگو ہوئی تھی اسے انھوں نے اختصار سے بیان کیا اور کہا کہ قبل اس کے کہ ہم اس معاملہ میں گفت و شنید بند کریں جس کے بعد آپ کی

---

[1] فورٹ سینٹ کے جنوبی علاقے میں اس وقت خانہ جنگی برپا تھی۔
[2] نواب کی وصیت کے بموجب ریاست کے دو خان صاحبان یعنی امیر محمد نجیب اور محمد تقی علی خاں ولیعہد کے اتالیق مقرر کیے گئے تھے۔
[3] یہ نواب کا فرزند بتایا جاتا تھا اور اس کی عمر اس وقت اٹھارہ سال تھی۔

مسند نشینی کی تمام توقعات ختم ہو جائیں گی ہماری خواہش ہے کہ آپ ان تمام امور کے متعلق جن پر آپ کے تمام ذاتی مفاد کا انحصار ہے اپنی رائے ظاہر کریں اور اپنے ارادوں سے ہمیں آگاہ کریں" شہزادے نے جواب دیا کہ "آپ میرے اتالیقوں سے گفتگو کریں میرے والد مرحوم نے انھیں اس قسم کے معاملات میں مشورہ دینے کے لیے مقرر کیا تھا۔ کسی معاملے میں میری اور ان کی دو رائیں نہیں ہو سکتیں"

اس جواب کے ملنے کے بعد کرنل کلوز اور مسٹر ویب نے خان صاحبان کو مطلع کیا کہ لارڈ کلائیو کا خیال ہے کہ اس معاملہ میں قطعی فیصلہ کرنے سے قبل وہ خود علی حسین سے ملاقات کریں۔ لہذا اس کام کی غرض سے وہ قلعہ والی فوج کے سپہ سالار کے خیمے میں تشریف لائیں گے یہ تجویز بالکل خلاف توقع تھی اور خان صاحبان نے اسے مختلف قسم کے اعتراضات سے جو وہ پیشتر علی حسین کے کمسن اور ناتجربہ کار ہونے کے متعلق پیش کر چکے تھے ٹالنا چاہا لیکن جب انھیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ ان کے سب دلایل بے سود ہیں تو وہ مجبوراً راضی ہو گئے اور فوراً علی حسین کے سازوسامان (۳۰۳) کی تیاری کے لیے روانہ ہو گئے اس طور سے نوعمر ولیعہد کو موقع مل گیا اور اس نے اپنے اتالیقوں کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر مسٹر ویب اور کرنل کلوز سے چپکے سے کہدیا کہ "مجھے تو ان لوگوں نے سراسر دھوکے میں ڈال رکھا ہے" اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہوتی تھی اور اتنا کہہ کر وہ اتالیقوں کی پروا کیے بغیر اس خیمے میں جا پہنچا جو لارڈ کلائیو سے ملاقات کرنے کی غرض سے تیار کیا گیا تھا۔

جب تعارف کی رسم ادا ہو چکی تو شہزادے کے مصاحبوں اور اتالیقوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا اور لارڈ کلائیو نے تمام گفت و شنید کا جواب تک ہو چکی تھی ذکر کرنے کے بعد علی حسین سے کہا کہ "آپ فیصلہ کرنے سے قبل اس معاملہ کے اہم نتائج پر غور کر لیں۔ میری خواہش اور کوشش یہ ہے کہ آپ تمام واقعات سے واقف ہو جائیں تاکہ ان امور کی بابت جن پر آپ کے ذاتی مفاد نیز آپ کی اور آپ کے خاندان کی شہرت کا انحصار ہے آپ احتیاط سے رائے قایم کر سکیں"۔ اس کے جواب میں علی حسین نے بلا تامل صاف صاف کہدیا کہ "یہ تمام گفتگو میرے اتالیقوں سے ہوئی ہے۔ میں اس میں شریک نہیں تھا اور جو صورت پیدا ہو گئی ہے

اس سے مجھے قطعاً اختلاف ہے اور میں اسے ہرگز پسند نہیں کروں گا۔"
جب یہ انکشاف ہوا تو گفت وشنید کے ہر حصے کو دوبارہ واضح طور سے بیان کرنا ضروری سمجھا گیا۔ نوعمر شہزادے نے تمام معاملات پر کامل غور کرنے کے بعد کمپنی کے پیش کردہ اصول پر کہ ریاست کا تمام سیول و فوجی انتظام کمپنی کے قبضہ میں رہے گا معاہدہ کرنے کے لیے آمادگی ظاہر کی۔
علی حسین کو تالوی انتظامات کے متعلق خاص طور پر فکر تھی یعنی یہ کہ اس کے ذاتی مصارف کے لیے کتنی رقم مقرر کی جائے گی اور نواب مرحوم کے خزانے میں (۲۰۴)
جو اس کے نزدیک بہت بڑا تھا اس کا کس قدر حصہ رہے گا۔
اس گفتگو کے دوران میں نجیب خاں نے کئی مرتبہ گستاخانہ طور سے مداخلت کی لہذا یہ اجلاس برخاست کر دیا گیا اور ولی عہد نے خواہش کی کہ عہد نامہ کا مسودہ تیار کر لیا جائے جس کی خاص شرط یہ ہوگی کہ ریاست کا تمام سیول و فوجی انتظام کمپنی کے ماتحت رہے گا۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ "مجھے اس امر کا یقین واثق ہے کہ یہ معاہدہ میرے نیز خاندان کے مفاد کے لیے مفید ہوگا اور میرے اتالیق خواہ اس سے اتفاق کریں یا نہ کریں میں اس کی ضرور تعمیل کروں گا۔"
۲۰ر جولائی کو کرنل کلوز اور مسٹر ویب دوبارہ محل پر پہونچے اور وہاں ولیعہد اور اس کے دونوں اتالیقوں سے ملاقات کی۔ علی حسین نے لارڈ کلائیو سے جو باتیں طے کی تھیں ان سب سے اس نے اس وقت انکار کر دیا اور اپنے اتالیقوں کی رائے اور فیصلے پر قائم رہنے کا مصمم ارادہ ظاہر کیا۔
اس غیر معمولی تبدیلی کو اتالیقوں کے خوف ورعب پر محمول کیا گیا۔ لہذا اجلاس برخاست کیا گیا اور یہ تجویز پیش ہوئی کہ لارڈ کلائیو سے ملاقات کی جائے اس کی فوراً تعمیل ہوئی اور خیمے میں پہونچنے کے بعد ولیعہد کے مصاحب اور اتالیق پھر ہٹا دیئے گئے اور لارڈ کلائیو نے تنہا علی حسین سے گفتگو کی۔ شہزادے نے یہاں بھی اپنے وہی الفاظ دہرائے اور آخر وقت تک اپنے اتالیقوں کے فیصلے پر قائم رہنے کا ارادہ ظاہر کیا اور صاف الفاظ میں کہدیا کہ میں کسی ایسے معاہدے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں جس کی یہ شرط ہو کہ کرناٹک کا سیول و فوجی انتظام

کمپنی کے تحت میں رہے گا۔ جو کچھ میں نے آپ سے اس روز کہا تھا وہ بغیر سوچے سمجھے (۳۰۵)
کہہ دیا تھا۔ بعد میں مجھے تمام واقعات کا علم ہوا اور اب جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہی
میری حقیقی رائے ہے اور میرے تمام خاندان والے جن سے اس معاملہ میں مشورہ لیا
گیا اس فیصلہ پر متفق ہیں۔ گورنر جنرل کے اس بارے میں جو کچھ احکام ہیں ان سے
بھی میں واقف ہوں اور جو اطلاع مجھے ملی ہے اس کی صداقت میں بھی مجھے شبہ
نہیں اور میں خوب سمجھ رہا ہوں کہ اپنے اس فیصلہ سے میں کن کن خطرات کو
مول لے رہا ہوں۔ لیکن مجبور ہوں۔ ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کروں گا اور
مجوزہ شرایط ہرگز قبول نہ کروں گا۔"

لارڈ کلائیو نے اسے ہر چند سمجھایا اور اس بات کا یقین دلانے کی ہر ممکن
کوشش کی کہ اسے دھوکہ دیا جا رہا ہے اور سب لوگ اسے تباہ کر رہے ہیں اسکی
بہتری اسی میں ہے کہ وہ حکومت کمپنی کے مطالبات کی تعمیل کرے صاحب موصوف
نے اس سے صاف صاف کہدیا کہ "آپ اپنی حالت پر غور کیجیئے۔ آپ کے ساتھی
آپ کو جو مشورہ دے رہے ہیں وہ آپ کے مفاد کے خلاف ہے۔ ان کے جو اغراض
ہیں انھیں سمجھیئے۔ اگر آپ مجوزہ شرایط کے انکار پر ہی قایم رہے تو آپ
بلا شبہہ اپنے ساتھ اپنے تمام متعلقین کو بھی مصیبت میں پھنسا دیں گے" لیکن یہ
سب دلایل بے سود اور یہ تمام کوششیں بے کار رہیں۔

علی حسین اپنی بات پر قایم رہا۔ اور لارڈ کلائیو نے بالآخر بادل ناخواستہ
اسے آگاہ کیا کہ اب آپ کسی رعایت کے مستحق نہیں۔ آپ سخت سے سخت احکام
کا انتظار کریں جو آپ کے رویّہ کی وجہ سے اب لازم ہوگئے ہیں۔

نواب عمدۃ الامرا کے اس نام نہاد صاحبزادے سے اب کسی قسم کے معاہدہ (۳۰۶)
کی توقع باقی نہیں رہی۔ اس سے جو گفت و شنید ہوئی اس میں کمپنی کے
نمایندوں نے جن کے تفویض یہ تمام کام کیا گیا تھا نہایت صبر و تحمل اور اعتدال
سے کام لیا اور خاص خاص موقعوں پر لارڈ کلائیو نے کمال شفقت اور انتہائی انسانی
ہمدردی کا ثبوت دیا لیکن اس نوعمر شخص نے اس بری طرح اسے ختم کر دیا۔ اور
مجوزہ معاہدے پر دستخط کرنے سے قطعاً انکار کر دیا حالانکہ ابتدا ہی میں اُسے بتا دیا گیا تھا

کہ معاہدے کی پہلی اور اٹل شرط یہ ہوگی کہ حکومت کرناٹک کا تمام سیول وفوجی انتظام کمپنی کے ماتحت رہے گا۔

اگرچہ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ نواب محمد علی خاں کے پورے خاندان ہی کو نوابی کے حق سے محروم کردیا جائے۔ تاہم حکومت فورٹ سینٹ جارج کے علاقے کی حالت اس قسم کے فیصلے کی مقتضی نہ تھی۔ اس کے ایک حصہ میں اس وقت بغاوت برپا تھی لہذا گورنر مذکور نے عظیم الدولہ کو مسند نشین کرانے کا فیصلہ کیا۔

اگر نواب کے پورے خاندان کو غیر مستحق قرار نہ دیا جائے تو غالباً اس شہزادے کے حقوق علی حسین سے زیادہ تھے لیکن اس امر سے متعلق کوئی تحقیقات نہیں کی گئی۔ کیونکہ اس وقت کسی کے حق کا کچھ سوال ہی نہیں تھا۔ جو کچھ بھی کیا جارہا تھا وہ محض مصلحت اور رعایت پر مبنی تھا۔ شہزادے کے حقوق کا اگر کوئی لحاظ ہوسکتا تھا تو محض اس خیال سے کہ یہاں جو انتظام کیا جائے وہ انگریزی مقبوضات کے مسلمان باشندوں اور ہمسایہ ریاستوں کے مسلمان فرماں رواؤں کے احساسات کے مطابق ہو۔ (۳۰۷)

جب لارڈ کلائیو نے اس امر کا فیصلہ کرلیا تو کرنل کلوز اور مسٹر ویب کو متعین کیا گیا کہ جو شرائط علی حسین کو پیش کی گئی تھیں انھی کی بنا پر وہ عظیم الدولہ سے معاہدے کے لیے گفت و شنید کریں۔ ان کی عظیم الدولہ تک رسائی ہی مشکل تھی کیونکہ اسے سخت نگرانی میں رکھا گیا تھا علاوہ ازیں اس بات کا بھی خوف تھا کہ اگر محل میں یہ خبر پہونچ گئی کہ اسے مسند نشین کرانے کا خیال ہے تو وہ زندہ بھی نہ چھوڑا جائیگا یہ دقت محض ایک اتفاق سے رفع ہوگئی لیکن اس واقعہ سے کمپنی کی اسقدر سخت توہین ہوئی کہ اسکا فوری تدارک ضروری سمجھا گیا۔ علی حسین کے اتالیقوں نے تاخیر سے تنگ آکر اپنے آپ اسے پوشیدہ طور پر مسند نشین کرادیا۔ لارڈ کلائیو کو اطلاع ملی کہ کل دربار عام ہوگا اور اس میں مسند نشینی کی رسم ادا ہوگی۔ اس حرکت سے جو فتنہ برپا ہوتا وہ ظاہر ہے اس کے سوچنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لہذا لارڈ کلائیو نے فوراً احکام جاری کردئے کہ کمپنی کی فوجیں محل پر قبضہ کرلیں اور نواب کے تمام دربان ہٹادئے جائیں۔

اس مداخلت کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ عظیم الدولہ کمپنی کی حفاظت میں آگیا۔
۲۳ و ۲۴ ر جولائی کو کرنل کلوز اور مسٹر ویب نے اس سے ملاقات کی عہدنامے کے
(۳۰۸) اصول طے گئے اور ۲۵ ر کو معاہدے پر دستخط ہو گئے ۲۶ ر کو عظیم الدولہ کی لارڈ کلایو
سے ملاقات ہوئی اور اسی روز وہ امیر باغ کے محل میں پہنچا دیا گیا جو اس کے والد کا
قدیم محل تھا۔ دوران ملاقات میں عظیم الدولہ نے دیگر جزوی شرائط پر کرنل کلوز اور
مسٹر ویب سے خوب بحث کی جس سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ اس میں معاملہ فہمی
اور ذہانت کافی ہے اور وہ محض کودن نہیں ہے بلکہ جو رتبہ اسے عطا کیا گیا ہے
اس کا وہ اہل ہے۔

اس معاہدہ کی رو سے ریاست کے تمام سیول و فوجی انتظامات کمپنی کے قبضے میں آگئے۔ نواب کے ذاتی مصارف کے لیے دو تین لاکھ سالانہ پگوڈا مقرر ہوئے اس رقم پر اور کسی قسم کا بار نہیں ڈالا گیا۔ نواب محمد علی خاں کے دیگر مختلف رشتہ داروں کے لیے بھی مناسب وظائف مقرر ہوئے علاوہ ازیں سابق قرضوں کی واجب الادا رقوم کی بتدریج ادائی کا بھی معقول انتظام کیا گیا ایک عرصے سے اس قسم کے لین دین اور فضول خرچ اور ظلم و تشدد کی وجہ سے ریاست کی آمدنی پر سخت بار پڑ رہا تھا اور کرناٹک جیسا زرخیز خطہ تباہ ہو رہا تھا۔

مارکوئس ویلزلی کی ہندوستان سے واپسی ۱۸۰۵ء

(۳۰۹) لارڈ ویلزلی ۲۰ اگست ۱۸۰۵ء کو ہندوستان سے واپس ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس کا جانشین مارکوئس کارنوالس فورٹ ولیم پہنچ گیا۔

لارڈ ویلزلی کی حکمت عملی اور اس کے دور پر ایک نظر

اگر ہم اُن عام سیاسی مسائل پر جو اس نامور شخص نے طے کئے ایک نظر نہ ڈالیں یا اُن خیالات کو نظر انداز کر دیں جو اُس نے

۱؎ نواب کے ذاتی مصارف کے لیئے ریاست کی آمدنی کا ۱/۵ حصہ مقرر ہوا لیکن کمپنی نے اس بات کا وعدہ کیا کہ وہ ہر حالت میں نواب کے ذاتی مصارف کے لئے ہر مہینے بارہ ہزار پگوڈا پیشگی ادا کرے گی۔

اس ملک میں پیدا کیے یا ان عام فوائد پر غور نہ کریں جو اس کے دور میں کمپنی کو حاصل ہوئے تو اس کے عہد حکومت کا بیان قطعاً نامکمل رہ جائے گا۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ لارڈ ویلزلی کی آمد کے وقت ہندوستان کی جو عام حالت تھی اسی کی وجہ سے اسے اپنی حکومت کی تمام قوتوں سے فوراً کام لینے کی ضرورت پڑی حیدرآباد سے دوبارہ تعلقات قایم کرنا اور وہاں کے دربار میں زبردست فرانسیسی اثر کا خاتمہ کرنا ہی ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے مقصد اور جس کی مصلحت کے متعلق آج تک کبھی شبہ نہیں کیا گیا اس کا منشاء محض ٹیپو سلطان کے خلاف مدد حاصل کرنا ہی نہ تھا بلکہ ایک ایسے اہم اور روز افزوں خطرے کی مدافعت کرنا تھا جو غالباً اب تک کبھی برطانوی حکومت کو ہندوستان میں پیش نہیں آیا تھا۔

اس زمانہ میں عام خیال یہ تھا کہ فرانسیسی انگریزوں کے مشرقی مقبوضات کے خلاف کچھ خاص ارادے رکھتے ہیں اور انھوں نے مصر پر جو حملہ کیا تھا اس کا تعلق بھی ہندوستان سے بتایا جاتا تھا اور اس میں کسی کو شک بھی نہ تھا۔ ان خبروں سے
انگلستان میں سخت بے چینی پیدا ہو گئی تھی بوناپارٹ نے سلطان کو جو خط[1] روانہ کیا تھا اس سے (۳۱۰)

۱؎ یہ خط قاہرہ سے لکھا گیا تھا اور اس پر ۷ پلوویز سال ہشتم جمہوریہ کی تاریخ پڑی تھی اور اس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

"بحر احمر پر میرے پہنچنے کی اطلاع آپ کو مل چکی ہے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ یہاں میرے پاس بے شمار جرار فوج موجود ہے جس کی حقیقی خواہش اور دلی تمنا یہ ہے کہ وہ آپ کو انگلستان کے پنجے سے نجات دلائے۔

میں اس موقع پر اپنی خواہش کے اظہار کی جراءت کرتا ہوں کہ آپ مسقط اور موخا کے راستے سے اپنے یہاں کی سیاسی حالت سے مجھے آگاہ کریں۔ نیز میری یہ بھی خواہش ہے آپ اپنے ایک معتبر اور ہوشیار سفیر کو سوئز یا قاہرہ بھیجدیں تاکہ میں خود اس سے گفتگو کر
میری دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ آپ کی قوت کو ترقی دے اور دشمنوں کا خاتمہ کرے

آپ کا مخلص ، بوناپارٹ ،

ان سب باتوں کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ اور یہ بات بھی صاف ظاہر ہے کہ ویلزلی کے ابتدائی دور میں فرانسیسیوں کے پاس ایسے ذرایع بھی موجود تھے جن سے وہ بجا طور پر برطانوی حکومت کے خلاف اپنی سازشوں میں کامیابی کی توقع کر سکتے تھے۔ ٹیپو سلطان کے دربار میں فرانسیسی چھائے ہوئے تھے ان کے اس اتحاد کی مستحکم بنیاد یہ تھی کہ ان دونوں کو انگریزوں کے نام سے نفرت تھی۔ سندھیا سلطان سے بھی زیادہ زبردست تھا اور اس کے دربار میں فرانسیسیوں کا محض اثر ہی غالب نہ تھا۔ بلکہ اُنھوں نے وہاں ایک خاص قوت حاصل کر لی تھی یا یوں کہیئے کہ اس کی قلمرو میں اُنھوں نے اپنی ایک جدا سلطنت قائم کر لی تھی دریائے ستلج سے لیکر نواب وزیر اودھ کی ریاست تک (جو خود ابتر حالت میں تھی)، شمالی ہند کا تمام علاقہ ایک زبردست فوجی جماعت کے قبضے میں تھا صاحب کے پاس تقریباً چالیس ہزار پیدل اور ایک معقول توپ خانہ تھا اور اسے ہر قسم کے فوجی ذرایع پر قدرت حاصل تھی۔ اس فوج کی کمان تقریباً تین سو یوروپی افسروں کے ہاتھ میں تھی۔ جن میں انگریز چالیس سے زیادہ نہ تھے (اور یہ سب غیر اہم چھاؤنیوں پر مامور تھے) اور فرانسیسی حکام کا خاص مقصد یہ تھا کہ ان سب کو پریشان کر کے بھگا دیا (۳۱۱)
جائے تاکہ وہ ان کی جگہ دوسرے اشخاص رکھ سکیں اور جب کبھی کوئی خطرہ پیش آئے جس کا انھیں ہمہ وقت خیال لگا رہتا تھا تو ان پر اعتماد کیا جا سکے۔

حیدرآباد میں بھی ان کی معقول قوت تھی وہاں کی چودہ ہزار باقاعدہ فوج کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ اس فوج کے ساتھ ایک معقول توپ خانہ بھی تھا لیکن دربار میں وہ اب تک انگریزوں پر حاوی نہیں آسکے تھے۔ فرمانروائے دکن کو ہمیشہ مرہٹوں اور ٹیپو سلطان کا خوف لگا رہتا تھا اور یہ خوف اس قدر زیادہ اور بجا تھا کہ وہ کبھی کسی ایسے مشورے پر عمل نہیں کرتے تھے جس کی بدولت ان کا اس تنہا طاقت سے بگاڑ ہو جائے جو ضرورت کے وقت انھیں ان دشمنوں سے بچا سکتی تھی اگرچہ وہ اپنی دانشمندی کی وجہ سے اپنی حفاظت کے ان ذرایع کو جو انھیں برطانوی حکومت کی عدم مداخلت کے مسلک کی وجہ سے اختیار کرنے پڑے تھے اس وقت تک چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں تھے جب تک کہ ان خطرات کی مدافعت کا معقول

انتظام نہ ہو جائے تاہم جب ان سے اس بات کا قطعی وعدہ کر لیا گیا کہ مرہٹوں کے خلاف ان کی حفاظت کی جائے گی تو وہ ہر قسم کے ایثار کے لیے جس کا ان سے مطالبہ کیا گیا آمادہ ہو گئے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ لارڈ ویلزلی صاحب مرہٹوں کے آیندہ اقدامی حملوں کے خلاف سلطنت آصفیہ کی حفاظت کا وعدہ نہ کرتے تو نہ تو وہ ٹیپو کے خلاف جنگ کر سکتے تھے جو اس وقت اٹل تھی اور نہ فرانسیسیوں کو دکن سے خارج کر سکتے تھے (یہ کام بھی اگر نسبتاً پہلے کام سے زیادہ ضروری نہیں تو کم از کم اس کے برابر اہم ضرور تھا)، انگریزوں سے ۱۷۸۸ء میں معاہدہ کرنے کے بعد ہی سے فرمانروائے دکن اس قسم کے عہد نامے کے خواہاں تھے لیکن لارڈ کارنوالس نے محض اس وجہ سے انکار کیا تھا کہ اس وقت مرہٹے بھی حضور نظام دکن کیطرح ٹیپو کے خلاف انگریزی حکومت سے ملے ہوئے تھے۔ اور اس قسم کے معاہدے سے وہ لازمی طور پر برانگیختہ ہو جاتے یہ خاص وجہ جس کا لارڈ کارنوالس پر اس وقت اثر تھا۔ اب باقی نہیں رہی تھی۔ پونہ کی جس حکومت نے اتحاد ثلاثہ میں شرکت کی تھی۔ اس کا اب کہیں وجود بھی نہ تھا۔ اس کے وسایل پر اس وقت دولت راؤ سندھیا حاوی تھا۔ اور اس کے رویے سے مجموعی طور پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ برطانوی حکومت کے غنیموں کی تدبیروں کے جال توڑنا یا ان کے حملے کی مدافعت کرنا تو درکنار اس کے خلاف جو اتحاد بھی قایم ہو گا اس میں وہ ضرور شرکت کرے گا۔

ایسی حالت میں لارڈ ویلزلی شہریار دکن کے بجا مطالبات کو ٹال کر نہ اہم خطرات مول لے سکتا تھا اور نہ اس سلطنت کو جو اس کے تفویض کیگئی تھی ٹیپو سلطان کے خلاف ایک ایسی جنگ میں پھنسا سکتا تھا جس میں اس کے بغیر کسی حلیف کے لڑنا پڑتا اور جس میں فرانسیسی سلطان سے مل کر انگریزی طاقت کے خلاف اپنے پورے وسایل صرف کر دیتے لہٰذا برطانوی علاقے کی سلامتی کے خیال سے اسے مجبوراً حیدرآباد سے اس قسم کا معاہدہ کرنا پڑا۔

اس ایک مسئلہ کی بدولت کچھ ایسے چند در چند واقعات پیش آئے جن سے (۳.۱۴)
برطانوی حکومت ہند کی حالت بالکل بدل گئی اس کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ ٹیپو سلطان کی طاقت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی جگہ جدید ریاست میسور قایم ہو گئی۔ دوسرا

نتیجہ یہ نکلا کہ مرہٹوں کی سلطنت سے انگریزوں کے سیاسی تعلقات قطعی بدل گئے اور بعد ازاں بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ رہا کہ یا تو انگریز اپنے جدید معاہدوں سے علیحدگی اختیار کریں اور جدید فتوح سے دست بردار ہو جائیں یا مرہٹوں کے خاص خاص سرداروں کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ اپنے اطوار و مسلک میں اس قسم کی تبدیلی اور مناسب ترمیم کریں جو ملک کی تبدیل شدہ سیاسی حالت کے مطابق ہو۔

یہ توصیح ہے کہ صلح سیلبائی کے بعد سے مرہٹوں نے انگریزوں اور ان کے حلیفوں نے ان مقبوضات کی طرف جن کی حفاظت کمپنی کے ذمے تھی کبھی رُخ نہیں کیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے اور انگریزوں کے حدود صرف ایک جگہ اودھ سے ملتے تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مادھو راؤ اور دولت راؤ سندھیا دونوں شمالی ہند میں اپنی طاقت بڑھانے اور مرہٹوں کی سلطنت کے حقیقی مالک بننے کی فکر میں اس قدر زیادہ منہمک تھے کہ اودھ پر حملہ کرنے اور انگریزوں کو چھیڑنے کا انھیں خیال تک نہیں ہو سکتا تھا لیکن ان کی اس مصروفیت کی وجہ سے انگریزوں کے لیے مصیبت کا ایک جال پھیل رہا تھا اور اگرچہ وہ ان کے اس غیر جانبدارانہ مسلک کی بدولت اپنے آپ کو کم از کم عارضی طور پر ان کے حملوں سے محفوظ سمجھتے تھے لیکن اس کی وجہ سے وہ ایک ایسے اہم خطرے میں پھنس رہے تھے جس سے ان کی فوجوں کا اب تک ہندوستان میں کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔

دوسرے علاقوں میں انگریزوں کی سلطنت کے حدود مرہٹوں کی سرحدوں (۳۱۴)
سے دور تھے اور ان قزاقوں کے علاقوں اور انگریزوں کے مقبوضات میں حضور نظام دکن اور ٹیپو سلطان کی سلطنتیں حایل تھیں لیکن جب ایک ایسے مسلک کی وجہ سے جس کی مصلحت اور جس کے انصاف میں اب تک کبھی شبہہ نہیں کیا گیا۔ انھیں شہریار دکن سے اپنے تعلقات مستحکم بنانے کی غرض سے مثل اپنی سلطنت کے حیدر آباد کی حفاظت بھی اپنے ذمہ لینی پڑی اور ان کی راست نگرانی اور پناہ میں میسور کی جدید ریاست قایم ہوئی تو درحقیقت وہ ان تمام مقامی اور سیاسی تعلقات کے وارث بن گئے جو ان سلطنتوں کے مرہٹوں سے قایم تھے۔

ان ریاستوں کی تاریخ سے ظاہر ہوگا کہ مشکل سے کوئی سال ایسا گزرتا ہوگا جس
میں ان کا مرہٹوں سے کچھ نہ کچھ تنازعہ پیش نہ آتا ہو اور ایسی حالت میں جبکہ ان
تنازعات کی بنا مرہٹوں کے طرز حکومت میں شامل تھی انگریزوں کو ان جھگڑوں
اور لڑائیوں سے نجات ملنے کی توقع صرف اسی وقت ہوسکتی تھی جب کہ وہ مذکورہ
بالا طریقوں میں سے کسی ایک پر عمل کریں۔ پہلا طریقہ تو یہ تھا کہ وہ حیدرآباد و میسور سے
اپنے تعلقات منقطع کرلیں اور جدید فتوحات سے دست بردار ہوجائیں۔ دوسرا
طریقہ یہ تھا کہ مصالحت کے ذریعہ سے اس امر کی کوشش کی جائے کہ مرہٹے اپنے
طرز حکومت میں ایسی تبدیلی کریں جس سے عام امن قائم رہ سکے۔

(۳۱۵) پہلے طریقہ پر عمل کرنے میں تو سخت توہین اور تباہی تھی اور کسی ترمیم کے
ساتھ بھی اس کا خیال نہیں کیا جاسکتا تھا دوسرا طریقہ نہایت سہل اور اعتدال پسند
تھا اور مرہٹوں کے باہمی نفاق سے یہ توقع بھی کی جاسکتی تھی کہ جنگ کئے بغیر
یہ مطلب حاصل ہوجائے گا۔ جب گفت و شنید کی کامیابی مشتبہ نظر آنے لگی اور یہ ظاہر
ہوگیا کہ مرہٹے اس وقت صرف خوف ہی سے جنگ چھیڑنے سے باز آسکتے ہیں تو یہ
مناسب سمجھا گیا کہ ہر سیاسی معاملے سے فائدہ اٹھا کر انھیں جنگ ملتوی رکھنے کی
طرف راغب کیا جائے لیکن ساتھ ہی خود تیار رہنا چاہیئے تاکہ جنگ اٹل ہونے
کی صورت میں اپنی بات سے پیچھے نہ ہٹنا پڑے۔ دربار پونہ سے جو گفت و شنید شروع ہوئی
اس کا یہی مقصد تھا کیونکہ ملک کی عام حالت کا اندازہ کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا تھا
کہ انگریز دربار حیدرآباد اور حکومت میسور سے اپنے جدید تعلقات محض اس وقت
برقرار رکھ سکتے ہیں جبکہ یا تو دربار پونہ سے بھی ان کے تعلقات قائم ہوجائیں یا وہ
اپنے غیر جانبدارانہ مسلک کی حفاظت کے لیے ان کی سرحد پر ایک مستقل فوج رکھیں
چونکہ مرہٹوں پر کبھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے جب کبھی مرہٹے میدان
میں آتے تو یہی عمل کیا جاتا۔ یا یوں کہیئے کہ محض احتیاط کی خاطر ہر سال اسی
(۳۱۶) قسم کے مصارف برداشت کرنے پڑتے۔ بہرحال جب تک مرہٹے باہمی جنگ وجدل
میں مصروف تھے انگریزوں کو اپنی عدم مداخلت کی پالیسی کے ساتھ
ساتھ ہمیشہ مسلح بھی رہنا پڑتا اور جب ان کے باہمی تنازعات

کسی باہمی اتحاد یا کسی خاص مرکزی حکومت کے قایم ہو جانے کے بعد ختم ہو جاتے تو ان خطرات کی مدافعت کے لیے انھیں مزید تیاریاں کرنی پڑتیں اور انگریزوں کا ہی میں دیوالہ نکل جاتا اور چونکہ مرہٹوں کی اور ان کی رائے میں سخت تصادم تھا اس لیے اس سلسلے کے خاتمے کی کوئی توقع نہیں ہوسکتی تھی۔ مرہٹے تو محض اپنے تشدد اور دست درازیوں کے لیے طاقت و قوت چاہتے تھے اور انگریز ملک میں امن و امان قایم کرنے کے لیے لہذا انگریزوں کو اپنی اور اپنے حلیفوں کی خاطر اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ پیشوا سے ایک ایسا معاہدہ کریں جس کی بدولت اسے محض اپنے آبائی مقبوضات پر آزادی حاصل نہ ہو بلکہ دکن میں امن برقرار رکھنے کی ضرورت بھی لاحق ہو جائے۔

ان خیالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ ویلزلی کو دربار پونہ سے اتحاد قایم کرنے کی جو فکر تھی وہ ضرورتاً تھی نہ کہ ارادتاً اس کا مقصد جنگ سے بچنا تھا نہ کہ اسے چھیڑنا مثل سابق کے اس موقع پر بھی اس کا مسلک اپنی سلطنت میں امن قایم کرنا تھا اور اسی دھن میں جہاں کہیں بھی اسے مراسلت کرنے کا موقع ملا اس نے ہمیشہ صلح آمیز طریقہ سے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کی لیکن کبھی کسی ایسے سمجھوتے کو قابل تسلیم تصور نہیں کیا جس کی بدولت اسے عارضی نجات حاصل ہو جائے اور آئندہ کے لیے برطانوی حکومت کے امن و امان یا نام و ناموس کو کسی قسم کا خطرہ باقی رہ جائے۔

(۲۱۷) پیشوا سے اتحاد قایم کرنے میں جو کامیابی ہوئی اور مرہٹوں کے خلاف جنگ میں جو شاندار فتح حاصل ہوئی اس کے اسباب بیان ہو چکے ہیں۔ ان کارناموں کے نتائج نے ان تمام لوگوں کی پیشین گوئیوں کو باطل کر دکھایا جو متعصبانہ طریقے اور محدود نقطۂ نظر سے ان پر تبصرہ کرتے تھے۔ اور لارڈ ویلزلی کو اس بات کا فخر حاصل ہوا کہ اس نے اپنے دوران قیام ہی میں اپنی تمام امیدوں[1]

---

[1] سنہ ۱۷۹۵ء میں انھوں نے سلطنت آصفیہ پر جو حملہ کیا تھا اسی سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھیں جب کبھی لوٹ مار کا موقع ملتا تھا تو وہ کس طرح متحد ہو جاتے تھے۔

کو جو اس دانشمندانہ کارنامے سے وابستہ تھیں پورا ہوتا ہوا دیکھ لیا۔

لارڈ ویلزلی کی واپسی کے وقت ہندوستان کی عام حالت

اس کی واپسی کے وقت ہندوستان کی جو حالت تھی اگر اس پر ہم ایک نظر ڈالیں تو یہ مسئلہ اور بھی صاف طور سے حل ہو جائے گا۔

فرانسیسیوں کی سازش کا خاتمہ۔

برطانوی حکومت کے خلاف فرانسیسیوں کی ان تمام سازشوں کا خاتمہ ہو گیا جن کی کامیابی کے لیئے وہ برطانیہ کی رعایا سے مدد کی توقع رکھتے تھے[۱]۔

شہنشاہ دہلی کی رہائی

ضعیف اور قابل تعظیم شہنشاہ دہلی جو ایک عرصے سے مرہٹوں کا اسیر تھا اور بعد میں فرانسیسی جماعت کے پنجے میں پھنس گیا تھا اسکی مصیبت کے دن بھی ختم ہوئے اور برطانوی حکومت کے زیر سایہ اسے خاطر خواہ امن نصیب ہوا۔

دربار حیدرآباد سے اخلاص و اتحاد۔ (۲۱۸)

نواب میر اکبر علی خاں بہادر سکندر[۲] جاہ نے جو ۱۸۰۳ء میں اپنے والد کے جانشین ہوئے تھے کمپنی سے قدیم تعلقات برقرار رکھے اور

۱۔ ان سازشوں کا مقصد اب سب پر روشن ہو گیا تھا، جنرل ڈی کین کیساتھ جو فوج پانڈیچری روانہ کیگئی تھی اسکی تعداد اور اسکے سامان ہی سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ فرانسیسی اس قسم کی فوج سے اس طاقت کو مدد دے کر جو انگریزوں پر حملہ کرنے والی تھی فتح حاصل کرنے کی توقع رکھتے تھے۔

۲۔ حیدرآباد کے رزیڈنٹ کو ہدایت تھی کہ مرحوم اعلیٰحضرت کے بڑے بیٹے سکندر جاہ کو وہ پوری مدد دے اسکے عوض میں اعلیٰحضرت سکندر جاہ نے کمپنی کو سات لاکھ سالانہ کی وہ رقم جو شمالی سرکار کی دیوانی کے معاوضہ میں ادا کیجاتی تھی بخشدی لیکن لارڈ ویلزلی نے اس عطیہ کو اس خیال سے قبول نہیں کیا کہ انکی مسند نشینی میں مدد دینا کمپنی کا خاص فرض تھا اور محض ایک غیر جانبدار کی حیثیت سے اس نے اس موقع پر اپنا فرض انجام دیا تھا۔

اپنی ریاست میں ایک بڑی امدادی فوج[لہ] بدستور برقرار رکھی۔ اسکے مصارف ایک خاص علاقہ سے ادا کئے جاتے تھے جس میں میسور کا وہ حصہ شامل تھا جو ٹیپو سلطان سے فتح کر کے حیدر آباد میں شامل کیا گیا تھا۔ برار کی جدید فتح سے اس میں بیش بہا اضافہ ہو گیا تھا۔ اور راجہ برار کے جو کچھ حقوق اس علاقہ میں تھے ان سے اس نے دست برداری دیدی تھی۔

(۳۱۹) مرہٹوں کے سردار رگھوجی بھونسلا اور ہلکر کی تسخیر کی وجہ سے حضور تاجدار دکن کو آیندہ ہر قسم کے خطرات سے امن ملا اور ان کی رعایا کو ایسا چین نصیب ہوا جو اب تک کبھی میسر نہیں ہوا تھا۔

ٹیپو سلطان کی سلطنت کا خاتمہ اور ہندو ریاست کا قیام۔

ٹیپو سلطان کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ ہندو راجہ کے قدیم خاندان نے اسکی جگہ لی اور جس گدی سے حیدر علی اور اس کے فرزند نے اس خاندان کو اڑتالیس سال تک محروم رکھا تھا اس پر انگریزوں نے فیاضی و ہمدردی سے اسے جلوہ افروز کرایا جن خیالات کی بنا پر لارڈ ویلزلی نے یہ انتظام کیا تھا ان کا ذکر تو ہو چکا ہے لیکن اگر اس کے عملی پہلو کو چند الفاظ میں ظاہر کر دیا جائے تو مناسب ہوگا۔

میسور کی جدید حکومت کی نوعیت پر ایک نظر۔

میسور کی جدید حکومت ایک عام نظریے پر قایم ہے یعنی اسکے فرمانروا کو اپنی ریاست میں کامل آزادی حاصل رہے۔ امن برقرار رکھنے کیلئے اس کے پاس معقول فوج بھی ہو اور اسکے ساتھ ہی وہ اپنے حلیف کی جس نے اسکی

لہ۔ اس فوج میں یورپی سپاہیوں کا ایک رسالہ تھا، دو دستے ہندوستانی سواروں کے اور چھ ہندوستانی سپاہیوں کے تھے، اس فوج کیساتھ ایک معقول توپخانہ بھی رہتا تھا۔

ریاست کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے مدد کرے۔ لہٰذا اس حلیف کو اختیار حاصل ہوگا کہ امدادی فوج کو وہ ریاست کے اندر جس مقام پر چاہے رکھے تاکہ وہ اپنی ذمہ داری کو پورا کرسکے۔ اس بنا پر تمام بیرونی تعلقات کا تنہا اسی سے تعلق ہوگا۔

ان تعلقات کے ابتدائی مدارج میں سخت احتیاط درکار تھی اور اس احتیاط پر بھی اس نظریئے کی عملی کامیابی کا انحصار تھا لہٰذا لارڈ ویلزلی نے اس کی اہمیت کے لحاظ سے اس پر پوری توجہ صرف کی۔ دربار لکھنو و کرناٹک و تنجور کی مثالیں سبق سکھا چکی تھیں اور ان سے اب اس بات کا کافی تجربہ ہو گیا تھا کہ موقع پر کن خطرناک راستوں سے گریز کیا جائے (۳۲۰) اگرچہ دربار میسور اور مذکورۂ بالا ریاستوں کے فرمانرواؤں کے تعلقات کے آغاز میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ان سے انگریزوں کو تعلقات قایم کرنے پڑے تھے۔ اور میسور میں انھیں اصلاح کرنی تھی۔ تاہم اس امر کا اندیشہ تھا کہ اگر احتیاط و ہوشیاری سے کام نہ لیا گیا تو میسور کا نوعمر راجہ اور اس کے وزرا سازش اور رشوت ستانی کے راستے پر لگ جائیں گے جو ملک و رعایا کی تباہی کا موجب ہوگا اور اس جدید ریاست کے قیام سے جو کچھ امیدیں ہوسکتی ہیں ان سب پر پانی پھر جائے گا۔

ریاست میسور برطانوی حکومت کی کچھ اس قدر زیادہ محکوم تھی کہ اس کی مجالس وغیرہ میں جس قدر اثر و نگرانی رکھنی ضروری تھی اس کے ساتھ وہاں کے کارکن افراد کو وہ عزت و رتبہ حاصل نہیں ہوسکتا تھا جو ان کے اہم فرائض کی انجام دہی کے لیے ضروری تھا۔ ریاست کی ابتدائی حالت کی وجہ سے یہ امر نہایت ضروری تھا کہ وہاں کے حکام اپنے سخت اور دشوار اور نازک کاموں کو بہ خوبی انجام دیں لیکن جو اختیارات وہ استعمال کریں ان کا انھیں احساس نہ ہونے پائے اور وہ ہمیشہ اپنا یہ فرض منصبی سمجھیں کہ نہایت علانیہ اور نمایاں طور سے وہ ریاست کی حمایت کریں اور اپنے ہر کام سے اس کی شہرت کو دوبالا کریں تاکہ اسے ایک جدا اور مستحکم ریاست کی حیثیت حاصل ہو جائے (۳۲۱)

میجر ولکس[1] Major Wilkes نے میسور کے حالات پر جو واضح اور قابلانہ یادداشت لکھی ہے اس میں وہ تحریر کرتا ہے کہ ان تمام مقاصد کی کامیابی کا سہرا جو اس ریاست کے وجود میں پنہاں تھے ان اصول کے علاوہ جن کے ماتحت ابتدائی انتظامات عمل میں آئے ان اشخاص کے سر ہے جنھوں نے اپنی غیر معمولی قابلیت دماغی قوت اور اپنے اخلاص و اتحاد سے اپنی اپنی دیوانی و فوجی خدمات انجام دیں اور اس شخصیت کا بھی اس میں کچھ کم اثر نہیں جسے انگریزوں نے اپنی خوش قسمتی سے ریاست کا دیوان مقرر کیا تھا[2] اس شخص میں غیر معمولی قابلیت تو تھی ہی لیکن اسکے ساتھ ہی وہ ملک کے حالات سے خوب واقف تھا اور مردم شناسی میں تو اسے کمال حاصل تھا۔ لہٰذا ان اوصاف کی وجہ سے وہ قدیم اور جدید طرز کو بہ خوبی متحد کر سکا اور سابق حکومت میں جو خوبیاں تھیں انہیں بھی اس نے نچوڑ لیا۔

انگریزوں کے تعلقات ریاست میسور سے قابل رشک ہیں لیکن ساتھ ہی انکی نوعیت اس قدر نازک ہے کہ انگریزوں کو ہمیشہ اس کی سختی سے نگرانی کرنی پڑتی ہے اگر بنیادی اصول میں جن پر کہ ان تعلقات کا انحصار ہے ذرہ برابر بھی (۳۲۲) فرق آجائے تو بلا شبہہ فوراً سارا کھیل بگڑ جائے گا لیکن برخلاف اسکے جب تک یہ تعلقات قایم ہیں اس وقت تک وہ جنوبی ہند میں انگریزوں کی طاقت کی پشت پناہ بنے رہیں گے۔ آگے چل کر انگریزوں کا مسلک یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اس ریاست کی دولت اور وسعت کو کم کرنیکے بجائے اس میں اضافہ کریں کیونکہ ایک طرف تو انھیں اپنی سلطنت کیطرح اس کے تمام وسائل پر پورے اختیارات حاصل ہیں اور دوسری طرف یہ سلطنت ان تمام اعتراضات سے پاک ہے جو خود انکی حکومت

[1] اس یادداشت کے قابل مصنف کا نام ہمیشہ ان ممتاز ہستیوں میں شامل رہے گا جنھوں نے اپنے ذاتی اوصاف اور اپنی ذہانت اور قابلیت سے اہم معاملات کو خوش اسلوبی سے طے کرایا ہے۔

[2] اس شخص کا نام پورنیا تھا وہ ذات کا برہمن تھا اور ٹیپو سلطان کا وزیر مال تھا۔ لارڈ ولزلی نے میسور کے کمسن راجہ کے لیے اسے بہترین وزیر اعظم سمجھا۔

پر عاید ہوتے ہیں اور خاص کر اس عام اور ایک حد تک بجا اعتراض سے تو وہ قطعی طور
پر بری ہے کہ ہندوستانی رعایا کو بڑے عہدے معقول تعداد میں نہیں ملتے۔

جن لوگوں نے محض سطحی واقعات پر غور کیا ہے وہ اکثر انگریزوں کے ان
تعلقات کا دربار اودھ، اور تنجور اور ارکاٹ کے تعلقات سے مقابلہ کرتے ہیں اور ایک
عام اصول بناکر یہ غلط نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ ان تعلقات کا بھی وہی حشر ہوگا کیونکہ انہیں
بھی ایسی کمزوریاں موجود ہیں جو خود ان کا خاتمہ کر دیں گی اور انھیں کبھی دیرپا نہ ہونے
دیں گی لیکن ذرا سے غور سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میں کس قدر زمین و آسمان
کا فرق ہے ارکاٹ اور اودھ اور تنجور سے انگریزوں کے تعلقات رفتہ رفتہ اور
بتدریج قایم ہوئے اور ابتدا ہی سے ان میں سازش کی بنیاد پڑی۔ ان سلطنتوں کی آمدنی (۳۲۳)
کا انحصار قرض پر تھا اور مختلف افراد جن میں حکومت انگلستان کے بعض باوقار
اشخاص بھی شامل تھے اس ترکیب سے اس قدر بیجا فایدہ اٹھاتے تھے کہ انھیں
کبھی اس بات کا احساس تک نہ ہوتا تھا کہ ان کی یہ روش ان ریاستوں کو محض مفید
حلیف بننے ہی سے نہ روکے گی بلکہ ان کی تباہی کی بھی موجب ہوگی۔ جب انگریزی
حکومت کو اس کے نتایج نظر آنے لگے تو معاملات اس قدر زور پکڑ چکے تھے کہ ان کا
علاج ناممکن ثابت ہوا اور اس موذی مرض کی بیخ کنی نہ ہو سکی اور مختلف قسم کی
مجبوریوں کی وجہ سے یہ ریاستیں قدرتی طور پر برطانوی حکومت کے پنجے میں آگئیں
اور اس کی محکوم بن کر رہ گئیں۔ علاوہ ازیں ان کے دستور کے اصول کی نوعیت
کی وجہ سے بھی ان کا وجود باقی نہ رہ سکا اور ان کا خاتمہ کر دیا گیا۔

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ انہی وجوہ کی بنا پر ان ریاستوں کی شان
و شوکت۔ طاقت و قوت اور آن بان رفتہ رفتہ غائب ہوگئی لیکن اس کے ساتھ
یہ بھی خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر برطانوی حکومت سے ان کے تعلقات قایم نہ ہوتے
تو ان کے زبردست ہمسائے انھیں کبھی کا ہضم کر چکے ہوتے۔ اس بات کا امکان
ان کے دماغ میں تو کبھی نہ آیا ہوگا اور انسانی فطرت کا اقتضا بھی یہی ہے کہ ارکاٹ
و اودھ و تنجور کے نواب اور ان کے ماتحت اپنے سابق جاہ و جلال کو یاد کریں اور
اپنی سابق شان و شوکت کا موجودہ حیثیت سے مقابلہ کریں اور انگریزی

حکومت سے ان کے تعلقات کی جو نوعیت رہی ہے اس کا خیال کر کے وہ تنہا اسی کو (۳۲۴)
اس انقلاب کا ذمہ دار قرار دیں لیکن جتنا یہ خیال ان پر غالب ہے اتنا ہی غلط بھی ہے۔
میسور کی جدید حکومت کا خاکہ کچھ اور ہی ہے وہ بالکل اس کے متضاد ہے
اسکا وجود تو برطانوی حکومت کی فیاضی سے عمل میں آیا ہے اور اس حقیقی احسان
کا گراں بار ہمیشہ اس کی گردن پر رہے گا اور وہ کبھی اسے فراموش نہیں کر سکے گی۔
اسی وجہ سے عوام الناس کی رائے بھی کبھی اس کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ بدیہی و حقیقی طور
پر انگریزی حکومت کو از روئے انصاف اس بات کا حق حاصل ہے (اور معاہدے
سے بھی وہ اس بات کی مجاز ہے) کہ اس کے حالات و معاملات کی نگرانی کرے اور
ریاست کے وسایل کے استعمال اور آمدنی و خرچ اور فوج کی ترتیب و تنظیم پر نگاہ
رکھے جس طریقہ سے اس حق کو اب تک استعمال کیا گیا ہے اس سے میسور کی دولت و
آبادی اور خوشحالی میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ مرہٹوں کی لڑائی کے دوران
میں کمپنی کے مقبوضات میں سے کسی علاقے نے میسور کے برابر نہ تو اپنی استعداد سے
زیادہ اتنی فوج دی اور نہ اتنا غلہ اور روپیہ فراہم کیا۔ مزید براں یہ سب چیزیں نہایت
مستعدی اور جوش و خروش کیساتھ پیش کی گئی تھیں۔ یہی ایک واقعہ عملی طور پر اور
بلا شبہہ ان تعلقات کو خوش گوار ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

اس حکومت میں کمزوریاں بھی ہیں لیکن ایک ہندوستانی ریاست میں (۳۲۵)
جن جن خوبیوں کا ہونا ممکن ہے وہ سب اس میں موجود ہیں اور جہاں تک برطانیہ
کا اس سے تعلق ہے وہ پاک دامن بھی ہے۔ اب تک راجہ کے دربار میں سازش کا
بازار گرم نہیں ہوا۔ حکام و عہدہ داروں میں باہمی نااتفاقی پیدا نہیں ہوئی۔

[1] ویلور کی بغاوت میں اگرچہ ٹیپو کے خاندان کا نام زبان زد خلائق تھا تاہم نہ تو میسور کی
دس ہزار فوج کا کوئی ایسا سپاہی تھا اور نہ ریاست کی رعایا میں کوئی ایسا فرد تھا
جسے بغاوت کے سلسلہ میں غداری کی سزا دینی پڑی ہو۔ یہ یہاں کی حکومت کی نگرانی
اس کی قوت اور خوبی کی زبردست دلیل اور رعایا کی محبت کی نمایاں مثال ہے۔

ان میں رشوت ستانی کی کوئی مثال نہیں ملی ریاست کی آمدنی رہن نہیں رکھی گئی سخت شرح سود پر قرض لینے کا سلسلہ جو آخر میں ریاست کی بربادی اور حکومت کے جور و ظلم کا ذریعہ بن جاتا ہے اب تک شروع نہیں ہوا یہ وہ عظیم الشان فرق ہے جو ارکاٹ اودھ تنجور اور دیگر ادنیٰ ہندوستانی ریاستوں کے تعلقات سے حکومت میسور کے تعلقات کو ممتاز کرتا ہے اور اگر انگریزوں میں اتنی عقل اور ہمت ہے کہ وہ ان پاک اصول کو ہر قسم کے حملوں سے محفوظ رکھ سکیں تو یقیناً میسور کے تعلقات سے انھیں روز افزوں فایدہ پہونچے گا لیکن ان کی بدقسمتی سے باوجود ان تمام خوبیوں کے یہ رشتہ کچھ اس قدر نازک ہے کہ اسے اتنا نقصان کسی بے باک اور خطرناک حملے سے بھی نہیں پہونچ سکتا جتنا کہ ذرا سی بے پروائی یا اعانت کی کمی سے پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ میسور کی ریاست درحقیقت برطانوی حکومت کی اس قدر محکوم ہے اور اس کی محکومیت برطانوی افواج کے قیام سے کچھ اس قدر زیادہ بڑھ گئی ہے کہ جب تک انگریز متواتر اس بات کا خیال نہ رکھیں کہ اس رشتۂ اتحاد سے ان کا سراسر فایدہ ہے اس وقت تک اس ریاست کو وہ اعزاز و وقار حاصل نہیں ہو سکتا جو اس کی بقا کے لیے نہایت ضروری ہے۔ (۲۲۶)

میسور کے جدید انتظام کی خوبی اور اندرونی امن کی وجہ سے ریاست کی آمدنی میں بیش بہا اضافہ ہو گیا ہے اس کا اندازہ محض اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ کمپنی کی امدادی فوج اور ریاست کی دیگر فوجوں اور حکومت کے ہر قسم کے مصارف نکال دینے کے بعد ہر سال ایک معقول رقم بچ رہتی ہے جو دیگر مفید کاموں میں صرف کی جاتی ہے۔ ہندوستان کا کوئی اور علاقہ یہاں کی نہروں سڑکوں اور پلوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اگر یہی رفتار جاری رہی تو یہ ریاست یورپ کی اکثر ترقی و تہذیب یافتہ سلطنتوں کا بہ آسانی مقابلہ کر سکے گی۔

یہ ہیں وہ خیالات جن کا لارڈ ویلزلی نے انگلستان واپس ہوتے وقت اس ریاست کی بابت اظہار کیا تھا جو اس کے ہندوستان پہونچنے کے وقت ایک سخت گیر انسان کے پنجے میں تھی اور جس کی زندگی کا تنہا مقصد برطانوی حکومت کی تباہی اور بیخ کنی کے لیے سامان مہیا کرنا تھا۔

کرناٹک کی ترقی

اس بات کا اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ کرناٹک میں کمپنی کا خوب سکہ جم گیا تھا اور یہ زرخیز علاقہ بھی اب جور و تشدد اور قرض کے تباہ کن سلسلہ سے نجات پاکر سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا تھا۔ جن اصحاب کو جدید انتظامات اور معاہدوں سے اختلاف تھا اور جنھیں وہ انصاف کے خلاف سمجھتے تھے وہی اب اس بات سے انکار نہیں کر سکتے تھے کہ رعایا اور ریاست کی حالت بہت کچھ سنبھل گئی ہے۔

فتح کٹک اور بحری ساحل پر کمپنی کا تسلط

(۳۲۷) کٹک کی فتح اور الحاق سے مدراس اور بنگال کے صوبوں کی حدود مل گئی تھیں اور گجرات، ملابار اور کناڈا میں جو مقامات پہلے حاصل ہو چکے تھے ان کی وجہ سے دریائے گنگا سے لیکر دریائے سندھ تک تمام بحری ساحل پر انگریزوں ہی کا تسلط تھا۔

حکومت بمبئی کے وسائل میں اضافہ

بمبئی کی ماتحت حکومت نے بھی لارڈ ولیزلی کے دور میں اسی کے احکام کے بموجب پیشوا، سندھیا اور گیکوار سے معاونتی معاہدے کر کے گجرات میں نہایت اہم اور مفید علاقے حاصل کر لیے تھے اور اس جدید اضافے سے احاطہ بمبئی کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ ضرورت کے وقت وہ بہت بڑی فوجی امداد دے سکتا تھا۔ یورپ کی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے اس پر اس قسم کے مطالبات بہت جلد عاید ہوتے نظر آتے تھے۔

پیشوا جو اپنی کمزوری کی وجہ سے معاونتی معاہدہ کرتے ہوئے گھبراتا تھا اب برطانوی حکومت کا ایک صادق اور مفید حلیف تھا۔ ان جدید تعلقات سے جو فواید اس کی رعایا اور ریاست کو حاصل ہوئے ان کا اندازہ ہوتے ہی اس نے اپنے معاہدوں پر قایم رہنے کی ہر ممکن کوشش کی وہ ریاست جسے اس فرمانروا کی مسند نشینی کے بعد سے عہد نامۂ بسین تک سرکشوں کے غلبہ کی وجہ سے کبھی چین نصیب نہیں ہوا تھا اب امن کے مزے اڑا رہی تھی ریاست کی امدادی فوج پونہ سے چالیس
(۳۲۸) میل شمال میں مقیم تھی جو ہر بیرونی حملے کے وقت فوراً حیدرآباد

کی امدادی فوج سے مل سکتی تھی۔ اس طور سے پیشوا اور اعلیٰحضرت نظام دکن کی سرحدوں ہی کی حفاظت نہیں ہو تی تھی اور محض ان ریاستوں ہی میں امن قایم نہ تھا بلکہ ان کی بدولت جنوبی ہند کے تمام علاقوں کو مستقل طور پر امن نصیب ہو گیا تھا۔

سندھیا کی قوت کا خاتمہ

دولت راؤ سندھیا کی قوت میں پورے طور پر تخفیف ہو چکی تھی اور اگرچہ گوہد اور گوالیار کے علاقے نکل جانے سے لارڈ ویلزلی کی واپسی تک دولت راؤ سندھیا ناخوش رہا تھا اور جس طاقت نے اسے مغلوب کیا تھا اسکی فیاضی سے ان علاقوں کی واپسی کی اسے امید تھی تاہم دوبارہ جنگ چھیڑنے کا اسے قطعی خیال نہیں تھا۔ یہی نہیں بلکہ جب اس کے دیوان اور اس کے خسر سرجی راؤ گنکیا نے ہر ممکن طریقہ سے اسے برطانوی حکومت سے بھڑانے کی کوشش کی اور دوسرے سرداروں کے ساتھ مل کر سندھیا کے مستقر پر نگرانکار برطانوی رزیڈنٹ اور اس کے ساتھیوں پر حملہ کرنے اور ان کا مال اسباب لوٹنے کی فکر کی تو اس نے ان سے اشتعال انگیز نصائح پر سختی سے اظہار نفرت کیا۔

ہولکر کی قوت میں کمی

جسونت راؤ ہلکر کی بھی اب وہ شان باقی نہیں رہی تھی اور وہ ایک سلطنت کے سردار کے رتبے سے گر کر ایک قزاق کی حیثیت پر آگیا تھا اور بجائے زبردست اور باقاعدہ فوج کے اس کے پاس اب پست ہمت فوج کی ایک جماعت باقی رہ گئی تھی جس کے لیے بجز قزاقی کے کوئی دوسرا ذریعۂ معاش نہیں رہ گیا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ اس فوج کو برطانوی فوجوں کے مقابلے پر کھلے میدان میں لاتا تو درکنار انگریزی پڑاؤ کے قریب پچاس میل تک بھی آنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا[۱]۔

---

[۱] اس سردار نے جو آخری حملہ کیا وہ حقیقی معنوں میں محض مراجعت کا ایک سلسلہ تھا جو دہلی کے مغربی علاقے میں داخل ہونے کے بعد سے پنجاب کے علاقے امرتسر پہونچنے تک جاری رہا۔ یہاں پہونچنے کے بعد اس نے لارڈ لیک سے معاہدہ کر لیا۔

شمالی ہند کی حالت میں انقلاب اور کمپنی کا غلبہ

(۳۲۹) جنگ شروع کرتے وقت لارڈ ویلزلی کی جو توقعات شمالی ہند میں تھیں وہ سب پوری ہوگئیں۔ فرانسیسی جماعت کا خاتمہ ہوگیا۔ مرہٹوں کا زور ٹوٹ گیا۔ دوآبہ کے علاقے میں اور دریائے جمنا کے داہنے ساحل پر برطانوی حکومت کا تسلط قائم ہوگیا کماؤن سے لے کر بندیلکھنڈ تک کمپنی کی ادنی باجگذار ریاستوں کا ایک سلسلہ قایم ہوگیا اور اس طور سے اسے مرہٹوں کے حملوں سے ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی بندیلکھنڈ کا زرخیز علاقہ تسخیر ہوا۔ برطانوی فوجیں اس پر قابض ہوگئیں سنہ ۱۸۰۱ء میں اودھ سے جو علاقہ حاصل ہوا تھا اس میں بھی امن قایم ہوگیا۔ اس کی آمدنی میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ نواب وزیر اودھ کو اس انتظام سے اب محض اتفاق ہی نہ تھا بلکہ وہ اس سے خوش تھے۔ کیونکہ اسکی یہ دولت انھیں بلا خوف و خطر عیش و عشرت کے مزے اڑانے اور دولت جمع کرنیکا موقع مل گیا تھا۔

(۳۳۰) لارڈ ویلزلی کے ہر کام کا یہاں ذکر کرنا قطعی ناممکن ہے معمولی کاموں کی بابت محض اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ بھی سب اسی اصول پر مبنی تھے اور ان سب کی بھی اسی خوبی سے تکمیل ہوئی جیسی کہ مذکورۂ بالا امور کی ہوئی تھی اور ان سے بھی ایسے ہی مستقل فواید حاصل ہوئے اس کی حکومت کا ایک عام اثر یہ ہوا کہ کل ہندوستان کی کایا پلٹ ہوگئی اور ان اہم اور غیر معمولی واقعات سے اس ملک کے اندر برطانوی حکومت کی نوعیت قطعًا بدل گئی اور وہ اس والامرتبت شخص کی واپسی سے قبل ہی مطلق العنان بن گئی۔ اب اسے پوری آزادی حاصل تھی کہ وہ اپنے جدید مرتبے کے لحاظ سے اور اپنی عقل و تمیز سے کام لیکر جو مسلک مناسب سمجھے اختیار کرے۔ واقعات کی جو روش رہی اور جس طرز پر یہ حکومت قائم ہوئی اس کی وجہ سے اب اسے کسی ریاست یا کسی قسم کے اتحاد کا خوف باقی نہیں رہا۔ سندھیا کی بے چینی یا ہولکر کی مخاصمت اب ان حالات کو نہیں بدل سکتی تھی۔ جو کچھ اوپر بیان ہوچکا ہے اس سے یہ بات عیاں ہے کہ ان سرداروں کی اب ایسی حیثیت ہوگئی تھی کہ ان

کے حملے سے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہو سکتا تھا۔ محض مالی دقتوں اور فوجی مصارف کی ان سے فکر لاحق ہو سکتی تھی۔ اور یہ فکر بھی اس زمانے کی متواتر جنگ اور مختلف قسم کی جدوجہد کی وجہ سے تھی لہذا یہ بھی عارضی تھی۔ وسائل آمدنی کی ترقی جدید فتوحات کے محاصل اور مصارف کی تخفیف سے (جو لارڈ ویلزلی نے شروع کروی تھی) مالی دقتوں سے آیندہ محض نجات حاصل ہونے ہی کی توقع نہ تھی بلکہ (۳۳۱)
معقول بچت کی امید بھی تھی۔

لارڈ ویلزلی کی کامیابی کا راز

لارڈ ویلزلی کو برطانوی ہند کی حکومت میں جو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی وہ در اصل حیرت انگیز ہے۔ اس وسیع سلطنت کے کاموں میں اسکی حکومت کا جو طرز رہا اگر اس کا بھی ہم لحاظ رکھیں تو بھی اس حیرت میں کمی نہیں ہو سکتی۔ یہ اعلیٰ دماغ شخص ہر چیز پر حاوی تھا اور اس کے جوش کا اثر اس کے ہر مددگار میں پایا جاتا تھا۔ برطانوی ہند کے دور دراز مقامات پر بھی اسکا وہی رعب تھا۔ جو فورٹ ولیم میں پایا جاتا تھا۔ اس نے جن ملازموں کو خود نوکر رکھا ان پر ہمیشہ حد درجے اعتبار کیا۔ وہ ہر ایسی قوت متحرکہ سے کام لیتا تھا جو ایک راست باز اور حوصلہ مند شخص کو کام پر آمادہ کر سکتی ہے۔ وہ ہمیشہ ہر ایسے ملازم کی تعریف کے لیے آمادہ رہتا تھا جو انصاف پسند اور پابند اوقات ہوتا تھا۔ وہ حتی الامکان کبھی کسی کی برائی نہیں کرتا تھا۔ اس کی طبیعت میں ایک خاص بات یہ تھی کہ رائے دینے میں وہ ہمیشہ پس وپیش کرتا تھا۔ اور اکثر تساہل بھی کر جاتا تھا لیکن جب کام کا وقت آتا تو نہایت تیزی ہنرمندی اور پھرتی سے اسے انجام دیتا۔ اپنے ہر کام میں اپنے ماتحتوں سے حد درجہ کی کوشش کی توقع رکھتا تھا۔ اس لئے نہ کبھی اپنے حکام بالا کی مداخلت کی پروا کی اور نہ ان دفتری کارروائیوں کا لحاظ کیا جن کی وجہ سے کام میں تاخیر اور مختلف قسم کی دقتیں اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور نہ کبھی اپنے ماتحتوں کے بے جا مغالطوں کو برداشت کیا۔ اس کا در اصل یہ ایک خاص اصول تھا کہ جب کسی شخص کے سپرد کوئی کام کیا جائے تو اسے وہ تمام اختیارات بھی دے

دے جائیں جو اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہوں۔ اس کے دور میں برطانوی فوجوں (۳۳۲)
کی کمان جن عہدہ داروں کے ہاتھوں میں رہی ان کی غیر معمولی قابلیت اور ان کے اوصاف میں کوئی شبہہ نہیں ہوسکتا۔ تاہم ان کی غیر معمولی اور لاثانی فتحمندیوں کا راز اس اصول میں پنہاں ہے کہ لارڈ ویلزلی نے ان پر غیر معمولی طور پر بھروسہ کیا اور ان میں یہ احساس پیدا کیا کہ انھیں پورے اختیارات اور اپنی تمام قوتوں سے کام لینے کے مواقع حاصل ہیں۔

جو لوگ ان اختلافات سے واقف ہیں جو اس زمانہ میں برطانوی حکومت ہند کے متعلق ہندوستان میں پیدا ہو گئے تھے انھیں یہ بات معلوم کرکے ہرگز تعجب نہ ہوگا کہ وہاں لارڈ ویلزلی کے خلاف ایک زبردست تعصب پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے کارناموں کے متعلق جو یک طرفہ، پریشان کن اور مبالغہ آمیز خبریں وہاں پہونچیں ان سے عام خیال یہ ہو گیا کہ وہ سب کے سب برطانوی مفاد کے خلاف ہیں حالانکہ حقیقی واقعات قطعی اس کے برعکس تھے۔ سچ کب چھپ سکتا ہے۔ حقیقت بالآخر ظاہر ہو گئی اور اب لارڈ ویلزلی کو وہ اقتدار و عزت حاصل ہے جو کوئی قوم کسی ایک فرد کو کسی نمایاں ملکی خدمت کے صلے میں دے سکتی ہے۔

پانچواں باب

لارڈ کارنوالس کا دوسرا دور حکومت
اور
سرجارج بارلو کے دور کے واقعات

(جسونت راؤ ہلکر سے صلح ہونے تک)

لارڈ ویلزلی کی حکومت کے متعلق انگلستان کی پبلک کے خیالات

(۲۲۲)

لارڈ ویلزلی نے جس مسلک پر ہندوستان میں عمل کیا تھا اس کے برے نتائج پر کچھ اس قدر مبالغہ آمیز اور مبہم طریقہ سے خوف کا اظہار کیا گیا کہ اس سے انگلستان میں ایک عام بے چینی پیدا ہوگئی۔ ہندوستان کے قرضے میں اضافہ ہو جانے سے متعلقین کمپنی کی پریشانی دوچند ہوگئی اور ان پر اس عام خیال کا نہایت گہرا اثر پڑا۔ گوداموں میں جو مال بھرا ہوا تھا اس کی فروخت کی کمی اور سودی قرضے کی زیادتی کی وجہ سے کمپنی کا دیوالہ نکلنے کی نوبت آگئی۔ کمپنی کی اس حالت سے ان لوگوں کی اور بھی جرأت بڑھ گئی جن کی یہ خواہش تھی کہ ان سب باتوں کا الزام گورنر جنرل ہند کی سیاسی کارروائیوں پر محمول کیا جائے۔

انگلستان کے بڑے بڑے باخبر اشخاص بھی یہاں کے سیاسی معاملات کی تفصیل (۳۳۴)
سے واقف نہ تھے۔ لہٰذا جن لوگوں کا منشاء عوام کو لارڈ ویلزلی کے دور کے خلاف
بدظن کرنا تھا۔ انھیں فاصلے کی دوری اور ہندوستان کی خبروں کی نوعیت کی وجہ سے
خاطر خواہ مواقع حاصل ہو گئے لیکن از روئے انصاف اس بات کا اقبال کرنا چاہیئے
کہ جن لوگوں نے لارڈ ویلزلی کے اعمال کی سختی سے مخالفت کی وہ درحقیقت فرض شناس
لوگ تھے اور امور متعلقہ کی بابت انھوں نے جن خیالات اور جذبات کا اظہار کیا
ان پر وہ یقین بھی رکھتے تھے لارڈ ویلزلی نے برطانوی مقبوضات کی مشرق میں چند
سال ہی صدارت کی تھی لیکن اس قلیل مدت میں نہایت اہم تبدیلیاں واقع ہوئی
تھیں لہٰذا اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ ان کے متعلق پورا مواد بہم پہنچایا جائے
اور تفصیلی حالات سے پوری پوری واقفیت حاصل ہو تاکہ کم از کم انصاف پسند اور
وسیع النظر اشخاص ان اہم اور غیر معمولی انقلابات کی بابت جو مسلمہ خیالات اور قدیم
تعصبات کے سخت خلاف تھے اپنی صحیح رائے کا اظہار کر سکیں۔

لارڈ کارنوالس کا دوسری مرتبہ تقرر

بہرحال جن لوگوں پر ان خیالات کا اثر تھا انھیں لازمی
طور پر ان خرابیوں کے رفع کرنے کی فکر ہوئی۔ ایسی حالت
میں یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ اس موقع پر انھوں نے
لارڈ کارنوالس کو لارڈ ویلزلی کا جانشین منتخب کیا اور
اس انتخاب کو انگلستان میں عام طور پر پسند کیا گیا جو
لوگ بھی اس قابل قدر بزرگ ہستی کے خصائل سے واقف (۳۳۵)
ہیں انھیں یہ معلوم کر کے ہرگز تعجب نہ ہو گا کہ اس نے باوجود اپنی ضعیفی اور اپنے
سن کے اپنا فرض محسوس کیا اور ان کی درخواست رد نہ کی اگرچہ اس کی صحت
اس وقت روبہ انحطاط تھی تاہم ان بزرگ ہستیوں کی مانند جو مرنے سے قبل اپنے
ملک کی خدمت کرنے کا مزید موقع پا کر خوش ہو جاتی ہیں اس نے ان اشخاص کی
باتوں کو جو اپنے کاموں میں اس بڑے آدمی کی حمایت و تائید چاہتے تھے نہایت
جوش و مستعدی سے سنا۔ انھوں نے کہا کہ "جس سلطنت پر آپ ایک مرتبہ نہایت
شاندار کامیابی کے ساتھ حکومت کر چکے ہیں اسے اس نازک وقت میں آپ ہی

ناگزیر تباہی سے بچا سکتے ہیں"۔ لارڈ کارنوالس نے اپنے آخری مختصر دور میں جو چند سیاسی کام انجام دیئے ان کی نوعیت ان کارناموں سے بہت مختلف تھی جن کی وجہ سے اس کا پہلا دور برطانوی ہند میں ممتاز رہا تھا۔ اس فرق کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس کی روانگی کے وقت جو خیالات اس کے سامنے پیش کیئے گئے ان کا اس پر بہت اثر تھا۔ علاوہ ازیں ضعیفی اور صحت کی خرابی کا بھی اثر تھا جس کی وجہ سے اس کے دماغ میں اب پہلی سی قوت نہیں ہو سکتی تھی۔

دربار سندھیا سے مراسلت اور برطانوی رزیڈنٹ کی رہائی کا مسئلہ

جولائی ۱۸۰۵ء میں مارکوئیس کارنوالس فورٹ ولیم پہنچا۔ ہندوستان کی مختلف سلطنتوں کی اس وقت جو حالت تھی وہ بیان ہو چکی ہے یہاں صرف اتنا اور اضافہ کر دینا ضروری ہے کہ برطانوی رزیڈنٹ[1] اب تک سندھیا کے دربار میں مقید تھا۔ لارڈ لیک سندھیا کو (۳۳۶) لکھ چکا تھا کہ رزیڈنٹ کو فوراً رہا کر دیا جائے اور اگر اس کی تعمیل نہ کی گئی تو لازمی طور پر جنگ چھڑ جائے گی۔ جب اس مراسلہ کا بھی کچھ اثر نہ ہوا تو لیک نے دوسرے خط میں لکھ دیا کہ "آپ کی اس حرکت سے تمام صلح نامے اور امدادی معاہدے کالعدم ہو گئے کیونکہ آپ نے اس موقع پر محض معاہدہ کی خلاف ورزی ہی نہیں کی ہے بلکہ بین الاقوامی قانون کی بھی سخت توہین کی ہے لہٰذا برطانوی حکومت کو اب اس بات کی پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ آپ کے ساتھ جو طرزِ عمل بھی اپنے مفاد اور اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے مناسب سمجھے اختیار کرے" اس تحریر کے آخر میں ایک جلتا ہوا فقرہ یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ جب تک رزیڈنٹ کو رہا کر کے برطانوی خیمہ تک نہ پہنچا یا جائے گا، دونوں سلطنتوں کے مابین کسی قسم کی صلح یا مراسلت کی گنجائش نہ ہو گی۔

لارڈ ویلزلی نے اپنے مراسلہ مورخہ ۲۵ جولائی ۱۸۰۵ء میں لارڈ لیک کی جملہ کارروائی کی توثیق کر دی تھی اور اس کے ساتھ ہی، سندھیا کو اطلاع دیدی

[1] جنکنس (Jenkins)

گئی تھی کہ اس معاملہ میں لارڈ لیک جو کچھ کر رہے ہیں اس سے گورنر جنرل کو پورا اتفاق ہے اور اسی بنا پر انھیں پورے فوجی و سیاسی اختیارات عطا کر دیئے گئے ہیں لہٰذا اس سلسلہ میں آئندہ جو کام وہ کریں گے اس کی وہی وقعت ہوگی جو حکومت اعلیٰ کے کسی بلا واسطہ حکم کی ہونی چاہیئے۔"

لارڈ کارنوالس کے ہندوستان پہونچنے تک اس معاملہ میں اس حد تک کارروائی ہو چکی تھی۔ اس نے یہاں پہونچنے کے بعد ہی سندھیا کو ایک خط لکھا کہ (۳۴۷)
میرا ارادہ اس وقت تک آپ کو لکھنے کا نہ تھا جب تک کہ میں رزیڈنٹ کی رہائی کی خبر نہ سن لوں لیکن محض اس بات کے اظہار کے لیے کہ میں صلح و آشتی کا خواہاں ہوں اور اس خبر کے ملنے کے بعد کہ آپ نے رزیڈنٹ کو رہا کرنے اور اپنے دو معتبر وکلا کے ساتھ اسے لارڈ لیک کے خیمے تک پہونچانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے میں آپکو مطلع کرتا ہوں کہ لارڈ لیک کو آپ کے ان وکیلوں سے ان تمام معاملات پر گفتگو کرنے کا حق حاصل ہے جن کا تعلق دونوں سلطنتوں کے مفاد سے ہو سکتا ہے۔

اس عرصہ میں جنکنس (Jenkins) کا ایک خط[1] ملا جسمیں اس نے تحریر کیا تھا کہ سندھیا کو لارڈ کارنوالس کا خط مل چکا ہے لیکن اسے اب بھی میرے رہا کرنے میں تامل ہے اس کے بعد ہی لارڈ کارنوالس کے خط کے جواب میں سندھیا کا خط موصول ہوا۔ اس میں اس نے اخلاص و اتحاد کے اظہار کے بعد یہ تحریر کیا تھا کہ قدیم رواج کے مطابق رزیڈنٹ کو دربار سے روانہ ہونے کی اجازت اس وقت تک نہیں دی جا سکتی جب تک کہ اس کا جانشین یہاں نہ پہونچ جائے۔

لارڈ کارنوالس کو اب یہ خیال پیدا ہوا کہ رزیڈنسی کے لٹ جانے اور رزیڈنٹ (۳۴۸)
کے گرفتار ہونے سے برطانیہ کی جو توہین ہوئی ہے اس کا تو اقتضاء یہ ہے کہ جب تک رزیڈنٹ رہا نہ ہو سندھیا سے کسی قسم کی صلح نہ کی جائے لیکن رفتہ رفتہ امن و صلح کی فکر سے اس خیال میں کسیقدر تبدیلی ہوئی اور بالآخر وہ بالکل ہی تبدیل ہو گیا اور اس نے

[1] مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۸۰۵ء [2] ۱۶ ستمبر ۱۸۰۵ء۔

سندھیا کو دوسرا مراسلہ لکھا اگرچہ اس میں بھی رزیڈنٹ کی رہائی پر زور دیا گیا تھا تاہم اس کے ساتھ ہی اس میں یہ بھی تحریر تھا کہ "لارڈ لیک کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ علاقۂ گوہد اور گوالیار کی واپسی کی بابت آپ سے گفتگو کریں۔" سندھیا کے مراسلے کے ساتھ لارڈ لیک کو جو خط روانہ کیا گیا اس میں اس نے صاف طور پر لکھدیا تھا کہ "مجھے ان تمام نقصانات کا پورا احساس ہے جو رزیڈنٹ کی رہائی کے مطالبے کو چھوڑنے یا اسمیں کمی کرنے سے پیدا ہوں گے لیکن اگر مجھے اس بات کا احساس ہو جائے کہ سندھیا سے خاطر خواہ تصفیہ ہونے میں صرف یہی ایک رکاوٹ ہے تو میں اس میں بھی کمی کرنے کے لیے تیار ہوں کیونکہ میں اسے صرف قومی شان کی بات سمجھتا ہوں۔"

ان ہدایات کے پہنچنے سے قبل ہی لارڈ لیک رزیڈنٹ کو رہا کرا چکا تھا لہذا صلح کی اس قدر خواہش کا سندھیا پر جو اثر پڑتا اس کا اندازہ کرنے کا کوئی موقع نہ رہا گورنر جنرل کا پولیٹیکل ایجنٹ لارڈ لیک کے پڑاؤ پر موجود تھا۔ لارڈ کارنوالس نے اسے اس بات کا اختیار دیدیا کہ منشی کیول نائن (Kevel Nyne) کو دہلی سے بلا لیا جائے۔ یہ شخص ایک معزز ہندوستانی تھا اور دولت راؤ سندھیا کے خاص قدیم اور معتبر ملازموں میں سے تھا۔ اس زمانہ میں سندھیا کے خسر سرجی راؤ گھاٹگے کے تشدد سے پریشان ہو کر وہ فرار ہو گیا تھا جب یہ پہنچا تو اسے ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے کسی عزیز کی معرفت سندھیا کو سمجھائے کہ وہ برطانوی حکومت سے تعلقات برقرار رکھنے اور باہمی اختلافات کو طے کرنے کے لیے مناسب طریقہ اختیار کرے۔ حسب توقع سندھیا نے اس غیر متوقع طریقۂ مراسلت کو غنیمت سمجھا اور تصفیہ کے لیے اپنے شرائط منشی کیول کے پاس روانہ کر دیے تاکہ وہ انھیں برطانوی سپہ سالار کے سامنے پیش کر دے۔ (۳۲۹)

اس پیغام کا لارڈ لیک نے یہ جواب دیا کہ جب تک رزیڈنسی کے علاقے سے قبضہ نہ اٹھا یا جائے گا کسی قسم کی تجویز پر غور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی فوراً تعمیل کر دی گئی لارڈ کارنوالس کا آخری خط انگریزی کیمپ پر پہونچنے سے قبل ہی جنکنس برطانوی علاقے کی طرف روانہ ہو لیا تھا لہذا اسے سندھیا کو یہ خط نہیں بھیجا گیا۔

لہ کرنل میسلکم۔

سندھیا سے مصالحت کرنے کی تجویز اور شرائط

لارڈ کارنوالس جن شرائط پر سندھیا سے معاہدہ کرنا چاہتا تھا ان کے متعلق اس نے لارڈ لیک کو مکمل ہدایات روانہ کیں[1] اور تحریر کیا کہ "میری قطعی رائے یہ ہے کہ گوالیار اور گوہد کے علاقہ سندھیا کو واپس کر دئے جائیں اور انکا دیگر اختلافات کے تصفیے سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے لہٰذا اگر سندھیا رانا گوہد کے لیے کوئی معقول انتظام کر دے تو مجھے ان علاقوں پر سندھیا کا قبضہ بحال کرنے میں قطعی تامل نہیں ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی گورنر جنرل نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ اس تجویز سے میرا ہرگز یہ منشاء (۳۴۰)
نہیں ہے کہ ان علاقوں کو بلا معاوضے کے دیدیا جائے بلکہ میری خواہش یہ ہے کہ ان کے صلے میں کمپنی کو کم از کم ان وظائف وجاگیرات کے بار سے نجات مل جانی چاہئیے جو سندھیا سے معاہدہ کرنیکے بعد سے اس پر پڑ گیا ہے علاوہ ازیں سندھیا رانا گوہد کے مصارف کے لیے معقول انتظام کرے اور علاقۂ رزیڈنسی کے لٹ جانے سے جو ذاتی وسرکاری نقصان ہوا ہے اس کی بھی تلافی ہو جائے۔ گورنر جنرل نے اس تحریر میں یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ممکن ہے کہ دہلی کے مغربی وجنوبی مقبوضات میں سے بھی سندھیا کو کچھ علاقہ عطا کر دیا جائے لارڈ کارنوالس کی رائے تھی کہ اس معاملہ کو سیاسی مصلحت کے لحاظ سے طے کرنا چاہئے کیونکہ اگر واقعات اجازت دیں اور ہم راجہ جے پور سے اپنے تعلقات منقطع کر سکیں تو سندھیا کو اس سے خراج وصول کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اور اس طرح اس سمجھوتے سے اسے ایک اور فائدہ حاصل ہو جائے گا"۔

لارڈ کارنوالس ابتدا ہی سے اس بات پر تلا ہوا تھا کہ دریائے جمنا کمپنی کے مقبوضات کی سرحد قرار دی جائے لہٰذا اس نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ اگر دہلی کا جنوبی ومغربی علاقہ مرہٹوں کے علاوہ کسی اور طاقت کو دے دیا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا تاہم زیر بحث علاقہ سے تعلقات برقرار رکھنے کے بجائے اسے مرہٹوں کے حوالے کر دینا ہی بہتر ہے[2]

---

[1] ملاحظہ ہو مراسلہ لارڈ کارنوالس مورخہ ۱۹ ستمبر

[2] چونکہ لارڈ کارنوالس کا منشاء یہ تھا کہ ضعیف شہنشاہ کو اس کے پایہ تخت سے ہٹا دیا جائے، لہٰذا اس نے اس موقع پر شہر دہلی سے بھی دست بردار ہونے کا (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

(۲۴۱) لارڈ کارنوالس سندھیا سے حسب ذیل شرائط پر معاہدہ کرنا چاہتا تھا:-

اوّل۔ علاقہ گوہد و گوالیار سندھیا کو واپس دیا جائے۔

دوم صلح کی شرائط کے بموجب دھولپور باری اور راجہ کھیرا کے علاقے بھی اسکے حوالے کئے جائیں[1] اور صلح کے بعد سے جو روپیہ ان علاقوں سے وصول کیا گیا ہے اس کا حساب بھی اسے دیا جائے۔

سوم جے نگر کے علاقے سے جو تقریباً تین لاکھ سالانہ خراج وصول ہوتا ہے وہ بھی اسے دے دیا جائے۔

(۲۴۲) **چہارم** صلحنامے کی رو سے کمپنی نے جو وظائف مقرر کئے ہیں اور دو آب میں جاگیریں عطا کی ہیں انھیں سندھیا کی مرضی سے منسوخ کرایا جائے۔

پنجم۔ ان وظائف کے سلسلہ میں کمپنی کے ذمے جو رقم واجب ہے وہ سندھیا سے معاف کرائی جائے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) خیال کر لیا تھا۔ اسے ایک یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی کہ دریائے جمنا بذات خود ایک زبردست حدِ فاصل کا کام دے سکتی ہے لارڈ لیک نے اپنی ایک تحریر کے ذریعہ سے اس غلط فہمی کو رفع کر دیا اس موضوع پر اس نے کافی معلومات بہم پہونچائے اور آخر میں یہ بات ثابت کی کہ دریائے جمنا صرف بارش کے موسم میں حدِ فاصل کا کام دے سکتی ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں گرد و نواح کے علاقے کی عام حالت کی وجہ سے فوجی کارروائی عملاً ناممکن ہو جاتی ہے لیکن با ایں ہمہ پچیم اکتوبر سے قبل ہی اسے آگرہ کے قریب سے عبور کیا جا سکتا ہے اور جب آگے بڑھ کر وہ دریائے چمبل میں مل جاتی ہے تو وہ بارش کے چند ہفتوں کے علاوہ کسی وقت بھی حدِ فاصل نہیں بن سکتی۔

[1] لارڈ کارنوالس لکھتا ہے کہ میں اس امر سے بخوبی واقف ہوں کہ ان علاقوں کی واپسی کوئی خاص رعایت نہیں ہے۔ صلح نامے کی جس دفعہ کی رو سے سندھیا ان علاقوں میں اپنی فوج نہیں رکھ سکتا میں اسے بھی خارج کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔"

ششم۔ علاقۂ رزیڈنسی کے لٹ جانے سے کمپنی اور اس کے ملازموں کا جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی کرائی جائے۔

ہفتم۔ سندھیا سے رانا گوہڈ کے مصارف کے لیے دو ڈھائی یا تین لاکھ روپیہ سالانہ مقرر کرایا جائے۔

لارڈ کارنوالس ان شرائط پر صلح کی بات چیت شروع کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے اپنا یہ خیال بھی ظاہر کر دیا کہ "صلح و امن میں تاخیر کرنے کے بجائے میں ان مطالبات میں بھی کمی کرنے کے لئے آمادہ ہوں مزید براں اگر دونوں سلطنتوں کے باہمی اختلافات کو طے کرنے کی غرض سے سندھیا کو کچھ اور علاقہ دینا پڑے تو میں اپنے مقصد کی خاطر اس پر بھی راضی ہوں"۔

اسی مراسلے میں وہ یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ "اگرچہ میں سندھیا سے دوبارہ دوامی معاہدہ نہیں کرنا چاہتا تاہم جب تک کہ ہلکر سے خاطر خواہ صلح نہ ہو جائے سندھیا کو بہ حیثیت حلیف کے اپنے ساتھ رکھنا ضروری سمجھتا ہوں"۔ جن اسباب کی بنا پر وہ رانا گوہڈ سے کمپنی کا رشتۂ اتحاد منقطع کرنا چاہتا تھا۔ انھیں بھی وہ اس مراسلہ میں واضح کرتا ہے اس کے نزدیک رانا میں نہ تو حکومت کرنے کی صلاحیت تھی اور نہ اس نے کمپنی کے معاہدہ کی تعمیل کی تھی لیکن از روئے انصاف اس نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اس نا اہل رانا کی پرورش کے لیے کچھ معقول (۳۴۳)
انتظام کر دیا جائے۔

دہلی کے مغرب و جنوب میں کمپنی نے جو علاقہ فتح کیا تھا اس کے انتظام کی بابت بھی اس نے اپنی تجاویز سے لارڈ لیک کو آگاہ کیا۔ اس کی رائے تھی کہ اس علاقہ کا ایک حصہ تو ان مختلف سرداروں[1] میں تقسیم کر دیا جائے جن کی حفاظت کمپنی اپنے ذمے لے چکی ہے بشرطیکہ وہ اس بات کو منظور کریں کہ آئندہ وہ کمپنی کی حفاظت طلب نہیں کریں گے۔ باقی حصہ راجہ مچھیری اور بھرت پور کو دیدیا جائے

---

[1] ان سے وہ ہندوستانی سپہ دار اور سوار مراد ہیں جو کمپنی کے غنیموں کے ساتھ غداری کرنے یا اپنی دیگر خدمات کی بدولت اس صلہ کے مستحق ہو گئے تھے۔

بشرطیکہ وہ برطانوی حکومت سے اپنے تمام سابق معاہدے منسوخ کردیں۔

گورنر جنرل کا خیال تھا کہ جب اس طرح ان رئیسوں کی ریاستوں میں اضافہ ہوجائے گا تو ان کے مقبوضات خودبخود سندھیا اور کمپنی کی سلطنتوں کے درمیان حدِ فاصل بن جائیں گے اور سندھیا کی کمزوری کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بات بھی بعید نہیں معلوم ہوتی کہ اگر ان رئیسوں کو خود مختار جاگیرداروں کی اعانت حاصل ہو گئی تو وہ سندھیا کا مقابلہ کرلیں گے۔ لارڈ کارنوالس نے آخر میں یہ بھی لکھا کہ بہرحال ان علاقوں پر نہ کمپنی کا قبضہ برقرار رکھا جائے اور نہ ان سے اس کو کچھ سروکار ہے۔ ایسی حالت میں اگر یہ علاقے دولت راؤ سندھیا کی ماتحتی میں چلے جائیں تو بھی میں اس انتظام کو ازروئے مصلحت قابل اطمینان تصور کروں گا لیکن اگر یہ علاقے راجہ مچھیری اور بھرت پور کو دیدئے جائیں تو زیادہ مناسب ہے کیونکہ سندھیا ہمیشہ انھیں ان سے چھین لینے کی کوشش کرے گا اور اس طور سے ان میں ایک لاانتہا تنازع کی بنا پڑ جائے گی اور سندھیا کے لئے ایک معقول مشغلہ نکل آئے گا اور اس کی مصروفیت کے لئے مستقل انتظام ہو جائے گا۔ میں اس بات کا تو کبھی خیال ہی نہیں کر سکتا کہ سندھیا دوآبہ میں برطانوی مقبوضات پر حملہ کرے گا اور خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ وہ مچھیری اور بھرت پور کے سرداروں کو ہمیشہ کے لئے اپنا دشمن بنالے گا اس قسم کے حملے کا امکان اور بھی کم ہو جاتا ہے اور یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جب ان سرداروں کو انکے مقبوضات کے ایک خاص علاقے سے محروم کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس کا لازمی طور پر یہی نتیجہ ہوگا۔ (۳۴۴)

لارڈ کارنوالس کے مسلک پر لارڈ لیک کا تبصرہ

ان ہدایات کے جواب میں لارڈ لیک نے گورنر جنرل کو لکھا کہ میں نے اپنے ایک مراسلے میں اس موضوع پر بحث کی ہے کہ مرہٹوں کو شمالی ہند سے پورے طور پر خارج کردینے سے کمپنی کو کس قسم کے فوائد حاصل ہوں گے۔ آپ اسے ملاحظ فرمائیں۔ مجھے اپنے ذاتی تجربہ اور مقامی حالات کی واقفیت کی بنا پر اس بات کا یقین ہے کہ اگر ہم اپنی موجودہ مستحکم سرحد برقرار رکھیں گے تو مرہٹے ہمارے اس علاقے پر حملہ کرنے کا

کبھی خیال بھی نہیں کریں گے۔ برخلاف اس کے اگر انھیں اس علاقہ میں برقرار رکھا گیا یا انھیں جمنا کے مغربی علاقے کے جاگیرداروں یا چھوٹے سرداروں پر فوج کشی کرنے کا موقع دیا گیا تو ان سے کبھی بھی نجات حاصل نہ ہوسکے گی۔

(۳۴۵) لارڈ لیک نے اپنی اس رائے کے ثبوت میں متعدد دلایل پیش کیے کہ اگر ان جاگیرداروں کو برطانوی حفاظت سے محروم کردیا گیا تو سندھیا ان پر غالب آجائے گا یا کوئی اور سردار انھیں مغلوب کرلے گا اور انھیں تباہ کرکے اپنے لیے ایک معقول قوت حاصل کرلے گا جو جغرافی نقطۂ نظر اور مقامی حالات کے لحاظ سے برطانوی حکومت کے لیے سخت مضر ہوگی۔

لارڈ لیک کا بیان ہے کہ سندھیا[1] اور ہلکر کی فوجوں میں مرہٹوں کی تعداد نہایت قلیل ہے ان میں زیادہ تر راجپوت اور مسلمان شامل ہیں جو زیادہ تر اپنے وطن واپس ہوگئے ہیں یا برطانوی فوجوں میں بھرتی ہوگئے ہیں لہذا مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اگر ان کے ساتھ ذرا بھی نرمی کا برتاؤ کیا گیا اور ترکیب سے کام نکالا گیا تو وہ بہت جلد اپنی عادتوں کو ترک کرکے مفید رعایا بن جائیں گے لیکن اگر جمنا کے مغربی علاقے کو ہمیشہ کے لیے میدان کارزار بنا دیا گیا اور اسے کسی

[1] مرہٹہ سرداروں کی فوجوں کا اس طرح بےمیل ہونا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ ان میں کبھی اتحاد نہیں ہوسکتا ان کی قوت کے متعلق ابتدا سے ایک بڑی غلط فہمی رہی ہے ان کی تباہی اور نااتفاقی کی دراصل یہ ایک خاص بنا رہی ہے۔ مرہٹے ہندوستان کے ایک خاص علاقے کے باشندے ہیں جنھوں نے سلطنت مغلیہ کی کمزوری سے فایدہ اٹھا کر اپنا سکہ جما لیا تھا اور کل ملک میں چھا گئے تھے لیکن دیگر نیم وحشی وغیر مہذب قوموں کی طرح جن کی فتوحات میں بجز فوجی قوت کے اور کوئی جزو شامل نہیں ہوتا۔ یہ بھی وسعت سلطنت کے بعد بہت جلد کمزور پڑ گئے جن مرہٹہ سرداروں نے دور دراز مقامات پر فوج کشی کی تھی آج ان کی اولاد اپنے آبا واجداد کی مفتوحہ ولایتوں میں غیر قوموں کے جتھوں کو اپنے ساتھ لیے ہوئے لوٹ مار کرتی پھرتی ہے اور دوسروں کے علاقوں پر جو مظالم انھوں نے کیے تھے ان کے بدلے چند سال ہی کے عرصہ میں ان راجپوتوں اور مسلمان سپاہیوں نے ان کے علاقوں سے خوب گن گن کر لے لیے ہیں اور طرفہ تماشہ تو یہ ہے کہ مرہٹہ سردار ہی وہ جتھوں کے سردار بنے ہوئے ہیں۔

(۳۴۶) ایسے ہندوستانی رئیس کے حوالہ کر دیا گیا جس کا رجحان فتوح اور لوٹ مار کی طرف ہو تو اس قسم کی ترکیبیں ہرگز نہیں چل سکیں گی ان دونوں حالتوں میں اس جماعت کے عادات مستقل ہو جائیں گے۔ قزاقوں کے جتھے قایم ہو جائیں گے اور وہ ہمیشہ ایسے سرداروں کے پیرو بنے رہیں گے جو انھیں ان ویران علاقوں سے نکال کر جنھیں انھیں کے تشدد نے اجاڑ دیا ہے کمپنی کے متمول اور زرخیز ہمسایہ ولایتوں میں ساتھ لے جانے پر آمادہ ہوں۔"

اسی سلسلے میں لارڈ لیک نے یہ بھی لکھا کہ "سیاسی نقطۂ نظر سے تو اس مسئلہ میں میری یہ رائے ہے۔ اب اس کے عملی پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ سابق معاہدوں کی خلاف ورزی کیے بغیر اور انگریزوں کی عزت و شہرت کو نقصان پہونچائے بغیر اس پر عمل کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔" جن دلایل کی بناء پر لارڈ لیک نے اپنی رائے قایم کی تھی انھیں وضاحت سے بیان کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ لارڈ کارنوالس کے دماغ میں جو تجاویز ہیں وہ محض اس وجہ سے ناقابل عمل نہیں ہیں کہ ان سرداروں کو جنھیں حکومت مصلحت کی بناء پر اپنی حفاظت سے محروم کر رہی ہے۔ معقول معاوضہ دینا پڑے گا اور اس کا کمپنی کی آمدنی پر بار پڑے گا بلکہ اس کے لیے دیگر وجوہ بھی موجود ہیں۔

(۳۴۷) اسی مراسلے میں وہ یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ مجھے اس بات کا کامل یقین ہے کہ کوئی ترغیب ان سرداروں کو اس امر پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ وہ برطانوی حکومت کی پناہ کے فواید کو خود اپنے ہاتھ سے کھو دیں اس قسم کی تحریک ہی سے انھیں سخت پریشانی ہوگی بلکہ مجھے تو اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ وہ یہ خیال کریں گے کہ مرہٹوں سے صلح کرنے کی غرض سے انھیں بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ ان کے اس خیال سے برطانوی حکومت کی عزت و شہرت کو جو نقصان پہونچے گا وہ کسی قسم کے اعلان یا بیان سے مٹائے نہ مٹ سکے گا۔"

جن سرداروں کو برطانوی حکومت پر کچھ حق حاصل ہے اور جنھیں آپ جمنا کا مغربی علاقہ دینا چاہتے ہیں وہ کسی راجہ کی زمین کا ایک چپہ بھی اس وقت تک لینے کے لیے آمادہ نہ ہوں گے جب تک کہ انھیں اس بات کا یقین نہ دلایا

جائے گا کہ خود برطانوی حکومت اس جدید انتظام کی محافظ ہوگی اور صاف ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری زیر غور انتظام سے ہزار گنا زیادہ دشوار ثابت ہوگی۔ اگر برطانوی حکومت ان سرداروں کی حفاظت سے دست بردار ہو جائے گی تو یہ بیچارے جدید علاقوں کی قدیم مقامی حکومتوں کے مقابلے میں تین دن بھی نہ ٹھیر سکیں گے"۔

اس سلسلے میں سندھیا سے جو مراسلت ہوئی تھی اس کے متعلق لارڈ لیک نے گورنر جنرل کو اطلاع دی اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ رانا گوہد کی ذاتی کمزوری اور نااہلی کی وجہ سے وہ تمام توقعات جو اس سے معاہدہ کرتے وقت قائم ہوئے تھے منقطع ہو گئے۔ اس نے مارکوئس کارنوالس کی اس رائے سے پورا اتفاق کیا کہ اگرچہ (۳۴۸) رانا سے تعلقات منقطع کرنے کے لئے معقول وجوہ موجود ہیں تاہم یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے اس بات پر راضی کر لیا جائے کہ جن اختیارات سے وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا ان سے دست بردار ہو کر وہ اس حیثیت کو قبول کرے جو اس کی کمزور طبیعت اور نااہلی کے لئے موزوں ہے۔

راجہ جے پور سے کمپنی کے جو تعلقات قائم تھے ان کی بابت اس زمانے میں ایک خاص بحث چھڑ گئی تھی۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تعلقات کی ابتدا اور ان کی نوعیت یہاں بیان کر دی جائے۔

راجہ جے پور سے کمپنی کے تعلقات

راجہ جے پور ان سرداروں میں سے ایک ممتاز فرمانروا ہے جو شمالی ہند اور مالوے کے درمیانی علاقے پر قابض تھے۔ سندھیا سے جنگ چھڑنے کے بعد ہی اس نے انگریزی حکومت سے اتحاد قائم کر لیا تھا۔ اس اتحاد کے شرائط پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ راجہ مذکور نے اکثر موقعوں پر اس معاہدے کے منشا اور شرائط دونوں کی صریح خلاف ورزی کی تھی۔ جب کمپنی سندھیا اور ہولکر دونوں کے خلاف جنگ آزما تھی اور ان دونوں کی فوجیں جے پور کی سرحد پر پڑی ہوئی تھیں تو بمبئی کی ایک فوج ٹونک رامپورہ کو روانہ ہوئی۔ یہ مقام راجہ کے دار الحکومت کے سواد میں واقع تھا اور راجہ کے علاقے ہی سے بمبئی والی فوج کی ضروریات کا انتظام کیا گیا تھا۔ راجہ کا ایک سفیر اس وقت لارڈ لیک کے مستقر پر موجود تھا۔ ان حالات میں لارڈ لیک نے از روئے مصلحت یہ مناسب سمجھا کہ اس سفیر کی معرفت اس کے آقا کو

آگاہ کیا جائے کہ جو طرزِ عمل اُس نے اختیار کر رکھا ہے آخر اس کا کیا حشر ہونے والا ہے علاوہ ازیں اُس نے راجہ کے سفیر کو ہدایت کی کہ وہ اپنے آقا کو مطلع کر دے کہ اس وقت آپ کو ایک موقع حاصل ہے کہ آپ اپنے کو برطانوی حکومت کی دوستی اور اعانت (۳۴۹)
کا اہل ثابت کریں۔ مجھے یقین ہے کہ اس موقع کو آپ ضائع نہیں کریں گے۔

لارڈ لیک جب اس طرح راجہ کے سفیر کو آگاہ کر چکا تو لارڈ کارنوالس کا مراسلہ اسے موصول ہوا جس میں اُس نے تحریر کیا تھا کہ راجہ جے پور نے اس کے نزدیک کمپنی کے معاہدے کی تعمیل کرنے کے بجائے دشمنوں کا ساتھ دیا ہے لہذا وہ اُن تعلقات کو منقطع تصور کرتا ہے اور چونکہ اس اتحاد سے بجز دشواریوں اور پریشانیوں کے کچھ حاصل نہیں ہے اس لیے حکومت نے طے کر دیا ہے کہ اگر سندھیا یا ہولکر جے پور پر حملہ کرے تو اُس کی مدافعت کی کچھ فکر نہ کی جائے۔

لارڈ لیک کو اس بات کی بھی ہدایت تھی کہ بمبئی والی فوج کے سپہ سالار میجر جنرل جونس کو جو اس وقت جے پور کی سرحد پر مقیم تھا اس فیصلے کی اطلاع کر دے کہ اگر مرہٹے جے پور پر حملہ کریں تو وہ راجہ کو کسی قسم کی مدد نہ دے کیونکہ گورنر جنرل نے اس سے تعلقات منقطع کرنے کی بابت فیصلہ کر دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ہدایت بھی تھی کہ سردست راجہ جے پور کو اس کی اطلاع نہ کی جائے۔ موجودہ تعلقات کے خاتمے کی اطلاع کرنا خلافِ مصلحت ہوگا۔ ممکن ہے کہ موجودہ حالات میں اس اعلان سے برطانوی حکومت کے مفاد کو نقصان پہنچ جائے لہذا گورنر جنرل باجلاس کونسل نے اس بارے میں جو فیصلہ کیا ہے اُس کی اطلاع جے پور کے رزیڈنٹ کو کر دی جائے (۳۵۰)
لیکن اسے بھی یہ ہدایت کر دینی چاہیے کہ وہ راجہ سے اس کا کچھ ذکر نہ کرے اور اگر سندھیا یا ہولکر یا کوئی دوسرا سردار اس کے علاقے پر حملہ کرے تو برطانوی فوجوں کی امداد کا بھی اس سے کوئی وعدہ نہ کرے۔

لارڈ لیک اپنی کارروائی علیحدہ کر رہا تھا۔ ان احکام کے ملنے پر اُسے سخت کوفت ہوئی۔ اُس نے فوراً گورنر جنرل کو لکھا کہ "میں واقعات سے مجبور ہو کر راجہ کو کمپنی کی اعانت اور دوستی کا یقین دلا چکا ہوں لیکن اس کے ساتھ میں نے یہ شرط لگا دی ہے کہ وہ آئندہ اپنے طرزِ عمل سے خود کو برطانوی اعانت کا اہل

ثابت کرے گا"
اس مراسلے کے روانہ کرنے کے بعد لارڈ لیک کو جے پور کے رزیڈنٹ کے پاس
سے اطلاع ملی کہ ہولکر جے پور کی سمت سے کمپنی کی سرحد کی طرف بڑھ رہا ہے اور راجہ
کا ارادہ اُسے روکنے کا معلوم نہیں ہوتا۔ وہ رانا اودے کی لڑکی سے شادی کرنا
چاہتا ہے اور اسی کوشش میں لگا ہوا ہے اور اپنے اس ادنیٰ مقصد کے حصول
ہی میں اس نے اپنی ساری فوج مصروف کر رکھی ہے۔ اس اطلاع کے ملنے کے
بعد لارڈ لیک نے راجہ کو ایک خط لکھا اور جن جن موقعوں پر اُسنے معاہدے کی خلاف
ورزی کی تھی اُنہیں گنا کر اُسے آگاہ کیا کہ" اُن بے کار و بے سود اور تکلیف دہ
تعلقات کے خاتمے کی بابت عنقریب گورنر جنرل کے احکام جاری ہو جائیں گے لیکن
ساتھ ہی ساتھ اُس نے یہ بھی تحریر کیا کہ غالباً جنرل جونس کی فوج بہت جلد ہولکر کے (۳۵۱)
خلاف کارروائی شروع کرے گی لہٰذا آپ کو اب بھی اس بات کا موقع حاصل
ہے کہ آپ نہایت فراخ دلی سے اُس کی مدد کریں اور فوج کی رسد کا معقول انتظام
کریں تاکہ آپ کا دوبارہ اعتماد قائم ہو جائے"۔
لارڈ لیک نے راجہ کے ساتھ جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا نہ صرف اُسی کے لحاظ سے
یہ کارروائی مناسب تھی بلکہ غنیم اور کمپنی دونوں کی فوجی حالت اور ان کے پڑاؤ کے
لحاظ سے پہلے حملے میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے بھی وہ ضروری تھی۔ یہ ترکیب
کامیاب بھی رہی۔ جے پور کے رزیڈنٹ نے بعد میں مطلع کیا کہ" آپ کا خط ملنے
کے بعد راجہ نے اودے پور پر فوج کشی کرنے کا خیال (جو اُس کے نزدیک نہایت اہم
تھا) ترک کر دیا اور جنرل جونس کی امداد کے لئے فوج کا ایک دستہ مہیا کیا اور ہولکر
سے لڑائی ختم ہونے تک نہایت شوق و ذوق سے جنرل مذکور کا ساتھ دیا"۔
لارڈ لیک کا مراسلہ موصول ہونے کے بعد لارڈ کارنوالس نے جے پور
سے تعلقات منقطع کرنے کا فیصلہ سردست ملتوی کر دیا اور لارڈ لیک نے اِن
واقعات کے بعد یہ رائے قائم کی کہ راجہ کے سامنے جو شرائط پیش کیے گئے تھے اُن کی تکمیل
اور تعمیل کرنے کے بعد اُس نے اپنا حق قائم کر لیا ہے کہ اب اُسے برطانوی حکومت
کا ایک مخلص و وفادار حلیف سمجھا جائے۔

(۳۵۲) **دربار حیدرآباد۔ پونہ و برار کے نام لارڈ کارنوالس کے خطوط**

لارڈ کارنوالس نے اپنے اس دور میں حیدرآباد۔ پونہ اور برار کے درباروں سے کوئی مراسلت نہیں کی۔ اس نے فورٹ ولیم پہونچنے کے بعد ان سب کو اپنے سابق دور کے اصول یاد دلائے اور انھیں اس بات کا یقین دلایا کہ "اب بھی میں ہر مسئلے میں نہایت اعتدال سے کام لونگا اور میری خواہش ہے کہ حال کے واقعات سے آپ نے جو کچھ خیالات قائم کئے ہوں اُنھیں آپ دل سے نکال ڈالیں"۔ ان خطوط کا مدعا یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک یہ سمجھ جائے کہ لارڈ ویلزلی کے اصول مسترد ہو چکے ہیں اور اب نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ برار کے دربار میں برطانوی رزیڈنٹ سے اس مسئلے کے متعلق ایک موقع پر سخت بحث بھی ہوئی۔ راجہ برار لارڈ کارنوالس کے خط سے یہ سمجھا تھا کہ اس کی روانگی کے وقت ۱۷۹۳ء میں ہندوستان کی جو حالت تھی وہی اب پھر قائم کی جائے گی لہذا برار۔ کٹک و دیگر مقامات جو اس وقت راجہ کے مقبوضات میں شامل تھے اسے واپس مل جائیں گے۔

ہولکر سے مصالحت کا خیال

(۳۵۳) لارڈ لیک کو ہدایت کیگئی کہ وہ جسونت راؤ ہولکر سے مصالحت کے لئے گفتگو شروع کرے اور اگر وہ اپنے متعلق آئندہ کے لئے برطانوی حکومت کو اطمینان دلائے تو ہولکر خاندان کے قدیم مقبوضات اس کے حوالے کر دیئے جائیں۔ لارڈ کارنوالس کی زندگی میں ان تجاویز کو ہولکر کے سامنے پیش کرنے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ اس زمانے میں وہ اپنی قلیل شکست خوردہ اور پست ہمت فوج کے ساتھ دہلی کے ویران شمال مغربی علاقے[1] سے گزر کر پنجاب میں داخل ہو رہا تھا کہ لارڈ کارنوالس کا انتقال ہو گیا۔

گورنر جنرل نے جو مراسلے مجلس نظمار کو روانہ کئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے کمپنی کی مالی حالت سنبھالنے کا ابتدا ہی سے خیال تھا جو متواتر لڑائیوں سے

[1] اس وسیع اور زرخیز خطے میں سکھ آباد ہیں۔ یہ ایک عجیب قوم ہے۔ اس کے پورے حالات ایشیائی تحقیقات (Ascali Rezearched) کی گیارھویں جلد میں تفصیل سے درج ہیں۔

خراب ہوگئی تھی لیکن جب تک کہ جنگ قطعی طور پر ختم نہو جائے فوجی مصارف میں کسی قسم کی کمی نہیں کیجا سکتی تھی کیونکہ جنگ کی خاطر خواہ کامیابی اور خاتمہ کا انحصار فوج کی قوت اور اسکے ساز و سامان کی معقول تیاری پر ہی تھا۔

لارڈ کارنوالس کا انتقال ۵۔ اکتوبر ۱۸۰۵ء

(۳۵۴) لارڈ کارنوالس کی صحت انگلستان سے روانہ ہونے کے وقت ہی اچھی نہ تھی۔ فورٹ ولیم پہونچنے کے بعد جب وہ شمالی ہند کی فوج سے ملنے کے لیے روانہ ہوا[۲۵] تو اسکی صحت روز بروز بدتر ہوتی گئی اور ۵ اکتوبر ۱۸۰۵ء کو بنارس کے قریب غازی پور میں اس نے انتقال کیا۔

۵۔۱ لارڈ لیک کی بے قاعدہ سوار فوج کے غیر معمولی مصارف کی بابت بہت کچھ چہ میگوئیاں ہوتی تھیں لہذا فوجی مصارف کی اس مد پر لارڈ کارنوالس کی بھی نگاہ پڑی اور اس نے اس کی طرف فوری توجہ کی لیکن ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس فوج کے مصارف میں کثیر اضافہ اس وقت ہوا جب کہ ہولکر نے شمالی ہند سے مراجعت کی اور اس کے تمام سپاہی جو اس علاقے کے باشندے تھے اُس کا ساتھ چھوڑ کر برطانوی فوج سے آملے تاہم اُس عارضی فوج کے مصارف کبھی پانچ لاکھ تراسی ہزار چھ سو انہتّر روپیہ چار آنے نو پائی ماہانہ سے زائد نہیں ہوئے اور یہ خرچ بھی صرف تین مہینے رہا تھا۔ لارڈ کارنوالس کی آمد کے وقت تخفیف کا مسئلہ درپیش تھا۔ ستمبر ۱۸۰۶ء میں اس کے مصارف تین لاکھ نو ہزار چار سو پچپن روپیہ نو آنے رہ گئے۔ دسمبر میں دو لاکھ انیس ہزار چھ سو چھہتّر روپے دس آنے اور فروری ۱۸۰۷ء میں ایک لاکھ سے کم ہو گئے۔

۵۔۲ اس کی زندگی کے آخری مہینے میں اس کی صحت کی جو حالت تھی اس کا لحاظ کرنے کے بعد یہ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قدر اہم اور سخت کام کس طرح انجام دیتا تھا۔ باوجود کمزوری کے وہ ہر روز صبح لگاتار کام کرتا رہتا تھا حتیٰ کہ غشی کی نوبت آجاتی تھی۔ شام میں کسیقدر طبیعت سنبھل جاتی تھی اور کپڑے پہنکر وہ موصولہ مراسلے سننے کے لئے بیٹھ جاتا تھا اور جو خطوط لکھوانے ہوتے تھے ان کے متعلق ہدایات دیتا تھا۔ جو لوگ اس کی پیشی میں رہتے تھے ان کا بیان ہے کہ اس حالت میں بھی اس کی دماغی قوت قائم تھی۔

(۲۵۵) **اس کی خوبیوں کا اعتراف** اس مہتاہری کی زندگی کا یوں خاتمہ ہوا۔ جب تک کہ دنیا میں انسان کے پاک جوہر۔ اوصاف حمیدہ اور حب وطن کی قدر باقی ہے اس وقت تک اس شخص کا نام زندہ رہے گا۔ طبیعت کی قابل وقعت سادگی کے ساتھ ہی اُس میں حد درجے کی معاملہ فہمی اور انتہائی قوت فیصلہ تھی۔ ان دونوں خوبیوں نے ملکر اُسے سیول اور فوجی دونوں کاموں کے لئے نہایت موزوں بنا دیا تھا۔ اس کی حکومت کا پہلا دور برطانوی حکومت ہند میں ہمیشہ مدح وستائش کا مستحق رہے گا۔ اس کا دوسرا دور جس میں اس کا مسلک کچھ اور ہی نظر آتا ہے اس قدر مختصر رہا کہ اس کی بابت قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ اگر وہ زندہ رہتا تو کس قسم کے نتائج ظہور پذیر ہوتے تاہم اس بات کا تو یقین ہے کہ جو مراعات وہ کرنا چاہتا تھا ان کی خرابیوں کو وہ اپنے ذاتی اثر و اقتدار سے ضرور رفع کر دیتا۔ ہر ہندوستانی سلطنت اُس کے خصائل و خصوصیات سے واقف تھی اور ان سب کو اس بات کا اندازہ تھا کہ اُس نے اپنے سابق دور میں برطانوی حکومت کے مفاد اور وقار کو کس خوبی اور مستعدی سے برقرار رکھا تھا۔ بہر حال اُس کی زندگی کے آخر کاموں کی بابت لوگ کتنا ہی شبہ کیوں نہ کریں اور اپنے سابق دور کے اعلیٰ اور مستحکم اصول سے اس قدر زبردست انحراف کرنے کے وجوہ کی بابت ان کے جو کچھ بھی خیالات ہوں کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس ملک میں دوبارہ آنے سے اُس کے انتہائی اخلاص کا ثبوت ملتا ہے۔ جیسی عمر تھی ویسی ہی عزت تھی۔ اُس کی تمنا تھی کہ جس طرح زندگی شروع کی تھی اُسی طرح وہ ختم بھی ہو اور ایسا ہی ہوا۔ ملک کی خدمت میں تمام عمر بسر ہوئی تھی اور اسی حالت میں اُس کا خاتمہ ہوا۔

(۲۵۶) **سر جارج بارلو کا دور اور لارڈ کارنواس کی اصول پر عمل**

لارڈ کارنواس کے انتقال کے بعد سر جارج[۱] بارلو منصرمانہ طور سے برطانوی حکومت ہند کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔

اس نے اپنے پیشرو کے اصول کے مطابق

---

[۱] سر جارج بارلو کمپنی کا ایک سیول عہدے دار تھا۔ گورنر جنرل کے ممتاز

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۹)

لارڈ لیک کو سندھیا سے مصالحت کرنے کے متعلق ہدایات دینے سے سپہ سالار
افواج کو جو پہلا مراسلہ لکھا اُسی سے اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ وہ لارڈ کارنوالس
کے قدم بہ قدم ہی چلنا چاہتا ہے اور اُس کی طرح اُسے بھی اس امر کا یقین ہے
کہ کمپنی کے حقیقی مفاد کی خاطر دریائے جمنا اس کے مقبوضات کی سرحد قرار دی جائے
جن میں صرف دائیں ساحل پر آٹھ دس میل عرض کا علاقہ شامل ہو۔ مغربی ساحل
کی تمام ادنیٰ ریاستوں سے بہ عجلت ممکنہ تعلقات منقطع کئے جائیں اور ان رئیسوں
کے باہمی تنازعات ہی پر کمپنی کی آئندہ حفاظت کا انحصار سمجھا جائے۔ اسی اصول
کی بناء پر وہ سندھیا کے دفاعی معاہدے سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اور اسی (۳۵۷)
خیال سے اس کی خواہش تھی کہ ہولکر کی طاقت کا ہرگز خاتمہ نہ کیا جائے بلکہ اس سے
بھی صلح ہو جائے۔

سندھیا سے صلح اور اس کی شرائط ۱۸۰۵ء

۲۳ نومبر ۱۸۰۵ء کو گورنر جنرل کے پولیٹکل ایجنٹ[1] (جو لارڈ لیک کی نگرانی میں کام کر رہا تھا) اور منشی کیول کے مابین جسے سندھیا نے اپنا وکیل مقرر کیا تھا اور اپنے پورے اختیارات دے دیئے تھے مندرجۂ ذیل شرائط پر صلح طے ہوگئی۔

بجز اُن امور کے جن میں اس معاہدے کی رو سے ترمیم کی جائے باقی تمام شرائط جو سرجی آنجنگاؤں کی صلح میں طے پائی تھیں بدستور قائم رہیں گی۔

عہدے پر پہونچنے سے قبل اس نے ماتحت افسر کی حیثیت سے جو مختلف خدمات انجام دی تھیں ان میں ہمیشہ اپنی قابلیت اور دیانت کا ثبوت دیا تھا جس کی وجہ سے حکام بالا کی ہمیشہ اس پر توجہ و عنایت رہی۔ لارڈ کارنوالس کی ماتحتی میں اس نے بنگال کی سیول حکومت کے قواعد و ضوابط کی تیاری میں خاص طور پر کام انجام دیا۔ لارڈ ٹین ماؤتھ اور لارڈ ویلزلی کے زمانے میں معتمد خاص کے عہدے پر مامور رہا اور بعد ازاں لارڈ ویلزلی کے دور کے آخر چار سال میں مجلس اعلیٰ کا رکن رہا۔

[1] لفٹنٹ کرنل میلکام۔

اگرچہ مذکورۂ بالا معاہدے کے بموجب کمپنی گوالیار اور گوہڈ پر سندھیا کا حق تسلیم نہیں کرتی ہے تاہم محض دوستی کی خاطر وہ گوالیار نیز گوہڈ کے چند علاقے جو منسلکہ نقشے میں درج ہیں اُسے دینے پر راضی ہے۔

سندھیا کے دربار کے خاص خاص عہدے داروں کے لیے پندرہ لاکھ سالانہ کے جو وظائف سابق صلح نامے کی رو سے طے پائے تھے اُن سے سندھیا نے دست برداری دی۔

۳۱ر دسمبر ۱۸۰۵ء تک ان وظائف کی جو رقم باقی تھی اس کی ادائی کا کمپنی نے وعدہ کیا اور اس بات پر بھی رضامندی ظاہر کی کہ تاریخ مذکور تک دھولپور باڑی اور راجہ کھیرا کے علاقے کی آمدنی میں سے جو رقم باقی ہوگی وہ بھی ادا کردی جائے گی۔ البتہ مندرجۂ ذیل مدات کی بابت اس میں سے رقم منہا ہوگی۔

اول۔ باپو سندھیا اور سودشیں راؤ کے وظائف کی رقم جیسے برطانوی حکومت کی علانیہ مخاصمت کی بنا پر تاریخ مخالفت سے بند تصور کی جائے۔ (۳۵۸)

دوم۔ برطانوی رزیڈنسی کے علاقے کی لوٹ مار۔

سوم۔ مسٹر جنکنس نے جو نقد رقم مہاراجہ کے سواروں کو ادا کی۔

چہارم۔ دھولپور۔ باری اور راجہ کھیرا کے علاقوں کی مالگزاری وصول کرنے کے مصارف

دریائے چمبل[1] مشرق میں علاقہ گوہڈ تک اور مغرب میں شہر کوٹا تک دونوں سلطنتوں کی سرحد ہوگی۔ اس دریا کے شمالی علاقے پر سندھیا کو کوئی دعوےٰ نہیں ہوگا اور اسی طرح اس کے جنوب میں کمپنی اپنے تمام دعاوی سے دست بردار ہوجائے گی البتہ ساحل جمنا پر بھدک اور سوس پڑا کے جو علاقے واقع ہیں ان پر کمپنی کا قبضہ بدستور بحال

---

[1] دریائے چمبل اس خیال سے سرحد نہیں قرار دی گئی کہ وہ حد فاصل کا کام دے سکتی ہے بلکہ اس سے محض دونوں سلطنتوں کی حدود کا تعین کرنا مقصود تھا تاکہ سرحد کے متعلق آئندہ اس قسم کے تنازعات جن میں مرہٹے مشاق ہیں پیش نہ آئیں۔ لارڈ لیک

(۳۵۹) رہے گا۔

سندھیا نے بوندی۔ سمدی۔ دھولپور۔ باری اور راجہ کھیرک کے علاقے سے بعد میں دست برداری دے دی اور وہ اپنے تمام حقوق اور دعووں سے دست کش ہو گیا۔

کمپنی نے مہاراجہ کی ذات کے لئے چار لاکھ سالانہ روپیے مقرر کئے اور دولت راؤ سندھیا کی رانی وجے بائی کے لئے شمالی ہند میں دو لاکھ سالانہ اور اس کی بیٹی چمنا بائی کے لئے ایک لاکھ سالانہ کی جاگیر دے دی۔ علاوہ ازیں کمپنی نے اس بات کا بھی وعدہ کیا کہ وہ راجہ اودے پور۔ جودھپور۔ کوٹا اور سندھیا کے دیگر باجگزار روسائے مالوہ اور میوار سے کسی قسم کا کوئی معاہدہ نہیں کرے گی اور اُن سے جو معاہدے سندھیا کرے گا ان میں بھی مداخلت نہیں کرے گی۔

کمپنی نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر جسونت راؤ ہولکر سے صلح ہو گئی تو نہ وہ اس امر کی خواہش کرے گی کہ ہولکر کے جو مقبوضات تاپتی اور چمبل کے درمیان مالوہ میں واقع ہیں اور جن پر اب سندھیا قابض ہے وہ اُسے واپس کر دیئے جائیں اور نہ ان علاقوں کے انتظام میں کسی قسم کی مداخلت کرے گی۔ علاوہ ازیں سندھیا کو آزادی حاصل ہو گی کہ دریائے تاپتی شمالی اور دریائے چمبل کے جنوبی علاقوں
(۳۶۰) کے قبضے یا خراج کی بابت وہ جسونت راؤ ہولکر یا اُس کے خاندان کے کسی اور شخص سے جو انتظام مناسب سمجھے کرے۔ اس کے ساتھ ایک شرط یہ بھی تھی جسے صاف طور پر بیان کر دیا گیا تھا کہ اگر اس انتظام کے سلسلے میں جنگ یا کوئی تنازعہ پیش آئے گا تو اس میں بھی کمپنی کوئی حصہ نہیں لے گی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۲۸۰) نے معاہدہ کرتے وقت اس دفعہ کی وضاحت اس لحاظ سے اور بھی ضروری سمجھی کہ وہ راجہ جے پور کے طرز عمل کی بابت مطمئن ہونے کے بعد اس سے کمپنی کا اتحاد برقرار رکھنا ضروری خیال کرتا تھا۔

لہ بھدرک اور سوسن پڑا دونوں چھوٹے اور غیر زرخیز علاقے تھے اور اگرچہ وہ چمبل کے شمال میں واقع تھے تاہم دریائے جمنا کے ساحل پر ہونے کی وجہ سے اور آگرہ اور بندیلکھنڈ میں سلسلہ قائم رکھنے کی غرض سے کمپنی نے ان پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔

اسس عہد نامے میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ سندھیا آئندہ سے نہ تو سُرجی راؤ گنگا کو اپنے مشوروں میں شریک کرے گا اور نہ اُسے کبھی اپنی حکومت کے کسی عہدے پر مامور کرے گا۔[1]

اس معاہدے کے بموجب سندھیا اور اسس کے خاندان والوں کے علاوہ اس کے دربار کے خاص خاص عہدے داروں کو بھی تقریباً تین لاکھ سالانہ کی جاگیریں عطا ہوئیں لیکن اگر چمبل کے شمالی علاقے کی آمدنی جس سے سندھیا نے دست برداری دی تھی سات لاکھ کے قریب قرار دی جائے اور اس میں رانا گوہڈ کا تین لاکھ سالانہ منصب بھی شامل کیا جائے تو اس حساب سے کمپنی فائدے میں رہی۔ کیوں کہ یہ سب انتظامات گوالیار اور گوہڈ کے معاوضے میں کئے گئے تھے جن کی آمدنی تقریباً آٹھ لاکھ سالانہ تھی اور معاہدے کی رو سے اتنی ہی رقم رانا گوہڈ کے لئے مقرر ہوئی تھی۔ (۳۶۱)

[1] اس سفاک شخص کو کمپنی اپنا دشمن قرار دے چکی تھی معاہدے میں اسس قسم کی شرط طے کرا کر کمپنی نے اپنی ذلت کا اس سے خوب بدلہ لے لیا۔ اسس قسم کی ایک شرط ہولکر سے معاہدہ کرتے وقت بھی طے کر لی گئی لیکن جب چند ماہ بعد ہی یہ خبر ملی کہ سرجی راؤ ہولکر سے ملنے والا ہے تو اُن شرائط کی منسوخی کا حکم دے دیا گیا تھا تاکہ اُن کی بدولت کمپنی کو کوئی دقت یا پریشانی پیش نہ آئے۔ حالات زمانہ کے لحاظ سے اسس قسم کے جھگڑوں سے علٰحدہ رہنا نہایت ضروری تھا۔ جو لوگ سندھیا جیسے سرداروں کی حکومت کے حالات سے واقف ہیں وہ اس شرط کی ضرورت اور اسس کی منسوخی کی غلطی کو محسوس کر سکتے ہیں۔ جہاں طاقت و قوت و اختیارات مثل آمدنی کے تقسیم ہوتے ہیں وہاں ملازم بعض اوقات خود مختار ہو جاتے ہیں اور ایک حد تک وہی ان تمام کاموں کے ذمہ دار بن جاتے ہیں جنھیں دوسرے لوگ اندرونی حالات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے سمجھ بھی نہیں سکتے۔

سر جارج بارلو نے اس صلح نامے سے کلیتاً اتفاق نہیں کیا۔ اگرچہ اس نے اس امر پر اظہار اطمینان کیا کہ دولت راؤ سندھیا نے اس بات پر بخوشی رضامندی ظاہر کر دی کہ وہ دریائے چمبل کے شمالی علاقے سے آئندہ اپنا کچھ سروکار نہیں رکھے گا تاہم نہایت وثوق کے ساتھ اس نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ دریائے جمنا کے مغربی علاقوں اور وہاں کے سرداروں کے متعلق جو انتظامات وہ خود کرنا چاہتا ہے وہ حالات زمانہ اور مصلحت وقت دونوں کے لحاظ سے صحیح اصول پر مبنی ہیں اور لارڈ لیک کو لکھا کہ "مجھے اس بات کا کامل یقین ہے کہ جب ان انتظامات پر عمل کیا جائے گا تو اس علاقے میں ہمیں تمام مخاصمانہ حملوں سے ایک حد تک نجات مل جائے گی۔ اس سے زیادہ معقول انتظام ممکن نہیں ہے اور اگر جمنا کے مغربی علاقے کی ادنیٰ ریاستوں سے ہمارے تعلقات قائم رہے تو اس قسم کی حفاظت بالکل ممکن نہ ہوگی۔"

سر جارج بارلو کا خیال تھا کہ ہندوستان کی صرف بڑی بڑی طاقتوں سے دفاعی معاہدے قائم رہیں اور کمپنی کے مفاد اور استحکام کے لئے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ گرد و نواح کی دوسری ریاستوں سے ہمارے تعلقات صرف صلح و امن تک محدود رہیں اور اپنے مقبوضات کی حفاظت کے خیال سے ہم محض اپنا سیاسی اقتدار برقرار رکھیں۔ کمپنی کی سرحد کی حفاظت کا نہایت معقول اور (۳۶۲) باقاعدہ انتظام کریں اور اس کے ساتھ ہی اس بات کی کوشش کریں کہ شمالی ہند کی ریاستوں میں مثل سابق کے دوبارہ ابتری و بد امنی و باہمی جنگ و جدال جاری ہو جائے۔

ان خیالات کی وجہ سے گورنر جنرل کو فکر ہوئی کہ معاہدے کی پانچویں اور چھٹی دفعہ اس معاملے میں خارج ہو گی کیوں کہ ان دفعات کی رو سے چمبل کے شمالی علاقے میں مقام کوٹا سے لے کر دریائے جمنا تک جتنے چھوٹے چھوٹے رئیس و سردار آباد ہیں ان سب کو سندھیا کے تشدد سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری کمپنی پر عائد ہو جاتی ہے۔

ان دقتوں کے رفع کرنے کے لئے سر جارج بارلو نے چند اقتناعی

دفعات معاہدے میں شامل کر دیں۔

دریائے چمبل کا شمالی علاقہ جو سندھیا کو صلح نامہ سرجی انجن گاؤں کی دفعہ سات کے مطابق دیا گیا تھا وہ سندھیا کمپنی کو واپس کرتا ہے۔ (اس میں دھولپور۔ باری اور راجہ کھیرا کے علاقے شامل ہیں) اور کمپنی اس دریا کے تمام جنوبی علاقے سے اپنی حکومت کے خراج اور قبضے سے دست بردار ہوتی ہے لیکن بھدک اور سوس پڑا کے علاقے بدستور کمپنی کے قبضے میں رہیں گے۔

کمپنی محض اخلاص و دوستی کے اظہار کی خاطر سندھیا کی ذات کے لئے چار لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرنے کا وعدہ کرتی ہے اور شمالی ہند میں دو لاکھ سالانہ کی جاگیر سندھیا کی بیوی وجے بائی کو اور ایک لاکھ سالانہ کی اُس کی بیٹی چمنا بائی کو عطا کرتی ہے۔ (۳۶۳)

ان دفعات کا مقصد جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے محض معاہدے کی دفعات پانچ۔ چھ اور سات کے اثرات کو زائل کرنا تھا۔ توثیق شدہ عہدنامے کے ساتھ مندرجۂ بالا شرائط منشی کیول کے سامنے پیش کر دیئے گئے۔

گورنر جنرل کو بعد میں یہ خیال پیدا ہوا کہ سندھیا کو چار لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرنے کے بجائے ٹونک رامپورہ کی جاگیر دے دی جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ اس سے ایک خاص فائدہ یہ بھی ہوگا کہ سندھیا اور ہولکر میں اس کی وجہ سے دائمی مخاصمت پیدا ہو جائے گی اور ان دونوں کے مقاصد میں ایک قسم کا تصادم ہو جائے گا۔

عہدنامے کی باقی شرائط سے گورنر جنرل نے پورا اتفاق کیا اور اپنے مراسلے میں تحریر کیا کہ نہایت غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حکمت عملی اور مصلحت وقت دونوں کا اقتضاء یہ ہے کہ ریاست جے پور سے تعلقات منقطع کر دیئے جائیں لیکن اس کام کو عمل میں لانے کے لئے جو تدابیر ضروری ہیں ان کی تفصیل دوسرے مراسلے میں تحریر کی جائے گی۔"

لارڈ لیک نے اختتامی دفعات منشی کیول کے پاس روانہ کر دیئے اور

ساتھ ہی ساتھ یہ تجویز بھی پیش کر دی کہ سالانہ رقم کے معاوضے میں ٹونک رامپورہ
کی جاگیر قبول کرلی جائے۔ منشی کیول نے جواب میں تحریر کیا کہ سندھیا
(۳۶۴) اس تجویز کو قبول نہیں کرے گا بلکہ مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ اگر یہ
جاگیر مفت اور بلامعاوضہ بھی دی گئی تو بھی میرا آقا اسے لینے پر راضی نہیں ہوگا
اس کی وجہ صاف ہے۔ اس کی بدولت ہولکر سے مصالحت کرنے میں اُسے سخت
دقتیں پیش آجائیں گے۔ منشی کیول نے اس بات پر بھی زور دیا کہ جب تک
برطانوی رزیڈنٹ سندھیا کے دربار میں نہ پہونچ جائے یہ شرائط
اس کے سامنے پیش نہ کی جائیں۔ رزیڈنٹ اُسے سب باتیں اچھی طرح
سمجھا دے گا اور مزید برآں جن اصول اور مسلک کے تحت میں یہ تجاویز
پیش کی جارہی ہیں اس کی بابت بھی سندھیا کو اطمینان ہو جائے گا۔ لارڈ لیک
کو یہ بات بہت معقول معلوم ہوئی اور اُس نے گورنر جنرل کو مطلع کردیا کہ
اس معاملے کو سردست ملتوی کردیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس موقع سے فائدہ اٹھاکر
لارڈ لیک نے گورنر جنرل کو دوبارہ تحریر کیا کہ جن اصول پر عمل کرنے کی
مجھے ہدایت کی گئی ہے ان میں اگر کچھ ترمیم کردی جائے تو مناسب ہوگا۔ جن
وجوہ کی بنا پر اس نے دریائے چمبل کو دونوں سلطنتوں کی سرحد قرار دیا تھا
ان پر دوبارہ زور دیا اور سمجھایا کہ چمبل کے شمال (اور کوٹا کے مقابلے) میں
راجہ بوندی کا علاقہ اگرچہ آمدنی اور وسعت دونوں کے لحاظ سے نہایت معمولی
لیکن شمالی ہند میں داخل ہونے کیلئے ادھر سے کئی راستے ہیں۔ اس لحاظ سے اس علاقے کی
بہت بڑی اہمیت ہے۔ اسکے علاوہ یہاں کے راجہ کا کمپنی کے ساتھ ہمیشہ دوستانہ
سلوک رہا ہے جسکی وجہ سے میرے نزدیک کمپنی کا فرض ہے کہ وہ اس کی حفاظت کرے مزید
برآں ایک خاص واقعہ کی وجہ سے وہ اس حفاظت کا اور بھی زیادہ مستحق ہے
کرنل مانسن نے جب مراجعت شروع کی تھی تو یہی وہ شخص تھا جس نے ہولکر
کی قدیم مخالفت اور اپنی ادنیٰ حیثیت کے باوجود نہایت ہمت کے ساتھ کرنل
مذکور کی مدد کی اور اپنے کو ہولکر کے انتقام کا نشانہ بنالیا۔ اس واقعہ کے سلسلے
میں لارڈ موصوف نے یہ بھی تحریر کیا کہ مجھے ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا ہے

(٣٦٥) کہ جب کبھی بھی جسونت راؤ ہولکر سے کوئی معاملہ کیا جائے گا۔ ہم برطانوی حکومت کی عزت و شہرت کا لحاظ کرنے کے بعد بوندی کے راجہ کو اس کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکیں گے لہٰذا میری رائے ہے کہ اسی موقع پر اُسے مرہٹوں کی طاقت اور اثر سے پورے طور پر آزاد کرا دیا جائے۔"

اس مراسلے میں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "شمالی ہند میں دریائے چمبل کے شمالی علاقے سے سندھیا کا بلا چون و چرا دست بردار ہونا اس بات کے مراوف ہے کہ اس نے ہماری جدید طاقت اور اقتدار کو صاف طور پر اور بلا کسی شرط کے تسلیم کر لیا ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ جب تک ہولکر سے بھی اسی قسم کی کوئی شرط نہ کی جائے اس سے کوئی باعزت معاہدہ نہیں ہو سکتا اور نہ معاہدے کو بغیر اس کے محفوظ کہا جا سکتا ہے۔"

ممکن ہے کہ مرہٹوں کے خاص خاص سرداروں کے تنازعات سے کمپنی کو ایک عرصۂ دراز کے لئے نجات مل جائے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر سندھیا اور ہولکر کو جمنا کے مغربی علاقوں کی ریاستوں میں اپنا اپنا اثر قائم کرنے اور اپنے تنازعات میں انھیں شریک کرنے کا موقع دے دیا گیا تو ان سب کے حوصلے جو اب ختم ہو چکے ہیں دوبارہ بلند ہو جائیں گے اور کمپنی کے اقتدار کو جو اب ہر جگہ تسلیم کیا جاتا ہے برقرار رکھنے کے لئے دوسری جنگ کرنی پڑے گی۔

ان باتوں کا گورنر جنرل پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے ارادے پر
(٣٦٦) قائم رہا اور اپنی تجاویز میں اس نے کسی قسم کی کمی نہ کی۔ وہ لکھتا ہے کہ "لارڈ لیک کو جو مقامی تجربہ حاصل ہے اس کا ضرور لحاظ کرنا چاہئے لیکن میں مجبور ہوں۔ اس معاملے میں جس اصول پر میں چل رہا ہوں اس کا برقرار رکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔" سر جارج بارلو نے ابتدائی دفعات راست دولت راؤ سندھیا کے پاس روانہ کر دیں اور ان کی نوعیت اور اپنے مقصد کو ایک علیحدہ خط میں واضح کر دیا۔

ہولکر سے صلح اور معاہدہ سنہ ١٨٠٦ء

اس عرصے میں جب یہ بحث و مباحثے ہو رہے تھے لارڈ لیک جسونت راؤ

ہولکر کا تعاقب کر رہا تھا۔ ہولکر اپنے آخری حملے میں برطانوی فوج کا کہیں مقابلہ نہ کر سکا۔ ہر موقع پر اسے بھاگنا پڑا۔ لارڈ لیک نے دریاے بیاس[1] تک اس کا پیچھا کیا اور بالآخر ہولکر نے تنگ آکر اپنے وکیل لارڈ لیک کے پاس روانہ کئے اور صلح کی درخواست کی۔ چنانچہ حسب ذیل شرائط اسے پیش کی گئیں۔

ٹونک رامپورہ۔ بوندی وغیرہ اور چمبل کے شمالی علاقے کے دیگر مقامات میں اُسے جو حقوق حاصل ہیں اُن سے دست برداری کی جائے۔

کمپنی وعدہ کرتی ہے کہ دریائے چمبل کے جنوبی علاقے کے کسی راجہ یا خاندان یا ہولکر کے کسی باجگزار کے معاملہ میں وہ کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گی اور عہدنامے کے آٹھ ماہ بعد چندور۔ گولنا اور تاپتی و گوداوری کے جنوبی علاقے کے تمام قلعے اور مقامات جو ہولکر کے قبضے میں تھے اور جن پر فتح کے بعد سے کمپنی قابض ہے واپس دے دیئے جائیں گے بشرطیکہ انگریزی حکومت کو اس دوران میں جسونت راؤ ہولکر کے طرز عمل سے اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ وہ کمپنی اور اس کے حلیفوں کے ساتھ در اصل صلح کے
ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ ہولکر کوچ اور بندیلکھنڈ کے علاقوں سے اپنے تمام (۳۶۷)
دعوے اٹھا لے اور برطانوی حکومت اور اس کے حلیفوں سے آئندہ کسی قسم کا کوئی مطالبہ نہ کرے۔

برطانوی حکومت کی بلا اجازت کسی یوروپین کو اپنے یہاں ملازم نہ رکھے۔

سرجی راؤ گنگا کو نہ اپنے یہاں کسی عہدے پر مامور کرے اور نہ اپنے مشوروں میں اسے شریک کرے۔

اگر یہ شرائط تسلیم کر لئے گئے تو جسونت راؤ ہولکر کو شمالی ہند

---

[1] بیاس ان پانچ دریاؤں میں سے ایک ہے جو پنجاب کو سیراب کرتی ہیں یونانی اسی کو ہی نے سس (Lyphases) کہتے ہیں۔

میں واپس ہونے کی اجازت دے دی جائے گی لیکن واپسی کے لئے ایک خاص راستہ مقرر کر دیا جائے گا تاکہ برطانوی حکومت اور اس کے حلیفوں کے علاقے کو اس کے گزرنے سے کچھ نقصان نہ پہنچ سکے۔

گورنر جنرل کے ایجنٹ[1] اور ہولکر کے وکیلوں میں تھوڑی گفت وشنید کے بعد جملہ شرائط چند غیر اہم ترمیموں کے ساتھ قبول کر لی گئیں اور انھیں عہد نامے کی شکل میں مرتب کر لیا گیا۔ ۷/ جنوری کو ان کی توثیق ہو گئی۔ اگرچہ یہ شرائط سپہ سالار کی مرتب کی ہوئی تھیں تاہم گورنر جنرل کی عام ہدایات اور اصول کے مطابق تھیں۔

سر جارج بارلو نے اس عہد نامے کو کمپنی کے شایان شان اور برطانوی حکومت کے نہایت مفید خیال کیا۔

گورنر جنرل نے لارڈ لیک کو ہدایت کر دی تھی کہ ٹونک رامپورہ کی تجویز پر بہت زور دیا جائے تاکہ اس کے متعلق سندھیا سے معاملہ کرنے میں سہولت پیدا ہو جائے لیکن اس کا کوئی امکان نظر نہ آیا اور اُسے محسوس ہو گیا کہ جب تک خود کمپنی اُس کی نگرانی اور محافظ نہ بنے گی کوئی سردار یا والی ریاست اُسے لینے پر ہرگز آمادہ نہ ہو گا لہٰذا بجز اس کے اب کوئی چارہ نہ تھا کہ یا تو کمپنی اُس علاقے کو اپنے قبضے میں رکھے یا کسی دوسرے کو دے کر اس کی محافظ بن جائے لیکن حکمت عملی کے جن اصول پر وہ عمل کرنا چاہتا تھا ان کی رو سے ان میں سے کسی ایک بات کو بھی روا نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اس لئے (۳۶۸) گورنر جنرل نے یہ فیصلہ کیا کہ عہد نامے کی دفعہ ۲ کو منسوخ کر کے یہ علاقہ ہولکر کے حوالے کر دیا جائے۔ عہد نامے کے مسودے کو واپس کرتے وقت اس میں ایک اتناعی دفعہ شامل کر دی گئی جس کی رو سے یہ زرخیز علاقہ اُسے دوبارہ واپس کر دیا گیا۔ اسی سلسلے میں راجہ بوندی کو بھی کمپنی کی حفاظت سے محروم کر دیا گیا۔ ہولکر اور

---

[1] لفٹننٹ کرنل میلکام۔

سندھیا کے علاقے واپس کرنے کی بابت جو اصول قائم کئے گئے تھے ان میں ترمیم کرانا۔ اور گورنر جنرل کے خیالات بدلنے کی لارڈ لیک نے ہر ممکن کوشش کی اور اسے ہر چند سمجھایا کہ ان رئیسوں نے اپنے سابق طرزِ عمل اور سلوک سے اس بات کا حق قائم کرلیا ہے کہ کمپنی انھیں اپنی حفاظت سے محروم نہ کرے لیکن سب کوششیں بے سود رہیں اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوسکی۔ لارڈ لیک کو مذکورۂ بالا اسباب کی بنا پر راجہ بوندی کا بہت لحاظ تھا اور کم از کم اسے وہ کمپنی کی حفاظت میں رکھنا چاہتا تھا لیکن سر جارج بارلو آخر تک اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اس تخصیص سے محض اس کے اصول اور مسلک ہی کی خلاف ورزی نہ ہوگی جس پر وہ قائم رہنا اپنا فرض سمجھتا تھا بلکہ اس کی وجہ سے سخت سیاسی دقتیں پیش آنے کا بھی اندیشہ رہے گا۔

(۲۶۹) لارڈ لیک کو جب یہ اطلاع ملی کہ گورنر جنرل کا ارادہ راجہ جے پور سے بھی تعلقات منقطع کرنے کا ہے تو اس نے فوراً اسے لکھا کہ "اگر راجہ جے پور کا سابق طرزِ عمل وفاداری کے بالکل خلاف تھا اور خصوصاً اس موقع پر جب کہ ہولکر نے شمالی ہند پر حملہ کیا تھا تاہم اس حملے کی مدافعت کے لئے اس کی اعانت اس قدر ضروری تھی کہ میں نے گزشتہ معاملات کو درگزر کرنے اور اس کے سابق طرزِ عمل کو نظر انداز کرنے کا وعدہ کرلیا اور آئندہ اخلاص و اتحاد اور کمپنی کی حفاظت برقرار رکھنے کا یقین دلاکر سابق معاہدے کی تعمیل پر اسے آمادہ کرلیا۔ اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ راجہ نے نہایت مستعدی سے اپنا وعدہ پورا کیا اور میجر جنرل جونس کی فوج اس کی اعانت اور رسد کے انتظام کی بدولت ایک ایسے خاص مقام پر جمی رہی جو جنگ کی کامیابی کے لئے نہایت اہم تھا۔ اس بارے میں جنرل جونس کے پاس سے جو مراسلے وصول ہوئے تھے ان سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ہولکر کو برطانوی فوج کی امداد نہ ملتی (جیسا کہ اس وقت خیال تھا) تو راجہ کی فوج جو برطانوی مستقر پر پہنچ گئی تھی نہایت مستعدی سے ہولکر کے خلاف کام کرتی۔ علاوہ ازیں راجہ نے جس اخلاص اور وفاداری سے اس نازک موقع پر ہمارا ساتھ دیا اس کا ثبوت

جنرل جونس کے بیان سے بھی ملتا ہے۔ ان واقعات کی بنا پر میں نے راجہ کے ساتھ خصوصیت کا برتاؤ کیا ہے۔ مزید برآں مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ اب حالات اس قدر تبدیل ہو گئے ہیں کہ ہماری حکومت کو راجہ سے تعلقات منقطع کرنے کا خیال ترک کرنا پڑے گا، ورنہ میں ہرگز یہ طرزِ عمل اختیار نہ کرتا۔" (۳۷۰)

لارڈ لیک نے یہ بھی لکھا کہ "اگر راجہ سے جدید معاہدہ کرنے یا موجودہ تعلقات کو جو دونوں سلطنتوں میں قائم ہیں منقطع کرنے کے لئے معقول وجوہ موجود بھی ہوں تو بھی یہ سوال غور طلب ہے کہ ہمیں اس طرح ایک سخت تعلقات ختم کرنے کا کس حد تک حق حاصل ہے کیونکہ ہمارے اس فعل سے سندھیا اور ہولکر دونوں کو راجہ جے پور پر فوری حملہ کرنے کا موقع مل جائے گا لہٰذا جب تک کہ اس فیصلے کے لئے زبردست اور ناقابل تردید دلائل ہمارے پاس موجود نہ ہوں ہمارا یہ فعل برطانوی حکومت کو ہندوستانی ریاستوں کی نگاہ میں گرا دے گا جو اس کے لئے نہایت مضر ہوگا۔" اس مراسلے میں لارڈ لیک نے گورنر جنرل کے ایجنٹ اور ہولکر کے وکیلوں کی گفتگو کا[1] بھی حوالہ دیا اور اس امر کی اطلاع دی کہ ہولکر راجہ بوندی اور راجہ جے پور سے خراج وصول کرنے کا حق بھی چاہتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ (ان ملاقاتوں کی کیفیت کا مطالعہ کرنے کے بعد) آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ برطانوی حکومت کی وقعت قائم رکھ کر ان میں سے کسی مطالبہ کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ نے جے پور سے تعلقات منقطع (۳۷۱)

---

[1] ہولکر کے وکیلوں نے نہایت سختی اور بے باکی سے مطالبہ کیا کہ راجہ بوندی و جے پور سے خراج وصول کرنے کا سابق حق برقرار رکھا جائے۔ ان میں سے ایک نے راجہ جے پور کے متعلق یہ بھی لکھا کہ وہ تو انگریزوں کی اعانت کا ہمیشہ مستحق رہے گا کیونکہ محض ان کی خوشنودی کے لئے وہ بیچارہ ... وزیر علی کو اپنی پناہ سے نکالکر ان کے حوالے کر چکا ہے اور ہمیشہ کے لئے اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا چکا۔ گورنر جنرل کے ایجنٹ نے یہ بات گوارا نہ کی کہ برطانوی حکومت کے ایک حلیف کی بابت اس قسم کے الفاظ اس کے سامنے رکھے جائیں اس نے سخت ناخوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ راجہ جے پور نے ایک قاتل کو کمپنی کے حوالے کیا جسے پناہ دینا اس کے لئے باعث ذلت تھا۔

کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو میں یہ درخواست کرونگا کہ جب تک ہولکر راجہ مذکور کے علاقے سے گزر کر اپنے مقبوضات مالوہ میں داخل نہ ہو جائے (جس کیلئے وہ معاہدے کی رو سے پابند ہے) آپ اس فیصلے کی تعمیل ملتوی رکھیں۔

لارڈ لیک اس سے قبل بھی اپنے دلائل پیش کر چکا تھا لیکن سرجارج بارلو کو ان کے خلاف دیکھ کر اس نے اس وقت صرف عہد و پیماں کی پابندی پر زور دیا۔ (۲۷۲)
گورنر جنرل پر اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا اور لارڈ لیک کی تحریر کے بعد بھی وہ اپنے خیال پر قائم رہا کہ راجہ کی سابق روش کی وجہ سے کمپنی کو اس سے تعلقات منقطع کر لینے کا حق حاصل ہے اور بعد میں جو تجاویز پرزور الفاظ میں اس کے سامنے پیش کی گئیں تھیں ان کی تعمیل سے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں اس موقع پر اس نے جو کچھ کیا وہ سب اپنی حفاظت اور سہولت کے لئے کیا نہ کہ عہد و پیمان کی پابندی کی خاطر لہذا زیر بحث مسئلہ پر اس نقطۂ نظر سے غور کرنے کے بعد میں ایسے معاہدوں سے علٰحدگی اختیار کرنے میں ہرگز تامل نہیں کر سکتا جن کی بدولت آئندہ مزید دقتوں کے پیش آنے کا اندیشہ ہو۔

انگریزی حکومت ریاست جے پور کو اپنی فیاضی کا ثبوت دے چکی ہے جس زمانے میں کہ سندھیا سے صلح کی بات چیت جاری تھی اگر اس وقت جے پور سے تعلقات ختم کر دئیے جاتے اور سندھیا کو راجہ سے خراج وصول کرنے کا حق دے دیا جاتا تو کمپنی کا بہت کچھ فائدہ ہو سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اب جہاں تک کہ اس کی تعمیل کا تعلق ہے کمپنی کو پورا حق حاصل ہے۔ کہ وہ اپنی سہولت کے لحاظ سے جس وقت چاہے اس پر عمل کرے۔ مجھے یہ خوف ہے کہ اگر ہولکر نے جے پور کے علاقے سے گزرتے وقت کہیں دست درازی کردی تو بیشتر سے اتحاد کا خاتمہ نہ ہونے کی صورت میں ہمیں اس کے حلیف کی حیثیت سے اس کا تدارک لازمی طور پر کرنا پڑے گا لہذا میں نے اپنے فیصلے کی فوری تعمیل کرانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

سرجارج بارلو نے اپنے اس ارادے کے مطابق جے پور کے رزیڈنٹ کو مطلع کردیا کہ وہ دفاعی معاہدے کی منسوخی کا عام اعلان کردے لیکن اس کے

ساتھ ہی راجہ کو اطمینان دلا دے کہ انگریزی حکومت اس سے صلح و آشتی کے تعلقات بخوشی برقرار رکھے گی ۔ گورنر جنرل نے خود بھی ایک خط راجہ کے پاس روانہ کیا اور جن اسباب کی بنا پر اس نے یہ فیصلہ کیا تھا انھیں واضح کیا لیکن دربار جے پور نے ان دلائل پر سخت نکتہ چینی کی، فیصلے کو خلاف انصاف بتایا اور اس سے جو اہم خطرات ریاست کو پیش آنے والے تھے ان سے متاثر ہوکر اس کے دربار والے یہ تک بول گئے کہ برطانوی حکومت کی نوعیت کے لحاظ سے انھیں اس کا کس حد تک ادب و احترام کرنا چاہیے ۔ راجہ کے (۲۴۳) ایک وکیل نے دہلی میں لارڈ لیک سے ملاقات کی اور راجہ نے جو پیغام بھیجا تھا اسے بیان کرنے کے بعد اس نے دوران گفتگو میں نہایت بے باکانہ طور سے یہ کہہ دیا کہ "انگریزی حکومت کے ہندوستان میں قائم ہونے کے بعد سے یہ پہلا موقع ہے جبکہ اس نے عہد و پیمان کے ایفا کو اپنی سہولت کے تابع کیا ہے"۔

بھرت پور اور مچھیری کی حفاظت کی ذمہ داری سے دستبردار ہونے کا خیال

سر جارج بارلو جے پور کی طرح بھرت پور اور مچھیری سے بھی تعلقات ختم کرنے کی فکر میں تھا لیکن ان ریاستوں کے فرمانرواؤں نے کمپنی کو اب تک شکایت کا کوئی ایسا موقع نہیں دیا تھا جس کی وجہ سے بلا ان کی مرضی کے تعلقات ختم کئے جا سکیں لہٰذا اس نے اس معاملے کے متعلق گفت و شنید شروع کرنے کی لارڈ لیک کو ہدایت کی اور اسے اختیار دیدیا کہ ان والیان ریاست کو کمپنی کی حفاظت سے دست بردار ہونے پر آمادہ کیا جائے اور بطور ترغیب کے معقول علاقے دینے کا وعدہ کیا جائے۔

لارڈ لیک نے متعدد وجوہ کی بنا پر ان تجاویز کو مذکورۂ بالا راجاؤں کے سامنے پیش کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس نے نہایت پُر زور الفاظ میں گورنر جنرل کو لکھا کہ "مجھے اندیشہ ہے کہ محض اس افواہ ہی سے کہ برطانوی حکومت

ان سے تعلقات ختم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے ان علاقوں میں جہاں امن قائم کرنے کے لئے خوں بہایا گیا ہے اور خزانے لٹائے گئے ہیں دوبارہ بدامنی پھیل جائے گی اور خونریزی و غارت گری کا دور از سر نو شروع ہو جائے گا۔"

گورنر جنرل نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر قائم ہوں لیکن اس کی تعمیل کرانے میں سر دست عجلت نہیں ہے" (۲۷۴)

اس سلسلے میں مراسلت جاری رہی اور اس کی تعمیل کا مسئلہ التوا میں پڑ گیا اور خوش قسمتی سے یہ سوال دوبارہ نہ اٹھا۔ سرکاری مفاد کے لئے یہ نہایت ہی اچھا ہوا۔ بھرت پور اور مچھیری کے راجہ اور انکے علاقے کے جاگیردار اپنے عہد و پیمان پر قائم رہے۔ جمنا کے مغربی علاقے میں کمپنی کو جو تقویت حاصل ہے وہ خاص طور پر انھیں کی وجہ سے قائم ہے۔

دربار حیدرآباد کے معاملات اور عدم مداخلت کے مسلک سے انحراف

یہاں تک تو سر جارج بارلو نے عدم مداخلت کے اصول پر جس کا لارڈ کارنوالس حامی تھا عمل کیا لیکن حیدرآباد میں چند ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے اسے مجبوراً اپنے اصول سے انحراف کرنا پڑا۔

میر عالم بہادر سلطنت آصفیہ کے ایک قابل وزیر اور انگریزوں کے حامی و معاون تھے کمپنی کئی سال سے انھیں مدد دے رہی تھی۔ اس لگاؤ کی وجہ سے شہریار دکن ان سے ناراض ہو گئے اور ان پر انھیں قطعی اعتماد نہ رہا کمپنی کی متعدد کوششوں کے بعد انھوں نے ظاہری طور پر ان سے مصالحت کر لی اور اس بات پر بھی رضامندی ظاہر کی کہ راجہ سوہی پت رام کو دربار سے ہٹا کر برار بھیجد یا جائیگا۔ یہ شخص ایک نہایت با اثر ہندو سردار تھا۔ اسی نے میر عالم کے خلاف سازش کی تھی ان سب باتوں کی تکمیل بھی ہو گئی لیکن بہت جلد یہ محسوس ہو گیا کہ میر عالم (۲۷۵) کے ساتھ جو کچھ کیا گیا تھا وہ محض ظاہرداری کے لئے تھا اور ہندو سردار جسے بلدے سے خارج کیا گیا تھا برابر اپنی سازشوں میں مشغول ہے جس کا خاص مقصد یہ ہے کہ میر عالم کو تباہ کر دیا جائے اور برطانوی حکومت کے اتحاد کا خاتمہ ہو جائے اور سکندر جاہ بہادر ان سب باتوں سے چشم پوشی کر رہے ہیں

اس سازش کی نوعیت اور سازشوں کے خصائل کی وجہ سے جن میں بدظن
سپاہی بھی شامل تھے فوری کارروائی ضروری سمجھی گئی۔

سر جارج بارلو کو اس موقع پر یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ آیا اسے اپنے عدم مداخلت
کے اصول پر جس کا کہ وہ اعلان کر چکا ہے اور جس پر وہ اپنی خواہش کے مطابق
قائم رہنا چاہتا ہے عمل کرنا چاہیئے یا اس خاص معاملے میں اس سے گریز کرنا
چاہیئے جن وجوہ کی بناء پر اسے آخر الذکر بات کے لئے فیصلہ کرنا پڑا انھیں
وہ اپنے ایک قابلانہ مراسلے میں بیان کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ دربار حیدرآباد
سے تعلقات برقرار رکھنے کا یہی تنہا ذریعہ تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "اس
غیر معمولی موقع پر اس بات کے جتلانے کے لئے دلائل پیش کرنے کی ضرورت
نہیں کہ سلطنت حیدرآباد سے اس قسم کے تعلقات برقرار رکھنے میں جو بظاہر
نہایت مستحکم لیکن درحقیقت مائل بہ زوال ہیں کس قسم کے خطرات پیش آئیں گے
جنگ چھڑنے کی صورت میں یہی ایک خطرہ نہیں کہ اس سلطنت کے وسائل
اور افواج سے جن پر کہ معاہدے کی رو سے ہمیں حق حاصل ہے ہم مستفید
نہ ہو سکیں گے بلکہ صورت حال یہ ہو گی کہ ہماری امدادی فوج ایک دشمن (۲۷۶)
کے علاقے میں پھنس جائے گی اور ایسی حالت میں جس قسم کے خطرات
عام طور پر پیش آتے ہیں ان سب کا اسے مقابلہ کرنا پڑیگا۔ اور خاص خاص
مقامات پر قبضہ کرنے (رسدگاہیں قائم کرنے اور کمپنی کے دوسرے علاقوں
سے مراسلت کا سلسلہ محفوظ رکھنے سے جو فوائد حاصل ہو سکتے ہیں ان سب
سے ہم محروم ہو جائیں گے لہذا بجز اس کے اب کوئی چارہ باقی نہیں کہ یا تو
اتحاد ختم کر دیا جائے یا ہم براہ راست مداخلت کریں اور اپنے پورے اثر
اور زور سے کام لے کر جو ان حالات میں ہمیں میسر ہو سکتے ہیں اس اتحاد کو صحیح
اور مستحکم بنیاد پر قائم کر دیں"۔

بعد ازاں سر جارج بارلو نے اس مسئلہ پر غور کیا کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ
شہریار دکن صحیح معنوں میں اتحاد پر قائم رہنا نہیں چاہتے تو کیا کمپنی کو از روئے
انصاف ان سے تعلقات ختم کر دینے ضروری ہیں اس سلسلے میں وہ اپنے مندرجہ

ذیل خیالات کا اظہار کرتا ہے "اس اتحاد کا مقصد یہ تھا کہ دونوں سلطنتوں کے مفاد ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں۔ ان کی توتیں ایک دوسرے کی حفاظت کریں اور عام امن کی نگراں بھی رہیں جو لڑائیاں ٹالے نہ ٹلیں ان کے نقصانات و فوائد میں دونوں یکساں شریک رہیں۔ اس اتحاد کی شرائط دیگر حالات کے تابع نہیں بلکہ وہ بذات خود مکمل ہیں اور یہ اتحاد دونوں سلطنتوں کی حکومتوں کی تنظیم میں سرایت کر گیا ہے۔ (۴۷۷) اور ان دونوں نے دوسری ریاستوں سے جو تعلقات جدا جدا یا مل کر قائم کئے ہیں ان میں بھی یہ پیچ در پیچ شامل ہے۔ ان کے تمام جدید تعلقات ذمہ داریاں اور عہد و پیمان اسی اتحاد کی بنا پر قائم ہوئے ہیں اور اسی کی بدولت وہ برقرار ہیں۔ ان حالات میں اگر ایک فریق اپنی مرضی کے مطابق اسے ختم کرنے کا مجاز ہو جائے تو دوسرے فریق کے مفاد و وقار اور استحکام کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہو جائے گا کیونکہ اس اتحاد ہی کی بدولت یہ سب انتظامات عمل میں آئے تھے اور اسی کی وجہ سے تمام ذمہ داریاں لی گئیں تھیں۔

دربار حیدر آباد سے رشتۂ اتحاد ٹوٹنے سے جن نتائج کے ظہور پذیر ہونے کا اندیشہ تھا ان پر تبصرہ کرنے کے بعد سر جارج بارلو نے تحریر کیا کہ "اس سے تو ہماری سلطنت کی بنیاد ہل جائے گی اور ہندوستان کی سیاست میں جو برتری ہمیں حاصل ہے اس کا خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے بعد ہمارے جو کچھ سیاسی تعلقات باقی رہ جائیں گے ان کے زوال کا پیش خیمہ اور خاتمہ کا یہ سبب بن جائے گا اور جس قوت اور جن وسائل پر آج ہمیں کامل اختیار حاصل ہے کل وہ ہمارے خلاف استعمال ہوں گے۔ اس طرح ہمارے اثر اور ہماری قوت میں جو کمی ہو گی اس سے سرکش اور بدظن طبقوں کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور ان کے دلوں میں نئی نئی امنگیں پیدا ہو جائیں گی اس کمزوری اور بزدلی کے اظہار کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ معاہدے کی رو سے امدادی فوج کے مصارف کے لئے حیدر آباد کا جو علاقہ لیا گیا تھا وہ بھی امدادی فوج ہٹانے کی صورت میں واپس کرنا پڑے گا"۔ اسی سلسلے میں وہ بھی لکھتا ہے کہ "اگر قوت و اثر سے دست بردار ہونا ہر حال میں مضر ہوتا ہے تو اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ ہمارے

اعتدال پسند مسلک کی بابت نہایت زور و شور سے غلط فہمی پھیلائی جارہی ہے
وہ ہمارے لئے کس قدر خطرناک ہوگا۔ علاوہ ازیں اس اتحاد کے خاتمے سے
فرمانروایان دکن کے عیار و حیلہ ساز مشیروں کے ان لغو بیانات کی زبردست
تائید ہو جائے گی جن کے ذریعہ سے وہ انھیں کو ہماری قوت سے بدظن کرنے (۳۷۸)
اور اس بات کو ان کے ذہن نشین کرانے کی کمینہ کوششیں کر رہے ہیں کہ ہم کمزور پڑ گئے
ہیں اور اب ہم خوف زدہ ہیں۔"

ان خیالات سے متاثر ہوکر سر جارج بارلو نے اس معاملے میں جو کارروائی
کی وہ حکمت عملی اور دانشمندی دونوں کے مطابق تھی اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ
کمپنی نے ہندوستان کی سلطنتوں میں اپنی جو حیثیت قائم کرلی ہے اس سے
پیچھے ہٹنا بالکل ناممکن ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی روشن ہے کہ جو جگہ بھی ہم خالی
کریں گے اور جس اثر سے ہم دست بردار ہوں گے اس پر ہمارے دشمن قابض
ہو جائیں گے اور چونکہ ان لوگوں کو ہمارے مقاصد سمجھنے کی صلاحیت نہیں
اس لئے وہ ہمارے اعتدال کو کمزوری اور ذاتی اعتماد کو خوف پر محمول کریں گے۔
اس قسم کی غلطی اور غلط فہمیوں کا صرف ایک نتیجہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہوگا کہ دوسروں
کو ہم پر حملہ کرنے اور ہماری توہین کرنے کی جرأت ہو جائے گی اور جنگ و فتوحات
کی مسلمہ خرابیاں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائیں گی۔ سر جارج بارلو نے عقل سے
کام لیکر اس موقع پر عدم مداخلت کے اصول سے انحراف کرنے کے لئے جو دلائل
پیش کئے ہیں ان پر غور کرنا ضروری ہے کیونکہ ایک نہایت مستند اور باوقعت
ذریعہ سے اس مسلک کے محدود دائرہ کا اظہار ہوتا ہے۔

(۳۷۹) وہ لکھتا ہے کہ "میں اس امر سے بخوبی واقف ہوں کہ سلطنت آصفیہ
کے اندرونی معاملات میں دخل دینے سے میں عدم مداخلت کے قائم اصول سے انحراف
کر رہا ہوں جو ایک دانشمندانہ اور منصفانہ حکمت عملی پر مبنی ہے لیکن اس اصول
کے قائم کرتے وقت یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ شہریار دکن اس اتحاد کے
اصولوں اور مسلمہ فوائد کا صحیح اندازہ کریں گے اور اس کے برقرار رکھنے کی صدق
دل سے کوشش کریں گے۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا کہ وہ استقلال اور دوراندیشی

سے کام لے کر اور اپنے اقتدار کا لحاظ رکھ کر اپنے خود غرض اور کم ظرف مشیروں کے مشوروں کو مسترد کرتے رہیں گے جن کا ہمیشہ یہ شعار ہو گا کہ وہ اس بات کو ان کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کریں کہ دوسروں کا اثر قبول کر کے اپنے اوپر قیود عائد کرنا گویا اپنی ذلت کرانا ہے لہذا اس اتحاد کا خاتمہ کر دیا جائے اگر اس اصول میں یہ جائز اور مناسب مفروضات شامل نہ ہوں تو اس کی بنیاد ہی غائب ہو جاتی ہے۔ اس وقت اس سے جو انحراف کیا جا رہا ہے وہ کسی خاص ارادے سے نہیں بلکہ محض ضرورت سے ہے۔ ہمارا یہ مقصد نہیں کہ حکمت عملی کے عام اصول مسترد کر دیئے جائیں بلکہ جس قدر بھی ان سے انحراف کیا جا رہا ہے وہ اس مجبوری سے ہے کہ سلطنت آصفیہ کی اس وقت جو حالت ہے اسے مد نظر رکھتے ہوئے اصل اصولوں پر ان تمام فوائد سے محروم ہوئے بغیر عمل نہیں ہو سکتا جن کی کہ ان سے توقع تھی لہذا ہمارا منشاء یہ ہے کہ اس وقت جو زبردست خطرات درپیش ہیں ان کی مدافعت کا انتظام ہو جائے۔"

عہدنامۂ بسین کی ترمیم کا مسئلہ اور سر جارج بارلو کی مخالفت

سر جارج بارلو نے سلطنت حیدرآباد کے ساتھ جو حکمت عملی اختیار کی تھی اسی کے مطابق اسے عہدنامہ بسین کی ترمیم کے مسئلہ میں حکام انگلستان کی بھی مخالفت کرنی پڑی۔ ان لوگوں نے جس کوتاہ بینی سے ابتدا میں اس عہدنامے پر اعتراض کیا تھا وہی اب تک قائم تھی ان کا خیال تھا کہ اس کی بدولت گوناگوں مصیبتیں پیش آتی رہیں گی لہذا اس موقع پر ان کی تجویز یہ تھی کہ اگر اسے ختم نہ کیا جا سکے تو اس میں ترمیم ضرور کر دی جائے۔ اگر (۳۸) اس تجویز پر عمل کیا جاتا تو عہدناموں کی منسوخی میں ایک اور اضافہ ہو جاتا اور مالی نقصان کے ساتھ کمپنی کی قوت میں بھی کمی ہو جاتی لہذا گورنر جنرل نے اسے خلاف مصلحت قرار دیا اور اس کے مضر اثرات نہایت پرزور الفاظ میں بیان کئے اور مجلس راز دار کو جو مراسلہ[1] روانہ کیا اس میں وہ تحریر کرتا

[1] مورخہ یکم جون سنہ ۱۸۰۵ء

ہے کہ قبل اس کے کہ میں اس مراسلے کو ختم کروں آپ کی ان تجاویز پر اپنی رائے ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو آپ نے عہدنامۂ بسین کی شرائط میں ترمیم کرنے کی بابت اپنے سابق مراسلے میں پیش کی ہیں ۔

"اس عہدنامہ کی شرائط میں جو ترمیم بھی کی جائے گی اس سے مرہٹوں کو دلی مسرت حاصل ہوگی کیونکہ ترمیم کی نوعیت کے لحاظ سے انھیں اس بات کی امید ہو جائے گی کہ وہ برطانوی حکومت کے اثر کو پونہ میں کمزور کر کے بالآخر ختم کر سکیں گے لہذا یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ان حالات میں مرہٹوں کے خاص خاص سردار اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے جو کوشش بھی کریں گے وہ برطانوی حکومت کے لئے سخت تکلیف دہ ثابت ہوگی اور ہمارے لئے بجز اس کے کوئی چارہ باقی نہ رہ جائیگا کہ یا تو ہم ان کی کوششوں کو بارآور ہوتے دیکھیں یا اپنے اصول کے خلاف جن کا ہم علانیہ طور پر دعویٰ کرتے رہتے ہیں دربار پونہ کی سازشوں میں مداخلت کریں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مرہٹوں کے بڑے بڑے سرداروں سے ہمارے تنازعات شروع ہو جائیں گے اور مصائب و تکالیف کے ایک لامتناہی سلسلے کی بنا پڑ جائے گی (۲۸۱)
اگر ہمارا مقصد یہ ہے کہ پیشوا سے ہمارے جو تعلقات قائم ہو گئے ہیں ان سے دوسرے مرہٹہ سردار بھی مانوس ہو جائیں تو میرے نزدیک انھیں راضی کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ یا تو ہم اپنے اتحاد کو بجنسہٖ برقرار رکھیں یا اس سے بالکل دست بردار ہو جائیں ۔ اگر اوّل الذکر تدبیر کے عملی پہلو کو دیانت داری کے مطابق بھی تصور کر لیا جائے تب بھی دقت باقی رہتی ہے اس کی وجہ سے مرہٹہ سرداروں کے حوصلے دوبارہ بڑھ جائیں گے اور انھیں برطانوی حکومت کے خلاف اپنی سازشیں جاری رکھنے کے مزید ذرائع حاصل ہو جائیں گے ۔ ان حالات میں ان کا مقصد محض اپنے علاقے کو واپس لینا ہی نہ ہوگا بلکہ وہ برطانوی حکومت کے خاتمے کی بھی کوشش کریں گے اور ان کوششوں کو عمل میں لانے کے لئے انھیں بلا روک ٹوک فرانسیسی فوجوں سے ملنے کے بھی زبردست ذرائع حاصل ہو جائیں گے ۔ آپ کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ عہدنامۂ بسین کی مجوزہ ترمیم کو پیشوا پسند کرے گا لیکن اگر آپ پونے کے رزیڈنٹ کے مراسلوں کا مطالعہ کریں تو آپ پر یہ بات روشن ہو جائے گی کہ

ابتدا میں پیشوا کو ان شرائط کے منظور کرنے میں جو کچھ بھی تردد یا تامل رہا ہو اب وہ اپنی خیر اسی میں سمجھتا ہے کہ انھیں برقرار رکھا جائے۔ ہمیں اس بات کا اطمینان ہے کہ وہ عہدنامۂ مذکور میں کسی قسم کی ترمیم نہیں چاہتا۔ آپ کی مجلس کے سامنے (۳۸۲)
دو تجویزیں پیش ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک کا مقصد یہ ہے کہ جس دفعہ کی رو سے پیشوا برطانوی حکومت کی اطلاع اور رضامندی کے بغیر کسی غیر ریاست سے کسی قسم کے تعلقات قائم کرنے کا مجاز نہیں ہے اسے منسوخ کردیا جائے۔ اس کے نزدیک اس تجویز کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوگی۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ امدادی فوج کو اس کی ریاست سے باہر کسی مقام پر منتقل کردیا جائے یہ اس سے وہ بہت گھبرائے گا اور یقینی طور پر وہ اسے نامنظور کرے گا۔ ان واقعات کو پیش نظر رکھ کر ہمیں اتحاد کو پورے طور سے ختم کرنے کے مسئلے پر اور مجوزہ ترمیموں کے عملی پہلو پر غور کرلینا چاہیے۔

"جہاں تک کہ اتحاد کے ختم کرنے کا تعلق ہے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ پیشوا مسلمہ طور پر اسے برقرار رکھنے کا خواہشمند ہے تو برطانوی حکومت دیانت داری کے عام اصول کے مطابق اسے ختم کردینے کی کس حد تک مجاز ہوسکتی ہے۔ عہدنامۂ بسین اور بعد کی شرائط سے کمپنی کو جو حقوق اور علاقے حاصل ہوئے ہیں اگر ان سے بھی دست برداری دے دی جائے تو بھی مذکورۂ بالا مسئلے پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑے گا کیونکہ پیشوا کی رضامندی حاصل کئے بغیر تعلقات ختم کردینے کے بعد یہ فرض کرلیا جائے گا کہ دیانت داری کے اصول کے مطابق ہمیں ان تمام حقوق اور علاقوں سے بھی دست بردار ہوجانا چاہیے۔

عہدنامۂ بسین کی رو سے ہمیں جو حقوق اور علاقے حاصل ہوئے ہیں ان کی اہمیت پر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان سے دست بردار (۳۸۳)
ہونے کی صورت میں کمپنی کا کتنا نقصان ہے اور ہمیں کس کس قسم کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس سے صرف یہی نقصان نہیں ہوگا کہ ہمارے ہاتھ سے کچھ علاقہ نکل جائے گا اور ہماری آمدنی کم ہو جائے گی یا ہمارے سیاسی وسائل میں کسی قدر کمی واقع ہوجائے گی بلکہ سب سے بڑا خطرہ تو یہ ہے کہ جو سردار

ہمارے خلاف تلوار اُٹھا چکے ہیں انھیں کے ہاتھ میں یہ سب طاقت چلی جائے گی کیونکہ مذکورۂ بالا واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں ان سرداروں کے خیالات کے مطابق ہونگی نہ کہ پیشوا کی مرضی کے موافق۔

دربار پونہ سے اتحاد ختم کرنے کے مسئلے میں محض پیشوا کے ساتھ ہی وفاداری کا سوال نہیں بلکہ اس کا تعلق حضور نظام دکن سے بھی ہے عہدنامہ میں چند شرائط ان کے موافق بھی موجود ہیں۔ دراصل عہدنامہ بسین کی بنیاد حیدرآباد کے عہدنامۂ مورخہ اکتوبر سنہ ۱۸۰۰ء پر قائم ہے[1] اور ان شرائط کو قبل از قبل ہی حیدرآباد کے عہدنامے میں خفیہ طور پر شامل کردیا گیا تھا۔"

"جہاں تک کہ عہدنامۂ بسین کی مجوزہ ترمیموں کا تعلق ہے (خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ پیشوا اصل شرائط میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں چاہتا) یہ بات صاف ظاہر ہے کہ حضور نظام دکن کو ان تبدیلیوں کی وجہ سے جو ایثار کرنا پڑیگا ان کی جب تک خاطر خواہ تلافی نہ کردی جائے گی وہ اُنھیں منظور نہیں کریں گے۔ ان ترمیموں سے میرے نزدیک جو خرابیاں پیدا ہوں گی ان کے متعلق میں اپنی رائے کا پہلے ہی اظہار کرچکا ہوں۔"

عدم مداخلت کے مسلک پر تبصرہ (۳۸۴)

حکومت ہند کے حکام بالا کو انگلستان میں یہ فکر تھی کہ لارڈ ویلزلی کے کاموں کی ایک حد تک تلافی ہوجائے لہٰذا انھوں نے لارڈ کارنوالس کو باوجود اس کی کمزوری۔ ضعیفی اور خراب صحت کے اس کام پر مامور کیا اور خواہش کی کہ لارڈ ویلزلی کے اصولوں کے خلاف وہ ایک مسلک جاری کرے۔ اس شخص نے ہندوستان پہونچنے کے بعد اپنی بقیہ زندگی اور اپنے قیام کی قلیل مدت میں اپنے ہر کام سے حکام بالا کی اس خواہش کو پورا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ کمپنی نے خاص خاص ہندوستانی ریاستوں سے

[1] یہ ایک ناقابل تردید واقعہ ہے اور ان لوگوں کے اعتراضات کا معقول جواب ہے جو حیدرآباد کے معاہدے کو منظور کرنے کے بعد عہدنامۂ بسین ۱۸۰۲ء کو قبول نہیں کرتے۔

جو قریبی تعلقات قائم کئے تھے ان سے حتی الوسع علیحدگی اختیار کرنے کے لئے مراسلت کی اور ادنیٰ رئیسوں کی حفاظت کی ذمہ داری سے بھی نجات حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھی[1]۔ یہی نہیں بلکہ دریائے جمنا کے مغربی علاقے کے ایک بڑے (۳۸۵) حصے سے دست بردار ہونے کا بھی خیال ظاہر کیا۔ لارڈ کارنوالس کی رائے تھی کہ اس علاقے سے بجائے حفاظت اور فائدے کے کمپنی کو وقت اور پریشانی اور مختلف قسم کے خطرات درپیش آنے کا اندیشہ رہے گا۔ ان سب تجاویز کے عمل میں آجانے سے جو جو کچھ نتائج ظہور پذیر ہوتے ان کا صحیح اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے۔

راجپوت اور سکھ سرداروں سے جو تعلقات قائم ہوئے تھے ان کے ختم ہوتے ہی جو واقعات پیش آئے ان سے مسئلے پر بہترین رائے قائم کرنے کے لئے

---

[1] لارڈ کارنوالس اور اس کے جانشین نے جو مسلک اختیار کیا تھا اس پر ایک ممتاز سرکاری عہدے دار سر بیری کلوز (Sir Berrey closes) نے بہت سخت تبصرہ کیا ہے۔ وہ اپنی تحریر مورخہ ۱۷ اگست ۱۸۰۶ء میں لفٹنٹ کرنل میلکام کو لکھتا ہے کہ لارڈ کارنوالس کے پاس سے جو مراسلہ مجھے موصول ہوا ہے اس کا مضمون اس تحریر سے ملتا ہوا ہے جو انھوں نے آپکو لکھی تھی لارڈ موصوف نے جو اصول بیان کئے ہیں ان سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم ہر قسم کے معاہدوں سے گھرے اور بندھے ہوئے ہیں اور جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے وہ محض ایک بار گراں ہے۔ ہم اپنی کامیابی سے خود خوف زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے پالیگاروں کی مثال یاد آتی ہے۔ یہ لوگ قلعہ کی دیوار شق کر کے ہمیں شکست دیتے ہیں اور پھر خود خوف زدہ ہو کر اسی قلعہ کے دوسرے دروازے سے نکل کر بھاگ جاتے ہیں۔ اگر ہمارے یہی خیالات رہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ جب تک ہماری سرحدوں پر زبردست فوجیں غاتی رہیں گی ہم یہاں نہ محفوظ رہ سکتے ہیں اور نہ پھل پھول سکتے ہیں باوجود اس کے فرانسیسیوں کا نہ اب حیدرآباد میں اثر باقی ہے اور نہ سرنگاپٹم اور علی گڈھ میں ان کا وجود ہے لیکن جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر تمام بندرگاہ فرانسیسی فوجوں کے لئے کھلے پڑے ہیں۔ یہ سب حالات نہایت افسوسناک ہیں جب کبھی ان باتوں کا خیال آجاتا ہے تو طبیعت گھبرا اٹھتی ہے سچ تو یہ ہے کہ میں ان سب باتوں سے تنگ آگیا ہوں۔

معقول مواد ملتا ہے۔ اگرچہ سر جارج بارلو اپنے پیشرو کے قدم بہ قدم چلنا چاہتا تھا اور خود بھی اسی طرف مائل تھا تاہم اس نے نہایت دانشمندی کا کام یہ کیا کہ جن اصولوں پر اس نے شمالی ہند میں عمل کیا تھا ان کا دربار حیدر آباد اور پونہ کے معاملات پر اطلاق نہیں کیا۔ ان سلطنتوں کے ساتھ اس نے جو طرز عمل اختیار کیا اور ان کے تعلقات کی نوعیت اور اہمیت اور ان میں ترمیم کرنے کے خطرناک نتائج کی بابت جن خیالات کا اظہار کیا وہ اس کی دور اندیشی اور معاملہ فہمی پر دلالت کرتے ہیں سر جارج بارلو نے اس موضوع پر اپنے جو خیالات قلمبند کئے ہیں ان سے بہتر اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہو سکتا کہ ہماری ہندوستانی سلطنت کی سیاسی حکومت کے اصول میں تبدیلی کرنے کے جو تجاویز اس وقت درپیش تھے وہ ہر لحاظ سے ناقابل عمل اور خلاف مصلحت تھے۔

چھٹا باب (۳۸۶)

لارڈ منٹو کا دورِ حکومت

ہندوستانی سلطنتوں کی حالت ۱۸۰۷ء

جولائی ۱۸۰۷ء میں لارڈ منٹو ہندوستان پہنچا اس کی آمد کے وقت یہاں کی ریاستوں کی جو حالت تھی اگر اس پر ہم ایک نظر ڈالیں تو اس کے دور کے سیاسی حالات سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

حیدرآباد و پونہ

دربار حیدرآباد و پونہ کی حالت کا خاکہ پچھلے باب کے آخری حصے میں درج کیا جا چکا ہے۔

سندھیا و ہولکر اور پنڈاریوں کا زور

اگرچہ سندھیا اور ہولکر سے معاہدے ہو کر صرف دو سال گزرے تھے تاہم جس مسلک پر ان کی بنیاد رکھی گئی تھی اس کی نوعیت و کیفیت کا اندازہ اس قلیل مدت ہی میں بخوبی ہو گیا تھا۔ مالوے اور راجپوتانہ کے علاقوں پر ان کا بہت برا اثر پڑا تھا۔ ہندوستانی سپاہیوں (۳۸۷)

کی ایک کثیر تعداد جو نہ کسی کے بس میں تھی اور نہ جس پر کسی کی نگرانی تھی پہلے ہی سے ان علاقوں کو تاخت و تاراج کر رہی تھی۔ اب اس کے ساتھ بے قاعدہ سواروں کی وہ جماعتیں بھی شریک ہو گئیں تھیں جنھیں کمپنی نے جنگ ختم ہونے کے بعد برخاست کر دیا تھا۔ یہ لوگ کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے فتح و ظفر یابی سے ان کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ جس جگہ بھی وہ چھاپہ مارتے تھے وہیں سے انھیں تازہ دم سپاہی مل جاتے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ ان سپاہیوں کا اثر ایک خاص دائرے میں محدود رہے گا اور وہیں انکی قوت ختم ہو جائے گی لیکن چند ہی سال کے عرصے میں اس بے قاعدہ جنگ کے شعلے کہیں سے کہیں پہونچ گئے۔ سب سے پہلے راجہ برار ان کے تشدد کا شکار بنا۔ ہولکر کے پاگل پن سے اس کی فوج تو لٹیروں کی مختلف جماعتوں سے مل گئی تھی اور سندھیا نے ان علاقوں میں جہاں اس وقت بدامنی۔ ابتری و غارتگری برپا تھی اپنی فوجوں کو مصروف کر رکھا تھا۔

جن سرداروں کے تحت یہ قزاق کام کرتے تھے ان کے تفصیلی حالات یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں۔ محض اتنا بیان کر دینا کافی ہے کہ یہ قزاق خواہ برائے نام سندھیا اور ہولکر کے تابع ہوں یا امیر خاں کے علم کے نیچے کام کر رہے ہوں یا پنڈاریوں کے سردار چیتو و کریم خاں کے شاگرد ہوں ان سب کے حرکات یکساں تھے ان کے مقاصد سے کچھ ایسی کم مائگی اور کم ظرفی ٹپکتی تھی کہ ان کی دست درازیوں سے نجات حاصل کرنے کی کوئی توقع نہیں نظر آتی تھی۔ فراخدلی۔ بلند حوصلگی اور شان و شوکت کی ہوس ایک ایسی چیز ہے۔ (۴۸۸)
جو انسان کو اگر ایک وقت کسی کی دل آزاری پر مجبور کرتی ہے تو دوسرے وقت رحم و کرم کے جذبے کو بھی ابھارتی ہے۔ اگر وہ بربادی کا باعث ہوتی ہے تو آبادی کے لئے سامان بھی مہیا کرتی ہے مصیبت زدہ سرزمین کے مظلوم اور صلح جو باشندوں کو دلاسا دلاتی ہے اور ان کے دلوں میں امن و امان کی امیدیں پیدا کر کے فتوح کے عارضی تکالیف کو صبر سے برداشت کرنے کے لئے آمادہ کرتی ہے لیکن یہ صفت ان قزاقوں میں بالکل مفقود تھی۔

راجپوتانہ | راجپوتانے کی قدیم ریاستیں۔ جودھ پور۔ اودے پور۔ جے پور

نیز دوسری باجگذار ریاستیں اس وقت نہایت المناک حالت میں تھیں۔ ان کے حالات اور جذبات کا صحیح خاکہ کھینچنے کے لئے دہلی کے رزیڈنٹ کے مراسلے سے[1] اقتباس درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس کے پاس برطانوی حکومت کی امداد حاصل کرنے کے لئے جو درخواستیں متواتر آتی رہتی تھیں ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ "جب میں ان درخواستوں کے جواب لکھتا ہوں تو مجھے اس بات کی تمنا رہتی ہے کہ کوئی شخص تو برطانوی حکومت کے اعتدال پسند مسلک کو اچھا سمجھے۔ یہ لوگ بلا تامل صاف صاف کہتے ہیں کہ انھیں برطانوی حکومت کی حفاظت کا پورا حق حاصل ہے۔ ہندوستان میں ہمیشہ ایک اعلیٰ حکومت رہی ہے جس کی اطاعت صلح پسند ریاستیں قبول کرلیتی تھیں اور اس کے عوض میں وہ اس کی حفاظت کی مستحق بن جاتی تھیں۔ اس طور سے ان کی حکومت بھی قایم رہتی تھی اور ان کا اعزاز بھی برقرار رہتا تھا اور ساتھ ہی وہ نئے نئے سرداروں کے حملوں اور قانون شکن قزاقوں کی دست
(۳۸۹) درازیوں سے بھی محفوظ ہو جاتے تھے۔ اس قسم کی اعلیٰ اور محافظ حکومت کی
جگہ اب برطانوی حکومت نے لی ہے لہذا وہ لازمی و قدرتی طور پر صلح پسند و کمزور طبقے کی محافظ و نگراں ہے۔ جب سے اس قسم کی حفاظت اس نے اپنے ذمہ لینے سے انکار کیا ہے تمام ریاستیں قزاقوں (لٹیروں) نفس پرستوں اور بدترین خلایق کے جور و ستم کی شکار بنی ہوئی ہیں۔"

اودھ۔ بڑودہ میسور۔ ٹراونکور اور بندھیلکھنڈ

اودھ، بڑودہ، میسور اور ٹراونکور کی تحتانی ریاستوں میں امن قائم تھا اور اُن کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ بندھیلکھنڈ کا علاقہ جس کی حالت ابتدا میں امید افزا نہ تھی اب روز افزوں ترقی پذیر تھا۔ اور وہاں کے متعدد سردار برطانوی حکومت کی حفاظت سے مطمئن ہو کر اپنی پرانی عادتیں چھوڑتے جاتے تھے اور مطیع و صلح پسند رعایا بن رہے تھے۔

[1] مراسلہ چارلس مٹکاف مورخہ ۲ر جون ۱۸۱۶ء

دوآبہ اور جمنا کا مغربی علاقہ

دوآبے اور جمنا کے مغربی علاقوں کے رئیسوں اور سرداروں پر بھی ان باتوں کا معقول اثر پڑ رہا تھا۔ جن سرداروں کی قدیم جاگیریں واگذاشت کردی گئیں تھیں یا جنھیں نئی عطا ہوئی تھیں وہ سب نہایت امن میں تھے لیکن جب سے برطانوی حکومت نے سکھ سرداروں کے علاقے سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا تھا وہاں ابتری برپا ہوگئی تھی اور لوگ پریشان تھے۔

نظما کے خیالات اور لارڈ منٹو کا مسلک

جب لارڈ منٹو ہندوستان پہنچا تو ان ریاستوں کی یہ
(۳۹۰) حالت تھی۔ اس شخص میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اعتدال پسند تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں استقلال بھی تھا اور قابلیت بھی لہٰذا اس سے توقع کیجاتی تھی کہ ایک طرف تو وہ کمپنی کے مقبوضات کی حالت درست کردے گا اور جہاں جہاں برطانوی حکومت اپنی زبان ہار چکی ہے وہاں اس کے عہدوپیماں کی پابندی کرے گا اور دوسری طرف بغیر کسی خاص ضرورت کے وہ کوئی ایسی روش ہرگز اختیار نہیں کرے گا جس کی بدولت برطانوی حکومت کو جنگ یا کسی اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑے۔

یہاں اس بات کا اظہار کردینا ضروری ہے کہ سر جارج بارلو نے ہلکر سے جنگ ختم ہونے کے بعد جو کام انجام دیئے تھے ان سے کمپنی کے حکام اعلیٰ بالکل مطمئن نہیں تھے جے پور سے تعلقات منقطع کرنے کے متعلق سوال کیا جاتا تھا کہ یہ فعل کس حد تک اصول وفاداری کے مطابق تھا۔ نظما نے حکومت بنگال کے نام جو مراسلہ روانہ کیا تھا اس میں انھوں نے تحریر کیا کہ "ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہلکر کے خلاف دوران جنگ میں راجہ جے پور نے اپنے معاہدوں کی پابندی نہیں کی لیکن واقعات سے ظاہر ہے کہ جنگ کے آخر حصے میں اس نے لارڈ لیک کی تحریک پر ہماری فوجوں کی مدد کی لہٰذا ہمارے نزدیک اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ لارڈ موصوف نے راجہ سے اس بات کا وعدہ کرلیا تھا کہ برطانوی حکومت کی

حفاظت برقرار رکھی جائے گی اس سے تعلقات ختم کرنا ازروئے انصاف کس حد تک
حق بجانب ہے۔ راجہ مذکور بجا طور پر یہ توقع کر سکتا تھا کہ کمپنی اپنے اس فیصلے کے ساتھ
کم از کم ان تنازعات اور بحث طلب امور کو جو اس کے اور سندھیا کے درمیان سے چلے
آتے تھے اپنے اثر سے طے کرا دے گی۔ یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ کمپنی کے تعلقات کی (۳۹۱)
وجہ سے سندھیا کو راجہ سے سخت نفرت ہو گئی تھی۔ اسی سلسلے میں نظما یہ بھی لکھتے ہیں
کہ "ان باتوں سے ہمارا یہ منشا نہیں کہ جو تعلقات اب ختم ہو چکے ہیں انھیں دوبارہ قائم
کیا جائے اور نہ ہمارے نزدیک اب ایسی کوئی تدبیر ممکن ہے جس کے ذریعہ سے
ہم شمالی ہند میں جنگ کے خطرات مول لئے بغیر راجہ کے مفاد کو کوئی فائدہ پہنچا سکیں
اور نہ اس قسم کے کسی خطرے کے مقابلے کے لئے ہم سر دست تیار ہیں لیکن اس
موقع پر ہم اپنی اس توقع کا اظہار کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ حکومت ہند ہندوستانی
فرماں رواؤں کے تمام معاملات میں آیندہ اس بات کا ضرور خیال رکھے گی کہ اپنے
حلیفوں کے ساتھ وفاداری جو ہمارا شعار رہا ہے اس میں فرق نہ آنے پائے اور
سیاسی نظریوں کو عمل میں لاتے وقت انصاف اور فیاضی کے اصولوں کی سختی سے
پابندی کی جائے۔"

حکام بالا نے اس بات کو بھی ظاہر کر دیا کہ لارڈ لیک نے سندھیا کے وزیر سرجی راؤ (۳۹۲)
گھاٹگے کی بابت جو دفعہ عہد نامے میں طے کی تھی (کہ برطانوی رزیڈنسی پر ظالمانہ
طریقے اور دغابازی سے حملہ کرنے کی وجہ سے اسے کبھی کوئی ملازمت نہ دی جائے)
اس کے منسوخ کر دینے سے جو مضر نتائج اور برے خیالات پیدا ہوں گے انھیں
بھی وہ اچھی طرح محسوس کرتے ہیں۔

نظما نے اس تمام کارروائی کو منظور کرتے ہوئے اس بات کی توقع ظاہر کی
کہ حکومت ہند نہ تو کوئی ایسا کام کرے گی اور نہ سندھیا سے اس قسم کی کوئی مراسلت
کرے گی جس سے مرہٹہ سرداروں کو یہ گمان کرنے کا موقع مل سکے کہ برطانوی حکومت
اپنے معاہدوں کی سختی سے پابندی کرتے ہوئے ڈرتی ہے اور اس سے جو نتائج
ظہور پذیر ہوں گے ان سے گھبراتی ہے۔

ان الفاظ سے نظما کے خیالات کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے۔ ایک طرف تو انھیں

اس بات کا خیال تھا کہ کمپنی کا اعتبار نہ گرنے پائے اور انگریزوں کے متعلق یہ شبہ کسی طرح بھی پیدا نہ ہونے پائے کہ وہ اپنے معاہدوں میں سچے نہیں ہیں۔ دوسری طرف ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ ہر ممکن طریقے سے اس بات کی کوشش کی جائے کہ برطانوی حکومت کے سیاسی تعلقات اور آگے نہ بڑھنے پائیں۔ اب تک اس قسم کے خیالات باقی تھے کہ ہندوستان میں امن برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کمپنی مقتدر اعلیٰ کے تمام اختیارات حاصل کرے۔ کمپنی کے ہاتھ جس قدر طاقت آتی جاتی تھی اتنے ہی انگلستان والے گھبراتے تھے اور مبالغہ آمیز بیانوں پر اعتبار کر کے اس کے متعدد نقائص اور خطرات پر دور بیٹھے بیٹھے بحث کرتے رہتے تھے ان کی خواہش تھی کہ اس بات کا تجربہ کیا جائے کہ کمپنی کی روز افزوں طاقت کو کس حد تک روکا جا سکتا ہے اور اگر ہندوستان میں شہنشاہی قائم کرنے کا خیال کیا جاتا ہے تو وہاں اپنا اقتدار کس حد تک برقرار رکھنا ضروری ہوگا۔ اس بات کے تجربے اور اس کام کی تکمیل کے لئے لارڈ منٹو سے زیادہ بہتر اور محتاط کوئی دوسرا شخص نہیں مل سکتا تھا۔ اس شخص کی ہمیشہ یہی کوشش رہی اور اس نے
(۳۹۳) کبھی اس نے فرق نہ آنے دیا کہ حکام بالا کی خواہشات اور ہدایات کی سختی سے اطاعت
کی جائے اور اس کے ساتھ ہی حکومت کا جو کام اس کے سپرد ہوا ہے اس کے مفاد کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ ان دونوں باتوں کو یکجا کرنے کے لئے اس نے جو کوششیں کیں ان کے نتائج پر ہمیں خاص طور سے غور کرنا چاہیے کیونکہ ان کا اثر محض لارڈ منٹو کے دور کے کاموں ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کے جانشینوں کے دور پر بھی ان کا اثر پڑا۔

حیدرآباد کے معاملات

شہر یار دکن سے جو معاہدے ہوئے تھے ان میں تو لارڈ منٹو کے دور میں کچھ فرق نہ آیا لیکن ریاست کے اندرونی سیاسی معاملات میں چند ایسے اہم تغیرات پیدا ہو گئے جن کا کمپنی کے تعلقات کی نوعیت پر بہت کچھ اثر پڑا۔ میر عالم نے (جسے دوبارہ برسر حکومت کرا دیا گیا تھا) ۱۸۰۸ء کے آخر میں انتقال کیا۔ شہر یار دکن اور دربار حیدرآباد کے لئے یہ نہایت الم ناک

واقعہ تھا لیکن برطانوی حکومت کے لئے بھی یہ کچھ کم افسوسناک نہ تھا۔ پورے تیس سال تک اس اعلیٰ دماغ شخص نے ریاست کا کام چلایا تھا اور اس طویل مدت میں وہ ہمیشہ انگریزوں اور ان کے تعلقات کا حامی رہا تھا۔ ایک ایسے قابل وزیر کی اعانت کی بدولت جس کے خیالات نہایت بلند تھے اور جو اپنے ہم وطنوں سے بوجہ اپنی غیر معمولی قابلیت کے بہت بڑھا ہوا تھا برطانوی قوم کی شہرت وعزت دوبالا ہوگئی تھی۔

میر عالم کے انتقال کے بعد اس کی جگہ کے انتظام کی بابت گورنر جنرل اور سکندر جاہ بہادر میں بہت کچھ مراسلت ہوئی۔ اس کے لئے کئی امیدوار تھے۔ بالآخر مسلمان امرا میں سے منیر الملک کو برائے نام مدارالمہام مقرر کیا گیا لیکن اس عہدے کا تمام کام چندولال کے تفویض ہوا۔ اور وہ دیوان کہلایا۔ (۳۹۴)

انگریزی حکومت چندولال کا تقرر کرنا چاہتی تھی اور سکندر جاہ بہادر منیر الملک کو چاہتے تھے لہذا باہمی سمجھوتے کے خیال سے مذکورہ بالا انتظام عمل میں آیا۔ اس کے ساتھ ایک تحریری معاہدہ یہ طے پایا تھا کہ منیر الملک تمام کام دیوان پر چھوڑ دینگے لیکن باوجود اس قرارداد کے وہ ان تمام اختیارات کے حاصل کرنے کی کوشش سے باز نہ آئے جو ان کے عہدے کے نام کے ساتھ وابستہ تھے منیر الملک کی سازشوں، سکندر جاہ بہادر کے طرز عمل اور دیوان مذکور کے بیکلے اور اوچھے پن کی وجہ سے کمپنی کو حیدرآباد کے معاملات میں سخت دقتیں پیش آتی رہیں۔

اسی عرصے میں کمپنی کے حکام مقیم انگلستان کا ایک مراسلہ مورخہ ۱۴ر ستمبر ۱۸۰۸ء موصول ہوا۔ سر جارج بارلو نے حیدرآباد کے معاملے میں جو طرز عمل اختیار کیا تھا اس سے انھوں نے اتفاق کیا لیکن ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ آئندہ سے حیدرآباد کے اندرونی معاملات میں ہرگز مداخلت نہ کی جائے اور وہاں کی فوج کی ترتیب کا جو مسئلہ چھڑ گیا ہے بجز اس کے اور کسی معاملے سے کچھ سروکار نہ رکھا جائے۔ آخرالذکر مسئلے کی نوعیت جدا ہے۔ اس کا سلطنت آصفیہ اور انگریزی حکومت دونوں کے مفاد سے تعلق ہے، علاوہ ازیں ہمارے نزدیک اس کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس اتحاد کے جو لوگ دشمن ہیں ان کے خیالات اس سے بالکل بدل

جائیں گے۔

ان ہدایات کے منشا کے مطابق برطانوی حکومت ہند نے اپنا پورا اثر حیدر آبادی (۳۹۵)
فوج کی اصلاح میں صرف کر دیا۔ ان فوجوں کی تیاری اور نگرانی اور قواعد سکھانے کا تمام کام برطانوی افسروں کے تفویض کیا گیا اس طور سے ایک باقاعدہ فوج تیار ہو گئی اور اس کے ہر شعبے کا انتظام راست برطانوی رزیڈنٹ کی ماتحتی میں ہو گیا۔

دیوان مذکور کی ذات کو اس فوج سے بہت تقویت حاصل تھی لہٰذا ان جدید رسالوں میں افسروں کے تقررات، ان کی تنخواہوں اور دیگر متعلقہ انتظامات کی بابت رزیڈنٹ جو تجویز بھی پیش کرتا تھا دیوان اُسے بسر و چشم تسلیم کر لیتا تھا اس خدمت کے صلے میں اور وفائی معاہدے کی سختی سے پابندی کرنے کی وجہ سے کمپنی اس کے متعدد حریفوں کے حربوں سے اسے محفوظ رکھتی تھی اور وہ اس کے اثر اور زور کے بل پر سلطنت کے اندرونی معاملات میں نہایت آزادی کے ساتھ اپنی مرضی کے موافق کام کرتا تھا۔

جس حکومت کا تنہا مقصد مالگزاری وصول کرنا ہو اور جہاں کے عہدیداروں کو نہ اپنی شہرت کا خیال ہو اور نہ اپنے رتبہ کا لحاظ وہاں کا تو خدا ہی مالک ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں حیدر آباد کی سلطنت کی خوشحالی میں فرق آگیا۔ امراء ذلیل ہوئے۔ رعایا ظالموں کا شکار بنی۔ ولیعہد (جس کی دماغی حالت کی بابت کچھ عرصہ سے شبہ تھا) بدظن ہو گیا۔ دیوان اور اس کے عزیز و رفیق اور روپیہ کا لین دین کرنے والے مہاجن گلچھرے اڑانے لگے۔ برطانیہ کے نام پر حرف آیا علانیہ طور پر لوگ یہ کہنے لگے کہ انگریزوں کی اعانت و حمایت نے دیوان اور اس کے زیر دستوں کو ان تمام خطرات سے نڈر بنا دیا ہے جن کے خوف سے بدترین مطلق العنان بادشاہ بھی ایک خاص حد سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ یہ رائے بالکل درست اور یہ الزام نہایت بجا تھا۔

حکومت حیدر آباد کی حالت کا یہ نہایت زبردست اور صحیح خاکہ ہے لارڈ منٹو (۳۹۶)
نے دیگر اہم خرابیوں کے اندیشے سے جن کاموں کی منظوری دے دی تھی

ان کے تکلیف دہ نتائج کو اس نے بہت زیادہ محسوس کیا اور ان پر اظہار افسوس کیا لیکن جو حد اس کے لئے مقرر کردی گئی تھی اس سے تجاوز کئے بغیر ان کی اصلاح دقت طلب تھی لہذا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دور میں ان حالات کو سنبھالنے کے لئے کوئی خاص کوشش نہ ہوسکی۔

پیشوا اور اس کے باجگذار جاگیرداروں کے معاملات میں کمپنی کی مداخلت اور تصفیہ

لارڈ منٹو کے دور حکومت میں پونہ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ پیشوا نے اکثر موقعوں پر مرہٹوں کے سابق اتحاد کو دوبارہ قایم کرنے کی کوشش کی لیکن گورنر جنرل نے ہر موقع پر اسے دبا دیا۔ البتہ ریاست کے باجگذار سرداروں کے معاملے میں (جو جنوبی سردار کہلاتے تھے) اسے کسی قدر سختی سے مداخلت کرنی پڑی۔ عہدنامہ بسین کے بعد سے ان جاگیرداروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی بابت سخت بحث چھڑی ہوئی تھی۔ جنرل ویلزلی نے اس خیال سے کہ یہ مسئلہ آیندہ کہیں کچھ رنگ نہ لائے ۱۸۰۳ء کے حملے کے بعد ہی اس کی تحقیقات کرنے اور قطعی طور پر اسے طے کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اس میں برابر تاخیر ہوتی رہی اور لارڈ منٹو بھی اپنی واپسی سے کچھ مدت قبل ہی اسے طے کرسکا۔

چونکہ اس معاملے کا تعلق صرف باجے راؤ سے نہیں بلکہ انگریزوں سے بھی تھا اس لئے اس پر خاص طور سے توجہ کرنی چاہیئے۔ ۱۸۰۳ء کی جنگ میں ان جاگیرداروں نے اپنے جو حقوق کمپنی پر قائم کر لئے تھے ان کے بعد کمپنی (۴۹۷) محض پیشوا کی خوشنودی کے لئے اس بات کو گوارا نہیں کرسکتی تھی کہ وہ اپنی حکومت کے زور سے ان کا خاتمہ کر ڈالے تاہم حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے وہ اس کے جائز حقوق منوانے میں اسے مدد دینے کے لئے آمادہ تھی۔ اس معاملے کی مداخلت کے سلسلے میں کمپنی نے جو مراسلت کی اگر اس سے چند اقتباسات یہاں درج کردئے جائیں تو یہ سب باتیں بہ آسانی سمجھ میں آجائیں گی۔ سر اس مسئلے پر ان باثر جاگیرداروں اور پیشوا کے درمیان ایک عرصۂ دراز سے کشمکش

جاری تھی۔ اگرچہ یہ جاگیردار خاندان پیشوا کی رعیت سمجھے جاتے تھے اور خود انھوں نے کبھی اس سے کبھی انکار نہیں کیا تھا تاہم ان کی اطاعت کچھ عجیب ہی ڈھنگ کی تھی۔ پیشوائے وقت کی شخصیت اور قوت کے لحاظ سے کبھی تو وہ مطیع بن جاتے تھے اور کبھی اس کے حقوق تک دبا بیٹھتے تھے۔ کئی پشتوں سے یہی سلسلہ جاری تھا۔

پونہ کے رزیڈنٹ نے پیشوا اور جنوبی جاگیرداروں کے باہمی اختلافات طے کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کیں:۔

ہر فریق اپنی اپنی پرانی شکایتیں بھول جائے۔ ہر ایک اپنے اپنے مالی مطالبات سے دست برداری دے۔ جب تک کہ جاگیردار وفاداری سے اپنے فرائض انجام دیتے رہیں وہ سرانجامی[1] اراضی پر قابض رہیں لیکن سابق موقعوں پر انھوں نے جو علاقے غصب کر لئے ہیں ان سے دست بردار ہو جائیں۔

اپنی مقررہ فوج کا ایک تہائی حصہ ہمیشہ اپنے کسی رشتہ دار کی کمان میں تیار رکھیں اور جب کبھی انھیں پوری فوج کے ساتھ طلب کیا جائے تو لازمی طور پر حاضر ہوں۔ (۳۹۸)

جب تک وہ ان شرائط کی پابندی کریں گے برطانوی حکومت ان کی نیز ان کے عزیز واقارب کی محافظ رہے گی۔

رزیڈنٹ نے اپنی ان تجاویز کے ساتھ یہ رائے بھی پیش کی کہ اگر جاگیردار انھیں منظور نہ کریں تو انھیں بہ جبر راضی کیا جائے اور اگر پیشوا راضی نہ ہو تو اُسے جتلا دیا جائے کہ اگر ان جاگیرداروں سے اس کی لڑائی ہوئی تو برطانوی فوج اس کی مدد نہیں کرے گی اور اس کے انکار کے بعد کمپنی کو اپنی فوجوں کے ہٹا لینے کا اختیار حاصل ہوگا۔

ان تجاویز کے موصول ہونے کے بعد لارڈ منٹو نے رزیڈنٹ کو لکھا کہ "یہ بات صاف طور سے طے پا چکی ہے کہ ان جاگیرداروں پر پیشوا کی اطاعت لازم ہے اور

[1] وہ اراضیات جو جاگیرداروں کو ان مقررہ فوجوں کے مصارف کے لئے عطا کی جاتی ہیں جنھیں فرمانروا اپنی ضرورت کے وقت ان سے طلب کر سکتا ہے۔

اسے ان کی خدمات پر حق حاصل ہے لہذا جب تک کہ پیشوا کے ان دعاوی کو باطل نہ ثابت کر دیا جائے برطانوی حکومت عہدنامۂ بسین کے مطابق فوجی امداد دینے سے انکار نہیں کر سکتی۔ مجھے اس بات سے پورا اتفاق ہے کہ اگر یہ اختلافات ایک عرصۂ دراز تک جاری رہے تو ان سے بُرے نتائج پیدا ہوں گے۔ پونہ کی آج کل جو حالت ہے اس سے یہ اندیشہ ہے کہ اگر اس زمانے میں کوئی جنگ چھڑ گئی تو پیشوا اپنے معاہدے کے مطابق برطانوی حکومت کو دس ہزار اور چھ ہزار پیادے ہرگز نہیں دے سکے گا[1]۔

(۳۹۹) اس مراسلے میں لارڈ منٹو نے رزیڈنٹ کی باقی تمام تجویزیں منظور کر لیں اور لکھا کہ ان میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے جاگیردار قبول نہ کر سکیں اور وہ برطانوی حکومت کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں لیکن اگر محض سرکشی اور بغاوت کے خیال سے وہ مخالفت کا اظہار کریں تو ان کی سرکوبی اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتی ہے کیونکہ ممکن ہے کہ وہ متحد ہو کر کسی ایسے وقت کھڑے ہو جائیں جب کہ کمپنی ان کے مقابلے کے لئے تیار نہ ہو۔ اگرچہ برطانوی فوجوں کو ان جاگیرداروں کے مقابلے میں بظاہر کوئی دقت پیش نہیں آئے گی تاہم اتنا اہتمام ضرور کر لینا چاہیے کہ اگر ان سے جنگ چھڑ جائے تو نہایت تیزی اور پھرتی سے اس میں کامیابی حاصل ہو سکے۔ اسی خیال سے اس نے مدراس، میسور اور دکن کی چھاؤنیوں کو بھی احکام جاری کر دئے کہ وہ اپنی اپنی فوجیں تیار کر لیں تاکہ اس مراسلت میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو جائے اور کمپنی کے حلیف پیشوا کے جائز حقوق کی مخالفت کو بہ آسانی دبایا جا سکے۔

پونہ کے رزیڈنٹ کو پیشوا کے راضی کرنے میں سخت دقت ہوئی۔ اول تو وہ اس بات کے لئے ہرگز آمادہ نہ تھا کہ کمپنی ثالث بن کر اس کے معاملات طے کرے۔ علاوہ ازیں اس کا یہ مطالبہ تھا کہ جب تک وہ خود ان جاگیرداروں کی تمام اراضی ضبط نہ کر لے گا اور انھیں اپنی فوج کے ذریعے سے دبا نہ لے گا اس

[1] بعد میں ان کی تعداد گھٹا کر پانچ ہزار سوار اور تین ہزار پیادے کر دی گئی تھی۔

وقت تک وہ کسی تجویز پر غور نہیں کرے گا۔ بالآخر یہ دقتیں رفع ہوگئیں اور ریزیڈنٹ نے جاگیرداروں کے نام گشتی چٹھیاں جاری کردیں کہ وہ سب کے سب پنڈرپور میں (۴۰۰)
حاضر ہوں۔ اس کے بعد اس نے امدادی فوج کا ایک بٹالین اپنے ساتھ لیا اور باجی راؤ کے ہمراہ خود بھی مقام مذکور پہ پہنچ گیا۔ جاگیرداروں سے پہلا مطالبہ یہ کیا گیا کہ جن اراضیات پر وہ بلا سند یا پروانے کے قابض ہیں ان سے دست بردار ہو جائیں اس کے ساتھ ہی انھیں یہ بتلا دیا گیا کہ اگر اس کی تعمیل سے انکار کیا گیا یا اسے ٹالنے کی کوشش کی گئی تو جبراً تعمیل کرائی جائے گی اور فوجیں فوراً ان کے خلاف روانہ کردی جائیں گی۔ باوجود اس دھمکی کے جاگیرداروں کی ایک کثیر تعداد نے جس میں آپا صاحب (پرسی رام کا بیٹا) بھی شامل تھا اس کی تعمیل میں تامل کیا لیکن ایک کثیر تعداد فوج کے کوچ[1] کے بعد انھیں محسوس ہو گیا کہ بجز تعمیل کے اور کوئی چارہ نہیں یہ سب مل کر پیشوا کے ساتھ پنڈرپور سے پونہ پہنچے اور وہاں سب معاملات قطعی طور پر طے ہو گئے۔

اس معاملے میں فریقین کے طبائع اور ان کے مفاد کے تصادم کی وجہ سے بہت سخت دقتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اگر اس قدر سخت اور ناطق حکم نہ دیا جاتا تو یہ مسئلہ جس نے حکومت پونہ کو ایک عرصہ سے بے چین کر رکھا تھا بغیر خون بہائے طے نہ ہوتا۔ باوجود اس کے پیشوا کو کمپنی سے یہ شکایت رہی کہ اس نے یہ تمام اراضی بلا کسی شرط کے واگذاشت نہ کرائیں لیکن کمپنی انصاف کی وجہ سے مجبور تھی کیونکہ وہ اپنی (۴۰۱)
قوت کو ظلم و تشدد کا آلہ بنائے بغیر اس مقصد کو حاصل نہیں کرسکتی تھی۔

سندھیا

اس دور میں سندھیا کے دربار سے جو مراسلت رہی وہ نہایت معمولی قسم کی تھی۔ سرجیارجنگھم (Serjejurgham) کے معاہدے کے بموجب جو معاملات فیصلہ طلب تھے ان میں سے چند کے متعلق کسی قدر اختلاف رائے واقع ہوا لیکن وہ سب نہایت خوش اسلوبی سے طے ہو گئے

[1] یہ فوج آپا صاحب کے قلعے کی طرف بڑھی اور قلعہ فتح ہو گیا لیکن جو مقابلہ یہاں ہوا اس کی ذمہ داری آپا صاحب پر نہیں عاید کی گئی بلکہ وہاں کے قلعہ دار کو اس کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔

اور سندھیا کے تعلقات برطانوی حکومت سے خوشگوار رہے البتہ پنڈاریوں سے کے جن جتھوں نے دکن پر دھاوے شروع کر دئیے تھے انھیں وہ ضرور مدد دیتا رہا۔

ہلکر

جسونت راؤ ہلکر ۱۸۰۶ء میں مالوہ سے واپس ہونے کے بعد پاگل ہوگیا[1] اور اس کی ریاست میں کچھ ایسی بدنظمی پھیل گئی کہ دوسری ریاستوں سے اس کے تعلقات محض برا ئے نام باقی رہ گئے۔

امیر خاں

امیر خاں کا ذکر بھی پہلے ہو چکا ہے۔ جسونت راؤ کے پاگل ہونے کے بعد اس مسلمان سردار نے اس کے دربار میں اپنا اثر جمانے کی کوشش کی لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد وہ کثیر تعداد فوج لے کر اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے دوسری سمت میں روانہ ہوگیا۔ اولاً اس نے ہلکر کی طرف سے راجہ برار سے ایک کثیر واجب الادا رقم کا مطالبہ کیا اور اس کی ریاست پر حملہ کرنے کی دھمکی دی۔

اگرچہ راجہ برار نے کمپنی سے مدد طلب نہیں کی تاہم گورنر جنرل نے یہ پسند نہ کیا (۴۰۲)
کہ امیر خاں کی کثیر التعداد فوج جس میں اب پنڈاری بھی شامل ہو گئے تھے نربدا کے ساحل پر ناگپور کے راجہ کو مغلوب کرنے کے لئے پڑاؤ ڈال دے اور برطانوی حکومت اس کی طرف آنکھ اٹھا کے نہ دیکھے۔ لارڈ منٹو نے اپنی رائے میں اس موقع پر جو روش مناسب سمجھی اس کی بابت وہ لکھتا ہے کہ اگرچہ حکمت عملی کے لحاظ سے ہمیں ہر ایسے انقلاب میں جس کا مقصد دکن کی کسی خاص ریاست کا خاتمہ کرنا ہو دخل دینے کا حق حاصل ہے تاہم اس وقت صرف یہ سوال درپیش نہیں ہے کہ آیا ہمیں از روئے انصاف یا مصلحت راجہ برار کو اس کی ریاست کی حفاظت کرنے یا اس کے کسی علاقے کو اسے واپس دلانے میں مدد کرنی چاہیئے یا نہیں بلکہ حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ کیا ہم اس بات کو گوارا کر سکتے ہیں کہ ایک بلند حوصلہ مسلمان سردار (جس کے پاس اس قدر زبردست اور کثیر التعداد فوج موجود ہے کہ اس کا مقابلہ بجز کمپنی کے اور کوئی قوت نہیں کر سکتی) راجہ مذکور کی ریاست کا خاتمہ کر کے اپنی ایک جدید سلطنت قائم کرے جو ہماری حلیف

---

[1] اس واقعہ کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

اعلیحضرت نظام دکن کے مقبوضات سے ملحق ہو اور جس کے قیام سے اس بات کا اندیشہ ہو
کہ یہ سرداران کے ہم مذہب ہونے کے باعث اپنی جدید قوت اور اس کے وسائل
پر حاوی ہونے کے بعد ایک ایسا اتحاد قائم کرلے گا جس کا خاص مقصد یہ ہوگا کہ
حیدرآباد سے برطانوی حکومت کے تعلقات منقطع ہو جائیں اور جس کے ساتھ اس بات
کا بھی امکان ہو کہ شہر یار دکن خود بھی اسے پسند کریں گے اور ان کی سلطنت کی ایک
با اثر جماعت اس کی خاص مؤید ہوگی۔ ایسے سوال کا میرے نزدیک صرف ایک (۲۰۳)
ہی جواب ہو سکتا ہے۔"

مذکورہ بالا دلائل پیش کرنے کے بعد لارڈ منٹو نے یہ فیصلہ کیا کہ مصلحت اسی میں ہے
کہ امیر خاں کو آگے بڑھنے سے روکا جائے لہٰذا اس نے فوراً کرنل کلوز کی کمان میں
ایک معقول فوج برار کی مشرقی سرحد پر روانہ کر دی اور بنگال کی فوج کا ایک دستہ
لفٹنٹ کرنل مارٹنڈیل کی کمان میں بندیلکھنڈ کی جنوب مغربی سرحد پر متعین کر دیا
تاکہ اس علاقے کی حفاظت کا بھی انتظام ہو جائے اور وہ وقت ضرورت دشمن کے
خلاف حملہ کرنے میں شریک بھی ہو سکے۔

راجہ برار نے برطانوی حکومت سے مدد طلب نہیں کی تھی لیکن جب یہ فوج
پہنچی تو وہ بہت خوش ہوا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کا معاوضہ نہیں لیا جائیگا
تو یہ خوشی اور بھی بڑھ گئی گورنر جنرل کا یہ فیصلہ کہ اس خدمت کے عوض میں راجہ
سے نہ کوئی نقد رقم وصول کی جائے اور نہ ریاست کے کسی علاقے کا مطالبہ کیا
جائے دو وجوہ پر مبنی تھا۔ اوّل یہ کہ ہم راجہ کی اعانت محض اپنے مفاد کی خاطر
کر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ گزشتہ جنگ سے سندھیا اور ہلکر دونوں کے مقابلے
میں راجہ مذکور کا بہت زیادہ نقصان ہوا ہے اور اس کا بہت بڑا علاقہ ضبط ہو چکا ہے
لہٰذا اس خدمت کو ان تمام مطالبات کا معاوضہ سمجھنا چاہیئے جو وہ ہماری فیاضی
پر بھروسا کر کے ہم سے کر سکتا ہے۔

جب کرنل کلوز کی فوج ایک جگہ جمع ہو گئی تو لارڈ منٹو نے امیر خاں کو لکھا
کہ ناگپور کا علاقہ خالی کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی ہلکر کو بھی ان واقعات (۲۰۴)
کی اطلاع دی گئی اور اس سے دریافت کیا گیا کہ آیا امیر خاں اس کی حکومت کے

احکام کے مطابق کام کر رہا ہے یا اپنے فعل کا وہ خود ذمہ دار ہے امیر خاں نے جواب دیا کہ کمپنی کو ا... کے معاملات میں مداخلت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ دھمکی بھی دی کہ "انگریزی فوجیں میری طرف بڑھیں تو میں برطانوی علاقے پر حملہ کر دوں گا۔"

ہلکر کے وزیر نے سردار مذکور کی کارروائی سے اپنی حکومت کی بے تعلقی ظاہر کی اور تحریر کیا کہ وہ خود اس کے خلاف ہے اس زمانے میں ہلکر کے دربار میں امیر خاں کے اثر کو زائل کرنے کی جو تدبیریں ہو رہی تھیں ان کی مدافعت کے لئے اسے مجبوراً اپنی تمام فوجیں ناگپور کے سرحدی مقامات سے ہٹا لینی پڑیں۔

اس مدت میں لفٹنٹ کرنل مارٹنڈیل کرنل کلوز سے مل گیا تھا۔ ان دونوں نے مل کر مالوہ کا رخ کیا اور امیر خاں کے دارالحکومت سرونج نیز اس کے دیگر مقبوضات پر اپنا قبضہ جما لیا۔ ان واقعات کے بعد امیر خاں کی قوت کا خاتمہ یقینی معلوم ہوتا تھا لیکن صدر حکومت نے اپنے ارادے بدل دئے اور یہ سردار اس وقت بچ گیا۔

گورنر جنرل نے جب راجہ برار کی ریاست کے معاملے میں دخل دینے کا ارادہ کیا تھا تو اس کا خیال تھا کہ یا تو امیر خاں کی قوت کا خاتمہ کر دیا جائے یا (کسی ترکیب سے) اس کی فوج کو منتشر کر دیا جائے۔ انھیں خیالات کے مطابق کرنل کلوز کو ضروری ہدایات روانہ کئے گئے تھے لیکن اس مسئلے پر مزید غور کرنے کے بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ ان (۴۰۵)
ارادوں کو عمل میں لانے سے تو سیاسی تعلقات میں سخت پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی ایک وسیع پیمانے پر فوجی کارروائی کرنی پڑے گی۔ متعدد لوگوں کے مفاد پر اس کا اثر پڑیگا اور کمپنی کے مالیات پر بھی بہت بار پڑے گا۔ ان خیالات سے متاثر ہو کر اس نے اپنا دائرۂ عمل محدود کر دیا اور امیر خاں کو راجہ برار کے علاقہ سے نکال دینے ہی پر اکتفا کیا لیکن اس کے ساتھ ہی کرنل کلوز کو اس بات کا اختیار دے دیا کہ اگر وہ یہ دیکھے کہ مذکورۂ بالا خطرات کے اندیشے کے بغیر اصلی مقصد حاصل ہو سکتا ہے تو وہ اپنی مرضی کے موافق مناسب کارروائی کر سکتا ہے۔ کرنل کلوز اگرچہ ایک قابل شخص اور بہادر سپاہی تھا تاہم وہ بہت محتاط تھا لہٰذا اگر ان حالات میں اس نے اپنی مرضی کے موافق کام کرنے اور اس قدر سخت ذمہ داری کو تنہا اپنے اوپر لینے سے

انکار کر دیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس نے بھی اپنی تمام کوششیں محدود کر دیں اور سر دست راجہ مذکور کے علاقے کی حفاظت کا انتظام کر کے واپس ہو گیا امیر خان اپنی سالم فوج بچا لے گیا اور جدید فتوح اور ظلم و تشدد کی نئی کارروائیوں میں مشغول ہو گیا۔

گورنر جنرل نے اس کے بعد محسوس کیا کہ اگر راجہ برار کی ریاست اسی طرح غیر محفوظ رہی تو آئندہ سال پھر اسی قسم کا خطرہ پیش آئے گا لہٰذا اس نے راجہ کے
(۴۰۶) علاقے میں برطانوی فوج کا ایک دستہ مستقل طور سے رکھنے کی بابت مراسلت شروع کر دی۔ راجہ نے شروع میں اس تجویز کی مخالفت کی لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ کرنل کلوز کی فوج کو اپنی چھاؤنی پر واپس ہونے کا حکم مل گیا ہے تو وہ بہت پریشان ہوا اور خود اس معاملے کو طے کرانے کا خواہشمند ہو گیا مگر شرط یہ لگائی کہ اس فوج کے مصارف اس پر قطعاً نہ ڈالے جائیں۔ گورنر جنرل اس پر راضی نہیں ہوا اور اس سے مطالبہ کیا کہ اس فوج کے مستقل مصارف کے علاوہ جو رقم[1] اس کی ریاست کے تحفظ کی غرض سے صرف ہو گی وہ اسے ادا کرنی ہو گی۔ راجہ نے بہت کچھ پس و پیش کے بعد اس تجویز کو قبول کر لیا لیکن اس کی رضامندی کے اظہار سے قبل ہی فوجیں واپس بلا لی گئیں تھیں۔ اسی مدت میں لارڈ منٹو جاوا پر فوج کشی کرنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس طرح اس معاملے میں کوئی خاطر خواہ فیصلہ نہ ہو سکا۔

جب ان واقعات کی اطلاع انگلستان پہنچی تو حکام بالا نے ناگپور کے راجہ سے مجوزہ شرائط پر معاہدہ کرنے کی تجویز سے اتفاق کیا۔ مجلس رازدار کے مراسلے میں[2] یہ بات صاف الفاظ میں درج ہے کہ "گورنر جنرل با اجلاس کونسل نے راجہ برار کو بچانے کی غرض سے جو مداخلت کی وہ محض اپنے تحفظ کی غرض سے تھی لہٰذا اسے نہ خلاف قانون کہا جا سکتا ہے اور نہ اس سے ان احکام کی خلاف ورزی

---

[1] یعنی وہ زائد بھتہ جو فوجوں کو میدان جنگ میں پڑاؤ ڈالنے کے وقت دیا جاتا ہے

[2] مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۸۱۱ء

ہوتی ہے جن کی رو سے ہندوستانی ریاستوں کے باہمی تنازعات میں مداخلت کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔" اسی تحریر میں مجلس راز دار نے اپنا یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ جس قوت کے تشدد سے مجبور ہو کر ہمیں آیندہ تلوار اُٹھانے کا اندیشہ لگا رہے اسے مغلوب نہ کرنے کی مصلحت ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ برطانوی مفاد کی مستقل حفاظت کا مسئلہ ہندوستانی ریاستوں کے کسی توازن پر (جو تمہارے خیال میں ہو) ہرگز قائم نہیں ہے کمپنی کی طاقت کا حال ہماری بحری قوت کا سا ہے۔ ہمیں اپنی قوت کبھی کسی ناانصافی یا جور و ستم کے کام میں استعمال نہیں کرنی چاہیئے لیکن (۴۰۷)
اس کے ساتھ ہی وہ اس قدر زبردست اور اعلیٰ و برتر ہونی چاہیئے کہ اگر تمام ہندوستانی ریاستیں اس کے خلاف متحد ہو جائیں تو بھی وہ اس پر حاوی نہ آسکیں ورنہ اغلب یہ ہے کہ ایک نہ ایک دن اس کا خاتمہ ہو کر رہ جائے گا۔

لارڈ منٹو اور کمپنی کے حکام بالا نے اس اہم موقع پر جو طرز عمل اختیار کیا اس سے زیادہ کوئی زبردست ثبوت اس بات کا نہیں ہو سکتا کہ عدم مداخلت کے مسلک پر پورے طور سے تھوڑے سے عرصے تک بھی عمل نہیں کیا جا سکتا۔ گورنر جنرل نے اپنے مراسلے مورخہ یکم دسمبر ۱۸۰۹ء میں اس بارے میں نہایت بجا طور پر لکھا ہے۔ کہ "شاید اس بات پر کافی غور نہیں کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی ہر ریاست ایک مطلق العنان فوجی قوت ہے اور یہاں کے ہر فرمانروا اور ہر سردار کا پہلا فرض یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ جنگ کے ذریعہ سے فتوحات حاصل کرے۔ اسی میں اسکی شان و عظمت ہے اور اسی پر اس کی نیک نامی اور شہرت کا انحصار ہے لہذا اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان کی فوجی طاقتوں اور یہاں کے سرداروں کی ہوس اور حوصلوں کی کوئی انتہا نہیں ہے اور محض ان کی مجبوری ہی ان کے دائرۂ عمل کو محدود کر سکتی ہے تو بے جا نہ ہو گا کیونکہ یہ خیال محض تعصب پر مبنی نہیں ہے جو انسان کی فطرت سے ہے اور نہ صرف عام تجربے پر قائم ہے بلکہ ایک خاص طبقے کا ایمان ہے جو مسلمہ (۴۰۸)
عملی اصول اور صحیح خیالات کا نتیجہ ہے۔"

پنڈاریوں کے حملے

پنڈاریوں کی قوم جو ایک مدت دراز سے قزاقی کا پیشہ کرتی تھی اور مرہٹوں کی فوج کا ساتھ دیا

کرتی تھی اس زمانے میں یکایک ایک آزاد طاقت بن گئی۔ ان لوگوں نے ہلکر اور سندھیا کی جو اطاعت قبول کرلی تھی وہ بھی اب محض برائے نام رہ گئی۔ وہ اپنے اپنے سرداروں کے تحت کام کرتے تھے اور ملک کے ہر حصے کو تاخت و تاراج کرتے پھرتے تھے۔ جس جگہ انھیں کامیابی و فتحمندی حاصل ہوتی تھی وہیں کے باشندے افلاس و مصیبت سے تنگ آکر ان کے ساتھ ہو لیتے تھے اور اس طرح ان کی تعداد دن دونی رات چوگنی ہوتی جاتی تھی۔

جب برطانوی فوجوں نے کرنل کلوز کے تحت مالوے پر حملہ کیا تھا اس وقت ان قزاقوں میں بڑی ہل چل مچ گئی تھی لیکن کرنل مذکور کی واپسی کے بعد وہ پھر متحد ہو گئے اور اب پہلے سے بھی زیادہ دلیر بن گئے۔ راجہ برار کے اکثر علاقوں پر انھوں نے چھاپہ مارا اور اس کے دارالحکومت کے ایک چوتھائی حصے کو آگ لگادی ۱۸۱۲ء میں ان کی ایک جماعت نے مرزاپور کے زرخیز ضلع میں سے گزر کر کمپنی کے علاقے پر بھی دست درازی کی اور وہاں سے مال و متاع لوٹ کر لے گئے۔

گورنر جنرل نے اپنے مراسلے میں پنڈاریوں کے تشدد پر بحث کی اور ان سب کا تعلق امیر خاں کے ارادوں اور اس کی کارروائیوں سے منسوب کر کے حکام کمپنی کو لکھا کہ "اب اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہیئے کہ آیا ہمارے لئے یہ زیبا ہے کہ ہم سختی سے عدم مداخلت کے اصول کی پابندی کریں اور اپنی آنکھوں سے شمالی ہند میں بدامنی و ابتری اور جور و ستم کے مناظر دیکھتے رہیں یا مصیبت زدہ خلائق کی فریاد سنیں اور ان کمزور اور بے بس ریاستوں کی اعانت پر کمربستہ ہو جائیں جو ایک جاہ طلب قزاق کے ظلم و ستم اور جور و تشدد سے نجات حاصل کرنے کے لئے نہایت عجز کے ساتھ ہماری مدد طلب کر رہی ہیں" (۴۰۹)

لارڈ منٹو نے اس کے بعد ایک اور مراسلہ صیغہ راز میں لکھا چنانچہ جن اسباب کی بنا پر وہ راجہ ناگپور سے معاہدہ کرنے کا خواہشمند تھا ان کا حوالہ دیتے ہوئے وہ پنڈاریوں کا بھی ذکر کرتا ہے" راجہ ناگپور کے علاقے کی سرحد پر ان قزاقوں کے قیام سے جو کیفیت پیدا ہو گئی ہے وہ قابل غور ہے یہ علاقہ ہمارے حلیف پیشوا اور اعلیحضرت نظام دکن دونوں کی سلطنتوں سے ملحق ہے اور ہمارے مقبوضات بھی یہاں سے

کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں۔ اِن قزاقوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ انکی تنظیم بھی پہلے سے بہت بہتر ہے۔ انھیں اپنے بے باکانہ حملوں میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے اس سے انکی ہمت بڑھ گئی ہے۔ فتحمندی اور لوٹ مار کا ایک ایسا زبردست آلہ ان کے ہاتھ میں ہے جس سے ہر جاہ طلب اور قسمت آزما سردار متاثر ہو جاتا ہے یہی نہیں بلکہ بیرونی غنیم کو بھی اس سے ترغیب ہو سکتی ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ بہت سی اور باتیں بھی ہیں اِن سے نہ آپ حضرات ناواقف ہیں اور نہ ان کے یہاں بیان کرنے کی چنداں ضرورت ہے لہذا ہمارے لئے لازم ہے کہ ان سب حالات سے متاثر ہو کر ان قزاقوں کو دبانے کے لئے وسیع پیمانے پر کوشش کریں اس میں مستعدی درکار ہے اور عجلت بھی ضروری ہے۔ اس مسئلے کی طرف ہمیں بہت خاص توجہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ہمیں بہت جلد کچھ نہ کچھ تدابیر اختیار کرنا پڑیں گے (۱۰۱)
اس قسم کے مسائل پر کامل غور و خوض ضروری ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں سیاسی و فوجی دونوں انتظامات کرنے پڑیں گے اور جان توڑ کوشش کرنی ہوگی۔ اسلئے سردست عملی کارروائی ملتوی کرنی ضروری ہے اور میرے نزدیک اس وقت اس پر تفصیلی بحث کرنا بھی قبل از وقت ہوگا۔ یہاں اِن سب باتوں کے بیان کرنے کا منشا یہ ہے کہ آپ دریائے نربدا کے ساحل پر برطانوی فوج رکھنے کی ضرورت کا صحیح اندازہ کرلیں"

اگرچہ لارڈ منٹو کبھی کسی ایسے کام کے لئے آمادہ نہیں ہوتا تھا جسکی بدولت حکام بالا کی قبل از قبل منظوری حاصل کئے بغیر حکومت ہند کو کسی جنگ میں مبتلا ہونا پڑے تاہم اس نے کئی موقعوں پر یہ ظاہر کردیا کہ جس سلطنت کا کام اسکے تفویض کیا گیا ہے اس کے وقار یا مفاد کی خاطر جب کبھی فوری عملی کارروائی ضروری ہوگی تو اس کے نزدیک اس اصول کا لحاظ ختم ہو جائے گا۔

جب سر جارج بارلو نے جنوبی ستلج کے ادنیٰ سرداروں کو کمپنی کی حفاظت سے محروم کردیا تو راجہ رنجیت سنگھ والی لاہور نے جو ہمیشہ اپنی قوت بڑھانیکی فکر میں لگا رہتا تھا ان کی طرف توجہ کی اور ان کے باہمی تنازعات میں دو موقعوں پر مداخلت کر کے انھیں اپنی سرداری تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔ اس قسم کی بے جا مداخلت

کی ابتدا میں کچھ پروا نہیں کی گئی لیکن جب لارڈ منٹو نے یہ دیکھا کہ وہ باضابطہ طور پر
اپنی سلطنت بڑھانے کی ترکیبیں کر رہا ہے اور برطانوی حکومت کا کچھ لحاظ بھی نہیں (۴۱۱)
کرتا تو اس نے راجہ مذکور کی مزید ترقی کو روکنے کا تہیہ کرلیا اور کمپنی کے حکام بالا کو
لکھا کہ "مجھے اب اس امر کا یقین ہوگیا ہے کہ ایسے بلند حوصلہ والی ریاست کو جس کا
تنہا مقصد ملک گیری ہو کمپنی کے مقبوضات تک پہنچنے کی اجازت دینے سے جنوبی
ستلج کے سرداروں کی حفاظت اپنے ذمہ لے لینا زیادہ مناسب اور باعث سہولت
ہے۔" یہ ایک نہایت ہی مناسب رائے تھی لہٰذا اسی پر عمل ہوا اور دریائے جمنا
اور ستلج کے درمیانی علاقے میں جو سکھ سردار آباد تھے ان سب پر کمپنی کی شہنشاہی کا
اعلان کر دیا گیا۔ جب کمپنی کی سرحد پر ایک زبردست فوج جمع کی گئی تو رنجیت سنگھ
کو سخت تعجب ہوا اور وہ کسی قدر پریشان بھی ہوا اور شروع میں اس نے مقابلہ
کا بھی خیال کیا لیکن مزید غور کے بعد اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور جس قلعے پر
اس نے قبضہ کیا تھا وہاں سے بھی اپنی فوج ہٹالی۔

اس کے بعد انگریزی فوج کا ایک معقول دستہ بمقام لدھیانہ جو دریائے ستلج
کے بائیں کنارے پر واقع ہے مستقل طور پر سرڈیوڈ اختر لونی کی کمان میں رکھدیا
گیا اور باقی افواج اپنی اپنی چھاؤنی کو واپس ہوگئیں۔

لارڈ منٹو اپنے مراسلے میں ان فوجوں کی نقل و حرکت کا ذکر کرتے ہوئے
جن کی بدولت برطانوی سفیر متعینہ دربار لاہور کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی تھی
اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے کہ رنجیت سنگھ کو دریائے ستلج و جمنا کے درمیانی
علاقے پر قبضہ جمانے کی ترغیب محض اس بات سے ہوئی تھی کہ جنوبی سرداروں (۴۱۲)

لہ لارڈ منٹو نے اپنے ایک خط مورخہ ۱۵۔ دسمبر ۱۸۰۸ء موسومہ مجلس رازدار
میں نہایت قابلانہ طور سے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس کے پیشرو نے دو سال قبل جس حکمت عملی پر عمل
کیا تھا اس کا اب برقرار رکھنا قطعاً ناممکن ہے کیونکہ اس پر عمل کرنے سے ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنا
پڑے گا جن کی مدافعت کے لئے اسے اختیار کیا گیا تھا۔

سلہ مورخہ ۱۵۔ اپریل ۱۸۰۹ء بنام مجلس رازدار۔

پر مرہٹوں کو جو حقوق حاصل تھے (اور جن کے اب ہم وارث تھے) انکے استعمال کرنے کا ہم نے خیال ترک کر دیا تھا۔

اسی سلسلہ میں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "ہم نے ان کے سرداروں کو اپنی حفاظت سے محروم کرنے میں جلدی کی لیکن باوجود اس کے جب راجہ رنجیت سنگھ نے پہلی مرتبہ ان کے علاقہ پر حملہ کرنے کا خیال کیا تھا اگر اس وقت ہم ان کی حمایت کا اظہار کر دیتے یا جب گزشتہ سال اس نے ان پر دوبارہ حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور ان سب نے مل کر ہماری مدد چاہی تھی اس وقت ہم انھیں بچانے کا خیال ظاہر کر دیتے تو ہمارے ارادہ کا محض اظہار ہی رنجیت سنگھ کو اپنے ارادہ سے باز رکھنے کے لئے کافی ہوتا۔ اس بات کا تو کبھی گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم اس علاقے کو اپنی نگرانی میں رکھنے کا اعلان کر دیں اور فوج جمع کر کے اپنے ارادہ پر قائم رہنے کا ثبوت بھی دیں اور رنجیت سنگھ اس کے بعد بھی اپنی بلند حوصلہ تجاویز پر عمل کرنے کا خیال کرے۔

فرانسیسی حملے کے خوف کی وجہ سے اس زمانے میں ایران اور کابل کو وفد روانہ کئے گئے تھے۔ اسی غرض کے لئے ایک وفد لاہور بھی بھیجا گیا اور اتحاد قائم (۴۱۴) کرنے کی خواہش کی گئی لیکن رنجیت سنگھ اپنی جہالت کی وجہ سے نہ ہمارا مقصد سمجھ سکا اور نہ ہماری درخواست کا مفہوم اس کی سمجھ میں آیا اغلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن مقاصد کی وجہ سے ہم اپنی حاصل کردہ اثر سے دست بردار ہو گئے تھے اور جن اصولوں کی بنا پر ہم نے اپنے مطیع باجگذاروں کو نہ صرف اپنی حفاظت سے محروم کر دیا تھا۔ بلکہ انھیں دوسروں کا محکوم بنتے ہوئے بھی دیکھا تھا انھیں بھی وہ غلط سمجھا ان غلط فہمیوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہمیں لاہور کے اس فرمانروا سے جنگ کرنی پڑتی اور اس کے بعد غالباً اس کی طاقت کا خاتمہ ہو جاتا اور دریائے سندھ کے ساحل پر اگر ہماری حکومت قائم نہ ہوتی تو کم از کم ہمارا اثر و اقتدار ضرور قائم ہو جاتا۔ لیکن لارڈ منٹو نے اپنی دانشمندی اور مستقل مزاجی سے ان تمام خطرات کو دور کر دیا۔ ستلج کے جنوبی سرداروں کو دوبارہ کمپنی کی حفاظت میں لینے سے دریائے جمنا اور ستلج کے درمیانی علاقے میں امن و سکون قائم ہو گیا اور جس قسم کے تعلقات رنجیت سنگھ اور برطانوی حکومت کے

مابین ہونے چاہیئے تھے وہ بھی ایک معاہدے کے ذریعے سے قایم ہوگئے برطانوی حکومت نے وعدہ کیا کہ وہ اس کی سلطنت اور رعایا کے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی اور اس نے اپنی طرف سے اس بات کا اطمینان دلایا کہ دریائے ستلج کے بائیں کنارے پر اس کے جو مقبوضات واقع ہیں ان کے اندرونی انتظامات کے لئے جو فوج درکار ہوگی اس سے زائد فوج وہاں نہ رکھی جائے گی۔ جب لدھیانے میں فوج رکھی گئی تو خیال پیدا ہوا کہ اس قدر آگے بڑھنے سے کہیں رنجیت سنگھ کو حسد اور پریشانی نہ ہو لیکن اگر ابتدا میں اس قسم کا کوئی خیال تھا بھی تو وہ بہت جلد رفع ہوگیا ہوگا کیونکہ جو فوج وہاں بھیجی گئی تھی اس کا ایک بڑا حصہ واپس بلا لیا گیا اور انگریزی حکومت کی طرف سے جو کچھ شبہات اس کے دل میں پیدا ہوگئے تھے وہ رفع ہوگئے اور اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوگیا کہ اگرچہ انگریزوں کے پاس نہ طاقت کی کمی ہے اور نہ ہمت کی تاہم جس وقت ان کا مقصد (جس کا انھوں نے اعلان کیا تھا) حاصل ہوگیا تو انھوں نے اس کے بعد آگے بڑھنے کا مطلق خیال نہیں کیا۔ (۲۱۴)

دربار ایران میں برطانوی سفارت اور لارڈ منٹو کے خیالات

۱۸۰۸ء میں شہنشاہ نپولین کا ایک وفد ایران پہنچا جس کا خاص مقصد یہ تھا کہ دربار ایران سے ایسے تعلقات پیدا کئے جائیں جن کی بدولت انگریزوں کے خلاف ہندوستان پر حملہ کرنے میں سہولت ہو۔ اس خبر سے حکومتِ ہند پر ایک خوف طاری ہوگیا اور گورنر جنرل نے کمپنی کے ایک ذی مرتبہ عہدہ دار کو پورے اختیارات دیکر فوراً ایران روانہ کردیا تاکہ وہ وہاں پہنچ کر غنیم کی باتوں کو (جو کچھ بھی ان کی نوعیت ہو) پورے طور سے رد کرسکے۔ حکومت انگلستان نے بھی بادشاہ کی طرف سے ایک سفیر اس مقصد کے لئے روانہ کردیا تھا اور مجلس راز دار نے بھی اپنی باتیں اسے سمجھا دی تھیں۔ اس طور سے گورنر جنرل کے سفیر کے کام میں رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ یہ سفیر بوشہر تک پہنچا تھا کہ اسے شاہ ایران کا حکم ملا کہ جو کچھ

اسے کہنا ہے وہ ولی عہد سے (جو شیراز کا گورنر تھا) کہہ سکتا ہے۔ طہران آنے کی
ضرورت نہیں۔ سفیر مذکور اس بات پر راضی نہیں ہوا۔ اس نے خود آگے بڑھنے سے انکار
کردیا اور ایسی حالت میں جبکہ سابق معاہدوں کے خلاف فرانسیسی سفیر دربار میں مقیم تھا اور
اسے راست شاہ سے مراسلت کرنیکا شرف حاصل تھا اس نے ایک ولایت کے مستقر
پر ولیعہد سے گفتگو کرنا انگریزی قوم کے اقتدار کے خلاف سمجھا۔ اس نے ایک
عرضداشت طہران روانہ کی اور ان تمام باتوں کے علاوہ بادشاہ سلامت کی (۱۱۵)
رائے سے اتفاق نہ کرنے کے دیگر وجوہ بھی بیان کئے۔ جب اس عرضداشت
کا بھی کچھ اثر نہ ہوا تو وہ جہاز کے راستے سے کلکتے واپس ہوگیا۔ اس کے واپس
آنے کے بعد ایک فوجی مہم کی تیاری کا حکم دیدیا گیا اور خلیج فارس کے ایک
جزیرے پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ عام خیال یہ تھا کہ فرانسیسی بہت جلد اپنے
وعدے بھول جائیں گے اور حکومت ایران کو مجبوراً انگریزوں سے (جنھیں وہ
اس وقت ذلیل کررہی تھی) دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی درخواست کرنی پڑیگی
اور جب تک یہ صورت پیش نہ آئے گی اس سے کوئی معاہدہ ایسا نہیں ہوسکتا
جس پر اعتبار کیا جاسکے یا جس سے کسی فائدے کی توقع ہوسکے لیکن حکومت
انگلستان کی طرف سے جو سفیر گیا تھا اس نے وہاں پہنچ کر اس کے خلاف
رائے قائم کی۔ اس عرصے میں گورنر جنرل نے بھی اپنی طرف سے اسے
اختیارات دیدئے تھے۔ لیکن ایران پہنچنے کے بعد اس نے حکومت ہند کے
احکام پر عمل کرنے سے قطعاً انکار کردیا اور گورنر جنرل کی مخالفت کے باوجود اس نے
دربار ایران سے براہ راست گفتگو شروع کردی۔ جیسا کہ خیال تھا فرانسیسی اپنے
بڑے بڑے وعدے ایفا نہ کرسکے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں جو
فوجی تیاریاں شروع ہوئی تھیں ان سے ایرانی مرعوب ہوگئے۔ علاوہ ازیں
دربار ایران کی حرص وطمع کی بدولت جس کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا تھا سفیر مذکور
کو اپنے معاملات میں کوئی زیادہ دقت نہ ہوئی۔ اس نے وہاں پہنچنے کے
تھوڑے ہی عرصے بعد ایک معاہدہ طے کرلیا جس کی رو سے یہ قرار پایا کہ (۱۱۶)
جبتک روس سے جنگ جاری رہے حکومت ایران کو اس شرط سے مدد

بجائے کہ وہ فرانسیسیوں کی ہر قسم کی سازش اور ترکیبوں کی مدافعت کرتی رہے یا بہ الفاظ دیگر ان معاہدوں کی تعمیل کرے جو دس سال قبل اس نے انگریزوں سے کئے تھے۔ گورنر جنرل نے ان تمام کارروائیوں کی سختی سے مخالفت کی۔ اگرچہ یہ خبر آ چکی تھی کہ بونا پارٹ اسپین کے خلاف جنگ میں مصروف ہے اور اب وہ غالباً مشرق کی طرف رخ نہ کر سکے گا اور جو فوجی تیاریاں یہاں شروع کی گئیں تھیں وہ بھی اسی بنا پر روک دی گئیں تھیں تاہم کمپنی کے سفیر کو ہدایت کی گئی کہ وہ طہران روانہ ہو جائے اور حکومت ہند کی جو ذلت ہوئی ہے اس کے ہٹانے کی کوشش کرے۔

اس موقع پر کمپنی کو جو کثیر مصارف برداشت کرنے پڑے اور اس کارروائی سے مقامی اثر میں جو کمی واقع ہوئی اس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں صرف اتنا کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۱۰ء میں حکومت انگلستان کی طرف سے جو سفیر ایران گیا تھا اس نے اس بات پر زور دیا تھا کہ آئندہ سے جو سفیر ایران روانہ کیا جائے اسے شاہ انگلستان کی طرف سے پورے اختیارات حاصل ہونے چاہئیں تاکہ اس خاص امتیاز کی بدولت اسے خاطر خواہ کامیابی ہو سکے۔ حکومت ہند نے اس کا یہ جواب دیا کہ اس قسم کے اعزاز سے اسے کوئی اختیار اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ کمپنی کی حکومت اسے منظور نہ کرے اور وہ اس کے ہدایات پر عمل نہ کرے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کے معاہدوں کی اہمیت صرف مقامی حکومت ہی سمجھ سکتی ہے مشرقی مقبوضات ہی کا ان سے تعلق ہے اور برطانیہ عظمیٰ کا اس کے سوا اور کوئی تعلق ان سے نہیں ہے (۷ اہم)
اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ ایران سے سیاسی تعلقات قائم کرنے کا کام اگر ہندوستان سے انگلستان منتقل کر دیا گیا اور حکومت ہند کا اس سے کچھ تعلق نہ رہا تو گورنر جنرل کو اپنے اختیارات کے استعمال میں جو از روئے قانون اسے حاصل ہیں سخت دقتیں پیدا ہو جائیں گی اور جو وسیع سلطنت اس کے تفویض کی گئی ہے اور جس کی حفاظت اور امن و امان کا وہ تنہا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے اسے محفوظ رکھنے کے ذرائع میں کمی واقع ہو جائے گی۔

لارڈ منٹو لکھتا ہے کہ "ان دو متضاد باتوں پر یہاں بحث کرنے کی چنداں
ضرورت نہیں کہ ایک طرف تو ہم سے یہ کہا جائے کہ جن خطرات کی وجہ سے
ایران وفد بھیجا گیا ہے ان سے ہندوستان کو محفوظ رکھنا ہمارا خاص کام ہے
اور دوسری طرف ہمیں دربار ایران سے براہ راست مراسلت کرنے تک کا اختیار
حاصل نہ ہو یہی نہیں بلکہ جو سفیر وہاں بھیجا جائے اس پر نہ ہمارا کچھ دباؤ ہو اور نہ ہم اس
بات کے طے کرنے کے مجاز ہوں کہ کس وقت اور کس موقع پر گفت و شنید شروع
کی جائے اور نہ ہم یہ فیصلہ کر سکیں کہ جو باتیں طے کی جا رہی ہیں وہ ہماری حکومت
کے مفاد کے مطابق ہیں یا نہیں اور ان سب پر طرہ یہ کہ جن معاہدوں کی تعمیل اور
ذمہ داری تنہا ہم پر عائد کی جائے ان کی شرائط میں ترمیم و اضافہ کرنے کا بھی ہمیں
حق حاصل نہ ہو۔"

اگر موقعے ایسے پیش آئیں گے جب کہ برطانوی حکومت کا ایران وفد بھیجنا
حکومت ہند کے عزیز ترین مفاد کے سخت منافی ہو گا۔ ایسی حالت میں (۱۸۱۴)
عقل اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ حکومتِ انگلستان اپنے چند خیالات کی
بنا پر جو حقیقی حالات کے خلاف ہوں اپنا سفیر ایران روانہ کر دے اور حکومت
ہند کو اس سفیر کا کام روک دینے کا اختیار حاصل نہ ہو اور نہ یہ بات تسلیم کی جا سکتی
ہے کہ جس سفیر کا تقرر حکومت کے مشورے بغیر یا اس کی مخالفت کے باوجود عمل
میں آیا ہو وہ اس بات کا مجاز ہو کہ ہر ایسے معاملے میں جس کی تعمیل کرانے کی ذمہ داری
کمپنی پر عائد ہوتی ہو یا جسے وہ علانیہ طور پر اپنے وقار و مفاد کے خلاف سمجھتی
ہو اس کی منظوری حاصل کئے بغیر وہ اپنی مرضی کے موافق اپنی زبان ہار دے
اگر سفیر مذکور کو اس قسم کے اختیارات حاصل ہوں گے تو اس کا یہ مطلب
ہو گا کہ وہ محض اپنی سفارت ہی کا کام انجام نہیں دے رہا ہے جو شاہِ انگلستان
نے اسے تفویض کیا ہے بلکہ اس نے ہندوستان کی عنان حکومت اپنے
ہات میں لے لی ہے اور یہ وہ اختیار ہو گا جس کا شاہِ انگلستان نے بھی
آج تک کبھی دعویٰ نہیں کیا ہے اور اس قسم کی کارروائی سے شاہی احکام اور
ان کے منشاء کی بھی سخت خلاف ورزی ہو گی۔"

(۴۱۹) لارڈ منٹو لکھتا ہے کہ "اس موقع پر خاص بادشاہ سلامت کی طرف سے
سفیر کا تقرر ہوا۔ اُسے غیر معمولی اختیارات عطا کئے گئے۔ حکومت ہند کے اثر اور دباؤ
سے اُسے آزاد کیا گیا لیکن اس سے قبل حکومت ہند نے ایران سے تعلقات قائم
کئے ہیں اور انھیں نبھایا ہے۔ جو کچھ کہ پہلے سے ہوتا رہا ہے اس کے خاص
اسباب و وجوہ ہیں۔ سرکار عظمت مدار نے انتظامات کے لئے جو قوانین مرتب
کئے گئے ہیں۔ ان کی رو سے یہاں کی مقامی حکومت کو وہ تمام اختیارات حاصل ہیں
جو عام طور پر ایک خود مختار حکومت کو حاصل ہوتے ہیں۔ دیوانی و فوجی مقدمات فیصل کرنے
کے اختیارات اسے حاصل ہیں جنگ و صلح کرنے کی وہ مجاز ہے۔ برطانوی سلطنت
کے اس قابل قدر حصے کی بقاء کے لئے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ایشیا کی تمام
سلطنتیں برطانوی حکومت کے اس شعبے کو بھی ایک خود مختار طاقت سمجھیں
اور اسے وہ تمام اختیارات عملی طور پر حاصل ہوں جو عام طور پر اس قسم کی حکومتوں
کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔

"اسی وجہ سے کمپنی کی حکومت بجا طور پر اپنے سفیروں کے ذریعے سے
حکومت ایران سے مراسلت کرتی رہی ہے اور اس سے مساوی حیثیت سے
معاہدے کئے ہیں۔ حکومت ایران بھی یہ سمجھتی رہی ہے کہ برطانوی حکومت ہند
کو ایک خود مختار سلطنت کی طرح شاہ ایران کو بہ حیثیت حلیف کے مدد دینے یا
بہ حیثیت غنیم کے اپنے تمام وسائل اس کے خلاف استعمال کرنے کے اختیارات
حاصل ہیں۔ اسی حیثیت کی بدولت آج ہمیں وہ اعزاز و وقار حاصل ہے جو دنیا
کی تمام طاقتوں کے لئے اور خصوصاً ایشیائی حکومتوں کے لئے سیاسی میدان
(۴۲۰) میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔

اسی مسلمہ اصول ہی پر بیرونی تعلقات کی بنیاد رکھی گئی ہے اور صرف اسی
کی بدولت وہ مستحکم ہو سکتے ہیں۔ گرد و نواح کی ریاستوں میں ہم نے اپنی جو وقعت
قائم کی ہے اور برطانوی حکومت کو ہندوستان میں جو اعزاز حاصل ہو گیا ہے
اور جسکی اہمیت کو محسوس کر کے ہم نے اپنی کوششوں سے اسے برقرار رکھا ہے
اگر اس میں ذرا بھی فرق آگیا تو برطانوی حکومت کے نام کو بٹہ لگ جائے گا۔ اسے

دھوکے باز سمجھا جائے گا۔ ہمارا اعتبار گر جائے گا۔ اس حکومت کا جو رعب ہے اسے جو عزت حاصل ہے اسی کی بدولت ایک بڑی حد تک سلطنت میں امن و سکون قائم ہے۔ اگر اس میں کمی واقع ہو گئی تو یہاں وہ تمام خطرات نمودار ہو جائیں گے جو قوت و اختیارات کی کمی سے عام طور پر پیش آتے ہیں۔"

لارڈ منٹو نے جو مراسلے انگلستان روانہ کیے ان میں یہ تمام دلائل اور ان کے ساتھ اسی قسم کی چند اور باتیں جن کا زیادہ تر زیر بحث مسئلے سے تعلق تھا نہایت پرزور الفاظ میں درج ہیں لیکن یہ سب بے سود ثابت ہوئیں۔ وہاں وہی طرز جاری رہا اور اکثر ایرانیوں کو یہ خیال ہو گیا کہ شاہ انگلستان اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ظاہری و باطنی اختلافات موجود ہیں۔ دربار ایران کے چند لوگ جو اس
غلط فہمی سے واقف تھے انہوں نے کبھی اس کے رفع کرنے کی کوشش نہ کی کیونکہ اس (۲۲۱)
سے ان کا مطلب حل ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے سازشوں کا بازار گرم ہوا اور خود غرض و حریص و مغرور درباریوں کو خوب روپیہ بھر گیا۔

کابل کو وفد

فرانسیسی حملے کے خوف کی وجہ سے برطانوی وفد ایران گئے تھے اور اسی خطرے کی وجہ سے ایک سفیر شاہ کابل کے دربار میں بھی بھیجا گیا تھا۔ اگرچہ کابل سے اتحاد قائم ہونے کے تھوڑے ہی عرصے بعد شجاع الملک اپنے تخت سے معزول کر دیا گیا اور وہ بہ حیثیت ایک مفرور کے انگریزی حکومت کا دست نگر ہو گیا تاہم انگریزی سفارت پر جو روپیہ صرف کیا گیا اس کا نہایت معقول معاوضہ مل گیا اور جس حکومت نے اسے روانہ کیا تھا اس کی دانشمندی بھی قطعی طور پر ثابت ہو گئی۔ اس سے بہتر خدمات شاید ہی کسی سفیر نے انجام دی ہونگی۔

اس وفد کے جانے سے قبل افغانستان کے حالات سے انگریز بالکل ناواقف تھے۔ نہ وہاں کی رعایا کے حال کا انہیں کچھ پتہ تھا اور نہ وہاں کے فرمانروا اور سرداروں کی بابت وہ کچھ جانتے[1] تھے۔ حالانکہ انہیں اپنی مشرقی سلطنت کے اس سب سے کمزور رخنے کے متعلق آئندہ جو کوئی تدبیر اختیار کرنی پڑتی اس کے لئے ان امور سے واقفیت نہایت ضروری تھی۔ اس موقع پر

[1] آنریبل مسٹر الفنسٹن گورنر بمبئی۔

جس ممتاز عہدہ دار کو بہ حیثیت سفیر کے وہاں روانہ کیا گیا تھا اس نے اپنے ذوق و شوق اور اپنی دماغی قابلیت سے ایسی معلومات فراہم کریں جن کی حکومت ہند کبھی توقع بھی نہیں کر سکتی تھی اس وفد سے یہی ایک فائدہ نہیں ہوا بلکہ اس کی بدولت ایک مغرور اور جاہل قوم کے لوگ انگریزوں کو خوب سمجھ گئے اور سفیر مذکور سے ملنے کے بعد وہ انگریزوں کی خوبیوں کا اعتراف کرنے لگے اور برطانوی حکومت ہند کی نوعیت بھی ان کی سمجھ میں آگئی ان خیالات اور ان کے اثرات کی اہمیت کا اندازہ لگانا امکان سے باہر ہے۔ اس کی اہمیت وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو وحشی (۲۲۴ قوموں کے خصائل سے واقف ہیں اور جنھیں اس بات کا ذاتی تجربہ حاصل ہے کہ یہ لوگ کن کن باتوں سے متاثر ہوتے ہیں اور کس قسم کے حالات انھیں عمل پر آمادہ کرتے ہیں اور کونسی چیزیں انھیں اس سے باز رکھتی ہیں۔

نیپال سے تنازعات

گورکھے پہاڑی علاقے کے رہنے والے ہیں، اور بحیثیت مجموعی جنگجو واقع ہوئے ہیں، نیپال کے علاقے میں انھوں نے اپنی حکومت قائم کرلی ہے۔ لارڈ منٹو کے زمانے میں ان لوگوں نے گورکھپور اور سارن کے علاقوں میں دست درازی کی ابتدا میں یہ خیال کیا گیا کہ محض سرحدی افسروں کی حرکت ہے انھوں نے ناعاقبت اندیشی سے کام لے کر حملہ کر دیا ہے لہذا اس واقعہ کو ان کی قومی مخاصمت پر محمول نہیں کرنا چاہیئے لیکن جب ان کی زیادتیاں بڑھتی گئیں اور ان سے ان کی ہمتیں بھی بڑھ گئیں تو معاملے کی نوعیت بدل گئی اور لارڈ منٹو نے مجبوراً راجہ نیپال کو صاف صاف لکھ دیا کہ "مجھے یقین ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ گورکھپور کے ملحقہ علاقے میں تصفیہ طلب امور کی بابت تحقیقات جاری ہے آپ کی حکومت نے مذکورۂ بالا حملے کی ہرگز اجازت نہیں دی ہوگی تاہم یہ حملہ بغیر کسی اشتعال کے کیا گیا ہے اور اس لحاظ سے ناقابل معافی ہے لہذا اب مجھے قوی امید ہے کہ آپ اس پر اپنی سخت ناراضی کا اظہار کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی ان تمام واقعات

کو آپ کے علم میں لانے کے بعد میں اس واقعہ کو نظر انداز نہیں کر سکتا اور میں اس بات کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہوں کہ آپ مجرموں کو اپنی ملازمت سے علیحدہ کریں انھیں معقول سزائیں دیں اور جن لوگوں کو وہ اس علاقے سے پکڑ لے گئے ہیں انھیں رہا
کر دیا جائے اور جو مال وہ لوٹ کر لے گئے ہیں وہ واپس کیا جائے ۔ میرے پاس (د۴۲۳)
یہ شکایتیں بھی پہنچی ہیں کہ آپ کی رعایا نے ترہٹ میں بھی اسی قسم کی زیادتیاں کی ہیں ان سب باتوں کو ہرگز روا نہیں رکھا جا سکتا ۔

"اگر ان کا تدارک نہ ہوا اور اس قسم کی حرکات نہ روکی گئیں تو برطانوی حکومت مجبور ہوگی کہ آپ کی حکومت کو مطلع کئے بغیر وہ اپنی رعایا کے جان و مال کی حفاظت کے لئے جو ذرائع بھی مناسب سمجھے اختیار کرے لیکن میں توقع کرتا ہوں کہ اس وقت آپ ان تمام باتوں کی بابت میرا اطمینان کر دیں گے اور آئندہ سے اپنی رعایا اور اپنے عہدہ داروں پر اگر آپ معقول نگرانی رکھیں گے تو اس قسم کے واقعات آئندہ ہرگز پیش نہ آئیں گے ظاہر ہے کہ اس قسم کی باتوں سے تصفیہ طلب امور میں بحث و تحقیقات بے سود ثابت ہوگی اور اس سے ایسے نتائج پیدا ہوں گے جن سے ہر حکومت کو بچنا چاہیئے ۔"

اس مراسلے کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ لارڈ منٹو نیپال سے سمجھوتا کرنے اور صلح و آشتی کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے پر آمادہ تھا لیکن ساتھ ہی وہ اس پر بھی تلا ہوا تھا کہ اگر اس کے اعتدال پسند مسلک کو غلط سمجھا گیا اور صبر و تحمل کا کچھ اثر نہ ہوا یا اس کے بعد نیپالیوں کی دست درازیوں میں اضافہ ہوا تو وہ دیگر ضروری تدابیر بھی اختیار کرے گا لیکن اس واقعہ کے بعد وہ بہت جلد انگلستان واپس ہو گیا اور ان مغرور اور جنگجو نیپالیوں کی زیادتیاں روکنے
اور انھیں سزا دینے اور حکومت کی ذلت و توہین کا انتقام لینے کی ذمہ داری (د۴۲۴)
اس کے جانشین کے سر پڑی ۔

لارڈ منٹو کے زمانے میں بجز ٹراونکور کے اور کسی ماتحت ادنیٰ ریاست میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی ۔ اس ریاست کے دیوان کی بیوفائی اور اسکے بلند حوصلوں سے مجبور ہو کر حکومت ہند نے اپنا وقار برقرار رکھنے کے لئے

ایک زبردست فوج سے کام لیا جس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور آئندہ امن وامان کے لئے پہلے سے بھی زیادہ معقول انتظام ہوگیا۔

بندھیلکھنڈ کے معاملات

بندھیلکھنڈ میں بھی دوسری ہندوستانی حکومتوں کی طرح ایک کمزور اور نااہل فرمانروا کا دور جاری تھا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے سردار سرکش ہوگئے اور انھیں اپنی قوت اور اپنے مستحکم قلعوں پر اعتماد ہوگیا اور اپنے ساتھیوں کی اعانت پر بھروسہ کرکے اُنھوں نے ریاست کی حکومت کا مقابلہ کرنا شروع کردیا لہٰذا اُنھیں دبانے کی سخت کوشش کی گئی اور ان کے خلاف فوجی کارروائی نہایت کامیاب رہی۔ اجگرا اور کالنجر کے مشہور قلعوں کی تسخیر سے بندھیلکھنڈ میں ایسا امن قائم ہوگیا جو ایک صدی سے وہاں کی رعایا کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس قابل قدر علاقے میں امن قائم رکھنے کے لئے اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہاں کے راجاؤں اور ادنیٰ رئیسوں کی حفاظت بڑا تو بھی حکومت کلیتاً اپنے ذمہ لے لے تھوڑے ہی عرصے میں اس مسلک کے خوشگوار نتائج رونما ہوگئے۔ امن و انتظام برقرار رہا اور خوشحالی میں اضافہ ہوا۔ جن سرداروں نے اپنے نیک کردار اور طرز (۴۲۵)
عمل سے اپنے آپ کو کمپنی کی حفاظت کا مستحق بنالیا تھا ان کی ہمت افزائی کی گئی لیکن ریوا کے رئیس کو سزا دی گئی کیونکہ ۱۸۱۲ء میں جب پنڈاریوں نے مرزاپور پر حملہ کیا تھا تو اس نے اُنھیں مدد دی تھی۔ راجہ مجھیری نے بھی جے پور کی ابتری سے فائدہ اٹھاکر اس کے علاقے کا ایک قلعہ دبالیا تھا۔ اس سے قلعہ واپس لے لیا گیا اور اس کی اس حرکت سے کمپنی کو جو فوجی کارروائی کرنی پڑی اس کے مصارف بھی اس سے وصول کرلئے گئے۔ اس طرح مراعات اور تادیب کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ادنیٰ سردار راہ راست پر آگئے اور مطیع بن گئے۔

نواب وزیر اودھ کی ریاست میں باغی زمینداروں کی سرکشی جاری تھی انھیں اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے نواب وزیر کے پاس بجز برطانوی امداد کے اور کوئی معقول ذریعہ نہ تھا۔ برطانوی فوجوں سے جو کام یہاں لئے جاتے تھے ان سے اکثر برطانیہ کے نام پر دھبہ آتا تھا۔ لارڈ منٹو نے اس خرابی کے رفع

کرنے کے لئے لکھنؤ کے رزیڈنٹ کو ہدایت کی وہ نواب وزیر کو ریاست میں باقاعدہ
عدالتیں قایم کرنے کا مشورہ دے ممکن ہے کہ اس قسم کی تدبیروں سے ریاست کی
حالت سنبھل جائے۔ نواب وزیر نے اول تو اس تجویز سے اتفاق کرلیا لیکن
قبل اس کے کہ اس پر عمل شروع کیا جائے اس نے یک لخت اپنی رائے بدل دی
اور یہ کہدیا کہ "جب تک اس کے متعلق میرے تمام شکوک رفع نہ کردئے جائیں میں
اس تجویز کو ہرگز تسلیم نہیں کروں گا"۔ رزیڈنٹ نے اس طرز عمل اور ٹال مٹول کے جواب
پر سخت اعتراض کیا اور نواب وزیر کی باتوں کو صداقت کے خلاف بتایا اور گورنر جنرل (۴۲۶)
کو[۱] یہ تجویز پیش کی کہ آئندہ سے نواب کے عاملوں کی امداد اور سرکش زمینداروں کی
سرکوبی کے لئے برطانوی فوج ہرگز نہ دی جائے۔ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ نواب
کو ہمارے تمام تجاویز مجبوراً تسلیم کرنا پڑیں گے رزیڈنٹ نے یہ خیال کرکے کہ
کہ اس کی تجویز منظور کرلی جائے گی نواب وزیر کو مطلع کردیا کہ[۲] "آپ کی ناقص اور
مضرت رساں حکومت اور اسکے کارکنوں یا عاملوں کی اعانت کے لیے آئندہ
سے برطانوی فوج کا ایک سپاہی بھی آپ کو نہ مل سکے گا"۔
اس مسئلے کی گفت و شنید کا جو نتیجہ نکلا اس سے حکومت اعلیٰ کو مایوسی
تو ضرور ہوئی لیکن گورنر جنرل نے رزیڈنٹ کی پیش کردہ تجویز منظور کرنے کا
اپنے آپ کو مجاز نہ سمجھا۔ گورنر جنرل کے معتمد خاص نے اس موضوع پر جو قابلانہ
مراسلہ[۳] تحریر کیا تھا اس میں حکمت عملی اور وفاداری کے وہ تمام اصول نہایت
توضیح کے ساتھ درج ہیں جن کی وجہ سے صدر حکومت اس قسم کی تجاویز پر عمل
کرنے سے قاصر تھی وہ لکھتا ہے کہ "اگرچہ نواب وزیر کی حکومت میں نقائص
موجود ہیں اور باوجود اس کے ہمیں اس کی مدد کرنی پڑتی ہے اور اس لحاظ سے

۱؎ بحوالہ تحریر کپتان ہیلی مورخہ ۲۸ جون ۱۸۱۱ء مندرجہ کاغذات اودھ صفحہ (۲۳)

۲؎ بحوالہ کاغذات اودھ صفحہ (۲۳۳)۔

۳؎ بحوالہ تجویز موسومہ کپتان ہیلی مندرجہ کاغذات اودھ صفحہ (۲۳۴)

انگریزی حکومت کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ نواب کو ریاست میں ضروری اصلاحات کرنے کا مشورہ دے اور اس کی تعمیل کرانے کیلئے زبردست دلائل پیش کرے تاہم نواب سے یہ کہنا کہ آئندہ سے اسے ریاست کی یورشوں کے دبانے کے لئے ہرگز فوج نہیں دی جائے گی گورنر جنرل باجلاس کونسل کے منشاء کے خلاف ہے اور رزیڈنٹ موصوف نے معاملے میں اپنے اختیارات سے تجاوز کیا ہے۔" اسی سلسلے میں معتمد مذکور یہ بھی لکھتا ہے کہ "مذکورہ بالا تجویز پر جبراً عمل کرانے سے معاملے کی نوعیت بالکل بدل جائے گی۔ اسکے بعد فوراً (۲،۱۲۸)
یہ سوال پیدا ہو جائے گا کہ معاہدے کی رو سے دونوں سلطنتوں کے درمیان جو تعلقات قائم ہیں وہ برقرار رکھے جائیں یا ختم کر دیئے جائیں کیونکہ اگر فریقین معاہدہ میں سے ایک فریق عہدنامے کی کسی خاص دفعہ کے بموجب دوسرے فریق سے کسی بات کا مطالبہ کرے اور اسکے ساتھ ہی یہ اعلان کردے کہ اگر اس کی تعمیل نہیں کی گئی تو عہدنامے کی دوسری خاص شرط پر جو تعلقات کی اصل بنا ہے آئندہ سے عمل نہیں کیا جائے گا اور مذکورۂ بالا مطالبے کی تعمیل میں تاخیر ہونے یا انکار ہو جانے کی صورت میں اعلان کے مطابق عمل بھی شروع کر دیا جائے تو ایسی حالت میں فریقین کے تعلقات اور عہدناموں کی بنیاد ہی ختم ہو جائے گی۔

"اگر نواب وزیر اودھ اور کمپنی کے تعلقات میں ایسی کوئی صورت پیش آئے تو اس کا جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے اس پر چنداں بحث کرنیکی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ نواب وزیر کو جو دھمکی دی گئی ہے کہ اندرونی بغاوتوں کے رفع کرنے کے لئے آئندہ سے اسے فوجی امداد نہیں دی جائے گی اسے واپس لینا پڑے گا کیونکہ ہماری حکومت خود اپنے مفاد کی خاطر اس بات پر مجبور ہے کہ ریاست میں امن برقرار رکھنے کے لئے حسب ضرورت اپنی فوجی قوت سے کام لے۔ (۲۲۸)
کمپنی کے مقبوضات اور اودھ کے وجود کی وجہ سے ان دونوں حکومتوں میں جو تعلقات قائم ہیں ان کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کمپنی ان تعلقات کو ایک دن کے لئے بھی منقطع کرنا گوارا نہیں کر سکتی۔ ہر حالت میں اس سے معاہدہ کرنا پڑیگا خواہ اس معاہدے کی سابق حیثیت برقرار رہے یا اس میں تبدیل کی جائے اور

واقعات ہمیں مجبور کریں گے کہ نواب وزیر کے پاس جو علاقہ باقی رہ گیا ہے اس پر پہلے سے بھی زیادہ ہماری نگرانی ہو لیکن ۱۸۰۱ئہ میں نواب مذکور نے جو علاقہ کمپنی کے حوالے کیا ہے اور اس کے عوض میں جو معاہدہ کیا گیا ہے اس کی اس طور سے سراسر خلاف ورزی ہوگی۔

اُن دلائل کے لئے یہ کوئی معقول جواب نہیں ہو سکتا کہ نواب وزیر محض اس قسم کی دھمکی سے ہماری تجویز تسلیم کر سکتا ہے کیونکہ دھمکی کا اصول ہی ان تمام باتوں کے منافی ہے۔ انصاف حکمت عملی دونوں کی رو سے اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا"۔

ایسی حالت میں جبکہ نواب وزیر مجوزہ اصلاحات کے اس قدر سخت خلاف تھا تو ان کی تعمیل کے لئے اسے مجبور کرنا نامناسب ہوتا لہٰذا مذکورۂ بالا واقعات کے لحاظ سے جو کچھ بھی کیا گیا وہ بلاشبہ نہایت دانشمندی کا کام تھا اگر اسکے خلاف عمل کیا جاتا تو اغلب یہ تھا کہ یا تو اصلاح کرنے کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوتیں اور خود کمپنی ان پر قائم نہ رہ سکتی یا ان کی تائید میں ریاست کے اندرونی معاملات میں اس قدر سخت مداخلت کرنی پڑتی کہ نواب وزیر کی رہی سہی آزادی کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔

(۴۲۹) لکھنؤ کے رزیڈنٹ کا کام بہ حیثیت حکومت کے ایک اعلیٰ اور نگران نمایندے کے نہایت نازک اور سخت دشوار ہے۔ اس کا خاص فرض یہ ہے کہ جس فرمانروا کے دربار میں اسے متعین کیا گیا ہے اسے وہ ہر معاملے میں مدد دے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ ریاست کے تمام اندرونی معاملات سے پوری واقفیت حاصل کرے تاکہ اگر کسی موقع پر وہاں اس قسم کی کوئی بدانتظامی ہو جس سے کمپنی کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو وہ اپنی حکومت کو ان تمام معاملات کی اطلاع دے سکے تاکہ حکومت اعلیٰ نواب کو ضروری اصلاح کے لئے مشورہ دے یا اس پر اعتراض کر کے مداخلت کرے (جس کا اسے عہدنامے کی رو سے حق حاصل ہے) اس طور سے ان دونوں حکومتوں کے باہمی تعلقات کا انحصار رزیڈنٹ کے طرز عمل پر ہوگا۔ ضروری معلومات اور واقفیت حاصل کرنے کے جو ذرائع اسے حاصل ہیں وہ ایک حد تک یکطرفہ ہیں۔ بے لاگ نہیں ہو سکتے

کے لیئے جو قیود وہ ان پر عائد کریں ان کا اپنے آپ کو بھی پابند سمجھیں۔ اس میں کم از کم
یہ بات تو ضروری ہونی چاہیئے کہ کوئی حکومت فتوحات اور ملک گیری کو اپنا مسلک نہ
قرار دے سکے۔ اس بات کو پہلے سے طے کرلیا جائے اور اگر ضرورت پڑے تو عملی طور
سے سب متحد ہو کر اس بات کی کوشش کریں کہ کوئی ایک سلطنت دوسرے کے
حقوق قربانی کرکے اپنی قوت نہ بڑھا سکے۔ ہندوستان کی تاریخ کے کسی دور
میں اس قسم کے اتحاد یا توازن قوت کا پتہ نہیں چلتا۔ دراصل بات یہ ہے کہ اس
ملک میں جو سلطنتیں بھی پہلے قائم ہوئیں ان کی نوعیت ان کے مقاصد اور ان کے
دستور کی وجہ سے اس قسم کے اصول ان کے لئے موزوں بھی نہیں ہو سکتے تھے
جنگ و جدال۔ لوٹ مار۔ فتوحات و ملک گیری بھی ان کے خاص مقاصد تھے
اور یہی ان کے محرکات تھے۔ یہی ان کے فرمانرواؤں کے جائز اور مناسب مشاغل
تھے۔ انہی میں ان کی عزت تھی۔ انہی کی بدولت انھیں شہرت حاصل ہوتی تھی
ان کے مذہب کی رو سے یہ سب باتیں جائز تھیں لہذا کسی بہانے یا کسی جائز سبب
کی انھیں ضرورت نہ تھی۔ انسانی ہمدردی۔ ایفائے وعدہ اور دیانتداری
سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ وحشی قوموں کی طرح وہ بھی ان باتوں کے پابند نہ
تھے۔ محض مقابلے کی طاقت ہی انھیں روک سکتی تھی۔ انہی اصولوں اور انہی
محرکات کی کامیابی کی بدولت مسلمانوں نے سارے ہندوستان میں اپنی حکومت
قائم کرلی تھی۔ اس کے زوال کے بعد مرہٹوں نے زور پکڑا اور ان کی سلطنت
قائم ہوئی۔ آخر میں اس کے ٹکڑے ہوگئے لیکن مختلف سرداروں نے مل کر ایک
اتحاد قائم کرلیا جس کا خاص مقصد فتوحات و ملک گیری اور لوٹ مار تھا۔
اس طرح انھیں جو کچھ ملتا تھا اسے وہ اپنے رواج کے مطابق آپس میں بانٹ (۴۲۲)
لیتے تھے۔ ہر ایک کا حلقہ پہلے سے مقرر تھا۔ یہی حیدر علی اور اس کے جانشین کے
خیالات تھے۔ انہی اصولوں سے وہ متاثر ہوئے اور انہی پر عمل کرکے انھوں
نے اپنی سلطنت بڑھائی۔ کبھی کبھی حضور نظام دکن نے مرہٹوں اور میسور کے فرمانرواؤں
کو روکا اور اکثر اوقات ان تینوں طاقتوں میں ایک دوسرے کے خلاف اتحاد
بھی قائم ہوئے لیکن نہ وہ توازن قوت کے اصول پر مبنی تھے اور نہ پہلے سے

اس قسم کا کوئی اتحاد اس مقصد کے لئے قائم کیا گیا تھا بلکہ ملک گیری اور لوٹ مار اور دوسروں کے علاقے غصب کرنیکا خیال ان سب پہ حاوی تھا اور اسی کا یہ بھی ایک رخ تھا جنگ کرنے والوں کا مقصد دوسروں کی قوت کو ایک خاص حد پر قائم کرنا نہ تھا بلکہ ایک دوسرے کا خاتمہ کرکے اپنی قوت کو بڑھانا تھا۔ حقیقی واقعات ثابت کرنے اور مسلمہ اصولوں کو واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ عیاں را چہ بیاں۔ فتوحات و ملک گیری اور حرص و طمع کے ساتھ توازن قوت کا اصول کارگر نہیں ہو سکتا یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں بھی ایک زمانہ تھا جب کہ توازن قوت کے اصول پر کام کیا جاتا تھا اور لوگ اسے سمجھنے بھی لگے تھے ۱۸۰۰ء میں دربار حیدر آباد سے جو معاہدہ کیا گیا تھا اس سے قبل کا یہ زمانہ بتایا جاتا ہے اور ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس تاریخ کے بعد سے ایک جدید اصول کا آغاز ہوتا ہے جس کی وجہ سے بہت کچھ مظالم ہوئے ہیں اور جن خرابیوں کی عام طور پر مذمت کی جاتی ہے وہ سب اسی کا نتیجہ ہیں۔ اس دور کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اور ہمیں ان سلطنتوں میں توازن قوت کے اصول کا کہیں پتہ نہیں لگتا۔ مذکرۂ بالا تاریخ سے پانچ سال قبل ہی حیدر آباد کی سلطنت مرہٹوں کا شکار ہو چکی تھی۔ ان سے نجات حاصل کرنے کے لئے سلطنت آصفیہ کو جو قربانیاں کرنی پڑیں وہ (۳۴۴)
سب کو معلوم ہیں۔ بعد میں سندھیا نے اس علاقے پر ہاتھ مارا اور وہاں کی حکومت کی توہین کی اور اس پر ناجائز دباؤ ڈالنے کی کوشش کی اور جب تک کہ برطانوی حکومت سے دفاعی معاہدوں کی تکمیل نہ ہو گئی اس وقت تک اس قسم کے نامناسب اقدامات اور دباؤ کا سلسلہ جاری رہا۔ شمالی ہند میں مرہٹے دریائے گنگا سے جمنا تک اور جمنا سے دریائے سندھ تک چھائے ہوئے تھے۔ ان کی سلطنت کے حدود شمال اور جنوب میں سرہند سے لیکر دریائے نربدا تک اور مشرق و مغرب میں بندھیلکھنڈ سے گجرات تک پھیلے ہوئے تھے۔ دکن میں دریائے نربدا سے ایک طرف ان کی سرحد سلطنت آصفیہ اور علاقہ میسور سے ملتی تھی اور دوسری طرف شمالی سرکار سے اس وسیع سلطنت کے علاقوں کے درمیان متعدد راجپوتوں اور دیگر ادنیٰ سرداروں کی ریاستیں قائم تھیں جو ان کے سامنے ذرا بھی

چون وچرا نہیں کر سکتی تھیں اور خاموشی سے مرہٹوں کی فوجوں کو خراج ادا کر دیتی تھیں۔ شمالی ہند اور دکن کی سیاسی حالت یہ تھی۔ اس کے بعد کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کسی قسم کا توازن قوت موجود تھا۔ ممکن ہے کہ یہ دلیل پیش کی جائے کہ گو یہ وسیع علاقہ مرہٹوں کی قلمرو میں شامل تھا وہ مرہٹوں کی سلطنت کہلائی جاتی تھی لیکن دراصل اس میں چار مختلف سلطنتیں تھی اور اگرچہ ان میں ایک قسم کا اتحاد قائم تھا تاہم وہ ایک دوسرے کی روک تھام کرتی رہتی تھیں اور اسطرح ان کی قوت میں ایک توازن قائم رہتا تھا۔ اتنی بات تو ضرور ہے کہ اس اتحاد کی بدولت یہ سلطنتیں ایک دوسرے کو بیرونی طاقتوں کے حملوں سے بچانے کے لئے آمادہ ہو جاتی تھیں لیکن وہ خود فتوحات حاصل کرنے یا اپنی حکومت کا اقتدار بڑھانے کے لئے جو کوششیں کرتی تھیں ان کی کوئی روک تھام نہ ہو سکتی تھی اور نہ ان بلند حوصلہ تدابیر کی مدافعت ہو سکتی تھی جو یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے پر غالب آنے یا اس کی طاقت کو اپنی قوت میں سلب کرنے کے لئے کرتے رہتے تھے لہذا ہم اس زمانے میں دیکھتے ہیں کہ سندھیا کے پاس ایک کثیر فوج موجود ہے اور وہ پونہ پر حاوی ہے۔ ناگپور سے وہ روپیہ وصول [illegible]
کرتا ہے۔ اپنی برتری اور فوقیت جتانے کے لئے ہولکر سے جنگ کرتا ہے اور بالآخر حکومت پونہ کو اپنے شکنجے میں کس کر پیشوا کو نکال باہر کرتا ہے۔ باوجود اس تصادم کے یہ سب سردار اپنی خارجی فتوحات جاری رکھنے کے لئے آپس میں متحد ہو جاتے ہیں اور اپنی سلطنت بڑھانے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ہر شخص اپنے ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے اور مال غنیمت میں اپنا حصہ بٹانے میں چوکس ہے۔ ہم حیران ہیں کہ ان واقعات کے علم کے بعد ہم کس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانے میں لوگ توازن قوت کے اصول سے واقف تھے اور ہندوستانی ریاستوں میں اس پر عمل ہوتا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ دلیل پیش کیجائے کہ مرہٹوں کی سلطنت کے مقابلے کے لئے برطانوی حکومت موجود تھی اور مرہٹے خوف کی وجہ سے کبھی کمپنی کے خلاف کوئی مخاصمانہ کارروائی نہیں کرتے تھے۔ اگر اس واقعے کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی سیاسی توازن قوت کا خاص بنیادی اصول جو سیاسی

وتجارتی تعلقات سے قائم ہوتا ہے ان حالات میں منعقود نظر آتا ہے جہاں ایک (۴۳۶)
فریق کا تنہا مقصد اپنی حفاظت کرنا اور عام امن و امان برقرار رکھنا ہو اور دوسرے
فریق کا نصب العین جنگ و جدال اور فتوحات و ملک گیری ہو تو انکا توازن ایک
ہی لمحے میں ختم ہو جائے گا۔ ان حالات میں اول الذکر فریق اس بات کا مجاز ہوگا کہ اسے اپنی
مزید حفاظت کے لئے جو وسائل بھی از روئے انصاف میسر آسکیں یا جن پر وہ قابو
پاسکے انھیں وہ استعمال کرے۔ ہندوستانی ریاستوں میں ملک گیری کی
جو غیر محدود ہوس بلا تخصیص پائی جاتی ہے (جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے) اس کے
ثابت کرنے کے لئے ہم یہاں ان متعدد کوششوں کو بیان نہیں کریں گے جو ان ریاستوں
نے برطانوی حکومت کے قیام کے زمانے سے اب تک اس کی بیخ کنی کیلئے کی ہیں اور
نہ اس بات کے ثابت کرنے کی چنداں ضرورت ہے کہ یہ اصول ہندوستانی طاقتوں
میں خاص محرک عمل رہا ہے۔ اس سے ایک ناقابل تردید نتیجہ ہم نے یہ اخذ کیا ہے
کہ ہم کتنی ہی رعایت کریں اور کتنے ہی علاقوں سے دست بردار ہو جائیں اس ملک
میں توازن قوت نہ کبھی حقیقی معنوں میں قائم ہو سکتا ہے اور نہ مفید۔ ہندوستانی
ریاستوں کو جب کبھی ملک گیری کا موقع ملے گا وہ ضرور اس سے فائدہ اٹھائینگی
اور کبھی خاموش نہ بیٹھیں گی۔ آپ کی مجلس نے اپنے مراسلہ مورخہ ۲۰۔ اکتوبر ۱۸۰۵ء
میں بجا ارشاد فرمایا ہے کہ بعض بعض صورتوں میں مراجعت پیش قدمی سے زیادہ
خطرناک ہوتی ہے۔ آپ کا یہ خیال بھی صحیح ہے کہ اس کا اطلاق خاص طور سے
ہندوستان پر ہوتا ہے کیونکہ یہاں اس بات کی توقع بہت کم ہے کہ ہندوستانی
ریاستیں مراعات کو بجز کمزوری اور خوف کے کسی دوسرے اصول پر محمول کریں گی
"اگر اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی جائے تو گزشتہ زمانے کی ایک (۴۳۷)
طویل مدت کے واقعات پر غور کرنا پڑے گا جو نہایت تکلیف دہ ہوگا اور اسکے
ساتھ ہی آج کل کی ہندوستانی ریاستوں کے خیالات خصائل وخصوصیات
اور جذبات و حالات کی بھی تحقیق کرنی ہوگی۔ ان سب کے یہاں بیان کرنے کی
ضرورت نہیں کیونکہ ایک تو آپ ان سب باتوں سے خود واقف ہیں دوسرے
ہمارا تو یہ ایمان ہے کہ اپنی قوت اور سیاسی برتری اور فوقیت میں کمی کر کے

ہم اپنی حفاظت کی توقع نہیں کر سکتے اور یہ ایک ایسی صریح بات ہے جسکے واضح کرنے کے لئے کسی دلیل کی قطعاً ضرورت نہیں "۔

مدراس میں شورش

احاطۂ مدراس میں یورپین افسر حکومت سے بہت بدظن ہو گئے تھے لہٰذا لارڈ منٹو کو ۱۸۰۹ء میں مجبوراً خود مدراس جانا پڑا۔ اس موقع پر استقلال اور اعتدال دونوں سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ ان افسروں کے اشتعال اور غصے سے سلطنت کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا لیکن لارڈ منٹو کے وہاں پہنچتے ہی سے ان کا اشتعال فرو ہو گیا لہٰذا اسے برابر اس بات کا افسوس رہا کہ وہ اس سے قبل موقع پر کیوں نہ پہنچ سکا۔ مدراس سے گورنر جنرل اپنے ساتھ ایک کثیر فوج لے کر جاوا کی تسخیر کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس اہم کارنامے کی تاریخ کا اس کتاب سے بجز اس کے کچھ تعلق نہیں کہ اس فتح سے ہندوستانی مقبوضات کو مزید تقویت حاصل ہوئی اور لارڈ منٹو کی شہرت میں اضافہ ہوا۔ اس باہمت شخص کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اس بات کا اظہار کرنا ضروری ہے کہ جاوا اور فرانسیسی جزائر کے خلاف اس نے جو فوج کشی کی وہ اپنی ذمہ داری پر کی اور اس میں نہایت مستعدی اور جرات سے کام لیا اور ان مہمات میں جو کامیابی حاصل ہوئی اس کا سہرا اسی کے سر ہے۔

لارڈ منٹو کی واپسی

۱۸۱۳ء میں لارڈ منٹو انگلستان واپس ہو گیا اور وہاں پہنچنے کے چند ہفتے بعد ہی علیل ہوا اور اجل نے اس ممتاز اور پاک دامن ہستی کی مفید زندگی کا یک بیک (۳۴۸) خاتمہ کر دیا۔ انگلستان کی یہ بدقسمتی تھی کہ اس موقع پر اس شخص کا انتقال ہو گیا ہندوستانی سلطنت کی حالت کا اسے نہایت صحیح اندازہ تھا اور اس سے بہتر نہ کوئی اور شخص یہاں کی حالت دوسروں کو سمجھا سکتا تھا اور نہ اس سلطنت کی آئندہ حکومت کے متعلق اس سے بہتر اور مفید رائے دے سکتا تھا۔

لارڈ منٹو کے دور پر ایک نظر

لارڈ منٹو سے پہلے جتنے گورنر جنرل ہوئے ان سب کی حکومت سے لارڈ منٹو کی حکومت کا

طرزِ عمل مختلف تھا۔ وہ ایک نہایت قابل اور سلجھے ہوئے دماغ کا آدمی تھا۔ علاوہ
ازیں اصول حکومت سے بھی وہ بخوبی واقف تھا لہٰذا ایسے قابل آدمی کے لئے یہ
بات بالکل ناممکن تھی کہ کچھ عرصہ ہندوستان میں رہنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر نہ
پہنچے کہ سلطنت کو معرضِ خطرہ میں ڈالے بغیر اور خطرات میں بلا اضافہ کئے عدم مداخلت
کے مسلک پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک سنجیدہ اور متین آدمی تھا۔ اس نے یہ
اندازہ کر لیا تھا کہ ہر معاملے میں حکام بالا کو اپنا ہم خیال بنا لینے میں زیادہ فائدہ
ہے لہٰذا جہاں کہیں وہ یہ دیکھتا تھا کہ تاخیر مضر نہ ہوگی وہ ہمیشہ تاخیر کو ترجیح دیتا
تھا اور حکام بالا سے رائے طلب کرتا تھا اور حتی الوسع اپنی ہر دلیل سے وہ اس
بات پر زور دیتا تھا کہ جس کام کو وہ سرکاری مفاد کے لئے مفید خیال کرتا ہے
اس کی منظوری دے دی جائے لیکن ہر معاملے میں حکام بالا سے رائے لینے اور
انھیں اپنا ہم خیال بنانے کی خواہش اس وجہ سے نہ تھی کہ وہ اپنے اوپر ذمہ داری (۴۲۹)
لینے سے گھبراتا تھا بلکہ جب کبھی اس اصول سے انحراف ضروری ہوتا تھا تو وہ نہایت
مستعدی سے فوری فیصلہ کر دیتا تھا۔ اس بات کے ثبوت میں لاہور کے راجہ کا
معاملہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بندھیلکھنڈ کے ادنیٰ رئیسوں کی بھی مثال
پیش کی جا سکتی ہے جنھیں اس نے کمپنی کی حفاظت میں لے لیا تھا۔ امیر خاں اور
راجہ ناگپور کے معاملے میں اس نے جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ حکمت عملی کے لحاظ سے
نہایت قابل اعتراض اور بحث طلب امر ہے۔ مذکورۂ بالا مسلمان سردار کے خلاف
اس نے فوجی کارروائی کی اس میں تو وہ حد سے تجاوز کر گیا۔ جب تک کہ یہ تسلیم
نہ کر لیا جائے کہ وہ اس کے نتائج بھگتنے کے لئے آمادہ تھا اس وقت تک یہ
اعتراض باقی رہتا ہے۔ اس نے جو فوج جمع کی تھی وہ مالوے کی تسخیر کے لئے
کافی تھی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مالوے کی تسخیر کے بغیر پٹھان کے سردار کو مغلوب
نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غالباً اس مہم کا قریب قریب یہی منشا تھا اور لارڈ منٹو کے
بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ کمپنی کی
قوت کے مظاہرے سے جو اچھا اثر پڑا وہ توقعات کے مطابق تھا لہٰذا اسی پر
اس نے اکتفا کیا۔ راجہ ناگپور سے معاونتی معاہدہ نہ کرنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی

ہے کہ غالباً وہ آئندہ مشکلات کے خوف سے پیچھے ہٹ گیا منجملہ دیگر اسباب کے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خود راجہ ناگپور پر بھی اسے اعتماد نہ تھا۔ علاوہ ازیں اسی زمانے میں جاوا کی مہم بھی پیش آگئی۔ جو کام اُس نے مستعدی سے شروع کیا تھا اُسے ادھورا چھوڑنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لارڈ منٹو نے یہ خیال کر لیا تھا کہ اسوقت جو لوٹ مار اور غارتگری جاری ہے اور جس سے عام امن میں خلل پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس کا خاتمہ کرنے کے لئے وسیع پیمانہ پر تیاریاں کرنی ہوں گی لہذا جب اُسکی طرف توجہ کی جائے گی تو اسی سلسلے میں اس کام کی بھی تکمیل ہو جائے گی۔ اس موضوع پر اس نے محض اپنے خیالات ہی قلمبند نہیں کیئے بلکہ اس امر کی بھی کوشش کی کہ محکمۂ سیاسیات کے قابل عہدہ داروں کے (۲۴۰) خیالات بھی انگلستان پہنچ جائیں۔ اِن ضخیم مراسلوں میں جو رائیں درج ہیں ان سب میں اس امر پر اتفاق تھا کہ اِس خرابی سے امن و امان میں خلل واقع ہونے کا سخت اندیشہ ہے اور اس معاملے میں مداخلت نہایت ضروری ہے۔ اس کی وجہ سے حکام بالا نے بھی ان خطرات کا صحیح اندازہ کر لیا اور وہ بھی اس رائے سے متفق ہو گئے۔ اس رائے کا وہ پہلے بھی ایک موقع پر اظہار کر چکے تھے۔ جس مراسلے میں اُنھوں نے امیر خاں کے خلاف محدود دائرے پر کارروائی کرنے پر اعتراض کیا تھا اور راجہ ناگپور سے جلد از جلد کسی مناسب موقع پر معاونتی معاہدہ کرنے کی ہدایت کی تھی اس میں اس کا بھی ذکر ہے۔

لارڈ منٹو کی حکومت سے ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ حکام بالا کو اس بات کا کامل یقین ہو گیا کہ عدم مداخلت کے جس مسلک پر وہ چلنا چاہتے تھے اسکا برقرار رکھنا قطعی ناممکن ہے اور اس خیال کے بعد پھر ترقی کا دور شروع ہو گیا جو در اصل برطانوی سلطنت کی وسعت۔ اسکی نوعیت۔ اور اس کے مخصوص حالات کے لیئے نہایت موزوں تھا۔ لارڈ منٹو نے جب کبھی مجبور ہو کر اپنے راستے سے پہلو تہی کی تو ایسے موقع پر اس نے نہایت اعتدال سے کام لیا اور اپنے خیالات کی تائید میں جب کبھی وہ دلائل پیش کرتا تھا تو وہ اس قدر بجا اور درست

ہوتے تھے کہ بلحاظ مصلحت و دانشمندی ان سے اختلاف کرنا یا اُنھیں مسترد کرنا (۴۴۱)
ناممکن ہوتا تھا۔ اس طور سے حکام بالا کے خیالات میں رفتہ رفتہ تبدیلی ہوتی
گئی اور اِس تبدیلی سے لارڈ منٹو کے قابل ممتاز جانشین کے کاموں میں جو سہولت
ہوئی اور اس سے جو فوائد حاصل ہوئے وہ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔

ساتواں باب

مارکوئس ہیسٹنگز کا دور حکومت

پنڈاریوں کا زور اور حکومت ہند کی تشویش

۱۸۱۳ء میں مارکوئس ہیسٹنگز گورنر جنرل
و سپہ سالار ہند کی حیثیت سے یہاں پہنچا۔ یہ شخص (۴۴۲)
اپنے نسب اور اپنے کیرکٹر کے لحاظ سے دونوں عہدوں
کے اختیارات کے لئے نہایت موزوں تھا اور ضروریات
زمانہ کے لحاظ سے مصلحت بھی اسی میں تھی کہ یہ اختیارات
ایک ہی شخص کے ہاتھ میں رکھے جائیں حکام بالا کو
انگلستان میں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ قزاقوں کے جو بڑے بڑے گروہ
یہاں قائم ہو گئے ہیں ان کی زیادتیاں ہماری خاموشی کی وجہ سے روز بروز
بڑھتی جاتی ہیں لہذا ہمیں اپنی رعایا اور اپنے حلیفوں کو ان کے حملوں سے
محفوظ رکھنے کی غرض سے بہت جلد سختی سے کام لینا پڑے گا۔ (۴۴۳)

باوجود ان خیالات کے اب تک یہ توقع بھی تھی کہ شاید جنگ کی نوبت
نہ آئے اور جو ریاستیں ان قزاقوں کی معاون نہیں بنی ہیں ان سے اتحاد قائم کرنے
سے ہمارا مقصد حاصل ہو جائے۔ گورنر جنرل نے حکمت عملی اختیار کی وہ

انھیں خیالات اور اس قسم کے خواہشات پر مبنی تھی۔ اگرچہ امن برقرار رکھنے کی خاطر وہ ہر ممکن کوشش کرنے کے لئے آمادہ تھا تاہم اس کے طرزِ عمل سے بہت جلد اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ جس حکومت کا کام اس کے تفویض کیا گیا ہے اسکی عزت برقرار رکھنے کے لئے اگر جنگ ضروری سمجھی گئی تو وہ اس کی ذمہ داری سے پیچھے ہٹنے والا نہیں ہے اور وہ ہر گستاخانہ حملے کی مدافعت کے لئے تیار ہے۔

نیپالیوں کی دست درازیاں

لارڈ منٹو کے زمانے میں نیپالیوں نے جو دست درازیاں شروع کی تھیں ان کا کچھ نہ کچھ سلسلہ کئی سال سے جاری تھا۔ اولاً نہایت صبر و تحمل سے کام لیا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ کئی موضعوں پر برطانوی حکومت کے علاقوں پر جبراً قبضہ کر لیا گیا۔ لارڈ منٹو نے اپنی واپسی سے قبل مجبوراً انھیں جنگ کی دھمکی دے دی تھی لیکن اسکا بھی کچھ اثر نہیں ہوا اور ان کے اس قسم کے حرکات برابر جاری رہے۔ بالآخر مسلسل اور متواتر زیادتیوں کا نظر انداز کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ مارکوئس ہیسٹنگز نے ان کے روکنے کے لئے جو تدابیر اختیار (۴۴۴)
کیئے ان سے صاف ظاہر تھا کہ دونوں سلطنتوں کے درمیان جو تنازعات اور اختلافات ہیں انھیں حکومت ہند مصالحت کے ذریعے سے طے کرنا چاہتی ہے۔

ان سب کی تحقیقات شروع کی گئی اور کمشنر مقرر کیے گئے تاکہ وہ راجہ نیپال کے نمائندوں سے گفتگو کریں لیکن یہ تمام کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ جو معاملات ناقابلِ ابطال ثبوت کی بنا پر طے ہو گئے تھے انھیں نیپالیوں نے ازسرِنو چھیڑ دیا اور جب گورنر جنرل نے اس قسم کے معاملات پر دوبارہ بحث کرنے سے انکار کیا تو کمپنی کے نمائندوں کو حکم ملا کہ وہ فوراً نیپال کی سرحد سے باہر چلے جائیں۔ اس کے بعد گورکھا حکومت نے اپنے نمائندے کاٹمنڈو (جو اس کا دار الحکومت تھا) واپس بلا لئے۔ اس اشتعال انگیز حرکت کے بعد بھی گورنر جنرل اپنے طریقۂ عمل پر قائم رہا۔ اس نے راجہ کو ایک خط لکھا اور نیپال کے نمائندوں نے جو روش اختیار کی تھی اس کا حوالہ دے کر راجہ سے درخواست کی کہ کمپنی کے جن علاقوں پر نیپالیوں نے جبراً قبضہ کر لیا ہے اور جس کا وہ خود

اعتراف کر چکے ہیں انھیں خاموشی سے واگذاشت کر دیا جائے اور اسکے لئے احکام جاری کر دئے جائیں۔ اسی سلسلہ میں راجہ کو صاف طور سے تنبیہ کر دیا گیا کہ اگر ان علاقوں سے دست برداری نہیں دیگئی تو مجبوراً برطانوی فوجیں ان پر قبضہ کر لیں گی اور جو دیہات دوران تحقیقات میں عارضی طور پر ہمارے قبضے میں دے دئے گئے تھے ان کے دائمی الحاق کا اعلان کر دیا جائے گا۔

(۵۴۴) ان مطالبات اور دھمکیوں کی کچھ پروا نہیں کی گئی لہٰذا مجبوراً گورکھپور کے اضلاع پر قبضہ کرنے کا حکم دے دیا گیا اور راجہ نیپال سے دوبارہ درخواست کی گئی کہ سارن کے علاقے سے بھی دست برداری دی جائے لیکن جب اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا تو اس علاقے پر قبضہ کرنے کے لئے بھی فوج کا ایک دستہ روانہ کر دیا گیا جس نے وہاں پہنچ کر بغیر کسی مقابلے کے قبضہ کر لیا۔ کمپنی کی فوجوں کے پہنچتے ہی نیپالیوں کی فوجیں مراجعت کر گئیں۔ معاملات کی یہ صورت تھی کہ برسات کا موسم شروع ہو گیا۔ اس زمانے میں یہاں کی آب و ہوا نہایت خراب ہو جاتی ہے لہٰذا فوجیں واپس بلالی گئیں اور تصفیہ طلب علاقوں کا انتظام سیول اور پولیس کے ہندوستانی افسروں کو تفویض کر دیا گیا۔ نیپالیوں نے جب ان لوگوں کو غیر محفوظ دیکھا تو وہ ان پر فوراً حملہ کر بیٹھے اور بوٹوال میں جو پولیس کے ملازم متعین تھے ان میں سے اٹھارہ کو ہلاک کر ڈالا اور چھ کو مجروح اور برطانوی حکومت کے مقامی عہدہ دار کو نہتا پاکر انھوں نے اسے قصداً قتل کر دیا اس قتل میں حد درجہ بیرحمی برتی گئی مزید براں یہ سب حرکات نیپالیوں کے مقامی فوجدار یعنی سپہ سالار کی موجودگی میں ہوئے اور اس واقعے کے بعد اس قسم کی زیادتیاں دوسرے مقامات پر بھی ظہور میں آئیں۔

اس قدر زبردست علانیہ مخاصمانہ کار روائی کے بعد کمپنی فوراً اعلانِ جنگ کر دینے میں حق بجانب ہوتی لیکن گورنر جنرل نے محض اس خیال سے کہ معاملات حد سے تجاوز نہ کرنے پائیں راجہ نیپال کی توجہ ان واقعات کی طرف مبذول کرائی اور اس سے مطالبہ کیا کہ ان ظالمانہ حرکات کی ذمہ داری اُسے اپنے اوپر نہیں لینی چاہیئے بلکہ ان کے مرتکبین کو سزا دینی چاہیئے۔

اس مطالبے کا جو جواب ملا وہ مبہم تھا۔ اس میں کسی قدر دھمکی بھی تھی لیکن اس سے دو باتیں صاف ہوگئیں۔ اول یہ کہ نیپالی افسروں نے جو زیادتیاں کی تھیں ان کی اس نے تائید کی اور ملزموں کی حمایت کی۔ دوسرے یہ کہ برطانوی حکومت کے جو نقصانات ہوئے تھے اور اس کی جو ہتک ہوئی تھی اس کی تلافی کرنے کے لئے وہ آمادہ نہیں ہے۔ (۳۴۶)

اس طور سے مصالحت کے ذریعے سے معاملات طے کرنے کی توقع جاتی رہی اور گورنر جنرل نے جنگ کی تیاری شروع کردی۔ ہندوستانی ریاستوں اور کمپنی کی رعایا کی اطلاع کے لئے اس نے ایک اعلان شائع کیا اور جس ضرورت سے مجبور ہوکر یہ انتہائی کارروائی اختیار کرنی پڑی تھی اسے واضح کیا۔ نیپالیوں نے جو دست درازیاں کی تھیں انھیں تفصیل سے بیان کیا اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی ذکر کیا کہ سارن کے علاقہ میں جہاں جہاں کمپنی کی رعایا آباد اور فوج متعین ہے وہاں نیپالیوں نے ان کے ہلاک کرنے کے لئے پانی کے خزانوں اور متعدد کنووں میں زہر ڈالدیا ہے۔ اس سرکاری اعلان کے آخری حصے میں یہ درج تھا کہ "چونکہ برطانوی حکومت اپنے حقوق اپنے مفاد۔ اور اپنے اعزاز و وقار کی حفاظت کیلئے تلوار اٹھانے پر مجبور ہوئی ہے لہذا جبتک کہ غنیم نہایت عاجزانہ طور سے اپنے سفاکانہ طرز عمل کی تلافی نہیں کریگا اور تاوان جنگ ادا کرنے اور سابق تعلقات کو برقرار رکھنے کے لئے جنھیں اس نے نہایت بے شرمی سے تباہ کرڈالا ہے معقول ضمانت نہیں پیش کرے گا اس وقت تک وہ اپنا ہاتھ ہرگز نہیں روکے گی۔ (۳۴۷)

راجہ نیپال نے اس موقع پر جو طرز عمل اختیار کیا تھا اسے اس کے غرور اور اس کی جہالت پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں اسکے خود غرض درباریوں کا اثر اور ان کی سازش بھی اس میں شامل تھی۔ مزید براں اس قسم کی ہر ریاست میں معاملات کو التوا میں ڈالنے کی جو عادت ہے اسکا بھی دخل تھا۔ ان اسباب میں ایک اور اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ گزشتہ موقعوں پر انھیں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی اس سے ان میں گستاخی آگئی تھی اور وہ اقدامی حملوں کی طرف مائل ہوگئے تھے اس کے ساتھ ہی انھیں اپنے ہموطنوں کی ہمت و جرأت اور اپنے ملک کی قوت پر

ایک خاص گھمنڈ بھی تھا۔

نیپال کے خلاف جنگ کی تیاریاں اور ناگپور بھوپال اور ساگر سے اتحاد قائم کرنے میں ناکامی

جب لارڈ ہیسٹنگز نے جنگ کا تہیہ کر لیا تو اس نے اپنی وسیع پیمانے پر تیاریاں شروع کیں تاکہ ابتدا ہی میں حسب خواہ کامیابی حاصل ہو جائے لیکن اس نے یہ کاروائی صرف نیپال پر حملہ کرنے تک محدود نہیں رکھی ہندوستان پہنچنے کے تھوڑے ہی زمانے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ پنڈاریوں کی روز افزوں زیادتیاں اب زیادہ مدت تک برداشت نہ کیجا سکیں گی اور اس نے حکام بالا کو نہایت پرزور الفاظ میں لکھ دیا تھا کہ اس مصیبت اور خطرناک صورت سے فوری نجات حاصل کرنے کے لئے جو تدابیر ضروری ہیں ان کی جلد از جلد منظوری صادر فرمائی جائے۔

۱۸۱۲ء میں راجہ ناگپور سے جو مراسلت شروع ہوئی تھی وہ اب ۱۸۱۴ء میں انگریزوں کے خلاف ثابت ہوئی راجہ مذکور نے کمپنی سے دفاعی معاہدہ کرنے سے قطعی انکار کر دیا اور اس پر طرہ یہ کہ وزیر محمد نواب بھوپال کو دبانے کی غرض سے اس نے دولت راؤ سندھیا سے معاہدہ کر لیا۔ نواب مذکور ایک بہادر سردار تھا اور ایک مدت دراز سے ہندو ریاستوں کا مقابلہ کر رہا تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ان ریاستوں کی متحدہ قوت اب اس پر بہت جلد غالب آ جائے گی۔

ناگپور سے جو گفت و شنید جاری تھی اس میں ناکامی ہونے کے بعد خیال ہوا کہ مرہٹوں کے خلاف فوجی کارروائی شروع کرنے کا جو ارادہ ہے اسمیں خاطر خواہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے نواب بھوپال سے معاہدہ کیا جائے۔ اس ریاست (۸۴۴)

لہ نواب وزیر محمد کے خلاف اتحاد اور بھوپال کے محاصرے کی تفصیلی واقعات کے لئے ملاحظہ ہو سنٹرل انڈیا جلد اول صفحہ ۳۹۴

سے انگریزی حکومت کے تعلقات مدت سے دوستانہ تھے۔ علاوہ ازیں اس علاقہ کی جغرافی اہمیت اور نواب مذکور کے ذاتی اوصاف کے لحاظ سے بھی یہ اتحاد نہایت مناسب تھا لہٰذا گورنر جنرل نے نواب بھوپال سے مراسلت شروع کرنے کے لئے احکام جاری کر دیئے اور گوبند راؤ[1] کی طرف بھی رخ کیا۔ ہیسٹنگز کا خیال تھا کہ ان دونوں سرداروں سے معاہدہ کرنے کے بعد بندیلکھنڈ اور برار کی فوجی چھاؤنیوں میں ایک سلسلہ قائم ہو جائیگا اور کمپنی آئندہ دفاعی تدابیر اختیار کرے یا اقدامی دونوں صورتوں میں یہ اتحاد نہایت مفید ثابت ہوگا۔ اس وقت مرہٹہ سرداروں اور رنجیت سنگھ والی لاہور اور امیر خاں کے مابین باہمی سازشوں کا جو بازار گرم تھا اسکی وجہ سے گورنر جنرل کے نزدیک یہ کارروائی زیادہ ضروری تھی۔ آخر الذکر سردار کمپنی کی سرحدوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ علاوہ ازیں دوسرے آثار بھی یہ بتا رہے تھے کہ انگریزوں کے خلاف ایک جتھا قائم ہو رہا ہے جو نیپال سے جنگ چھڑ جانے کی صورت میں بہت جلد مکمل ہو جائے گا۔

وزیر محمد سے جب اتحاد کی خواہش کی گئی تو اس نے فوراً آمادگی ظاہر کی سندھیا کے دربار والے رزیڈنٹ نے اس آمادگی کے بعد جو نہایت معمولی الفاظ میں ظاہر کی گئی تھی یہ خیال کیا کہ اتحاد کے ابتدائی شرائط طے ہو گئے ہیں لہٰذا سندھیا کو اس کی اطلاع کر دی جائے۔ سندھیا نے اس پر نہایت سختی سے اعتراض کیا اور یہ دعویٰ پیش کیا کہ چونکہ نواب بھوپال اسکا زیر دست ہے لہٰذا انگریزی حکومت کو اس سے کسی قسم کا معاہدہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ دعویٰ واقعات کے خلاف تھا۔ بھوپال کے نواب کبھی سندھیا کے خاندان والوں کے باجگزار نہیں رہے تھے[2] البتہ وہ دوسری ریاستوں کے حملوں سے محفوظ رہنے اور کبھی کبھی خود ان سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے انہیں بڑی بڑی رقمیں دیتے رہتے تھے (۹۴۴)

لہ نواب بھوپال کے بزرگوں نے جنرل گاڈرڈ کی فوج کی مراجعت کے موقع پر انگریزوں کی معقول مدد کی تھی۔

ٹہ ساگر کا موروثی رئیس تھا

سہ بحوالہ سنٹرل انڈیا جلد اول صفحہ ۳۸۷۔

سندھیا اور نواب بھوپال کے تعلقات کی یہ نوعیت رہی تھی۔ گورنر جنرل نے اسی پر زور دیا اور اسی بنا پر یہ دلیل پیش کی کہ ان حالات میں برطانوی حکومت کو بھی اپنے مفاد کی خاطر مذکورۂ بالا مسلمان سردار سے اتحاد قائم کرنے کا حق حاصل ہے اس کے بعد سندھیا کو مطلع کر دیا گیا کہ بھوپال سے جو گفت و شنید جاری ہے وہ اس نوبت پر پہنچ چکی ہے کہ گورنر جنرل آپ سے بجا طور پر اس بات کا مطالبہ کر سکتا ہے کہ آپ اس ریاست پر حملہ کرنے کا خیال نہ کریں۔ اسی طور سے ناگپور کے راجہ کو بھی متنبہ کر دیا گیا۔ ان باتوں کو موثر بنانے کی غرض سے کمپنی کی فوج کا ایک دستہ بندھیلکھنڈ میں رکھ دیا گیا اور حیدرآباد کی امدادی فوج ایلچپور[1] کو منتقل کر دی گئی۔

دولت راؤ سندھیا کا ان باتوں سے اطمینان نہیں ہوا لیکن اس موقع پر (۱۸۰۵ء
وہ برطانوی حکومت سے بگاڑ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اگرچہ اس نے کئی مرتبہ اس قسم کے الفاظ استعمال کئے تھے جنھیں دھمکی پر محمول کیا جا سکتا تھا تاہم وہ رفتہ رفتہ جنگ کے راستے سے پیچھے ہٹ گیا علاوہ ازیں نواب بھوپال نے اپنے دارالحکومت کی حفاظت کے لئے جو زبردست تیاریاں کی تھیں ان کے بعد سندھیا کی کامیابی بھی بہت مشتبہ ہو گئی تھی۔ راجہ ناگپور نے گورنر جنرل کی باتوں کو بخوشی تسلیم کر لیا اور وعدہ کیا کہ وہ بھوپال پر حملہ کرنے کا کبھی ارادہ نہیں کرے گا اور ریاست مذکور کی حفاظت کے لئے جو برطانوی فوجیں روانہ کی جائیں گی انھیں اپنی ریاست سے گزرنے کی اجازت بھی دے دے گا۔

ان فوری خطرات سے محفوظ ہو جانے کے بعد وزیر محمد نے اتحاد کی تکمیل میں کچھ ایسی بے اعتنائی برتی کہ گورنر جنرل نے اس سے مراسلت بالکل بند کر دی۔ ساگر کے سردار کا بھی یہی رنگ رہا لہٰذا اس کے ساتھ بھی اسی قسم کی کارروائی کی گئی۔

نیپال کے خلاف جنگ

نیپال کے خلاف جنگ شروع کرنے میں جو غیر معمولی اور خلاف امید رکاوٹیں پیدا

[1] ایلچپور برار کا دارالحکومت ہے۔

ہوئیں اور جنگ چھڑنے کے بعد ابتدائی مدارج میں جو ناکامی ہوئی اس سے ہندوستانی ریاستوں میں فوراً سازشیں شروع ہوگئیں اور انمیں کچھ ایسی ہل چل مچ گئی کہ برطانوی حکومت کو یہ محسوس ہوگیا کہ ان میں سے ہر ایک اس کی قوت کے خلاف متحد ہونے کیلیئے آمادہ ہے۔ رنجیت سنگھ ستلج پر نمودار ہوگیا۔ امیر خاں نے کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات کی سرحد پر پڑاؤ ڈال دیا۔ ناگپور۔ پونہ اور گوالیار کے درباروں میں روزانہ ایک دوسرے کے قاصد چکر لگانے لگے اور ڈاک کا ایک سلسلہ بندھ گیا۔ برطانوی حکومت کی شکست کی توقع پر ان ریاستوں نے جو منصوبے باندھے تھے اور جو جال پھیلایا تھا اس کی نوعیت و وسعت کا تو کچھ پتہ نہیں لگ سکا لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں رہا کہ کمپنی کے خلاف بہت کچھ ہل چل تھی اور سازشیں ہورہی تھیں۔ سر ڈیوڈ اخترلونی کو کمایوں کے پہاڑی علاقے میں جو فتوح حاصل ہوئے ان سب سے معاملہ دگرگوں ہوگیا اور کمپنی (۴۵۱)
کے خلاف جو متحدہ کوششیں جاری تھیں اگر ان کی نوعیت میں کچھ فرق نہ آیا تو کم از کم وہ عمل میں نہ آسکیں۔

دسمبر ۱۸۱۴ء میں اور اس کے بعد دو مہینے تک معاملات ہمت شکن رہے۔ گورنر جنرل نے تمام بدشگونیوں کا اندازہ کرلیا اور نہایت استقلال سے نیپال میں جنگ جاری رکھی۔ بنگال کی تمام فوج وہاں مصروف رہی۔ مدراس اور بمبئی سے جو فوجیں فراہم ہوسکتی تھیں انھیں ان دونوں صوبوں کی سرحدوں پر جما دیا گیا تاکہ مرہٹے اور پنڈاری ادھر کا خیال نہ کرسکیں لیکن اپریل ۱۸۱۵ء کی فتوحات اس قدر فیصلہ کن رہیں کہ ماتحت حکومتوں کی فوجیں چھاؤنیوں میں واپس بھیجدی گئیں اور برطانوی مقبوضات پر کسی قسم کے حملے کا خوف باقی نہیں رہا۔

دریائے گھاگرا کے مغربی علاقے کے فتوح اور مزید تیاریوں سے حکومت نیپال اس قدر مرعوب ہوگئی کہ راجہ نے فوراً صلح کی درخواست پیش کردی۔ لارڈ ہیسٹنگز نے مندرجۂ ذیل شرائط اس کے سامنے پیش کئے۔

دریائے گھاگرا کے مغرب میں جو پہاڑی علاقہ فتح ہوچکا ہے وہ مستقل طور سے کمپنی کے حوالے کیا جائے۔

"جنگ سے قبل زیریں علاقے میں جن مقامات کی بابت تنازعہ تھا وہ (۴۵۲)

سب کمپنی کے حوالے کئے جائیں نیز پہاڑ کے دامن میں جو علاقہ واقع ہے اس سے بھی دست برداری دی جائے۔

"جنگ سے قبل کمپنی کے حلیف راجہ شکم سے جو علاقہ لیا گیا تھا وہ بھی واپس کیا جائے۔"

ان شرائط میں ایک اضافہ یہ بھی کر دیا گیا کہ حکومت نیپال برطانوی رزیڈنٹ کو کاٹھمنڈو میں رہنے کی اجازت دے گی۔ نیپالیوں کو اس سے ہمیشہ نفرت رہی تھی کیونکہ وہ اسے غلامی کی زنجیر کی پہلی کڑی سمجھتے تھے۔

یہ شرائط اس قدر ناقابل منظوری سمجھے گئے کہ راجہ نیپال کے مذہبی مشیر (یا گرو) نے جو صلح کرنے کے لیے متعین کئے گئے تھے یہ کہہ کر تمام گفت و شنید بند کر دی کہ ترائی کا علاقہ حکومت کاٹھمنڈو کے وزراء اور امراء کی پرورش کا واحد ذریعہ ہے لہذا اس علاقے کی ایک چپہ زمین بھی نہیں دیجا سکتی البتہ جن اضلاع کی بابت جھگڑا ہے ان سے اب وہ دست بردار ہونے کے لئے آمادہ ہیں۔

جب اس بات کا احساس ہوا کہ علاقہ ترائی کا مطالبہ ہی صلح میں حائل ہے نیز حکومت نیپال کا اس امر پر اصرار کسی خاص غرور پر مبنی نہیں ہے بلکہ جن لوگوں کو وہاں جاگیریں دی گئیں ہیں ان کی مالی حالت کا خیال دامن گیر ہے تو گورنر جنرل نے اپنے اس مطالبے میں کسی قدر کمی کر دی اور یہ تجویز پیش کی کہ اس کے عوض میں کمپنی سے دو تین لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کا کوئی علاقہ لے لیا جائے یا جن لوگوں کی وہاں جاگیریں ہیں وہ یہ رقم بطور وظیفے کے قبول کر لیں۔ یہ تجویز بھی مسترد کر دی گئی۔ جب کوئی اور تدبیر کارگر نہ ہوئی تو دوسرا مسودہ تیار کیا گیا اور اس میں ترائی کا صرف وہ علاقہ طلب کیا گیا جو دریائے گھاگرا کی شاخ کاکی اور گنڈک کے درمیان واقع ہے اس کے ساتھ بھی کمپنی نے ذاتی وانفرادی نقصانات کی تلافی کے لئے وظایف دینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن نیپال کے وکیلوں نے جواب دیا کہ راجہ کی منظوری کے بغیر ہم اسے بھی تسلیم نہیں کر سکتے البتہ ہم اتنا وعدہ ضرور کر سکتے ہیں کہ پندرہ دن کے اندر اس کا جواب بھیجدیا جائے گا۔" اس کا کوئی جواب نہیں ملا لیکن یہ پتا چل گیا کہ ان تجاویز کی وجہ سے دربار نیپال میں ایک

طوفان برپا ہے۔

ذاتی نقصانات کی تلافی کے لئے وظائف کی جو شرط پیش کی گئی تھی اسکی بہت
سخت مخالفت بھی اور یہ دلیل پیش کی گئی کہ اس طور سے راجہ کے اکثر وزراء اور امراء
ایک بیرونی طاقت کے دست نگر بن جائینگے ۔ امیر سنگھ نے جو خاص خوبیوں کا آدمی تھا اور جسے نیپال کے
فوجی سرداروں میں خاص امتیاز حاصل تھا خاص طور سے اس بات پر بہت زور دیا۔

اس قدیم فوجی افسر نے ان تمام تنازعات میں جو حصہ لیا تھا وہ قابل توجہ ہے وہ
شروع سے جنگ کے خلاف تھا اور جن باتوں سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی تھی اور جن (۴۵۴)
وجوہ سے یہ خطرات پیش آئے تھے ان سب کی اس نے مذمت کی تھی لیکن جب
جنگ چھڑ گئی تو وہ اس کا نہایت زبردست مؤید بن گیا اور اس نے اس بات پر زور دیا کہ
ملک کی پوری قوت اس میں صرف کی جائے اور آخر تک جان توڑ کوشش کی جائے
جنگ کے ابتدائی مدارج ہی میں اسے ہدایت ملی تھی کہ معقول مراعات دے کر صلح کر لی
جائے لیکن اس کا جو جواب اس نے دیا وہ اتفاق سے انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا
وہ ایک نہایت اہم تحریر ہے۔ اس سے اس کے لکھنے والے کی ذاتی خوبیوں
کا اندازہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس بہادر اور غیرت مند قوم کے
خیالات وجذبات کا بھی پتا چلتا ہے۔ علاوہ ازیں اس تحریر سے یہ بھی معلوم
ہوتا ہے کہ اگرچہ یہ لوگ اپنی حکومت کے انتہائی مطیع اور فرمانبردار ہوتے
ہیں لیکن ان کی اطاعت ہمیشہ غلامی نہیں ہوتی جیسا کہ انگریز اپنی
ناواقفیت کی وجہ سے ہر ایشیائی قوم کی بابت خیال کر لیتے
ہیں

امیر سنگھ نے جس طرح ابتدا میں ان تمام ناعاقبت اندیش حرکات کی مذمت
کی تھی جن کی وجہ سے جنگ چھڑی تھی اسی طرح جنگ شروع ہونے کے بعد اسکے
خطرات سے بچنے کے لئے دب کر بزدلی اور ذلت سے صلح کر لینے کی تجویز کو بری
نگاہ سے دیکھا مجوزہ مراعات کی بابت وہ اپنی اس تحریر میں لکھتا ہے کہ "اگر
شروع ہی میں آپ صلح پسند بن جاتے اور وکیلوں کے فیصلے کے مطابق بٹوال
اور شیوراج واپس کر دیتے تو اس جنگ سے ہم بچ جاتے لیکن آپ اپنی حرص وطمع

پر غالب نہ آسکے اور ان مقامات پر قبضہ برقرار رکھنے کی خواہش پر قائم رہے۔ مالگزاری کے عہدہ داروں کو قتل کر کے آپ نے ایک طوفان برپا کر دیا اور محض جزوی فروعات کے لئے جنگ مول لی۔"

اس خط کے دوسرے حصے میں وہ لکھتا ہے کہ اگر آپ نے اس وقت کچھ (۲۵۵
علاقہ دے کر سمجھوتہ کر لیا تو یاد رکھئے کہ چند ہی سال کے عرصے میں یہ غنیم ٹیپو کی سلطنت کی طرح نیپال پر بھی اپنا قبضہ جمالے گا لہٰذا اب وقت صلح سمجھوتوں کا نہیں ہے مالگزاری کے افسروں کے قتل سے قبل یہ تدابیر اختیار کی تو میں اور اب جب تک کہ ہمیں کامل فتح حاصل نہ ہو جائے ان کا نام نہیں لینا چاہیئے اس کے بعد میں انگریزوں کو اپنی شرائط پیش کروں گا اگر انھیں وہ مان گئے تو خیر ورنہ خدا کی مدد سے اور آپ کے اقبال سے اپنے دیس کی حرمت کھنکا (Khanka) سے لیکر ستلج تک قائم رکھوں گا۔ پس میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ صلح کا قطعی نام نہ لیجئے۔ پچھلی مرتبہ جب چند لوگوں نے صلح اور تجارتی معاہدے کی تجاویز پیش کی تھیں تو میں نے اس وقت بھی انھیں منظور نہیں کیا تھا لہٰذا اب میں یہ بات کیسے گوارا کر سکتا ہوں کہ اپنا علاقہ دے کر اور دب کر صلح کر لوں اور ہمیشہ کے لئے اپنے راجہ کے نام پر بٹہ لگاؤں لیکن اگر آپ اسی پر تلے ہوئے ہیں تو مہربانی فرما کر صلح کن کار تبہ ان صاحب کو عطا فرمائیے جنھوں نے کہ اس تجویز کو پیش کیا ہے اور مجھے اس ذلت سے محروم رکھئے۔"

یہ خط جنگ کے ابتدائی زمانے میں لکھا گیا تھا اور امیر سنگھ اسوقت سر ڈیوڈ اختر لونی کے خلاف کمایوں کے علاقے میں لڑ رہا تھا۔ میدان جنگ میں بھی اس نے اسی طرح ہمت و جرارت دکھائی اور حب وطن کا جوش ظاہر کیا۔ لاؤں کا قلعہ خاص اس کی نگرانی میں تھا۔ اس کی تسخیر کے بعد وہ کاٹمنڈو پہنچا اور وہاں برابر اس بات کی کوشش کرتا رہا کہ جنگ سختی سے جاری رکھی جائے اور دب کر ایسی شرائط ہرگز قبول نہ کیجائیں جن سے گورکھوں کی حکومت کی آزادی میں فرق آئے یا اس کی شہرت میں کمی واقع ہو۔

اس عرصے میں یہ خیال پیدا ہوا کہ حکومت نیپال کی کافی ذلت ہو چکی ہے (۲۵۶

اور ترائی کے علاقے پر قبضہ رکھنے سے کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہے لہذا جن شرائط پر بھی قابل اطمینان معاہدہ ہو سکے اور عزت بچ سکے اسے کر لیا جائے اس خیال کی بنا پر گورنر جنرل نے اپنی سابقہ تجاویز میں بہت کچھ ترمیم کر دی اور صلح پسند روش اختیار کی ۔ یہ پیغام صلح ابھی کائمنڈو پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ راجہ کا خاص وکیل یعنی اس کا گرو سابق مسودے پر بھی دستخط کرا کے پہنچ گیا ۔ اس اتفاق سے لارڈ ہیسٹنگز کو بہت خوشی ہوئی اور اپنے آپ کو مبارکباد دے کر کہا کہ میں نے اپنے مطالبات میں کمی کرنے کا جو ارادہ کیا تھا ان کی شکل اب ایک عطیہ کی ہوگی اور ہمارے مغلوب غنیم پر ہماری اس فیاضی کا بہت اچھا اثر ہوگا ۔" ابھی گفت وشنید جاری ہی تھی کہ جنگ کے حامی دربار نیپال میں غالب آ گئے ۔ عہدنامے کی توثیق ملتوی کر دی گئی اور جنگ کی تیاریاں مستعدی سے شروع ہوگئیں ۔ ان واقعات کو دربار نیپال کی تلون مزاجی اور بددیانتی پر محمول کیا گیا اور یہ خیال ہوا کہ انگریزوں نے آخر میں جو کمزوری دکھائی اور گھاگرا کے مشرقی علاقے میں بڑھنے کی کوشش نہ کی اس سے گورکھوں کے حوصلے بڑھ گئے اور انھیں کامیابی کی توقع ہوگئی ۔

(۴۵۷) جن اصولوں پر برطانوی حکومت اس وقت فیصلہ کر رہی تھی ان پر یہ لوگ عمل نہیں کر سکتے تھے لہذا ان معاملات میں برطانیہ کا جو نقطۂ نظر تھا اسے بھی وہ نہیں سمجھ سکتے تھے ۔ ان حالات میں گورنر جنرل نے جو صلح کی خواہش ظاہر کی اس سے لازمی طور پر انھیں یہ گمان ہوا کہ انگریز بھی اپنی کامیابی مشتبہ سمجھتے ہیں ۔ اگر ان کے اسی قسم کے خیالات تھے تو ان کا دھوکا بہت جلد دور ہو گیا ہوگا سرعد پر جو کثیر التعداد فوج جمع کی گئی تھی وہ فوراً اختر لونی کی کمان میں دیدی گئی اور اس نے بلا تامل ان کے پہاڑی علاقے پر دھاوا بول دیا ۔ انگریزوں کو مسلسل ایک ماہ تک فتوح حاصل ہوتے رہے اور اس قلیل مدت ہی میں نیپالیوں کی ہمت پست ہوگئی اور وہ انگریزوں کے رحم وکرم کے خواستگار بن گئے ۔ ان کے سفیر نے جن شرائط پر دستخط کئے تھے ان کی راجہ نے توثیق کر دی اس کے بعد اسے جتلا دیا گیا کہ انگریزی حکومت نے اپنی فیاضی سے ان میں ترمیم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن اس اثنا میں آپ کا جو طرز عمل رہا ہے اس کی وجہ سے آپ اس احسان

کئے مستحق نہیں رہے۔
جب حکومت نیپال نے عہدنامے کی تمام شرائط کی تعمیل کر دی تو گورنر جنرل نے کاٹھمنڈو میں ایک برطانوی رزیڈنٹ کا تقرر کیا اور ازراہ عنایت اسے اس بات کا اختیار دے دیا کہ ترائی کے علاقے کے عوض میں کمپنی نے وہاں کے امراء اور وزراء کے نقصانات کی تلافی کے لئے وظائف دینے کا جو وعدہ کیا تھا ان سے وہ راجہ کے خواہش کے مطابق دست بردار ہو جائے اور ترائی کا پورا علاقہ بجز ایک حصہ کے جو سلطنت اودھ سے ملحق تھا واپس کر دے۔
(۴۵۸) نواب وزیر اودھ نے جنگ کے آغاز کے وقت کمپنی کو ایک کروڑ روپیہ قرض دیا تھا لہذا اس رقم کے عوض میں مذکورۂ بالا علاقہ مع کمپنی کے ایک ضلع کے جو اس کے قرب میں واقع تھا نواب کو دے دیا گیا۔
گورنر جنرل نے اپنی فیاضی سے حتی الوسع نیپالیوں کو منانے کی کوشش کی اور اس مغرور اور جنگجو قوم کو اس غیر مساوی مقابلے میں جو شکست ہوئی تھی اور اس کی وجہ سے جو نقصانات اسے برداشت کرنے پڑے تھے ان سب پر بالآخر اسے صبر آ گیا۔

نیپال کے معاملے میں گورنر جنرل کی حکمت عملی اور بھوپال اور ساگر سے معاہدہ

گورنر جنرل کے دور کا یہ پہلا کام تھا اور اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس فتح سے محض اقدامی حملوں اور بے باکانہ جسارت ہی کا تدارک نہیں ہوا بلکہ اس سے ایک ایسی بہادر اور بلند حوصلہ قوم کی قوت کو ضعیف کر دیا گیا جس نے اپنی فتوحات کے ذریعہ سے اس زمانے میں تمام پہاڑی علاقے پر جو پنجاب کی شمالی سرحد تک پھیلا ہوا تھا قبضہ جما لیا تھا اور اپنے زبردست فوجی وسائل میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ ہندوستانی فرمانرواؤں کا خیال تھا کہ نیپال کے پہاڑی علاقے اس قدر محفوظ و محصور ہیں کہ انگریزوں کی قوت بھی ان پر غالب نہ آ سکے گی لہذا اس فتح سے ہندوستان میں جو عام اثر پیدا ہوا اس سے بھی کمپنی کو بہت کچھ فائدہ ہوا

اس زمانے میں کمپنی نے بھوپال اور ساگر کی ریاستوں سے تعلقات قائم کرنے کی جو تجویز کی تھی اس پر سخت اعتراضات ہوئے اور یہ کہا گیا کہ ایسی حالت میں جبکہ ایک طرف جنگ جاری تھی اور بنگال کی ساری فوج وہاں مصروف تھی اور اکثر فرمانروا اور سردار (جو اگرچہ کمپنی کے دوست نہیں تھے تاہم اس سے دبے ہوئے
(۴۵۹) تھے) اس وقت علانیہ مخالفت پر کمربستہ تھے یہ تجویز خلاف مصلحت تھی۔ علاوہ ازیں سندھیا، ہولکر، امیرخاں اور دیگر تمام قزاقوں سے جنگ مول لئے بغیر اس تجویز کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ بھوپال اور ساگر کی حفاظت اپنے ذمہ لینا گویا سندھیا سے فوری تصادم کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ دلیل پیش کی گئی کہ ہماری اس بے موقع گفت و شنید سے ان سب کو حسد پیدا ہو گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ۱۸۱۴ء کے اواخر اور ۱۸۱۵ء کے اوائل میں جب ہمیں نیپال کے خلاف شکست ہوئی تو ان سب نے برطانوی حکومت کے خلاف ایک زبردست جتھا قائم کر لیا جو ہر لحاظ سے ہمارے لئے نہایت خطرناک تھا۔

ان اعتراضات کا یہ جواب دیا گیا کہ ایسی صورت میں جب کہ راجہ ناگپور نے معاونتی معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا وسط ہند کے قزاقوں کے خلاف جن سے ہمیشہ جنگ کا کھٹکا لگا رہتا تھا خاطرخواہ کامیابی حاصل کرنے کی غرض سے اپنے وسائل بڑھانے کا یہی ایک ذریعہ تھا اور مذکورۂ بالا تجویز اس کے لئے بہترین تدبیر تھی۔ سندھیا اور دوسرے سرداروں کو ہم نیچا دکھا چکے تھے۔ ان کے پاس پہلے ہی سے بہت سے محرکات توت موجود تھے۔ انھیں جو بھی موقع ملتا اس سے وہ اپنی حالت سنبھالنے کی کوشش کرتے۔ ہماری اس تجویز سے انھیں کتنا ہی غصہ کیوں نہ آئے ہم پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی جتلا دیا گیا کہ ہماری اس کارروائی سے مالوہ کے رئیسوں
(۴۶۰) اور سرداروں کے دل میں جو امید قائم ہو گئی تھی کہ انھیں کمپنی کی حفاظت دوبارہ حاصل ہو جائے گی وہ ہر حالت میں مرہٹوں کی کمزور حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے بہت کافی تھی۔ ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے ہم جو اعتدال پسند تدبیر بھی اختیار کرتے وہ اس سے زیادہ موثر نہیں ہو سکتی تھی

حالات زمانہ کے لحاظ سے ان معاہدوں کی حکمت عملی کے متعلق جو کچھ بھی اختلاف رائے ہو لیکن اس موقع پر گورنر جنرل نے اپنی اور اپنے حلیفوں کی سرحدوں کو تمام اقدامی حملوں سے محفوظ رکھنے اور ان تمام عہد ناموں کی تکمیل کرانے کیلئے جو مذکورۂ بالا گفت وشنید سے عمل میں آئے تھے جو زبردست فوجی کاروائی کی اس کی دانشمندی میں کوئی شخص شبہہ نہیں کر سکتا۔

رئیس ہاتھرس کی سرکوبی

نیپال کے خلاف جنگ میں جو فتح حاصل ہوئی اس سے برطانوی فوجوں کی شہرت دوبالا ہوگئی۔ ایک سال بعد ہی کمپنی کے سرکش باجگذار رئیس ہاتھرس کی شکست سے اس میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اس سردار کو اپنے مضبوط قلعے پر بڑا ناز تھا اور اس زمانے میں اطاعت سے انحراف کر کے اس نے سرکشی پر کمر باندھی تھی لہذا اسے ایسی سخت سزا دینے کی ضرورت ہوئی جس سے دوسرے عبرت حاصل کر سکیں۔ کانپور کی چھاؤنی قریب تھی وہاں سے ایک توپخانہ بہ آسانی روانہ کر دیا گیا۔ ہندوستان میں اب تک جو توپیں استعمال ہوئی تھیں ان سے کمپنی کی توپیں اگر زیادہ طاقتور نہیں تو کم از کم ان کے ہم پلہ ضرور تھیں۔ ان سے گولہ باری شروع کی گئی اور چند گھنٹے کے اندر ہی اس مغرور قلعے کی دیوار شق ہو گئی۔ وہاں کے بارود خانے میں آگ لگی اور اس سے قلعہ بالکل مسمار ہو گیا۔ اس کے اندر جتنی عمارتیں تھیں ان میں سے ایک کا بھی نشان باقی نہیں رہا۔

(۲۶۱) یہ فتح کمپنی کو بغیر کسی نقصان کے حاصل ہوئی اور اس کا نہایت اچھا اثر ہوا شمالی ہند کی رعایا اور ہاتھرس والے جیسے سرداروں کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی سخت ضرورت بھی تھی۔

پنڈاریوں کی زیادتیاں

کمپنی کے ان فتوح کے بعد پنڈاریوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوگیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ دلیر ہو گئے۔ نیپال کی صلح اور ہاتھرس کی تسخیر کے بعد ہی ان کے ایک زبردست جتھے نے مدراس کے ایک علاقے پر

دھاوا کیا اور اسے تاراج کر ڈالا۔ اسی سال دکن پر بھی اُنھوں نے ہاتھ صاف کیا اور دوسرے سال پھر ادھر کا رخ کیا۔ ان کے حملے اس قدر سخت ہوئے کہ کمپنی اور حیدر آباد کی متحدہ فوجیں بھی مذکورۂ بالا علاقے کو انکی سفاکیوں سے نہ بچا سکیں گورنر جنرل کو یقین تھا کہ ان کی متواتر زیادتیاں اور اسکی مسلسل عرضداشتوں کے بعد حکام بالا اس ناقابل برداشت مصیبت کی طرف بہت جلد اپنی توجہ مبذول کریں گے لہذا اس نے سردست صرف دفاعی تدابیر اختیار کئے مگر ساتھ ہی ساتھ اس اٹل مقابلے کے لئے اپنی تیاریاں بھی جاری رکھیں جو عنقریب ہونیوالا تھا۔

جے پور سے دوبارہ اتحاد قائم کرنیکا خیال

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ۱۸۰۶ء میں جس اصول پر ریاست جے پور سے تعلقات منقطع کئے گئے تھے اس کے مبنی بہ دانشمندی ہونے میں حکام بالا کو شبہہ تھا بعد کے واقعات سے وہ خلاف مصلحت ثابت بھی ہو گیا اور ۱۸۱۳ء کے آخر میں اس بارے میں احکام بھی وصول ہو گئے کہ (۴۶۲)
اگر موقع ملے تو ریاست جے پور کو دوبارہ کمپنی کی حفاظت میں لے لیا جائے۔ اسی زمانے میں نیپال سے جنگ جاری تھی لہذا ان پر عمل نہ ہو سکا اور حکومت ہند نے حکام بالا کو اپنی رائے سے مطلع کر دیا کہ متعدد وجوہ کی بناء پر مذکورۂ بالا اتحاد کو سردست ملتوی رکھا جائے۔ پنڈاریوں کے خلاف جو انتظامات زیر غور ہیں انہی کے سلسلے میں اسکی تکمیل بھی ہو جائے گی۔ نیپال سے صلح ہو جانے کے بعد امیر خاں کے حملے کی وجہ سے ریاست جے پور کی دارالحکومت کی حالت اسقدر مخدوش ہو گئی کہ گورنر جنرل نے باوجود اپنی سابق رائے کے راجہ سے دوبارہ تعلقات قائم کرنے کی تجویز پیش کر دی۔ برطانوی حکومت نے جب سے راجہ جے پور کو اپنی حفاظت و اعانت سے محروم کیا تھا اسوقت سے وہ برابر اسکی خوشامد کر رہا تھا لیکن جب گورنر جنرل نے خود اس کی تحریک کی تو راجۂ مذکور نے سرد مہری اختیار کی بعد میں پتہ چلا کہ اس معاملے کو ارادتاً التوا میں ڈالا گیا تھا تاکہ امیر خاں اس بات کو محسوس کر کے کہ راجہ جب چاہے گا کمپنی کی مدد حاصل کر لے گا اپنے ارادوں سے باز آجائے۔ گورنر جنرل کو ان باتوں سے سخت کوفت ہوئی۔ علاوہ ازیں

اس وقت کوئی خاص خطرہ بھی نظر نہ آیا لہذا اسنے اپنی سابق رائے کے مطابق وسیع پیمانے پر تیاریاں جاری رکھیں اور اس معاملے کو فی الحال ملتوی کر دیا۔

ناگپور کے حالات اور کمپنی سے معاونتی معاہدہ

(۳۶۳)

رگھوجی بھونسلا (والی ناگپور) نے ۲۲ مارچ ۱۸۱۶ء میں انتقال کیا۔ برطانوی حکومت کو اس ریاست سے معاونتی معاہدہ کرنے کی جو دھن لگی ہوئی تھی اس کے لئے لارڈ ہیسٹنگز کو اب موقع مل گیا۔ پرسی رام بھونسلا راجۂ مذکور کا اکلوتا بیٹا تھا اگرچہ عام خیال یہ تھا کہ اس کی جسمانی و دماغی حالت ایسی نہیں کہ وہ حکومت کے فرائض انجام دے سکے تاہم اسے گدی نشین کرا دیا گیا۔ جب تک کہ وہ عوام کے سامنے نہ آیا اس کی نااہلی کا پورے طور سے اندازہ نہ ہو سکا۔ اس کی محض صحت ہی خراب نہ تھی بلکہ جسم بھی خراب تھا۔ دماغی کمزوری کی وجہ سے دماغ کی حالت بھی صحیح نہیں تھی۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ وہ صرف برائے نام ہی فرمانروا ہو سکتا تھا لہذا حکومت کے حقیقی اختیارات کے لئے ایک بلند حوصلہ سردار دھرماجی اور آپا صاحب میں مقابلہ شروع ہوا (آخر الذکر سابق راجہ کا بھتیجا تھا اور پرسی رام کے بعد گدی کا دعویدار سمجھا جاتا تھا) اور سازشوں کا بازار گرم ہو گیا۔ دھرماجی غالب آیا اور عنان حکومت اس کے ہاتھ میں آگئی لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ محروم کر دیا گیا اور آپا صاحب کے ہاتھ میں مقید ہو گیا۔ یہ سب کام پرسی رام کی مرضی سے ہوا تھا اور اس نے علانیہ طور پر اپنی رائے کا اظہار کر دیا تھا کہ اس کے رشتہ دار کو نائب السلطنت ہونا چاہیے اور حکومت کا تمام کام اسی کے ہاتھ میں رہے۔

برطانوی رزیڈنٹ کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے کام کرے لیکن اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ پرسی رام دراصل حکومت کا کام انجام دینے کے قابل نہیں اور آپا صاحب اسکے بعد گدی کا وارث ہے تو آخر الذکر کو نائب السلطنت بننے میں کمپنی کی مدد دی جائے۔ برطانوی رزیڈنٹ کو ان دونوں باتوں کی بابت کامل یقین ہو گیا۔ پرسی رام کی دماغی و جسمانی حالت سب کو معلوم تھی اور سابق راجہ کا بھانجہ اس کا تنہا قریبی رشتہ دار تھا لیکن

ہندو شاستر کے مطابق لڑکی کی اولاد گدی کی وارث نہیں ہوسکتی تھی لہذا یہ لڑکا آپا صاحب کے مقابلے پر صرف ایک صورت میں گدی کا دعوی دار بن سکتا تھا۔ جب[1] کہ پرسی رام اُسے علانیہ طور پر گود لے لے۔ (٤٦٤)

ان حالات میں جب آپا صاحب نے معاونتی معاہدے کی تحریک کی تو رزیڈنٹ فوراً اس کی طرف رجوع ہو گیا معاہدے کی شرائط طے ہو گئیں اور دکن کی حفاظت کے لئے جو اتحاد قائم تھا اس میں حضور نظام دکن پیشوا اور انگریزوں کی طرح راجہ ناگپور بھی شریک ہو گیا۔ انگریزوں نے اسے اپنی فوج کے چھ بٹالین اور سواروں کا ایک رسالہ دینے کا وعدہ کیا اور راجہ نے اس فوجی خدمت کے حقیقی مصارف[1] جو آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ ہوتے تھے ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔

اس عہدنامے کی گفت[2] و شنید اسقدر راز میں ہوئی تھی کہ آپا صاحب کے چند معتبر مشیروں کے علاوہ دوسرے درباریوں کو پہلی مرتبہ اس کا علم اسوقت ہوا جبکہ انگریزی فوجیں ناگپور میں داخل ہوئیں سابق راجہ کا وزیر خاص ناگوبا یہ سنکر آپے سے باہر ہو گیا اور محل کی عورتیں دمع پرسی رام کی رانی کے سخت ناراض ہو ئیں لیکن یہ سب کمپنی کے اتحاد کے خلاف نہیں تھے بلکہ انھیں آپا صاحب کی اس حرکت پر غصہ تھا۔ ان سب نے مل کر اپنے اثر سے اسے برسر حکومت (٤٦٥) کرایا تھا اور اس سے وعدہ لے لیا تھا کہ حکومت کا کوئی اہم کام ان کی اطلاع یا مرضی کے بغیر انجام نہیں پائے گا۔ ان سب نے اس موقع پر اس قدر سخت مخالفانہ طرز عمل اختیار کیا کہ راجہ کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور وہ ڈر کے مارے اپنا محل چھوڑ کر برطانوی چھاؤنی کے قریب ایک گاؤں میں پناہ گزیں ہو گیا۔

ا۔ گورنر جنرل نے یہ خواہش کی کہ سالانہ رقم کی ادائی کے عوض میں ریاست کا کوئی علاقہ فوج کے مصارف کے لئے مخصوص کر دیا جائے لہذا اسکے طے کرتے وقت معاونتی رقم میں جو پہلے ہی بہت قلیل تھی مزید نصف لاکھ کی کمی کر دی گئی۔

٢۔ گورنر جنرل با جلاس کونسل نے ١٠ جولائی ١٨١٦ء کو جو مراسلہ مجلس نظما کو روانہ کیا تھا اس میں اس گفت و شنید کے حالات و واقعات تفصیل سے درج ہیں۔

اس زمانے میں ہندوستان کی جو حالت تھی اس کا لحاظ کرتے ہوئے ناگپور کے اس معاونتی معاہدے سے بڑھکر کمپنی کے لئے کوئی خوش قسمتی کی بات نہیں ہوسکتی تھی۔ مرہٹوں کے اتحاد اور ان کی قوت کو اس سے سخت صدمہ پہنچا۔ اگرچہ اس سے محض مرہٹوں ہی کو حسد نہیں ہوا بلکہ امیر خاں اور پنڈاریوں کے دوسرے سردار بھی اس سے متاثر ہوئے اور مختلف قسم کے خطرات کا اندیشہ ہوگیا تاہم ان سب سرداروں کے خلاف دفاعی و اقدامی تدابیر اختیار کرنے اور فوجی کارروائی شروع کرنے میں جو سہولتیں حاصل ہوگئیں ان کی بدولت ان سب کی ناراضگی کے مضر اثرات پر بھی غالب آیا جا سکتا تھا۔

دربار پونہ کے حالات اور پیشوا باجی راؤ کا طرزِ عمل

لارڈ ہیسٹنگز کے ابتدائی دور کے تین سال میں دربار پونہ میں جو واقعات پیش آئے وہ قابل غور ہیں کیونکہ ان واقعات ہی کی وجہ سے بعد میں ایسے معاملات پیش آئے جن سے پیشوا کے خاندان اور مرہٹوں کے جتھے کا جس کا پیشوا رہنما سردار سمجھا جاتا تھا خاتمہ ہوگیا۔

اس بات کا اوپر ذکر ہوچکا ہے کہ لارڈ ویلزلی قزاقی و تاراجی کے رواج ۲۶۶۴،
کو مرہٹوں کی طاقت کے ساتھ وابستہ سمجھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اگر یہی ڈھنگ رہا تو محض برطانوی حکومت اور اس کے حلیفوں کے مقبوضات کی خوشحالی اور ترقی میں رکاوٹ پیدا نہ ہوگی بلکہ ان کا وجود بھی معرض خطر میں آجائیگا۔ ان قزاقوں کے جتھے کی قوت کو توڑنے اور ان کی حکومت کے اصول کو تبدیل کرنیکی غرض ہی سے اس نے عہد نامہ بسین طے کیا تھا اور معاہدہ کرتے وقت اس نے اسکے ہر پہلو پر غور کرلیا تھا۔ اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ مرہٹوں کی دوسری سلطنتوں کو اس سے کسقدر حسد ہوگا اور خود پیشوا باجی راؤ کا آئندہ کیا طرز عمل رہے گا۔

یہ ممتاز شخص لکھتا ہے کہ "یہ بات صاف ظاہر ہے کہ پیشوا نے برطانوی حکومت سے جو دفاعی معاہدہ کیا ہے وہ اس مجبوری کے احساس سے کیا ہے کہ اسے اپنے جائز اختیارات کو دوبارہ حاصل کرنے اور اپنی سلطنت میں امن

برقرار رکھنے کا بجز اس کے اور کوئی چارہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ جب حالات اس کے موافق ہو جائیں گے تو مرہٹوں کی دوسری سلطنتوں کے خیالات و جذبات کا اس پر بھی اثر ہوگا اور وہ برطانوی حکومت سے تعلقات منقطع کرنے کی خواہش و کوشش کرے گا"

باوجود ان خیالات اور اندیشوں کے دس سال تک کوئی بات ایسی نہیں ہوئی جس کی وجہ سے دونوں ریاستوں کے خوش گوار تعلقات میں فرق آ سکے۔ باجی راؤ نے بیرونی خطرات سے نجات پانے کے بعد اپنے مقبوضات کی حالت سنبھالنے اور اپنے وسائل بڑھانے کی طرف توجہ کی۔ اس نے سب سے پہلے اس بات (۴۶۷) کی کوشش کی (جیسا کہ ہر فرمانروا کو ان حالات میں کرنا چاہئے تھا) کہ حکومت پونہ کی کمزوری کے زمانے میں جو باجگذار جاگیردار اس کے احکام کے خلاف ورزی کیا کرتے تھے اور اکثر موقعوں پر اس کی توہین بھی کر چکے تھے ان کی فوجی قوت اور ان کے وسائل کو کم کیا جائے۔ برطانوی حکومت پیشوا کا اقتدار قائم کرنے کے لئے کئی مرتبہ اسے مدد دے چکی تھی لیکن سنہ ۱۸۰۳ء کی لڑائی میں جنوبی جاگیرداروں نے کمپنی کا جو ساتھ دیا تھا اس کی وجہ سے ان کے معاملے میں اسے بہ حیثیت ثالث کے کام کرنا پڑا[۱]۔ پیشوا اس سے مطمئن نہ ہوا۔ کولاپور[۲] اور ساونت واری کے علاقوں سے اسے دست بردار ہونا پڑا۔ اگرچہ ان پر اس کے سب دعوے بے بنیاد تھے تاہم وہ بہت زیادہ مشتعل ہو گیا اور اس سے اتحاد قائم ہونے کے بعد پہلے روز سے جس بات کا اندیشہ تھا وہ ظہور میں آ گئی اور اس نے دوسرے مرہٹہ فرمانرواؤں اور سرداروں سے جو برائے نام اس کے ماتحت سمجھتے تھے اور جواب بھی تمام رسم و رواج اور ظاہر باتوں میں اسے اپنی قوم کا رہنما مانتے تھے رازمیں مراسلت

۱۔ یہ سمجھوتہ سنہ ۱۸۱۲ء میں کرایا گیا تھا۔

۲۔ یہ ریاستیں بحری قزاقی کی عادی ہو گئی تھیں کمپنی کی تجارت کو ان کی دست درازیوں سے محفوظ رکھنے کی غرض سے لارڈ منٹو نے سنہ ۱۸۱۲ء میں انھیں ایک عہد نامہ کرنے پر مجبور کیا اور اس کی رو سے ان کے چند بندرگاہوں کو ان سے لے لیا۔ اس طرح ان بندرگاہوں پر قبضہ کرنے کے بعد انکے جہازوں کو روکا جا سکتا تھا اور ایک صدی سے جو قزاقی جاری تھی اس کا سد باب ہو گیا۔

شروع کردی عہد نامے کی وجہ سے اس قسم کی مراسلت ناجائز تھی لیکن ایسی باتوں
کو پوشیدہ رکھنے میں مرہٹے خاص طور پر مشاق ہیں لہذا اس قدر چالاکی سے کام
(۴۶۸) کیا جاتا تھا کہ ان کی گرفت کرنا دشوار تھا۔ جب تک کہ کسی خاص خطرے کا اندیشہ
نہ ہو کمپنی اسے برداشت کرتی رہی اور یہ خیال رہا کہ مرہٹوں کی اس قسم کی عادت
ہی ہے اور پیشوا کا مقصد محض اپنی ذاتی اہمیت برقرار رکھنا ہے نہ کہ برطانوی
قوت اور اس کے اقتدار کے خلاف کوئی خاص سازش کرنا۔

اس زمانے میں یہ خیال ہو گیا کہ باجی راؤ ۱۸۰۳ء میں اپنی سلطنت پر
دوبارہ قابض ہونے کے بعد سے برابر برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے یا کم از کم
اپنے آپ کو اس کے اثر سے آزاد کرانے کے لئے برابر ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔
اس بات میں قطعی شبہہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ فطرتی طور پر ان باتوں کی طرف مائل تھا
لیکن اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے جو کوشش وہ کر رہا تھا اسے نمایاں طور پر عمل
میں لانے کے لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ اس کے بدطینت مشیروں کو
اس کے دربار میں غلبہ ہو اور حالات زمانہ ان کے موافق ہوں۔ باجی راؤ کے
عادات وخصائل کے متعلق جو ہمیں تجربہ حاصل ہے اس سے تو کم از کم یہ نتیجہ نکلتا
ہے کہ وہ سازش کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا لیکن بزدلی کی وجہ سے اس پر
عمل نہیں کر سکتا تھا۔ اسکے حوصلے ہمیشہ بلند رہتے تھے لیکن اس کی کمزوری کی وجہ سے وہ سب
دبے کے دبے رہتے تھے۔ ان دو متضاد باتوں کی وجہ سے اس کا دماغ بے چین اور وہ
خود پریشان رہتا تھا اور کم ظرف مقربین اس پر حاوی ہو جاتے تھے بالآخر وہ ایک
نہایت اوباش بدطینت اور بدکردار شخص کے جال میں پھنس گیا۔ یہ شخص بدقسمت
پیشوا کو خوب سمجھ گیا تھا لہذا رفتہ رفتہ وہ اس پر پورے طور سے حاوی ہو گیا
اور جرم وسازش دغداری کے راستوں سے نکالکر اسے میدان جنگ تک پہنچا دیا
جہاں آخرکار اس کے اقبال کا خاتمہ ہو گیا۔

(۴۶۹) ترمبک جی ڈنگلیا ابتدا میں پیشوا کا ایک ادنی ملازم تھا۔ محل میں
عیش وعشرت کے جو جلسے ہوتے تھے (جن سے پیشوا کے نام پر بٹہ بھی لگ رہا
تھا) ان میں دوسروں کے مقابلے میں یہ شخص پیشوا کی نفسانی خواہشات کے

سامان بہت آسانی اور خوشی سے فراہم کرتا رہتا تھا اس طور سے اس نے پیشوا کی خوشنودی حاصل کی اور ۱۸۱۴ء میں وہ وزارت کے رتبے پر پہنچ گیا لیکن اس کی ترقی کی یہ انتہا نہ تھی۔ اس معاملے میں وہ اس قدر تیز رفتار رہا کہ چند ماہ کے اندر ہی سب پر غالب آگیا اور حکومت میں اس کا کوئی حریف باقی نہ رہا۔ اسی سال کے آخر میں ایک جدید فوج تیار ہوئی تھی اس کی کمان بھی اسے مل گئی۔ اس طرح جو غیر معمولی اثر اسے حاصل ہو گیا تھا اسے مستحکم بنانے کے لئے وہ برطانوی رزیڈنٹ سے مراسلت کرنے کے لئے ریاست کا وکیل مقرر ہو گیا۔ جس دن سے کہ پیشوا نے یہ کام اس بے باک اور بد طینت شخص کے تفویض کیا برطانوی رزیڈنٹ نے اسی روز سے معاملات کی نوعیت اور طرز تحریر میں بیّن فرق محسوس کیا اکثر مراسلوں کی زبان بھی سخت اور گستاخانہ ہوتی تھی اور ہر بات سے اس کے بلند حوصلوں کا بدیہی طور پر اندازہ ہوتا تھا لہذا بہت جلد اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ دونوں سلطنتوں کے اتحاد و تعلقات کا آئندہ کیا حشر ہونیوالا ہے۔

بڑودہ سے تعلقات

انگریزی حکومت نے ۱۸۰۲ء میں انند راؤ گیکواڑ والی بڑودہ سے معاونتی معاہدہ کیا تھا۔ یہ سردار بھی دوسرے مرہٹہ سرداروں کی طرح پیشوا کا برائے نام ماتحت رہا تھا لیکن اس سے جو معاہدہ کیا گیا اس ایک دفعہ کی رو سے اسے پیشوا کے اثر سے آزاد تسلیم کر لیا گیا لہذا اس کے مطابق کمپنی نے اس بات کی ذمہ داری لی کہ ان دونوں کے درمیان جو تنازعات اور تصفیہ طلب امور ہوں گے انھیں وہ طے کرا دیگی عہد نامۂ بسین میں اس معاہدے کی توثیق ہو گئی اور جو وعدہ کمپنی نے انند راؤ گیکواڑ
سے کیا تھا وہی پیشوا سے کر لیا بارہ سال تک کوئی تنازعہ کمپنی کے فیصلے کے لئے (۴۷۰)
پیش نہیں کیا گیا۔ سلطنت آصفیہ اور پیشوا کے معاملات میں بھی جب کبھی کمپنی نے بہ حیثیت ثالث کے اپنے خدمات پیش کئے تو پیشوا نے انکار کر دیا۔ یہی طرز اس نے بڑودہ کے معاملات میں بھی اختیار کیا لیکن جہاں تک کہ دربار بڑودہ کے معاملات کا تعلق تھا چند واقعات ایسے پیش آگئے جن کی وجہ سے اس طرز عمل میں تبدیلی ضروری ہو گئی۔ گیکواڑ نے احمد آباد کا نصف صوبہ دس سال کی مدت کے لئے

پیشوا اسے پٹے پر لیا تھا۔ جب یہ مدت ختم ہوئی تو اس علاقے میں امن برقرار رکھنے کی غرض سے انگریزی حکومت اور دربار بڑودہ دونوں کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کی توسیع کی جائے۔ پٹے کی تجدید کے لئے متعدد شرائط پیش کی گئیں اور ہر قسم کا اثر ڈالا گیا لیکن سب بے سود مذکورۂ بالا علاقہ واپس لے لیا گیا اور ترمبک جی کے حوالے کر دیا گیا۔ اس نے اپنا جو نائب وہاں کے انتظامات کے لئے بھیجا اس نے وہاں پہنچکر سازشیں شروع کر دیں جن کا فوری اثر یہ ہوا کہ باجی راؤ اور اس کے وزیر نے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ دربار بڑودہ سے بعجلت ممکنہ معاملہ کرا دیا جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ جب تک گیکواڑ کا وزیر گنگا دھر شاستری پونہ نہ آئے گا کوئی خاطر خواہ تصفیہ نہ ہو سکے گا۔ اس میں کوئی اعتراض کسی کو نہیں ہو سکتا تھا البتہ خود گنگا دھر اسے پسند نہیں کرتا تھا لیکن برطانوی حکومت کے اصرار سے وہ راضی ہو گیا اس کا خیال تھا کہ دربار پونہ کو بھی اس سے نفرت ہے لہذا کمپنی نے اس کی حفاظت اپنے ذمہ لی۔

پیشوا کے مطالبات بہت زیادہ تھے اور ہر حالت میں ان کا تصفیہ (۴۷۱) سخت دشوار معلوم ہوتا تھا لیکن بہت جلد اس بات کا احساس ہو گیا کہ دقتیں برابر بڑھ رہی ہیں اور اب جو مقاصد پیشوا کے پیش نظر ہیں ان میں رقمی معاملات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ گنگا دھر شاستری قطعی طور پر انگریزی حکومت کا حامی تھا لہذا اس کی وجہ سے بڑودے کے دربار میں انگریزوں کے خلاف کسی قسم کی سازش کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے اب یہ ترکیب نکالی گئی کہ یا تو شاستری کو پیشوا کا ہم خیال بنا لیا جائے یا اسے معزول کرا دیا جائے۔ اس سلسلے میں پہلی بات جو ظہور میں آئی وہ یہ تھی کہ گیکواڑ کے سابق وزیر سیتا رام کی طرف سے دو وکیل پونہ پہنچے اور ان کا نہایت معقول طریقے پر استقبال کیا گیا۔ ان کے اس طرح یک بہ یک پہنچنے سے شبہہ ہوا کیونکہ سیتا رام کو انگریزی حکومت نے اپنے اثر سے علیحدہ کرایا تھا اور کئی سال سے وہ دوبارہ برسر حکومت آنے کیلئے سازشیں کر رہا تھا۔ پونہ اور بڑودہ سے کمپنی نے جو معاہدہ کیا تھا اسکی

ایک خاص شرط یہ بھی تھی کہ یہ دونوں ریاستیں آپس میں کسی قسم کی راست مراسلت نہیں کریں گی لہٰذا برطانوی رزیڈنٹ نے اس تمام کارروائی پر اعتراض کیا اور اسے خلاف معاہدہ بتایا لیکن دربار پونہ میں تو ترمبک جی حاوی تھا جیسا سابق اس نے اس موقع پر بھی گستاخانہ طرز اختیار کیا اور جواب میں کہہ دیا کہ گیکواڑ پیشوا کا ماتحت ہے۔ کسی دوسری طاقت سے معاہدہ کر لینے سے اس کی باجگزارانہ حیثیت
میں فرق نہیں آسکتا۔ اس مفروضے کی نہایت سختی سے تردید کی گئی اور پیشوا کو مطلع (۴۷۲)
کر دیا گیا کہ اسے گیکواڑ کی حکومت میں مداخلت کرنے کا قطعی حق حاصل نہیں ہے لہٰذا جب تک کہ وہ اس بات کو باضابطہ طور پر تسلیم نہیں کرے گا کمپنی ان دونوں ریاستوں کے معاملات میں ثالث نہیں بنے گی علاوہ ازیں ستیارام کے وکیل حکومت بڑودہ کے دشمن ہیں لہٰذا یا تو ان دونوں کو کمپنی کے حوالے کیا جائے یا ان سے قطع تعلق کیا جائے۔ ان مطالبات کے ساتھ رزیڈنٹ نے آخر میں یہ بھی لکھ دیا کہ اگر ان کی تعمیل نہیں کی گئی تو گنگادھر شاستری کو فوراً بڑودہ واپس کر دیا جائے گا۔

اس کارروائی سے باجی راؤ اور اس کے وزیر دونوں بہت گھبرائے اور گنگادھر شاستری کے ساتھ انھوں نے اپنا طرزِ عمل بالکل بدل دیا اور اسے ایسا ملا لیا کہ اس نے ازخود رزیڈنٹ کی منت کی کہ اسے مزید قیام کی اجازت دی جائے کیونکہ قرینہ اس بات کا ہے کہ تمام معاملات برطانوی حکومت کی مداخلت کے بغیر خاطر خواہ طریقے پر طے ہو جائیں۔ یہ درخواست منظور کر لی گئی گنگادھر شاستری نے یہ تجویز پیش کی کہ پیشوا اپنے جملہ مطالبات کے عوض میں سات لاکھ سالانہ آمدنی کا علاقہ قبول کر لے۔ پیشوا نے اسے منظور کر لیا اور اس طور سے خاطر خواہ سمجھوتہ ہو گیا اور یہ بات قریب قریب طے پا گئی۔ گیکواڑ پر پیشوا کے بہت زیادہ مطالبات تھے لہٰذا اس کے لئے اس سے بہتر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن وہ اپنی ریاست کا علاقہ دینے پر راضی نہ ہوا اور اس بنا پر یہ تجویز مسترد کر دی۔

جب تک اس معاملے میں گفت و شنید جاری رہی گنگادھر شاستری کی (۴۷۳)

بہت آؤ بھگت رہی۔ ہر جگہ خود باجی راؤ نے اس کے ساتھ خصوصیت کا برتاؤ کیا۔ ترمبک جی اس کا گہرا دوست بن گیا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ پونہ میں اسے کسی اعلیٰ عہدے پر ممتاز کرنے کی بھی تجویز کی گئی۔ اس جدید اخلاص و اتحاد کو مستحکم بنانے کے لئے پیشوا کی سالی کی اس کے بیٹے سے نسبت بھی کی گئی۔ یہ تمام کارروائی اس حد تک پہنچی کہ باجی راؤ اس رشتے کی تکمیل کی غرض سے اپنے تمام متعلقین کو گیگواڑ کے وزیر کے ہمراہ لیکر تیرتھ کے لئے ناسک پہنچا اور برطانوی رزیڈانٹ بھی ان کے ساتھ گیا۔

اسی عرصہ میں گنگا دھر شاستری کو اطلاع ملی کہ اس کے راجہ نے اس کی پیش کردہ معقول اور اعتدال پسند تجویز کو مسترد کر دیا ہے اور وہ مجوزہ علاقہ دینے کے لئے راضی نہیں ہے۔ لیکن اس نے اس کی اطلاع پیشوا کو نہیں کی بلکہ خود ٹال مٹول شروع کر دی اپنے بیٹے کی شادی کو بھی اس نے ٹال دیا اور کچھ نہ کچھ بہانہ کر دیا۔ اس کا منشا یہ تھا کہ جو کام اس کے تفویض کیا گیا ہے اگر وہ خاطر خواہ طریقے پر طے نہ پائے تو مجوزہ شادی بھی نہ ہو لیکن حقیقت بہت جلد کھل گئی ظاہر ہے کہ پیشوا کی اس میں سخت توہین ہوئی۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ گنگا دھر نے اپنے خاندان کی مستورات کو باجی راؤ کی رانی سے ملنے کی اس بنا پر اجازت نہیں دی کہ محل کی حالت اس قابل نہیں کہ شریف عورتیں وہاں جا سکیں۔

اس طرح جو سازش تھی اس میں ناکامی ہوئی۔ دوستی کا جو دم بھرا جا رہا تھا (۴۷۷)
وہ بھی ختم ہو گئی۔ خاندانی رشتے کی جو تجویز تھی اس میں بھی ذلت ہوئی اور مزید براں اپنے سے ایک کم رتبہ والے شخص نے ذاتی خصائل و اطوار پر بھی علانیہ طور پر حملہ کیا۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ کوئی فرمانروا بھی انہیں آسانی سے درگذر نہیں کر سکتا تھا۔ اگرچہ ظاہرداری برابر برتی جا رہی تھی پیشوا کے دل میں ان ذلتوں کا کانٹا کھٹک رہا تھا۔ اندازے سے معلوم ہوتا ہے کہ سردست ترمبک جی نے یہ کہہ کر تسلی کر دی تھی کہ کسی مناسب موقع پر ان سب باتوں کا پورا پورا بدلہ لے لیا جائے گا۔ درحقیقت ترمبک جی پر بھی بہت اثر تھا اور اسے اس بات کی ندامت تھی کہ مجوزہ رشتے کے ٹوٹ جانے سے اس کے آقا کی جو ذلت

ہوئی ہے اُس کا وہ خود سبب بنا ہے۔ یہی سب خیالات اور جذبات گنگا دھر شاستری
کے قتل کے موجب ہوئے۔ ان سب باتوں کے ایک ماہ بعد ہی یہ واقعہ پنڈرپور کے
مقدس شہر میں پیش آیا۔ شاستری کو خود باجی راؤ اصرار کر کے اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔
وہاں پہنچنے کے دوسرے دن ترمبک جی نے اصرار کیا کہ وہ بٹھوڈا پر چل کر پوجا کرے
اس دعوت کو شاستری نے دو مرتبہ مسترد کیا لیکن جب تیسری مرتبہ اصرار ہوا تو وہ اسکے
ہمراہ ہولیا۔ جب پوجا ختم ہوگئی تو ترمبک جی شاستری کو مندر میں چھوڑ کر باہر آگیا۔
وہ چند قدم ہی گیا ہوگا کہ چند قاتلوں نے لپک کر شاستری پر حملہ کر دیا اور اسے
قتل کر کے بھاگ گئے۔ اس دردناک واقعہ کے متعلق کوئی تحقیقات نہیں کی گئی پیشوا
اور ترمبک جی کو اپنی جان بچانے کی فکر تھی اور ایک مجرم اپنے جرم کے احساس اور (۴۷۵)
خوف سے جو تدبیریں بہ نظر احتیاط اختیار کر سکتا ہے وہ سب پہلے سے کر لی گئیں
تھیں۔

مندرجہ بالا واقعات کے علاوہ دیگر ذرائع سے بھی ترمبک جی کا جرم
ثابت ہو گیا۔ اس ثبوت کی بابت رزیڈنٹ کی رائے ہے کہ وہ ناقابل تردید ہے
لیکن باجی راؤ پر نہ کسی دھمکی کا اثر ہوا اور نہ کسی صدائے احتجاج کا نہ اس نے ترمبک جی
کو گرفتار کیا اور نہ سیتارام کے وکیلوں کو جن کا اس میں لگاؤ تھا بہرحال کمپنی کے
لئے اس وقت صرف ایک ہی راستہ ہو سکتا تھا کیونکہ گنگا دھر نے پونہ کی سازشوں
کے جال میں پھنسنے کے بعد خواہ کچھ ہی تصور کیا ہو برطانوی حکومت اس کی حفاظت
قطعی طور پر اپنے ذمہ لے چکی تھی لہذا اپنی عزت بچانے کے لئے اسے سختی سے کام
لینے کی اور فیصلہ کن تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت تھی ایسا ہی کیا گیا برطانوی فوج
باجی راؤ کے دارالحکومت پر پہنچ گئی اور اسے مجبوراً بادل ناخواستہ اپنے وزیر
کو مقید کرنا پڑا اور جب اسے اس بات کا اطمینان دلا دیا گیا کہ اس کے بعد قتل کے

لے۔ یہ مقام بیجاپور کے علاقے میں پونہ سے چھیاسی میل کے فاصلے پر
واقع ہے۔ برہمنوں کا دعویٰ ہے کہ محض یہ شہر ہی مقدس (متبرک) نہیں ہے بلکہ اس کے
گرد و نواح کے علاقے کو بھی یہی شرف حاصل ہے۔

سلسلے میں کوئی اور کارروائی نہیں کیجائے گی تو اُس نے اسے کمپنی کے حوالے بھی کردیا۔ اصل واقعہ یہ تھا اور ہر طرح یہ بات ثابت تھی کہ اس موقع پر ترمبک جی نے جو کچھ بھی کیا تھا وہ پیشوا کے علم میں تھا اور وہ اُس کی منظوری دے چکا تھا لیکن اُس بنا پر مزید کارروائی کرنے کا کوئی خیال نہیں تھا لہٰذا باجی راؤ کو اس کے کم ظرف رفیق سے علٰحدگی ہی پر اکتفا کیا گیا۔ جس طریقے سے باجی راؤ کو مجبور کیا گیا اور اپنا مطلب حاصل ہوا اُس سے برطانیہ کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیل گئی مرہٹوں کی سلطنت کے پیشوا کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اسے دیگر حالات میں ظلم پر محمول کیا جاسکتا تھا لیکن اُس وقت اسے تلطف آمیز سمجھا گیا کیونکہ ہر ایک کو اس بات کا یقین تھا کہ مندر جیسے مقدس مقام پر برہمن جیسی پاک ذات کے ناپاک قتل میں پیشوا کا ضرور دخل تھا۔ علاوہ ازیں وہ محض ایک اعلیٰ ذات کا برہمن ہونے کی وجہ سے قابل احترام نہ تھا بلکہ ایک سلطنت کا وزیر اور باضابطہ سفیر ہونے کی حیثیت سے بھی حفاظت کا مستحق تھا۔ (۱۸۱۶)

باجی راؤ کی اس طرح جو ذلت ہوئی اگرچہ وہ خود ہی اُس کا سبب بنا تھا تاہم قدرتی طور پر اس نے اس سے بہت محسوس کیا لیکن بجائے اس کے کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آتا اُس نے برطانوی حکومت کے خلاف اپنی سازشیں اور بڑھادیں مرہٹوں کے دوسرے درباروں میں اُس کے وکیلوں نے پہلے سے بھی زیادہ جدوجہد شروع کردی اس موقع پر جو کاغذات کمپنی کے ہاتھ لگے اور جو بعد میں ملے ان سب سے اُس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیئے وہ مرہٹوں کی سب ریاستوں کو متحد کرنا چاہتا تھا۔ ترمبک جی نے بعد میں اس بات کا اقبال کیا کہ اس قسم کی سازشیں گنگا دھر شاستری کے پونہ پہنچنے سے قبل ہی سے شروع ہوگئی تھیں۔ اب ان میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا لیکن پیشوا ہر قدم پر محسوس کرتا تھا کہ "جائے اُستاد خالیست" اور برطانوی رزیڈنٹ کو پریشان کرتا رہتا تھا کہ اس کے رفیق کو رہا کردیا جائے۔ اس سے برابر انکار ہوتا رہا اور اس قسم کی بے سود درخواستوں کو رد کرنے کے لئے گورنر جنرل نے باجی راؤ کو بالآخر مطلع کردیا کہ "آپ کی یہ درخواست کبھی منظور نہیں ہوسکتی" لیکن اسیر کی چالاکی اور جسارت (۱۸۱۷)

اور اس کے محافظوں کی عدم توجہی سے وہ بات بن گئی جو پیشوا کی منت وسماجت
سے حاصل نہ ہو سکی تھی بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ترمبک جی کو تھانے
کے جس قلعے میں مقید کیا گیا تھا وہ بہت غیر محفوظ تھا۔ پیشوا کا علاقہ اس سے ملحق
تھا اور درمیان میں صرف ایک تنگ بحری راستہ حائل تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہرے
والوں کی نگاہ بچتے ہی وہ قلعے کی چہار دیواری سے باہر نکل گیا۔ اس کے بھاگ جانے
کا پہلے ہی سے انتظام ہو لیا تھا۔ یہاں سے مفرور ہونے کے چند منٹ بعد ہی وہ
غائب ہو گیا اور کسی کے ہاتھ نہ آسکا۔

ترمبک جی ستمبر ۱۸۱۶ء میں جبکہ برسات کا موسم تھا یہاں سے فرار ہوا اور
مسلسل تین ماہ تک روپوش رہا۔ پیشوا سمجھتا تھا کہ اس معاملے میں بھی اس
پر شبہہ کیا جائے گا لہذا اس نے یہ چال چلی کہ برطانوی رزیڈنٹ اور اسکی
معرفت گورنر جنرل کو اس بات کا اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ اسے اپنے
سابق وزیر کے قیام کی بابت قطعی کوئی علم نہیں ہے اور وہ اپنی سابق حرکتوں
پر نادم ہے اور ہر طریقے سے برطانوی حکومت کا اعتماد حاصل کرنے کا خواہشمند
ہے پنڈاریوں کے خلاف جو تیاریاں ہو رہی تھیں ان میں بھی اس نے شریک ہونے
کی خواہش کی ظاہر داری کے لئے اس نے اپنے سفیر کو جو سندھیا کے دربار میں مقیم
تھا احکام بھیجدیئے کہ بجز ان واقعات کے جن کا اپنے شمالی ہند کے مقبوضات
سے تعلق ہو وہ کسی دوسرے مسئلہ پر کسی قسم کی مراسلت نہ کرے۔ اسکے ساتھ
ہی اس نے اپنے تمام مطالبات کے عوض میں گیکواڑ سے صرف چھ لاکھ روپیہ (۴۷۸)
قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس کے خیالات وجذبات کی اس بدیہی تبدیلی کو
اسکی احتیاط پسندی اور کمزوری پر محمول کیا گیا تاہم یہ خیال کر کے کہ آئندہ ان سب
باتوں کا اس کے افعال پر اچھا اثر پڑے گا اس کے اقوال کا خیر مقدم کیا گیا۔
لارڈ ہیسٹنگز نے اس موقع پر باجی راؤ کو جو خط لکھا اسکا طرز مخلصانہ تھا اور
اس میں جو لحاظ اس کا کیا گیا تھا اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب اس بات کی
توقع تھی کہ وہ راہِ راست پر آجائے گا اور ایسی کوئی بات نہیں کرے گا جو اسکی
تباہی کا موجب ہو لیکن اس قسم کے تمام توقعات بہت جلد منقطع ہو گئے

اور یہ پتہ لگا کہ ترمبک جی مہادیو پہاڑ پر مقیم ہے اور فوجیں اکھٹا کر رہا ہے۔ بدیہی طور پر باجی راؤ اس کا حامی و معاون تھا لیکن محض ظاہرداری کے لیئے اس نے کمپنی سے اس بغاوت کے فرو کرنے میں مدد چاہی۔ دراصل وہ اس سے ملا ہوا تھا اور ہر بات کا اسے پتہ تھا۔ جس حملے کو وہ ظاہری طور پر اپنی حکومت کے خلاف بتا رہا تھا اس کا وہ خود ہی بانی تھا۔

جب مندرجۂ بالا واقعات ثابت ہو گئے اور اس امر کا یقین ہو گیا کہ پیشوا لڑائی کی تیاری کر رہا ہے۔ پونہ سے خزانہ ہٹایا جا رہا ہے۔ سامان رسد جمع ہو رہا ہے۔ قلعوں کی مرمت ہو رہی ہے۔ ہم خیال لوگ جمع ہو رہے ہیں اور ہر سمت میں فوجیں تیار ہو رہی ہیں تو انگریزی حکومت کو بھی اپنی حفاظت کے لئے زبردست انتظامات کرنے کی مجبوری لاحق ہو گئی۔ گورنر جنرل با جلاس کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ باجی راؤ نے اپنے عہد و پیمان کی خلاف ورزی کی اور اب اسکی حیثیت ایک ۴۷۹)
غنیم کی سی ہے۔ باجی راؤ کی یہ حیثیت قرار دینے کے بعد مندرجۂ ذیل تجاویز میں سے کسی ایک پر عمل کرنے کی رائے ہوئی۔ اول یہ کہ انتہائی تدبیر اختیار کی جائے یعنی اس کے خلاف جنگ کا اعلان ہو اور برطانوی حکومت کی جانب سے اس کے مقبوضات پر قبضہ کر لیا جائے۔ دوسرے یہ ہو سکتا ہے کہ پیشوا کو معزول کر دیا جائے اور اس کی جگہ اس کے بھائی جمناجی کو مسند نشین کرا دیا جائے۔ تیسرے یہ ممکن ہے کہ باجی راؤ کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے سابق طرز عمل کی بابت صفائی پیش کرے اور آئندہ کے لئے ضمانت دے اور اس غرض کے لئے ایک جدید معاہدہ کرے جس کی رو سے کمپنی کو اس قسم کے تمام خطرات کے روکنے کے لئے جو اس کی کمزوری اور بے وفائی کی وجہ سے پیش آئے ہیں پہلے سے زیادہ معقول ذرائع حاصل ہو جائیں۔

آخری تجویز پر عمل کیا گیا اور تھوڑی سی گفت و شنید اور فوجی نقل و حرکت کے بعد جس کی تفصیل یہاں ضروری نہیں باجی راؤ کے سامنے (جس نے مجبور ہو کر اپنے چند زبردست قلعے کمپنی کے حوالے اس شرط پر کر دیئے تھے کہ جو معاہدہ بھی اس سے کیا جائے گا اس کی رو سے اُسے مسند پر برقرار رکھا جائے گا)، یہ تجویز پیش

گی گئی کہ یا تو وہ فوراً جنگ چھیڑ دے جس کے لئے وہ اس وقت تیار نہیں تھا۔ یا برطانوی حکومت کے پیش کردہ شرائط پر جدید عہد نامہ کرے۔ ایک سخت کشمکش کے بعد جس میں اس کی طبیعت کمزوری کی وجہ سے کبھی ذلت وحیا کا جذبہ اس پر غالب آتا تھا۔ کبھی خوف طاری ہوتا تھا کبھی مایوسی چھا جاتی تھی اور کبھی غیرت جوش میں آتی تھی بالآخر ۱۳ جون کو اس نے عہد نامے پر دستخط کر دیئے جس کی خاص شرائط یہ تھیں کہ:-

"ترمبک جی کو گنگا دھر شاستری کا قاتل اور حکومت کا باغی تصور کیا۔ (۴۸۰)
جائے اور اس کے خاندان والے بطور ضمانت کے برطانوی حکومت کے حوالے کیئے جائیں۔

"پیشوا اس بات کا اقرار کرے کہ مرہٹوں کا جو اتحاد قائم ہے اور جس کا وہ برائے نام سردار و رہنما ہے اسے اب وہ اپنی حد تک معدوم تصور کرے گا اور اس حیثیت سے اپنی سلطنت کے باہر جن فرمانرواؤں اور سرداروں پر اسے حقوق حاصل ہیں یا جن پر اس کے دعوے ہیں ان سے کچھ سروکار نہیں رکھے گا۔

"گیکواڑ پر جو پیشوا کے مطالبات ہیں ان سب کے عوض میں وہ نقد چار لاکھ روپیہ قبول کرے گا اور سابق معاہدے کی رو سے کمپنی کو پیشوا سے جس قدر فوج[1] طلب کرنے کا حق حاصل ہے اس کے جملہ مصارف کے لئے اپنا کوئی علاقہ مخصوص کرے گا۔

"پیشوا اپنا قلعہ احمد نگر جو دکن میں واقع ہے نیز اپنے تمام مقبوضات جو مالوہ اور شمالی ہند میں واقع ہیں کمپنی کے حوالے کرے گا اور احمد آباد میں اس کا جو حصہ ہے اس کا دوامی پٹہ ساڑھے چار لاکھ روپیہ کے عوض میں کمپنی کے نام لکھ دے گا۔

اس عہد نامے کے بعد اگرچہ جنوبی جاگیرداروں پر پیشوا کی سرداری

---

[1] اس کی تعداد سابق معاہدے میں طے ہو چکی تھی۔

بدستور قائم رہی لیکن دراصل وہ کمپنی کے ماتحت بن گئے۔ ان میں سے جن کی اراضی پر باجی راؤ نے قبضہ کرلیا تھا وہ واپس کرادی گئیں اور استیا کی پوری جاگیر واگذاشت اور انگریزی حکومت کی سفارش پر اس کے سابق ورثار کو جنھیں کسی زمانے میں مرہٹوں میں خاص وقار حاصل تھا واپس کرادی گئی۔

برطانوی حکومت نے پیشوا کو اس معاہدے[1] پر جو مجبور کیا اسکا خاص (۱۸۳)
منشاء یہ تھا کہ مقامی خطرات کی مدافعت ہو جائے اور چونکہ پیشوا کی مخاصمانہ روش علانیہ طور پر ثابت ہو چکی تھی لہٰذا اس کی طاقت و قوت میں اس قدر کمی کر دیجائے کہ اس وقت پنڈاریوں کے خاتمے کے لئے جو تدابیر اختیار کی جا رہی تھیں ان کی نہ وہ مخالفت کر سکے اور نہ ان میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کر سکے۔ مذکورۂ بالا عہد نامے کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے ورنہ اس کی نوعیت کے سمجھنے میں بہت سخت غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

باجی راؤ کو کمپنی کا دشمن تصور کیا گیا تھا اور ویسا ہی اس کے ساتھ سلوک کیا گیا۔ اس نے انگریزی حکومت کی پیش کردہ شرائط گفت و شنید کے ذریعہ سے نہیں بلکہ فوجی کارروائی کے بعد تسلیم کی تھیں۔ بغیر لڑائی کے ایسے بے بس کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ اسوقت جنگ چھڑنے سے کمپنی کے تمام معاملات درہم و برہم ہو جاتے اور یہ امر خلافِ مصلحت بھی تھا تاہم اس بات کی کوئی توقع باقی نہیں رہی تھی پیشوا کے دل میں برطانوی قوم کی طرف سے کبھی دوستانہ خیالات پیدا ہو سکیں گے البتہ یہ خیال ضرور تھا کہ اس وقت اسے جو سبق ملا ہے اس سے وہ پہلے سے بھی زیادہ مرعوب ہو جائے گا اور اس طور سے ممکن ہے کہ وہ اپنی بے وفائی سے باز آجائے۔ علاوہ ازیں ایک خیال یہ بھی تھا کہ بجائے اس کے کہ وہ مایوس ہو کر تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق بن اپنی سلطنت برقرار رکھنے کیلئے انگریزی حکومت کے خلاف کمربستہ ہو اسے اس بات کی ترغیب دلائی جائے کہ قزاقوں کی جد و جہد کا خاتمہ کرنے کے لئے جو تیاریاں ہو رہی تھیں ان میں ایک وفادار (۲۰۳)

---

[1] گورنر جنرل نے ۵ر جولائی ۱۸۱۷ء کو اس کی توثیق کی۔

حلیف کی حیثیت سے شریک ہو کر وہ اپنا مقصد حاصل کرے۔ اس طرز عمل پر اسے راغب کرنے کی غرض سے عہدنامے کی خاص خاص شرائط کی تکمیل کے بعد اس کے پہاڑی قلعے جو شروع میں بطور ضمانت کیلئے گئے تھے واپس کر دیئے گئے اور برطانوی حکومت نے ہر ممکن طریقے سے اسے اس بات کا اطمینان دلایا کہ انگریز اسے ہمیشہ ایک قابل قدر حلیف سمجھتے رہے ہیں اور محض واقعات سے مجبور ہو کر انھیں بادل ناخواستہ اسے اس وقت اپنا دشمن تصور کرنا پڑا لہذا برطانوی حکومت کی اس میں عین خوشی ہوگی کہ وہ اسے آیندہ اپنے طرز عمل سے اُس پر عنایت کرنے کا موقع دے۔

اس عہدنامے کی وجہ سے گیکواڑ سے بھی ایک تصفیہی معاہدہ کرنا پڑا۔ باجی راؤ سے جو معاہدہ ہوا تھا اس سے گیکواڑ کو بہت فائدہ پہنچا کیونکہ تمام مطالبات چار لاکھ جیسی قلیل رقم کے عوض میں طے پا گئے۔ دربار بڑودہ سے جدید معاہدہ کرنے کی غایت یہ تھی کہ باہمی تعلقات میں اس قسم کی مناسب تبدیلی کی جائے جو دونوں کے مفاد کے لئے سودمند ہو اور جس کے ذریعہ سے ان تمام تنازعات اور اختلافات کا خاتمہ ہو جائے جو دونوں حکومتوں کے بنیادی اصولوں کے اختلاف مشترکہ مقبوضات اور باجگذار جاگیرداروں پر مختلف دعوؤں کی وجہ سے مقامی عہدہ داروں کے مابین واقع ہوتے رہتے ہیں۔ اس مفید مقصد کیلئے نومبر ۱۸۱۷ء تک گفت و شنید نہ ہو سکی۔ اس کے بعد شرائط طے پائیں اور آپس کے لین دین اور علاقوں کے باہمی تبادلے سے تمام معاملات نہایت خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔ اس معاہدے کی سب سے اہم دفعہ وہ تھی جس کی رو سے (۴۸۳)
برطانوی حکومت کو شہر احمد آباد[1] پر قبضہ مل گیا۔

حکومت اودھ میں بدنظمی کا دور جاری تھا اور کمپنی کو نواب کا اقتدار برقرار

[1] یہ شہر گجرات کے مسلمان فرمانرواؤں کا دارالحکومت تھا وہ ایک چھوٹی دریا کے ساحل پر جو سمندر میں شہر کھمبے کے قریب گرتی ہے واقع ہے۔ یہ دریا کشتیوں کے لئے قابل عبور بھی ہے۔

رکھنے کے لئے فوجی مدد دینی پڑتی تھی جس سے اس کی نیک نامی میں فرق آرہا تھا لارڈ ہیسٹنگز نے ہندوستان پہنچنے کے بعد اس کی طرف توجہ کی اور اس بات پر زور دیا کہ نواب اپنی حکومت کے ان تمام نقائص کو دور کرے جو اس کی رعایا کی تباہی کے موجب اور ظلم کا آلہ بنے ہوئے ہیں لیکن اسکی کسی دلیل کا نواب پر اثر نہ ہوا۔ اگرچہ گورنر جنرل کو نواب وزیر کے طرز عمل کی وجہ سے عہدناموں کے مطابق اس کی حکومت کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا حق حاصل تھا تاہم اس نے اس موقع پر جب کہ ہندوستان میں کامل امن قائم کرنے کی وسیع پیمانے پر تیاریاں ہو رہی تھیں اور اس سلسلے میں حلیفوں کے اخلاص و اتحاد کی سخت ضرورت تھی اسے برگشتہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

نواب وزیر نے جنگ نیپال کے موقع پر کمپنی کو دو کروڑ روپیہ قرض دیا تھا۔ اختتام جنگ پر کمپنی نے اس قرضے کی نصف رقم کے معاوضے میں کھیرا گڑھ کے اضلاع جو نیپالیوں سے حاصل کئے گئے تھے اور جو نواب ممدوح کی ریاست سے متصل تھے اُسے دے دیئے۔ باقی نصف رقم کا سود ان وظائف کی رقم میں محسوب کر لیا گیا جو نواب کے ذمے باقی تھی اور جس کے ادا کرنے کے لئے کمپنی ضامن تھی۔ اس انتظام کے بعد تمام ناگوار بحث وحجت کا خاتمہ ہو گیا۔ (۴۸۴)

ہندوستان کے حالات کی بابت انگلستان میں تشویش اور حکام اعلےٰ کی ہدایات

چند سال سے ہندوستان میں جو واقعات پیش آرہے تھے ان کی وجہ سے انگلستان میں کمپنی کے حکام بالا کو سخت تشویش تھی۔ قزاقی وغارتگری جو روز بروز بڑھتی جاتی تھی اس کے روکنے کی ضرورت کو ہر شخص محسوس کرتا تھا لیکن اس مقصد کے لئے جو تدابیر ضروری تھے ان کے اختیار کرنے میں سخت مشکلات کا سامنا تھا۔ لارڈ منٹو اس موضوع پر کئی مراسلے[1] انگلستان روانہ کر چکا تھا۔ اب لارڈ ہیسٹنگز

[1] بحوالۂ مراسلہ گورنر جنرل باجلاس کونسل (بقیۂ حاشیہ برصفحۂ آئندہ)

نے مجلس راز دار کو ایک مراسلہ لکھا اور ان کی توجہ اس خطرے کی طرف بہ طور خاص مبذول کرائی ۔ پنڈاریوں کی دست درازیوں کو روکنے کا جو انتظام کیا گیا تھا اس کا حوالہ دے کر وہ لکھتا ہے کہ موسم باراں کے ختم پر ان قزاقوں کا سارے ملک میں پھر دور دورہ ہو جائے گا لہذا دوبارہ انھیں انتظامات پر عمل کرنا ہوگا اور جب تک کہ اس بلا سے نجات حاصل کرنے کے لئے کوئی معقول اور زبردست طریقہ اختیار نہ کیا جائے گا ہر سال یہی دقت پیش آتی رہے گی ۔

(۱۸۱۵ء) گورنر جنرل نے دربار ناگپور سے اس وقت تک اتحاد قائم نہیں کیا جب تک کہ اس کی منظوری انگلستان سے وصول نہ ہوئی ۔ جنگ نیپال اور پونہ کے معاملات میں اس نے احکام بالا کے بغیر کام کیا تھا لیکن اسے اس بات کا احساس تھا کہ برطانوی حکومت کی جو ذلت ہوئی تھی اس کا انتقام لینے اور فوری خطرات[52] کی مدافعت کے لیئے فوری کارروائی ضروری تھی لیکن جن معاملات میں تاخیر مضر نہیں ہوتی تھی ان میں وہ ہمیشہ ان کی منظوری قبل از قبل حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا بسا اوقات یہ منظوری آسانی سے حاصل نہیں ہوتی تھی اس کے کئی خاص اسباب تھے پہلی وجہ تو یہ تھی کہ ان کا جواب آنے تک اس بات کا امکان رہتا تھا کہ یہاں کے حالات بالکل ہی بدل جائیں ۔ علاوہ ازیں ہندوستانی لڑائیوں کے خلاف انگلستان میں ایک عام تعصب تھا ۔ پارلیمنٹ کا قانون موجود تھا جکی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مورخہ ۲ ر اکتوبر ۱۸۱۲ء بنام مجلس راز دار ۔ اس میں چند دفاعی تدابیر کے سلسلے میں یہ عبارت درج ہے "ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ یہ تمام تدابیر وانتظامات محض عارضی ہیں ۔ ان سے کوئی خاص علاج نہیں ہو سکتا ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آیندہ کسی موقع پر ہمیں اس روز افزوں مصیبت کی بیخ کنی کے لئے باضابطہ طور پر سیاسی و فوجی کارروائی کرنی پڑے گی ۔

۵۱ ۔ مورخہ ۳۰ ر مئی ۱۸۱۴ء

۵۲ ۔ مراسلہ حکومت ہند مورخہ ۱۰ ر جولائی ۱۸۱۶ء بنام مجلس نظماء یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ آپ کی مجلس نے ناگپور کے معاونتی معاہدے کو قطعی طور پر منظور کر لیا ہے ۔

روسے ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے کا طریقہ مقرر کردیا گیا تھا۔ وزراء جو احکام نافذ کرتے تھے یا جو کام ان کی منظوری سے انجام پاتے تھے ان سب کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی تھی لہذا ان کے لئے سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ مقامی حالات کے لحاظ سے جو کام گورنر جنرل ضروری سمجھ کر خود کرلیتا تھا اس کی وہ توثیق کردیتے تھے اور اس کی رہنمائی کے لئے براہ راست احکام نافذ کرنے یا اس کی پیش کردہ تجاویز کو قبل از قبل منظوری دینے کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لیتے تھے۔

ان اسباب کی وجہ سے قطعی احکام وصول ہونے میں تاخیر ہوتی رہی۔ ز۴۸۶
لیکن جب ۱۸۱۶ء میں پنڈاریوں نے کمپنی کے علاقے پر دھاوا مارا اور اسکی اطلاع انگلستان بھیجی گئی اور ساتھ ہی ان کے مظالم کی تفصیل بھی تحریر کی گئی تو حکام بالا[1] کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ ان دست درازیوں کے روکنے میں اب اگر مزید تاخیر کی گئی تو رعایا کی حفاظت کرنے میں جو ہر حکومت کا فرض اولین ہے کوتاہی[2] ہوگی۔ اس خیال سے متاثر ہوکر انھوں نے گورنر جنرل باجلاس کونسل کو ایک مراسلہ تحریر کیا اور اس ناقابل برداشت مصیبت کی مدافعت کے لئے ضروری کارروائی کرنے کا اسے اختیار دے دیا۔ حکومت فورٹ سینٹ جارج کے علاقہ پر پنڈاریوں کا حملہ۔ ان کے مظالم اور مال غنیمت کے ساتھ ان کی واپسی کا حوالہ دیکر مجلس رازدار نے اپنے اس مراسلے[3] میں تحریر کیا کہ "ہم ۲۹ ستمبر ۱۸۱۵ء اور اس کے بعد حال ہی میں جو ہدایات روانہ کئے ہیں ان سے ہمارا یہ مدعا تھا کہ پنڈاریوں کی بیخ کنی یا ان کے حملے کے محض خوف کی وجہ سے ان کے خلاف نہ کوئی اتحاد قائم کیا جائے اور نہ

ف ۱۔ اس زمانے میں ہسٹنگز مجلس نگراں کا صدر تھا۔

ف ۲۔ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۸۱۶ء

ف ۳۔ اگرچہ یہ مراسلہ مجلس رازدار نے روانہ کیا تھا لیکن دراصل وہ مجلس نگراں کی طرف سے تھا ان دونوں مجلسوں کے باہمی تعلقات اختیارات کے لئے ملاحظہ ہو باب نہم جلد دوم۔

کوئی اقدامی کارروائی کی جائے لیکن ہمارا مطلب یہ نہ تھا کہ اگر قزاقوں کے جتھے ہمارے علاقے پر دھاوا کریں اور برطانوی رعایا کے جان و مال کی حفاظت کے لئے معقول انتظامات کی ضرورت محسوس ہو تب بھی آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور اپنی عقل اور اپنے اعتیار تمیزی سے کام نہ لیں۔ ہم آپکو اس امر کا یقین دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ آپ ان کے حملوں کی مدافعت اور (۴۰۷)
اس سلسلے میں حملہ آوروں کی تادیب کے لئے جو تدبیر بھی اختیار کرتے ان کی تائید و توثیق کرنے میں ہمیں ایک لمحے کے لئے بھی پس و پیش نہیں ہو سکتا تھا۔"

سابق حملوں کی سزا دینے اور آئندہ کے لئے ان کا سدباب کرنے کی غرض سے گورنر جنرل بلحاظ مصلحت و دانشمندی جو تدابیر اور مختلف ذرائع اختیار کر سکتا تھا ان کی بابت اپنی رائے اور خیالات کا اظہار کرنے کے بعد مجلس مذکور نے اپنا مراسلہ مندرجہ ذیل ہدایات پر ختم کیا:۔

"ہمیں اس بات کی قوی امید ہے کہ اگر ان کا دوسرا حملہ ہوا تو آپ ان کی اچھی طرح خبر لے سکیں گے اور انھیں پھر اس کی جرأت نہ ہو سکے گی۔ دیہات کے باشندوں پر انھوں نے جو دردناک مظالم آپ کے بیان کے مطابق کئے ہیں ان کے پڑھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"ان امن پسند باشندوں کو اس قسم کے مظالم سے محفوظ رکھنا حکومت کا خاص فرض ہے جس کی تعمیل اور تکمیل میں کسی قسم کی دقت یا دشواری[۵۱] کا عذر قابل تسلیم نہیں ہو سکتا۔

۵۱۔ اس مراسلے کے موصول ہونے سے قبل گورنر جنرل باجلال کونسل نے اپنی تحریر مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۸۱۶ء میں یہ خیال ظاہر کیا تھا "سابق تجربہ کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پنڈاریوں کے خلاف دفاعی کارروائی محض بے سود ہی نہیں ہوگی بلکہ اس انتظام کے سالانہ مصارف اس رقم سے کہیں زیادہ ہوں گے جو ان کی بیخ کنی کرنے کے لئے درکار ہوگی (بحوالۂ کاغذات متعلقۂ جنگ مرہٹہ و پنڈاریاں صفحہ ۴۳)۔

انہیں اس بات کی توقع ہے اور آپ پر اعتماد ہے کہ آپ ہمارے اس عام اصول کا لحاظ رکھیں گے کہ جس حد تک ممکن ہو سکے جنگ سے گریز کیا جائے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ خاص طور پر جنگ کے لئے کوئی حکمت عملی اختیار کرنا یا بعید مقاصد اور مشروط فوائد کی خاطر جنگ مول لینا ایک چیز ہے اور برطانوی حکومت کی توہین کا انتقام لینا یا اپنی رعایا کی حمایت کی خاطر جو ہماری حفاظت کی محتاج ہے فوجی کارروائی کرنا اور اس میں مستعدی ظاہر کرنا دوسری چیز ہے۔ ان دونوں کا فرق آپ کو معلوم کر لینا چاہیئے۔"

پنڈاریوں کے خلاف تیاریاں اور فوجی کارروائی

حکومت ہند کی بابت حکام بالا کے جو خیالات اور جذبات تھے ان کا اس طرح ٹھیک ٹھیک اظہار ہو گیا اور ان کی قطعی رائے معلوم ہو گئی یہ مراسلہ لارڈ ہیسٹنگز کو مارچ ۱۸۱۷ء کے آخر میں موصول ہوا۔ اور گورنر جنرل موصوف نے پنڈاریوں کے خلاف ابتدائی کارروائی شروع کرنے کا فیصلہ کر دیا۔

بنگال مدراس و بمبئی کی فوجوں کو میدان جنگ کے لئے تیار ہونے کا حکم بھیج دیا گیا۔ اگرچہ گورنر جنرل کا ارادہ اپنی فوجی کارروائی کو محض قزاقوں کی بیخ کنی تک محدود رکھنے کا تھا تاہم اس نے اس قدر وسیع پیمانے پر تیاریاں کیں کہ حکمت عملی کے حقیقی مقصد میں جو دقتیں یا رکاوٹیں پیدا ہوں ان سب پر وہ بہ آسانی حاوی ہو سکے۔

اس نے اس بات کا اندازہ کر لیا تھا کہ جس میدان میں وہ قدم رکھنے والا ہے جوں جوں اسے طے کیا جائے گا وہ وسیع تر ہوتا جائے گا۔ جس جنگ کا اس نے بیڑا اٹھایا تھا وہ کسی ایک قبیلے یا کسی خاص قوم یا حکومت کے خلاف تھی بلکہ غارتگری کے عام رواج کے خلاف تھی جس کا لارڈ ویلزلی نے قریب قریب خاتمہ کر دیا تھا اور جو اب دوبارہ زور پکڑ گئی تھی اور ہندوستان کے عام امن

کے لئے مضر ثابت ہو رہی تھی۔ اس زبردست مقصد کے لئے معقول فوجی و سیاسی تدابیر اختیار کرنے سے قبل لارڈ ہیسٹنگز نے تمام ایسے عہدہ داروں سے مشورہ لیا جن کے ذاتی معلومات اور تجربے سے اس کے معلومات میں اضافہ ہو سکتا یا رائے قائم کرنے میں مدد مل سکتی تھی۔ اس طور سے حکومت نے جو ضخیم سرکاری کاغذات مرتب کئے ان کے مطالعہ سے ایک عجیب بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سب متضاد عادات و اطوار اور متضاد خیالات والے اشخاص جن کے مستقر بھی ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے اس مسئلے پر متفق تھے۔ ان سب میں اگر کوئی اختلاف تھا تو وہ صرف طریقۂ علاج کے متعلق تھا لیکن جہاں تک کہ فوراً فوجی کارروائی شروع کرنے یا لارڈ ویلزلی کی حکمت عملی کے اصولوں پر دوبارہ عمل کرنے کا سوال تھا اس پر سب کی ایک ہی رائے تھی۔

اس زمانے میں برطانوی حکومت اور ہندوستان کی دوسری سلطنتوں کی جو حالت تھی اگر اسے تفصیل کے ساتھ یہاں بیان کیا جائے تو مضمون کے تسلسل میں فرق آجائے گا لیکن اس خیال سے کہ اکثر لوگ اس قسم کے مسائل (۴۹۰)
کے مطالعہ میں واقعات مابعد کے مقابلے میں واقعات ماسبق کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں سرجان میلکم کی تحریر جس میں اس موضوع پر نہایت توضیح سے بحث کی گئی ہے ضمیمہ[۱] میں شامل کر دی گئی ہے۔ سرجان میلکام اور مارکوئیس ہیسٹنگز کے درمیان اس مسئلہ پر بہت مراسلت ہوئی تھی لہذا مذکورۂ بالا تحریر گورنر جنرل کی خواہش اور اصرار پر لکھی گئی تھی۔ اس زمانہ کے وقت میں کمپنی کی جو اصلی حالت تھی اور بارہ سال کے تجربے کے بعد عدم مداخلت کے مسلک کی بابت جو خیالات سب کو قائم کرنے پڑے تھے ان سب کا اس تحریر سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

جنگ کے واقعات کی تفصیل اس موضوع کے مقصد کے خلاف ہے لہذا یہاں صرف وہی واقعات درج کئے جائیں گے جن سے سیاسی معاملات کے سمجھنے میں

۱؎ ۔ تحریر سرجان میلکام بنام مارکوئیس ہیسٹنگز مورخہ ۱۲ جولائی ۱۸۱۸ع بحوالہ ضمیمہ (۴)۔

آسانی ہو سکے۔ اسی سلسلے میں ۱۸۱۷ء کے موسم بہار میں کمپنی نے اپنی فوجیں جس طریقے سے ترتیب دیں اسے خاص طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس ترتیب کی وجہ سے محض جنگ ہی نہیں۔ کامیابی یقینی نہیں ہو گی بلکہ اس سے دیگر خوشگوار نتائج بھی ظہور پذیر ہوئے اور اس کی بدولت بہت سے فرمانروا اور رئیس تباہی سے بچ گئے۔ ان فوجوں کو ایسے مناسب مقامات پر جمادیا گیا تھا کہ اگر یہ فرمانروا اور رئیس امن و سکون کے حامی نہیں تو وہ انھیں ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھ سکیں اور اگر وہ غارتگری و بدامنی کی حمایت کریں تو ان کا بہ آسانی خاتمہ کر سکیں۔

دکن کی فوج کے دستے سر تھامس ہلپ کی کمان میں اور گجرات کی ایک زبردست فوج سر کیر (Sir. Keir) کی ماتحتی میں خاص پنڈاریوں پر حملہ کرنے کی غرض سے جنوب کی سمت سے بڑھی۔ دوسری طرف بنگال کی فوجیں اس قدر خوبی سے مختلف مقامات پر جمادی گئیں تھیں کہ گورنر جنرل کا ان سب سے پورا پورا مقصد حاصل ہو گیا لارڈ ہیسٹنگز لکھتا ہے کہ ان ترکیبوں سے میرا مطلب یہ تھا کہ ہماری متعدد فوجیں ایسے مقامات پر پہنچ جائیں کہ ان کی موجودگی میں اگر کوئی ہندوستانی ریاست دوسری کسی فوج سے ملنا چاہے تو اسے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑے اور اگر کوئی سلطنت اپنے علاقے میں بھی ہمارے احکام کے خلاف اپنی فوج جمع کرنے کی کوشش کرے تو بھی اسے سخت خطرات کا مقابلہ کرنا پڑے لیکن یہ ترکیب اسی وقت کامیاب ہو سکتی تھی جب کہ تمام تیاریاں راز میں کی جائیں۔ فوجوں کے لئے مناسب مقامات منتخب کئے جائیں اور مجوزہ مقامات پر بعجلت ممکنہ پہنچ جائیں۔"

دولت راؤ سندھیا کا طرز عمل اور جدید معاہدہ

مرہٹہ سرداروں میں اس وقت بھی سندھیا سب سے زیادہ طاقتور تھا لہٰذا خود اس کی قوم کے سردار نیز پنڈاری اسی پر آس لگائے بیٹھے تھے لیکن لارڈ ہیسٹنگز خود ایک زبردست فوج لیکر پہنچ گیا اور میجر

جنرل ڈونکن کی کمان میں بھی ایک فوج وہاں پہنچ گئی۔ ان دونوں فوجوں کے پہنچنے
کے بعد سندھیا ایسا گھر گیا کہ اس کے لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ باقی نہ رہا کہ یا تو (۴۹۲)
وہ گورنر جنرل کی پیش کردہ شرائط قبول کرے یا شکست کھا کر اپنی قوت کا ہمیشہ کیلئے
خاتمہ کرلے۔ سندھیا نے مجبوراً اپنی طبیعت کے خلاف اول الذکر راستہ اختیار کیا
لیکن مرہٹوں کے اتحاد کے ایک رکن کی حیثیت سے اسے وہ بہت شاق گذرا اور
اس کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ انگریزوں کی قوت کے خلاف جو ایک زبردست
اتحاد قائم ہو رہا تھا اس کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر سندھیا کی اعانت و جدوجہد
پر تھا لہذا اس طور پر اس کی علانیہ علیحدگی سے محض پنڈاریوں ہی کو نقصان نہیں
پہنچا بلکہ اس اتحاد کو بھی سخت صدمہ پہنچا۔ لارڈ ہیسٹنگز نے اپنی دوربینی سے ان
سب باتوں کا قبل از قبل اندازہ کر لیا تھا[۱]۔

اس زمانے میں راجہ نیپال اور سندھیا کے مابین انگریزوں کے خلاف جو (۴۹۳)
مراسلت جاری تھی اس کا لارڈ ہیسٹنگز کو پتا لگ گیا۔ اس نے ان واقعات کی سندھیا
کو اطلاع کی اور اپنے خیالات سے اسے آگاہ کیا لیکن اس کے خلاف کوئی کارروائی
نہ کی۔ گورنر جنرل کا خیال تھا کہ اس کا سندھیا پر اچھا اثر پڑے گا اور اسے
اپنی اس توقع میں مایوسی بھی نہیں ہوئی اس وقت جو گفت و شنید جاری تھی اگرچہ
اس کی کامیابی کا مدار زیادہ تر فوج کی نقل و حرکت اور سیاسی ترکیبوں پر تھا
تاہم اس کا بھی خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس واقعہ کے سلسلے میں لارڈ ہیسٹنگز سندھیا کی

---

[۱]۔ جس طریقے سے لارڈ ہیسٹنگز نے اس فرمانروا سے گفت و شنید شروع کی اور شرائط
طے کیں وہ اس کی تحریر مورخہ یکم مارچ سنہ ۱۸۱۲ء بنام مجلس رازدار میں درج ہے۔ وہ نہایت
واضح طور پر سندھیا کو قزاقوں کے جتھوں کا خاص سردار اور معاون تصور کرتا ہے اور اس
حیثیت سے اس کی قوت کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد اس پر مجبور ہوتا ہے کہ یا تو اسے
جبراً امن و امان کا حامی بنایا جائے یا اس کے خلاف اس سے اعلان
کرایا جائے تاکہ اس کا خاتمہ کیا جا سکے۔ بحوالہ کاغذات مطبوعہ متعلقہ پنڈاریان
و مرہٹہ سرداران صفحہ (۳۸۳)

نازک حالت اور جغرافی نقطۂ نظر سے اس کی ریاست کی کیفیت بھی بیان کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "سندھیا اس وقت گوالیار میں مقیم تھا جو اس کی ریاست کا مرکز اور زرخیز ترین حصہ ہے۔ اس خرابی کے علاوہ کہ کمپنی کے مقبوضات اور گوالیار کے درمیان صرف دریائے جمنا حائل تھی فوجی نقطۂ نظر سے ایک نقص اور بھی تھا جسکی طرف مہاراجہ مذکور نے غالباً کبھی توجہ نہیں کی تھی۔ گوالیار کے جنوب میں تقریباً بیس میل کے فاصلے پر یک بہ یک پہاڑیوں کا ایک بے ڈھنگا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کے چاروں طرف ایک گھنا جنگل واقع ہے۔ جو دریائے سندھ خرد سے لے کر چمبل تک چلا جاتا ہے۔ اس قسم کے جنگل ہندوستان میں عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ مذکورۂ بالا دونوں دریا مل کر علاقہ گوالیار اور اس کے سواد کے مقامات پر ایک سرحد کا کام دیتے ہیں۔ اس سمت سے گاڑیوں اور توپ خانوں کے گزرنے کے لئے صرف دو راستے ہیں۔ ایک دریائے سندھ خرد کی جانب ہے اور دوسرا چمبل سے تھوڑی دور پر ہے۔ میں نے ایک ایسے مرکزی مقام پر قبضہ کر لیا کہ دریائے سندھ خرد کی طرف سے کوئی نہ نکل سکے اور دوسرے راستے کے عقب پر میجر جنرل ڈنکن کی فوج حاوی اس طور سے سندھیا ایک مخمصے میں پھنس گیا اور اس کے لئے بجز اس کے کوئی اور چارہ باقی نہ رہا کہ یا تو وہ میرے پیش کردہ شرائط قبول کرے یا ایک پگڈنڈی کے راستے سے گزر کر پہاڑی علاقے سے باہر آئے۔ اس راستے سے وقت واحد (۴۹۴
میں صرف چند آدمی اس کے ساتھ گزر سکتے تھے۔ اس طور سے اس کا نہایت اعلیٰ درجہ کا توپ خانہ (جس میں تقریباً ایک سو پیتل کی توپیں تھیں) مع سازو سامان کے ختم ہو جاتا اور اس کے زرخیز ترین مقبوضات ہمارے ہاتھ لگ جاتے۔

میرے پیش کردہ شرائط کا قبول کرنا گویا بلا کسی شرط کے کمپنی کی اطاعت قبول کرنا تھا لیکن یہ شرائط ایسے پیرایہ میں پیش کئے گئے تھے کہ علانیہ طور پر اسکی توہین نہ ہونے پائے۔ اگر اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ میرے علم میں مہاراجہ سندھیا نے قطعی طور پر پنڈاریوں کو مدد دینے کا وعدہ کیا تھا اور رازمیں مراسلت کر کے وہ نیپالیوں کو ہمارے خلاف حملہ کرنے کے لئے ابھار رہا تھا اور میں نے اس کے

خطوط پکڑ لئے تھے تو یہ شرائط ہرگز سخت نہیں معلوم ہوں گی اور نہ کوئی انھیں خلاف
انصاف کہہ سکے گا۔ اگر مجھے اس بات کا یقین نہ ہو جاتا کہ وسط ہند میں اس وقت
جو ریاستیں قائم ہیں ان کا وجود برقرار رکھنا اور ملک میں امن و امان قائم
کرنے کے لئے انھیں اپنا آلہ بنانا ضروری ہے تو سندھیا کی مسلسل غداریوں کے
بعد اس قدر صبر سے ہرگز کام نہ لیا جاتا۔ مذکورۂ بالا شرائط کے بعد وہ بے بس
ہوگیا اور انھیں تسلیم کر کے اس نے اپنے آپ کو بچا لیا۔ اگر دوسرے کسی علاقے
میں اسے کوئی فائدہ حاصل ہوتا تو وہ ہانڈی کے ابال کی طرح محض عارضی ہوتا۔
دوسری ریاستوں کے لئے جو کسی قدر فاصلے پر واقع تھیں یہ واقعہ سخت مفر
ہوا۔ سندھیا کی کثیر فوج جس کے ساتھ مل کر وہ کام کرنے والی تھیں نہ پہنچ سکی
اور اس کے بغیر وہ کسی قسم کی جد و جہد نہ کر سکیں۔"

مذکورۂ بالا زبردست و فیصلہ کن تدابیر اور مستعدی کا سندھیا اور
(۴۹۵) اس کے وزرا پر جو اثر پڑا اس میں برطانوی رزیڈنٹ کی قابلیت اور متانت
سے مزید اضافہ ہو گیا۔ اس نے نہایت پر اثر الفاظ میں اسے جتلا دیا کہ ایک
راستے میں امن و سلامتی ہے اور دوسرے میں سراسر تباہی ہے اور اپنا اثر
ڈال کر اس سے مجوزہ معاہدے پر دستخط کرا لئے جس کی رو سے یہ طے پایا کہ
سندھیا پنڈاریوں کی بیخ کنی کرنے میں معقول مدد دے گا اور اپنی فوج کا ایک
دستہ دے گا جو برطانوی افسروں کی نگرانی میں برطانوی فوجوں کے ساتھ
مل کر قزاقوں کے خلاف کام کرے گا۔ یہ فوج نہایت مکمل حالت میں ہونی چاہئے
لہٰذا عہد نامہ سُرجی ارجنگاؤں کی رو سے انگریزی حکومت کے ذمے جو رقوم عائد
کی گئی ہیں وہ تین سال تک طلب نہیں کی جائیں گی اور انھیں مذکورۂ بالا فوج
کی تیاری میں صرف کیا جائے گا۔ سندھیا کے خاندان والوں اور اس کے
وزرا کو جو رقوم ہر سال بطور وظیفے کے دی جاتی ہیں وہ برطانوی افسروں
کی معرفت حیدر آباد کے رسالے پر جو برطانوی فوجوں کے ساتھ کام کرنے کے لئے متعین
کیا گیا ہے صرف کی جائیں اور سندھیا کی باقی فوجیں اپنے اپنے پڑاؤ پر جو
برطانوی حکومت تجویز کرے گی مقیم رہیں اور بغیر اس کی اجازت کے قطعی

نقل و حرکت نہ کریں۔

سندھیا نے ان شرائط پر پابند رہنے اور اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لئے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ دوران جنگ میں برطانوی فوجیں
(۴۹۶) اسیر گڈھ اور ہندیا کے قلعوں میں مقیم رہیں نیز عہدنامہ مورخہ ۲۲ نومبر ۱۸۰۵ء کی دفعہ ۸ منسوخ کی جائے۔ اس دفعہ کی منسوخی کے بعد انگریزی حکومت جے پور جودھپور۔ اودے پور۔ کوٹہ۔ بوندی اور دریائے چمبل کی جانب ساحل والی تمام ریاستوں سے معاہدہ کرنے کی مجاز ہو گئی لیکن اس کے ساتھ ہی سندھیا کو برطانوی حکومت کی حفاظت حاصل ہو گئی اور ان ریاستوں سے جو خراج اسے ملتا تھا وہ بدستور جاری رہا البتہ کمپنی سے ان کا معاہدہ ہو جانے کی صورت میں وہ ان کے معاملات میں مداخلت کرنے کا مجاز نہیں رہا۔

یہ ہے خلاصہ اس معاہدے کا جو سندھیا کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑا۔ اس کی بدولت اسے جو روش اختیار کرنی پڑی اگرچہ وہ اس کی مرضی کے خلاف تھی تاہم اس کے مفاد کے موافق تھی۔ جس مجبوری سے اس نے ان شرائط پر دستخط کئے تھے وہ ظاہر ہے لہٰذا اس اتحاد میں وہ یقیناً شریک ہو چکا تھا اس سے علیحدگی اختیار کرنے کے لئے وہ یہی ایک عذر پیش کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس اتحاد کی تمام تدابیر ابھی پایۂ تکمیل پر نہیں پہنچی تھیں کہ ایک طرف پیشوا اور بھونسلا نے فوجی کارروائی شروع کر دی۔ دوسری طرف پنڈاریوں نے گوالیار کا رخ کیا۔ ان واقعات سے ایک ہلچل مچ گئی اور یہ خیال ہو گیا کہ سندھیا ان حالات میں اپنے معاہدے پر قائم نہیں رہے گا۔ اگر اس وقت اس کے دل میں اس قسم کا کوئی خیال پیدا ہوا ہوگا تو اسے بہت جلد اپنی حیثیت کا احساس ہو گیا ہوگا۔ لارڈ ہیسٹنگز نے کوچ کر کے اپنی فوج سندھیا اور پنڈاریوں کی فوج کے درمیان ڈال دی
(۴۹۷) جس سے سندھیا کا ڈگمگانا ختم ہو گیا اور جو لوگ اس پر آس لگائے بیٹھے تھے ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

اس کے بعد جو لڑائی شروع ہوئی اس میں سندھیا اگر غیر جانبدار

نہیں تو خاموش ضرور رہا لیکن اس کی فوج کے جس حصے کے مصارف کے لئے پہلے سے انتظام کر لیا گیا تھا اس سے بھی کام لینے میں سخت دقت محسوس ہوئی۔ اسیر گڈھ کا مستحکم قلعہ بھی کمپنی کے حوالے نہیں کیا گیا۔ اس کے لئے یہ عذر پیش کیا گیا کہ وہاں کا گورنر جسونت راؤ لار منحرف ہو گیا ہے اور وہ علانیہ طور پر باجی راؤ کی حمایت کر رہا ہے۔ اس سردار نے جب ناگپور کے سابق راجہ اپّا صاحب کو اپنے یہاں پناہ دی تو اس سے قلعہ خالی کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور سندھیا نے بھی فوری تعمیل کرانے کے لئے احکام جاری کر دیئے۔ جب اس نے اس سے انکار کیا تو برطانوی فوجوں نے اس کے قلعے کا باضابطہ طور پر محاصرہ کر لیا۔ اس کی تسخیر کے بعد محض ایک اتفاق سے سندھیا کا ایک خط انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا جس میں اس نے اپنے اس سردار کو ہدایت کی تھی کہ پیشوا کی طرف سے جو احکام بھی وصول ہوں ان کی تعمیل کی جائے۔

جب رزیڈنٹ نے سندھیا کو یہ خط دکھایا تو اس نے تسلیم کیا کہ یہ اسی کی تحریر ہے لیکن اس طرح اس کی جو بے وفائی ثابت ہوتی تھی اس کے لئے اپنے اور پیشوا کے قدیم خاندانی تعلقات کا عذر پیش کیا۔ یہ عذر ایک حد تک معقول تھا لہٰذا اسے مسترد نہیں کیا گیا اور لارڈ ہیسٹنگز نے اپنی مصلحت آمیز فیاضی کی بناء پر صرف یہ (۴۹۸) مطالبہ پیش کیا کہ اسیر گڈھ کا قلعہ مستقل طور سے کمپنی کے حوالے کر دیا جائے۔ اس طور سے کمپنی قزاقوں اور لٹیروں کو روک سکتی تھی ورنہ جب تک کہ یہ قلعہ مرہٹوں کے ہاتھ میں رہتا وہ ان کی حفاظت اور پناہ کا ذریعہ بنا رہتا۔ سندھیا نے بخوشی یہ مطالبہ تسلیم کر لیا اور اس کے درباروالوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ درحقیقت گورنر جنرل نے اس موقع پر اعتدال سے کام لیا۔

حیدر آباد کی حالت

لارڈ ہیسٹنگز کے دور میں سلطنت آصفیہ کے سیاسی معاہدوں میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی سلطنت مذکور کی اندرونی حالت کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ یہاں کے وزیر سے کمپنی کا سمجھوتا ہو گیا تھا اور وہ اس کی اعانت کا محتاج تھا اس طور سے وہاں ایک نہایت معقول فوج تیار

ہو گئی تھی جس میں سوار اور پیادے دونوں شامل تھے برطانوی افسروں کے ہاتھ میں اس کی کمان تھی اور انہی کے توسط سے اس کی تنخواہیں جو نہایت معقول تھیں پابندی سے ادا ہوتی رہتی تھیں اور کمپنی کو اس پر پورا اختیار حاصل تھا دراصل یہ کمپنی ہی کی فوجیں تھیں اور جس حکومت کی وہ برائے نام ملازم تھیں اس سے زیادہ ان پر اس کا اثر تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ شہریار دکن کے پاس بجز انکی ڈیوڑھی کے دربان اور پہرے والوں کے جو راست ان کے ماتحت تھے کوئی اور فوج نہیں تھی۔

ایلچ پور کے قدیم موروثی جاگیردار صلابت جنگ کے پاس البتہ ایک معقول فوج تھی لیکن وہ کسی لحاظ سے حیدر آباد کی فوج نہیں کہی جا سکتی۔ اگرچہ یہ سردار سلطنت آصفیہ کے امراء میں شامل تھا تاہم اس نے ۱۸۰۳ء میں مرہٹوں کے خلاف اپنی بہادری اور صداقت دکھا کر کمپنی کی اعانت و عنایت کا اپنے آپ کو مستحق بنا لیا تھا اور اسی بناء پر اس سے ایک سمجھوتا کر لیا گیا تھا جس کی رو سے وہ ایک بڑی حد تک دربار حیدر آباد کے اثر سے آزاد ہو گیا تھا۔ اس عنایت (۴۹۹
کے عوض میں وہ مع اپنے تمام ساتھیوں کے جن پر اس کا اثر تھا ہمیشہ کمپنی کی خدمت کرنے کے لئے آمادہ رہتا تھا اور اس کی فوج نے جس میں باقاعدہ پیدل اور بے قاعدہ سواروں کا ایک دستہ شامل تھا پنڈاریوں کے خلاف خوب کام دیا۔

اگرچہ حیدر آباد کی حالت نہایت ابتر تھی تاہم خوش قسمتی سے وقتی ضروریات کے لئے ہمارے حسب منشا تھی۔ کمپنی سلطنت کے تمام وسائل پر حاوی ہو گئی۔ اگر وہاں کے حالات مختلف ہوتے تو یہ بات ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ مرہٹوں کے خلاف جو مدد یہاں سے ملی تھی اس کا اختتام جنگ پر اعتراف کیا گیا اور جب انگریزی حکومت نے پیشوا کے علاقے پر قبضہ کیا تو پیشوا کے سابق مطالبات چوتھ ہی محض معاف نہیں کئے گئے بلکہ دربار پونہ کو حیدر آباد پر جو حقوق حاصل تھے وہ سب منسوخ کر دیئے گئے۔ چند اضلاع کا آپس میں تبادلہ کر لیا گیا جو دونوں کے لئے مفید ہوا بعد میں ان سب باتوں کو ایک معاہدے کی شکل میں ترتیب دے لیا گیا اور ۱۲ دسمبر ۱۸۲۲ء کو اس پر دستخط ہو گئے۔

راجپوت ریاستوں سے معاہدہ

اسی زمانے میں یعنی جنگ کی ابتدائی کامیابی
کے بعد ہی اودے پور۔ جودھپور۔ جے پور۔ کوٹہ
اور بوندی کی راجپوت ریاستوں سے معاہدے ہوئے
ان سب معاہدوں کا ایک ہی مقصد تھا۔ ان میں سے
ہر ایک نے انگریزی حکومت کی شہنشاہی قبول کی اور اس بات کی ذمہ داری (۵۰۰)
لی کہ زیر دست کی حیثیت سے وہ ہمیشہ کمپنی کا ساتھ دے گی اور جو خراج وہ
اپنے سابق سردار کو ادا کیا کرتی تھی وہی کمپنی کو ادا کرے گی۔ ان پہ سابق خراج
جو واجب الادا تھا اس کا تادیہ کمپنی نے اپنے ذمہ لیا اور اس بات کا وعدہ کیا کہ وہ
اپنے ان تحتانی حلیفوں کو بیرونی طاقتوں کے حملوں۔ مطالبات اور مداخلت سے
محفوظ رکھے گی۔ اس کے ساتھ ہی اندرونی معاملات میں ان کے سب اختیارات
بدستور قائم رکھے گئے۔ ان سب معاہدوں کی ایک ہی حیثیت تھی البتہ کہیں کہیں
مقامی حالات یا فرمانرواؤں کے مخصوص حالات کے لحاظ سے کچھ تبدیلی کی گئی تھی مثلاً
ریاست کوٹہ میں مشہور ظالم سنگھ ایک مدت دراز سے بہ حیثیت اتالیق کے
کام کر رہا تھا لہذا صیغۂ راز میں اس سے ایک معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے اسکے
تمام ذاتی اعزاز و اختیارات اس کے وارثوں کے لئے مخصوص کر دیئے گئے۔
اس معاہدے سے جن فوری فوائد کی توقع تھی وہ ان نقصانات کے مقابلے میں
جن کا کہ آئندہ اندیشہ ہو سکتا تھا بہت زیادہ تھے۔ اس موضوع پر دوسری کتاب[1]
میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ یہ ایک غیر معمولی شخص تھا۔ اس کے تعلقات سے
جن جن فائدوں کی توقع کی گئی تھی وہ سب پوری ہوئیں اور اس نے جو خدمات
انجام دیں ان کا صلہ بھی اسے بہت جلد مل گیا جسونت راؤ ہولکر نے ریاست
کوٹہ کے جن علاقوں پہ قبضہ کر لیا تھا وہ اسے عطا
کر دیئے گئے[2]۔ (۵۰۱)

---

[1] بحوالہ دی سنٹرل انڈیا (وسط ہند) جلد دوم (صفحہ ۵۰۱)

[2] بحوالہ سنٹرل انڈیا صفحہ ۵۰۰ جلد دوم۔

امیر خاں سے معاہدہ

جس مستعدی اور دانشمندی سے بغیر گولی چلائے سندھیا کو مغلوب کر کے صلح پر مجبور کیا گیا اسی طرح امیر خاں پر بھی اثر ڈالا گیا۔ اس کے وکیل نے دہلی کے رزیڈنٹ سے جو معاہدہ کیا تھا اس کی توثیق کے مسئلہ کو یہ سردار طرح طرح کے عذر پیش کر کے ٹال رہا تھا لیکن جب کمپنی کی فوجیں اس کے قریب پہنچ گئیں اور انھوں نے چند ایسے مقامات پر قبضہ کر لیا کہ اسے معاہدے پر دستخط کرنے یا ایک غیر مساوی مقابلے کے لئے تیار ہوجانے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہ گیا تو اس نے بھی سلامتی کی راہ اختیار کر لی۔ ہولکر کے خاندان سے جو مقبوضات اسے ملے تھے ان پر اس کا قبضہ بحال رکھا گیا لیکن اُسے اپنے توپ خانے کا ایک بڑا حصہ انگریزی حکومت کے حوالے کرنا پڑا اور قزاقوں کے جو جتھے دس سال سے مالوہ اور راجپوتانہ کے لئے بلائے بے درماں بنے ہوئے تھے انھیں بھی برخاست کرنا پڑا۔

راجہ ناگپور کی بے وفائی

۱۸۱۷ء کے اوائل میں پیشوا اور راجہ ناگپور کی جو حالت تھی اس کا ذکر ہوچکا ہے۔ گورنر جنرل ان دونوں کے کیرکٹر کی بابت اپنی رائے ظاہر کرتا ہے اور برطانوی حکومت کے ان پر جو حقوق ہیں ان کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے مفاد کا ضرور خیال رکھیں گے۔ مجھے اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ وہ سب سے پہلے جنگ کی طرف مائل ہونگے اور مجھے ایسی روش اختیار کرنے پر مجبور کریں گے جس کے نتائج میرے ابتدائی خیالات کے قطعی خلاف ہوں گے۔" (۵۰۲)

ان دونوں کے کیرکٹر کا ذکر کرتے ہوئے لارڈ ہیسٹنگز لکھتا ہے کہ "اگر پیشوا اور راجہ ناگپور کی خلاف توقع غداری اور حماقت ظہور میں نہ آتی تو میں اپنے تئیں نیز سرکار عظمت مدار کو اس بات کی مبارکباد دیتا کہ میں نے اپنی توقع کے مطابق غارتگری کے رواج کا خاتمہ کر دیا اور نہ ہندوستان کی کسی طاقت کو چھیڑنے کی ضرورت پڑی اور نہ چپہ بھر زمین برطانوی حکومت

کے مقبوضات میں شامل کی گئی۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ آپ میری اس دلی خواہش سے واقف تھے اور اسے پسند کرتے تھے لیکن جن اسباب کی بنا پر مجھے اس میں مایوسی ہوئی وہ میرے اختیار سے باہر تھے۔ جب یہ واقعات ظہور میں آئے اور بے وفا حلیفوں اور علانیہ دشمنوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی ضرورت پیش آئی تو مجھے اس بات کا اقبال کرنا پڑا کہ جن اصول کی طرف میں ابتداء میں مائل تھا اور جن پر عمل کرنا میں اپنا فرض سمجھتا تھا ان پر اب قائم رہنا ممکن نہ تھا۔ اس معاملے میں جو احکام مختلف حالات کے لحاظ سے جاری کئے گئے تھے ان کی تعمیل آپ کے مقبوضات کو خطرے میں ڈالے بغیر نہیں ہوسکتی تھی اور اس بات کو نہ میں پسند کرسکتا تھا اور نہ میری اس قسم کی اطاعت سے میرے ہموطن خوش ہوسکتے تھے۔"[۵۱]

مذکورۂ بالا واقعہ ہماری ہندوستانی تاریخ کی ان متعدد مثالوں میں سے ایک مثال ہے جن سے یہ بارہا نہایت واضح طور پر ثابت ہوچکا ہے کہ جب کبھی ہم کسی جنگ میں مبتلا ہوں گے تو اس میں ہمارے لئے کوئی حدود مقرر نہ ہوسکیں گے۔ (۵۰۳)
واقعات کی تھوڑی سی تفصیل سے واضح ہوجائے گا کہ اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ صدر حکومت اپنی شہرت اور اپنے مفاد کو نثار کئے بغیر پنڈاریوں کے خلاف فوجی کارروائی شروع کرنے میں مزید تاخیر روا نہیں رکھ سکتی تھی تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اسی قدر سخت ضرورت اپا صاحب اور باجی راؤ دونوں کے خلاف جنگ کرنے کی تھی تاکہ ان بے وفا فرمانروائوں کا پورے طور سے خاتمہ کردیا جائے۔

اگرچہ اپا صاحب والی ناگپور کو انگریزی حکومت ہی کی بدولت گدی نصیب ہوئی تھی تاہم اس نے ابتدا ہی سے کچھ ایسا طرز عمل اختیار کیا جو ہر لحاظ سے وفاداری اور احسانمندی کے خلاف تھا۔ جن وزراء کے اثر سے امدادی معاہدہ طے پایا تھا انھیں اس نے ملازمت سے علیحدہ کردیا اور باجی راؤ سے جو اس وقت ہمارے مفاد کے خلاف تدبیریں کر رہا تھا نہایت باقاعدہ طور پر بصیغۂ راز مراسلت شروع کردی۔ اس قسم کی مراسلت معاہدے کی رو سے ناجائز تھی

۵۱؎ - بحوالہ تحریر لارڈ ہیسٹنگز مورخہ یکم مارچ ۱۸۲۰ء (صفحہ ۳۲ مطبوعہ کاغذات)

لیکن اس قسم کی باتوں کو چھیڑ کر ناگوار صورت پیدا کرنا مقصود نہ تھا اس لئے مرہٹوں
کے عادات و خصائل اور اس نوعمر فرماں روا کی کمزوری کا جس کی وجہ سے وہ سازش
کی طرف مائل تھا خاص طور پر لحاظ کیا گیا۔

(۵۰۴) دربار ناگپور میں اس وقت دو خاص جماعتیں تھیں۔ ان میں سے ایک قطعی
طور پر انگریزوں کے مفاد کے خلاف تھی۔ آج کل اسی کا اثر بڑھا ہوا تھا لیکن باوجود
اس کے راجہ رزیڈنٹ سے اس قدر اخلاص اور صفائی سے ملتا تھا کہ اگر مسٹر
جنکنس ذرا بھی بے خبر رہتا تو وہ بہت سخت مغالطے میں پڑ جاتا اور اپنے آپ
کو محفوظ سمجھتا رہتا۔ اس نے زبانی جمع خرچ کے مقابلے میں راجہ کی حرکتوں
کی طرف زیادہ توجہ کی۔ ناگپور کی فوج میں اضافہ ہوا۔ پونہ سے مراسلت
روز بروز بڑھتی رہی۔ برطانوی فوجوں پر حملہ ہونے کے بعد پیشوا کی طرف سے
اسے خلعت عطا ہوا اور علانیہ طور پر اس کی عزت کی گئی یہ سب باتیں ایسی
تھیں جنھیں چاپلوسی کی باتوں یا پوچ عذرات سے نہیں ٹالا جا سکتا تھا اور نہ
مخاصمانہ اسپرٹ کے علاوہ کسی اور سبب پر انھیں محمول کیا جا سکتا تھا۔ باوجود
ان واقعات کے چند باتیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے رزیڈنٹ کو اس بات کی
توقع ہو گئی کہ راجہ حد سے گذرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ سندھیا کے معاہدے
اور پیشوا کی ناکامی کی خبر ناگپور کو ایک ہی دن پہنچی اور اس خیال سے کہ راجہ پر ان کا
اچھا اثر پڑے گا ان کی اطلاع اسے کر دی گئی۔ مسٹر جنکنس Mrs. Jenkins
لکھتا ہے کہ راجہ نے اول الذکر واقعہ پر اظہار اطمینان کیا اور پیشوا کی حماقت پر افسوس کیا اور کہا کہ کیا
وہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر تھوڑی بہت کامیابی اسے حاصل ہو جائے گی تو وہ اس سے انگریزوں
کی قوت کو کوئی صدمہ پہنچا سکے گا"۔ اگرچہ رزیڈنٹ کا خیال تھا کہ اپا صاحب کے
بدطینت مشیروں میں ان واقعات سے جو ہیجان پیدا ہو گیا ہے اس کا اثر اچھا ہوگا
(۵۰۵) تاہم اپنے اس خیال سے متاثر ہو کر اس نے فوری ضروریات کے لئے مزید فوج
حاصل کرنے میں تاخیر نہ کی۔ حفظ ماتقدم کے لئے اس نے جو انتظامات کئے تھے
ان کی تکمیل کے چند روز بعد ہی اسے اطلاع ملی کہ ناگپور میں جو تھوڑی سی برطانوی
فوج تھی اس پر حملہ ہونے والا ہے۔ ۲۴ نومبر ۱۸۱۷ء کو اس نے لفٹنٹ

جنرل سر تھامس ہلپ کو جو خط لکھا تھا اس کے مندرجۂ ذیل اقتباس سے راجہ مذکور
کے دوغلے پن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مسٹر جنکنس لکھتا ہے کہ گذشتہ ماہ کی ۱۴ تاریخ
کو جو تحریر میں نے آپ کو روانہ کی تھی اس کے بعد سے مجھے برابر اس بات کی اطلاع
مل رہی ہے کہ مقامی برطانوی فوجوں پر حملہ ہونے والا ہے۔ ماہ رواں کی ۶ تاریخ کو
میں نے سر جان میلکام اور آپ کو جو خط لکھا تھا اس میں ان تمام باتوں کا میں ذکر
کر چکا ہوں جن کی بنا پر راجہ کو اس حرکت کے لئے اُبھارا جا رہا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم
ہوا ہے کہ راجہ کے چند دانشمند مشیر اپنے اثر سے اب تک اسے روکے ہوئے ہیں
لیکن جہاں تک کہ راجہ کی ذات کا تعلق ہے اس کے کسی سرکاری مراسلے یا اسکے
کسی لفظ سے اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے بگاڑ کرنے والا ہے۔ اب
تک شکایت کا ایک لفظ بھی وہ اپنی زبان پر نہیں لایا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب جنگ
کی حامی جماعت نے ایک روز یہ خبر مشہور کر دی کہ برطانوی فوجیں اس پر حملہ کرنے
کی غرض سے کوچ کرنے والی ہیں تو اس نے خوف زدہ ہو کر میرے منشی کو جو ایک
مرہٹہ ہے اپنے پاس بلایا اور ایک گھنٹے تک اس سے گفتگو کی اور پیشوا کی غداری
کے خلاف رائے ظاہر کی اور کہا کہ یہ بات قطعی ناممکن ہے کہ میں اس کی تقلید کروں
میرے وسائل محدود ہیں۔ میری جو حیثیت ہے وہ ظاہر ہے۔ میں مع اپنے
اہل وعیال کے ایک کھلے شہر میں مقیم ہوں۔ بجز ایک چاندا کے قلعے کے میرے (۵۰۶)
پاس کوئی اور قلعہ نہیں جس میں انھیں حفاظت کی خاطر رکھا جا سکے۔ مزید برآں
مجھ پر برطانوی حکومت کا احسان ہے۔ اسی کی بدولت مجھے سب کچھ حاصل ہوا
ہے۔ اسی کی عنایت و اعانت کا میں ہمیشہ خواستگار اور محتاج ہوں اور تنہا
اسی پر بھروسہ کر سکتا ہوں۔

رزیڈنٹ مذکور آخر میں لکھتا ہے کہ "اب تک میں نہایت چوکنا ہو لیا
ہوں میں نے اپنی طرف سے حتی الوسع کسی قسم کی بدگمانی کا بھی اظہار نہیں کیا لیکن ہمارے
دشمن نہایت زور شور سے یہ افواہ اڑا رہے ہیں کہ کمپنی پر حملہ ہونے والا ہے۔
اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی مشہور کی جا رہی ہے کہ پنڈاری بھی ہم پر حملہ کرنے والے
ہیں اور اس خبر اور خوف کے بہانے سے راجہ کی فوجیں ہر وقت کمربستہ رہتی ہیں

لہٰذا میں نے دربار والوں کو آگاہ کر دیا ہے کہ اس قسم کی خبریں صحیح ہوں یا غلط اگر برطانوی فوجوں کو رزیڈنسی کی طرف بڑھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کی ذمہ داری آپ سب پر ہوگی۔ پنڈاریوں کے متعلق جو خبریں اڑائی جارہی ہیں ان میں علانیہ طور پر راجہ کے گماشتوں کا زیادہ حصہ ہے۔"

راجہ کی صلح پسند باتوں کے باوجود اس کی فوجوں کی نقل و حرکت ہماری خبروں کے مطابق نکلی اور اس کے ارادوں کا اس قدر صاف اندازہ ہو گیا کہ ان میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ ان واقعات کے بعد کمپنی کی فوج کو غیر محفوظ چھاؤنیوں سے رزیڈنسی میں منتقل کر کے سیتا بلدی پہاڑی[1] پر جو اس کے متصل تھی جما دیا گیا۔

۲۶ر نومبر کی رات کو ایک کثیر التعداد فوج نے اس قلیل جماعت پر جو حملہ (۵۰۰) کیا اور اٹھارہ گھنٹے کی لڑائی کے بعد ہمیں جو شاندار فتح حاصل ہوئی اس کی تفصیل ہمارے فوجی کارناموں کی تاریخ میں ملے گی۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ غنیم کو ہر جگہ اور ہر سمت میں شکست ہوئی۔ اسی اثناء میں جو کمک طلب کی گئی تھی وہ آپہنچی اور اس کے بعد اپا صاحب کو اپنی کامیابی کی کوئی توقع باقی نہ رہی اور اس نے دوبارہ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے مراسلت شروع کر دی اور اس بات کے باور کرانے کی کوشش کی کہ کمپنی کی فوجوں پر جو حملہ ہوا وہ بغیر اس کی منظوری اور رضامندی کے ہوا تھا۔ اس سے مطالبہ کیا گیا کہ پہلے میدان جنگ سے فوجیں ہٹالی جائیں اس کے بعد اس کی تحریر کا جواب دیا جائے گا۔ اس کی تعمیل کر دی گئی اور اس کی فوجوں کی مراجعت اور جنرل ڈوٹن General Doveton. کی فوج کے پہنچنے میں (جن کا مقدمۃ الجیش ناگپور ۱۲ر دسمبر کو پہنچا) جو وقفہ گزرا اس میں یہ سر پھرا راجہ برابر خوشامد اور اطاعت گزاری کا اظہار کرتا رہا لیکن ساتھ ہی ساتھ بزدل اور غیر مستقل مزاج لوگوں کی طرح اپنی تلون مزاجی کا بھی ثبوت دیتا رہا۔

---

[1] یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جو ناگپور سے دکھائی دیتی ہے۔

جنرل ڈوٹن کے پہنچنے کے بعد اسے مندرجۂ ذیل شرائط پیش کی گئیں ۱۔
وہ اس بات کا اعتراف کرے کہ کمپنی کی فوج پر حملہ کرنے کے بعد وہ بالکل
ہمارے رحم و کرم پر ہے اور اس کی نجات کا انحصار تنہا ہماری فیاضی اور ہمارے
اعتدال پسند مسلک پر ہے۔ اس کے بعد وہ اپنا تمام سامان جنگ اور اسلحہ (۵۰۸)
وغیرہ ہمارے حوالے کرے۔ اس کی فوج کی تعداد معین ہونے کے بعد اس کا کچھ حصہ
اُسے واپس دے دیا جائے گا۔ رزیڈنٹ سے مشورہ کرنے کے بعد وہ اپنے عرب
سپاہی نیز دوسرے تمام سپاہیوں کو جس حد تک ممکن ہو برخاست کرے۔
اس کی فوج کے لئے اس وقت جو مقام مقرر کیا جائے وہاں وہ فوراً منتقل کر دی
جائے۔ شہر ناگپور پر کمپنی کی فوجیں قابض ہوں گی اور وہ تمام سرکاری و غیر سرکاری
مال کی حفاظت کریں گی۔ راجہ کو جو سیول اختیارات حاصل ہیں وہ بھی انہی فوجوں کے
ہاتھ میں رہیں گے اور وہی اس کی جگہ کام کریں گی۔ شرائط صلح طے ہو جانے کے بعد
شہر ناگپور پر سے قبضہ ہٹا لیا جائے گا۔ راجہ سردست برطانوی رزیڈنسی کے علاقے
میں یا باہر کسی خیمے میں منتقل ہو جائے اور جب تک کہ ہر معاملہ طے نہ ہو جائے
وہیں قیام کرے۔ شرائط معاہدہ کی رو سے اس کی ریاست کا کوئی بڑا علاقہ اس سے
نہیں لیا جائے گا البتہ امدادی فوج اور دیگر فوجوں کے ضروری مصارف کے لئے جو
سابق معاہدوں میں طے ہو چکے ہیں کوئی علاقہ ضرور لیا جائے گا۔ دوسرے جو امور
پیش کئے جائیں گے ان کا مقصد بجز امن برقرار رکھنے کے اور کچھ نہ ہوگا اور ان
سب میں بھی راجہ کی حکومت کے اقتدار کا خاطر خواہ طریقے پر لحاظ رکھا جائے گا۔"

ان سب شرائط کی تعمیل ۱۶ تاریخ کی صبح کے چار بجے تک ضروری قرار دی گئی
اور اس کے ساتھ یہ شرط لگائی گئی کہ ۷ بجے صبح تک راجہ کی فوجیں شہر سے باہر
ہو جائیں جس کے بعد کمپنی کی فوجیں شہر میں داخل ہونگی راجہ کو اختیار حاصل ہے کہ
ان شرائط کی تکمیل سے قبل ہی رزیڈنسی کے علاقے میں چلا آئے یا اس کے بعد
دن میں کسی وقت جیسا وہ مناسب سمجھے۔

ان شرائط سے جو راجہ کو پیش کئے گئے تھے اس کے اختیارات تو بہت
کچھ محدود ہو گئے لیکن اس کی حکومت کے نام اور کام میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس نے (۵۰۹)

مہلت حاصل کرنے کے لئے بہت کچھ ٹال مٹول کی لیکن بالآخر سب شرائط منظور کر لئے اور اپنے چند وزراء کے ساتھ برطانوی رزیڈنسی میں منتقل ہو گیا۔ اس کی فوجوں نے کسی قدر مقابلے کی جرات کی لیکن ان پر حملہ کر کے انھیں پسپا کر دیا گیا۔ سوار فوج بالکل منتشر ہو گئی اور سوار اپنے اپنے گھر واپس ہو گئے۔ عربوں کے ایک دستے نے البتہ مقابلہ کیا اور محل کی طرف مراجعت کر کے انھوں نے چند روز تک اس کی حفاظت کی لیکن بعد میں انھوں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔

رزیڈنٹ نے مقامی حالات[۱] اور ہندوستان کے عام حالات کو پیش نظر رکھ کر سرکاری طور پر اس بات کا وعدہ کر لیا تھا کہ اپّا صاحب کو دوبارہ برسر حکومت کرا دیا جائے گا لہذا جب گورنر جنرل کے ہدایات اس کی معزولی کی بابت وصول ہوئے تو اس نے اپنے فیصلے میں کوئی تبدیلی نہ کی اور راجہ کو اس کے محل میں واپس ہونے کی اجازت دے دی البتہ جو شرائط اس نے راجہ کے روبرو پیش کئے تھے اور جنھیں وہ قبول کر چکا تھا انھیں قطعی طور پر پیش نہ کیا بلکہ ان کے بجائے لارڈ ہیسٹنگز کی منظوری حاصل کرنے تک ایک عارضی معاہدے پر راجہ کے دستخط لے لئے۔[۲]

۱۔ مسٹر جنکنس نے اپّا صاحب کو دوبارہ برسر حکومت کرانے کا جو فیصلہ کیا اس کا خاص سبب یہ تھا کہ اس کی معزولی کی صورت میں جس شخص کو مسند نشین کرایا جاتا اس میں نہ خود حکومت کا کام چلانے کی قابلیت اور نہ اس کا اتنا اثر تھا کہ دوسروں سے وہ کام لے سکے۔

۲۔ جدید معاہدے کی رو سے اپّا صاحب نے دریائے نربدا کے تمام شمالی علاقے اور جنوبی ساحل کے چند مقبوضات سے دست برداری دی اور گوالگڈھ، سرگوجا اور جبلپور کے علاقوں پر جو حقوق اسے حاصل تھے ان سے بھی وہ دست کش ہو گیا۔

کمپنی نے ان علاقوں کو امدادی فوج کے مصارف اور دیگر فوجی خدمات کے عوض میں شامل کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی طے پایا کہ راجہ اپنے تمام سیول و فوجی محکموں کا کام ایسے وزراء سے لے جن پر برطانوی رزیڈنٹ کو اعتماد ہو۔

راجہ نے انگریزی فوجوں کی حفاظت میں مع اپنے متعلقین کے ناگپور (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

گورنر جنرل کا خیال تھا کہ جو کچھ واقعات ظہور پذیر ہو چکے ہیں ان کے بعد (۵۱۰)
اپّا صاحب پر قطعی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں دیگر متعدد وجوہ بھی ایسے
موجود تھے جن کی بنا پر اس نے اپنے نزدیک یہ فیصلہ کر لیا کہ اپّا صاحب کو دوبارہ
برسر حکومت نہ کرایا جائے لہذا اس سلسلے میں جو ہدایات ناگپور روانہ کئے گئے
وہ اس مفروضے پر مبنی تھے کہ ریزیڈنٹ نے اپا صاحب سے کوئی ایسا معاہدہ نہیں
کیا ہے جس سے اس کے دوبارہ برسر حکومت آنے کا بعید امکان بھی ہو سکے لیکن
جب لارڈ ہیسٹنگز کو مسٹر جنکنس کی تحریر وصول ہوئی تو اس نے نہایت دانشمندی
سے کام لیا اور جو معاہدہ طے ہو چکا تھا اس کی تائید اس خیال سے کردی کہ برطانوی
نمائندوں کے قول و فعل پر دیسی ریاستوں میں عام طور پر جو اعتبار کیا جاتا ہے۔
اس میں فرق نہ آنے پائے۔
ان خیالات کی بنا پر لارڈ موصوف نے ریزیڈنٹ کو ہدایت کی کہ عارضی
معاہدے کو ایک باضابطہ عہد نامے کی شکل میں ترتیب دے لیا جائے۔ اس (۵۱۱)
مدت میں اپا صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ اپنے تمام علاقے سے دست بردار
ہونے کے لئے آمادہ ہے اور اپنے ذاتی اعزاز و خطاب اور ایک سالانہ وظیفہ
پر اکتفا کرنے کے لئے راضی ہے۔ اس تجویز کی وجہ سے تاخیر ہوئی لیکن لارڈ ہیسٹنگز
نے اسے خلاف مصلحت تصور کیا اور ریزیڈنٹ کو احکام بھیجدیئے کہ جو شرائط پہلے
طے ہو چکے ہیں۔ انھیں پر عمل کیا جائے۔ یہ احکام پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ ناگپور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) میں قیام کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ جدید معاہدے کے طے ہونے
کے وقت امدادی رقم کا جو بقایا تھا وہ ادا کیا گیا اور یہ طے پایا کہ جب تک کہ مذکورہ بالا تمام علاقہ برطانوی
حکومت کے حوالے نہ کیا جائے سابق رقم کی ادائی جاری رہے گی۔
اسی سلسلے میں یہ بھی طے پایا کہ راجہ کے علاقے کے جس قلعہ پر بھی انگریزی حکومت قبضہ کرنا چاہے
اس سے دست برداری دی جائے۔ راجہ کے نزدیک جن لوگوں نے اس کی مرضی اور احکام کے خلاف
اسے جنگ میں پھنسایا تھا انھیں گرفتار کر کے کمپنی کے حوالے کیا جائے۔ علاوہ ازیں سیتا
بلدی کی دونوں پہاڑیاں اور ان کا ملحقہ میدان کمپنی کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ وہاں اپنی فوجی عمارتیں تعمیر کرا سکے۔

میں دوسری بغاوت ہو گئی۔
ریاست کے متعدد قلعہ داروں نے جب اپنے اپنے قلعے کمپنی کے حوالے کرنے سے انکار کیا تو مختلف قسم کے شبہات پیدا ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس بات کا ناقابل تردید ثبوت مل گیا کہ ان کے بے وفا مالک نے انھیں ہماری مخالفت کرنے کی ہدایت کی تھی اس کی فوج کے باغی سرداروں اور اس کے وزراء کے پاس جنھوں نے سابق موقع پر اسے ابھارا تھا اس کے خطوط پکڑے گئے۔ ان واقعات سے یہ بات صاف ظاہر ہو گئی کہ باوجود کمپنی کے اعتدال اور نیک سلوک کے وہ برابر مخاصمانہ کارروائی میں مشغول ہے۔ اسی زمانے میں یہ بھی پتہ لگا اور اسکے لئے قطعی ثبوت بھی مل گیا کہ جس گدی کی اس نے اس قدر سخت ذلت کی ہے اسکے حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے پیشرو بالا صاحب کو بھی قتل کرایا تھا۔ ان سازشوں اور جرموں کی نوعیت اس قدر سخت تھی کہ رزیڈنٹ کو ان سب باتوں کی اطلاع گورنر جنرل کو کرنی چاہئے تھی اور اس کے حکم کا انتظار کرنا چاہیئے تھا لیکن ایک طرف تو اسے یہ خبر ملی کہ راجہ اپنے دار الحکومت سے فرار ہونے کی فکر میں ہے اور دوسری طرف یہ پتہ لگا کہ باجی راؤ ناگپور کی طرف بڑھنے والا ہے اور اپا صاحب اس سے برابر مراسلت کر رہا ہے لہذا یہ وقت غور و خوض کا نہ تھا۔ مسٹر جنکنس نے اپنی فوجوں کو محل کا محاصرہ کرنے اور اپا صاحب کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا اس کے بعد اپا صاحب کو رزیڈنسی میں پہنچا دیا گیا اور وہیں وہ مقید رہا۔ احکام وصول ہونے کے بعد فوج کے ایک زبردست دستے کی نگرانی میں اسے شمالی ہند کے برطانوی علاقے کو روانہ کر دیا گیا۔ رائچورہ[1] پہنچنے کے بعد اس نے اپنے پہرے والوں کو رشوت دی اور وہاں سے نکل بھاگا اول مہادیو پہاڑ پر پہنچا اور وہاں سے اسیر گڈھ پہنچ گیا اور پنڈاریوں کے سردار چیتو سے مل گیا۔ اپا صاحب کے یہاں پہنچنے کے چند روز بعد ہی برطانوی فوج کے ایک دستے نے اسیر گڈھ کے قلعے کے قریب چیتو پر حملہ کیا اور اسکی (۵۱۲)

[1] یہ مقام جبلپور سے ایک منزل کے فاصلے پر واقع ہے۔

فوج کو منتشر کر دیا۔ اس کے بعد سے اس ذلیل اور غدار شخص کا ہمیں کچھ حال معلوم نہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ کچھ مدت تک آسیر گڈھ میں پناہ گزیں رہنے کے بعد وہ پنجاب روانہ ہو گیا اور اب تک[1] وہیں رنجیت سنگھ والی لاہور کی روٹیوں پر ذلت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

پونے کے حالات

ناگپور کے علاقے میں حکومت قائم کرنے اور ضروری انتظامات عمل میں لانے کے لئے گورنر جنرل نے جو تدبیریں اختیار
(۵۱۳) کیں ان کا بعد میں ذکر کیا جائے گا۔ اب پونے کے حالات کی طرف توجہ کرنی چاہیئے وہاں کے نو فرمانروا سے بھی آپا صاحب کی سی حرکتیں سرزد ہوئیں جن سے مجبور ہو کر برطانوی حکومت کو ایسی کارروائی کرنی پڑی جس سے بالآخر باجی راؤ کی حکومت اور اس کے خاندان کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔

برطانوی حکومت نے پیشوا کی آئندہ غداری سے بچنے کے لئے جن شرائط پر اسے مجبور کیا تھا اور اس طور سے جو کثیر نقصانات اسے برداشت کرنے پڑے تھے انکے بعد سے اس کے دل میں ایک قسم کی کشمکش جاری تھی جس کی وجہ سے کبھی تو وہ جنگ کی حامی جماعت کے زیر اثر آجاتا تھا اور کبھی حامیان امن کی طرف جن کا یہ قول تھا کہ جس قوت کے مقابلے کی تاب نہیں ہے اس کی پیش کردہ شرائط قبول کر لینی چاہئیں مائل ہو جاتا تھا۔

حامی جنگ جماعت کا سردار گوکل تھا یہ شخص ذات کا برہمن اور ایک نہایت جوشیلا فوجی سردار تھا۔ ۱۸۰۳ء کی لڑائی میں اس نے نہایت مستعدی اور بہادری سے کام کیا تھا جس کے صلے میں برطانوی حکومت نے اس کے ساتھ ابتک فیاضانہ سلوک کیا تھا اور اس وقت جو کچھ عزت و قوت اسے حاصل تھی وہ برطانوی حکومت کی اعانت ہی کی بدولت تھی لیکن جاہ طلبی کی ہوس اور مذہبی تعصب نے اسے اتنا اندھا کر دیا تھا کہ وہ اس زمانے میں جنگ کا حامی بن گیا۔ امن وصلح کی حامی جو جماعت تھی اس کا سردار مور دکشت تھا۔ یہ ایک برہمن وزیر اور

[1] مؤلف کا بیان ۱۸۳۶ء کا ہے۔

نہایت سادہ وضع اور راستباز شخص تھا۔ باجی راؤ کو ترمبک جی کے ساتھ جو خصوصیت تھی اس کی وہ برابر مذمت کرتا رہتا تھا اور ایک سمجھدار شخص ہونے کی حیثیت سے وہ یہ تاڑ گیا تھا کہ اس شخص کی صحبت اور نفسانی خواہشات کے مضر اثر سے
(۵۱۴) اس کا آقا بہت جلد اپنے آپ کو تباہ کرلے گا۔ ۱۳ر جون کو پیشوا سے جو معاہدہ ہوا تھا اس میں باجی راؤ کے خوف کے علاوہ اس وزیر کی نصیحت اور اس کے ہم خیال معزز اشخاص کا اثر بھی شامل تھا۔ اس موقع پر یہ توقع کی گئی تھی کہ جس طرح باجی راؤ نے اپنے ذاتی اغراض اور مشیروں کی صلاح سے اپنے بزرگوں کی سلطنت برقرار رکھنے کے لئے ہماری پیش کردہ شرائط قبول کر لی ہیں اسی طرح نہ وہ ان کے عمل میں مانع ہوگا اور نہ ان کی خلاف ورزی کرے گا۔ علاوہ ازیں ایک خیال یہ بھی تھا کہ جب ضرورت و مجبوری اور مقابلے کی کامیابی سے مایوس ہو کر وہ اپنے متعدد قلعے اور علاقے انگریزی حکومت کے حوالے کر چکا ہے اور اس طرح اس کی قوت میں کمی واقع ہو چکی ہے تو اس کے بعد اور خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ وہ پہلے بھی جنگ سے بروقت پیچھے ہٹ گیا تھا۔ آئندہ اپنی قسمت کا فیصلہ کیونکر شمشیر کے حوالے کردے گا لیکن جو طرز عمل اس نے اختیار کیا وہ ہر لحاظ سے بعید از عقل تھا اور اسے محض اس کی طبیعت کی کمزوری پر محمول کرنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں اس زمانے میں گوکل نے اس پر اپنا پورا اثر بٹھا لیا تھا۔ اس کے رفیق ترمبک جی کا اس پر برابر دباؤ پڑ رہا تھا اور بلاشبہ مرہٹوں کی دوسری سلطنتوں سے بھی اسے اعانت و مدد کے وعدے مل چکے تھے غارتگری اور قزاقی ان مرہٹوں کے مسلک کا ایک جزو بن گئی تھی، لہذا جو قوت اس کا خاتمہ کرنے پر تلی تھی اس کے خلاف وہ سب متحد ہونے کے لئے آمادہ ہو گئے ان زبردست محرکات اور اتحاد کے باوجود اگر پونہ کی برطانوی فوج پنڈاریوں کے خلاف روانہ نہ ہو گئی ہوتی تو پیشوا کی ہمت جنگ شروع کرنے کی ہرگز
(۵۱۵) نہ پڑتی اور ذاتی خطرات اس پر لازمی حاوی رہتے۔ بہر حال اس طور سے اسکی ہمت بڑھ گئی اور جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کی تدبیریں پوشیدہ نہیں رہیں اور رزیڈنٹ نے کمک طلب کی ہے اور پونہ کی قلیل فوج کی اعانت کے لئے

دوسری فوج آرہی ہے تو اس نے پہلا وار چلانے کا فیصلہ کر دیا۔ اس نے پونہ میں ایک کثیر فوج جمع کی۔ انگریزی چھاؤنیوں کو لوٹا اور جب اس کے مخاصمانہ انداز اور حرکات سے متاثر ہو کر رزیڈنٹ اس کے دارالحکومت سے باہر قریب کے ایک محفوظ مقام پر منتقل ہو گیا تو اس نے برطانوی رزیڈنسی پر بھی ہاتھ مارا اور بعد میں کھڑکی کی قلیل برطانوی فوج پر بلا وجہ اور بغیر کسی اشتعال کے حملہ کیا۔ مسٹر الفنسٹن نے ۶۔ نومبر ۱۸۱۷ء کو جو خط لارڈ ہیسٹنگز کو لکھا تھا اس میں ان سب واقعات کی تفصیل درج ہے۔ اس تحریر کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ باجی راؤ کی طرف سے علانیہ مخاصمت کا اظہار ہو جانے کے بعد بھی مسٹر الفنسٹن نے اسے جنگ سے باز رکھنے کی ہر ممکنہ کوشش کی کیونکہ ایسی صورت میں اس کی تباہی لازمی معلوم ہوتی تھی۔

واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیشوا سے جو جنگ چھڑی اس میں خود
باجی راؤ کا کوئی دخل نہیں تھا اور نہ دوران جنگ میں اس نے اپنی طرف سے
خاطر خواہ کوشش کی محض اس کے ناعاقبت اندیش مشیروں نے اسے پھنسا دیا (۵۱۶)
تھا۔ پونہ پر قبضہ ہونے کے بعد صحیح واقعات کا علم ہوا اور ان سے یہ عقدہ کھلا کہ جنگ شروع ہونے کے وقت باجی راؤ نے گوکل سے کہلا بھیجا کہ میں جنگ کی ابتدا نہیں کروں گا لیکن اس مغرور سردار نے اپنے آقا کی کمزوری کے نتائج کو محسوس کرکے فوراً جنگ شروع کر دی۔ گوکل کا بیان ہے کہ کمپنی کی ہندوستانی فوجوں کی بابت اسے یقین تھا کہ وہ انگریزوں کا ہرگز ساتھ نہیں دیں گی اور محض اس خیال کی بنا پر اسے اپنی کامیابی کی توقع تھی۔ درحقیقت شاید ہی کبھی کسی سیاسی سازش میں ایک خاص جماعت کو ورغلانے اور لالچ دلانے کی اس قدر زبردست کوشش کی گئی ہوگی اور اس کے ساتھ شاید ہی کبھی اس قسم کی کوشش میں اس قدر سخت ناکامی ہوئی ہوگی۔ ہندوستانی سپاہی زیادہ تر پیشوا کے علاقے ہی کے رہنے والے تھے لیکن اعلیٰ تنخواہوں اور دیگر قسم کے لالچ کے مقابلے میں وہ ثابت قدم رہے۔ نہ بڑی بڑی رشوتوں کی ترغیب سے ان کی وفاداری میں فرق آیا اور نہ ان کے خاندانوں کے

ساتھ بدسلوکی کرنے کی دھمکیوں سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنے فرض سے منہ موڑا۔
جنگ شروع ہونے کے بعد سے ہتھیار ڈالنے کے وقت تک پیشوا برطانوی فوجوں کے مقابلے سے بچتا رہا۔ صرف گوکل کی فوج نے مقابلے کی جرأت کی اور وہ خود بھی آخر دم تک نہایت بہادری سے لڑتا رہا اور اسی لڑائی میں ہلاک ہوا۔ اگرچہ وہ ایک غیر دانشمند مشیر اور ناداں دوست تھا تاہم اس نے مرتے وقت ایک بہادر اور جانباز سپاہی کا لقب حاصل کر لیا۔

(۵۱۷) **باجی راؤ کی معزولی اور سلطنت پونہ کا خاتمہ**

باجی راؤ میدان جنگ میں تو سخت بزدل ثابت ہوا لیکن ہماری فوجوں سے بچنے میں اس نے کمال کر دکھایا اور تعاقب کی ناکامی کی وجہ سے بہ حیثیت غنیم کے اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اس کا علم بدظن لوگوں کا مرکز بن گیا۔ ان سب کے خدمات کا معاوضہ کرنے کے لئے اس کے پاس معقول سرمایہ موجود تھا۔ اگرچہ ہم نے اس کی معزولی کا اعلان کر دیا تھا اور ستارا کے راجہ کو قید خانے سے رہا کر کے پونے کا ایک علاقہ اس کے حوالے کر دیا تھا اور جو اختیارات اس کے بزرگوں کو برائے نام حاصل تھے وہ اب حقیقی معنوں میں اسے حاصل ہو گئے تھے تاہم مرہٹوں جیسی قوم کے دل سے ایک صدی کے خیالات و جذبات نہ ہمارے الفاظ سے مٹائے مٹ سکتے تھے اور نہ ہمارے انتظامات میں کوئی فرق پیدا کر سکتے تھے ہم باجی راؤ کو پیشوا کے لقب سے یاد کریں یا نہ کریں وہ فرمانرواؤں کے اس خاندان کا نمائندہ تھا جس کے سامنے مرہٹوں کی قوم کا ہر طبقہ کئی پشتوں سے سر جھکاتا رہا ہے خواہ وہ صدق دلی سے ہو یا محض ظاہرداری کی خاطر۔ دوسری تمام ریاستیں اس کی کامیابی کے لئے دعا کرتی تھیں ہر وہ قوت جسے ہم نیچا دکھا چکے تھے اور وہ تمام فرمانروا سردار جو ہم سے خوف کھاتے تھے اس بات پر متفق تھے کہ جب تک باجی راؤ میدان میں موجود ہے اس وقت تک ایک ایسا مرکز قائم رہیگا جس پر سب جمع ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے کہ وہاں کسی وقت ایسی قوت قائم ہو جائے جو انگریزوں کی قدر و منزلت کو

صدمہ پہنچا سکے۔ ان واقعات کی اہمیت کے لحاظ سے مرکزی حکومت اور
مقامی عہدہ دار جو اپنے مقامی تجربے کی وجہ سے زمانے کی خصوصیات کو خوب
۱۸۱۸ء سمجھے ہوئے تھے اس موقع پر خاص طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ مئی
میں باجی راؤ نے اسیر گڈھ پہنچکر یہ تجویز پیش کی کہ وہ اپنے آپ کو کمپنی
کے حوالے کرنے اور برطانوی قوم کی فیاضی پر بھروسہ کرنے کے
لئے آمادہ ہے۔

باجی راؤ کا اس کتاب میں اس قدر ذکر ہو چکا ہے اور تاریخ ہند (۵۱۸)
کے سیاسی واقعات پونہ کے فرمانرواؤں کے نام کے ساتھ اس قدر
زیادہ وابستہ ہیں کہ اگر اس خاندان کے آخری فرمانروا کی اطاعت و معزولی
کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کر دئے جائیں جس کی حکومت ایک زمانے
میں ساحل ملیبار سے لے کر صوبۂ لاہور تک پھیلی ہوئی تھی تو اس سے نہ
صرف ہمارے معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ ہمارا تجسس بھی ایک حد تک
رفع ہو جائے گا اس مقصد کیلئے بہترین اور مستند مواد ایک شخص کے
مراسلے میں مل سکتا ہے جس نے یہ تمام واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے
تھے اور جسے اس زمانے میں ہر سرکاری کاغذ پر عبور حاصل تھا لہذا یہ مراسلہ
اس کتاب کے ضمیمہ میں شامل کر دیا گیا ہے۔

اس تحریر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ باجی راؤ کے دو وکیل یا
سفیر ۱۸ مئی کو جنرل میلکام کے پاس پہنچے جو اس وقت مالوہ میں مئو کے پڑاؤ
پر مقیم تھا۔ انھوں نے اپنے آقا کا ایک خط اس کے سامنے پیش کیا جس میں
اس نے صلح و امن کی انتہائی خواہش کا اظہار کیا تھا اور اس کے ساتھ
ہی یہ توقع ظاہر کی تھی کہ جنرل مذکور (جسے وہ اپنا تنہا دوست سمجھتا تھا)

لہ - باجی راؤ ایسے ہر موقع پر کہا کرتا تھا کہ میرے تین دوست ہیں۔ کلوز، ویلزلی
(یعنی ڈیوک آف ویلنگٹن) اور میلکام کلوز مر چکا تھا۔ ویلزلی ایک بعید مقام پر اب بڑا آدمی (۵۱۹)
تھا اس طور سے یہاں صرف میلکام باقی رہ گیا تھا جو اسکی مدد کر سکتا تھا۔ ان تینوں کا ذکر وہ اس وجہ سے
کیا کرتا تھا کہ ۱۸۰۳ء میں جب اسے برسر حکومت کرایا گیا تھا تو اسمیں انہیں تینوں ہی کا دخل تھا۔

اس معاملہ میں بحیثیت ثالث کے مداخلت کرے گا۔ ان وکیلوں نے اس درخواست کو موثر بنانے کے لئے جو دلائل پیش کئے ان کا دہرانا بے سود ہوگا وہ یہ بات ثابت کرنا چاہتے تھے کہ باجی راؤ اپنی مرضی کے خلاف جنگ میں پھنس گیا تھا۔ یہ ثابت کرنے کیلئے کہ جس مقابلے کیلئے اسے ابھارا گیا تھا وہ اس کے بس کا کام نہ تھا انھوں نے بطور وسیلے کے اس کی بزدلی کا بھی ذکر کیا اور ان دلائل کی بنا پر اس بات کی توقع ظاہر کی کہ اس مرتبہ اسے اور معاف کر دیا جائے گا۔ ان سب باتوں کے جواب میں ان سے صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ جو کچھ واقعات ظہور میں آچکے ہیں ان کے بعد اور خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ پونہ پر ہمارا قبضہ ہو چکا ہے اور ہم اس کا اعلان بھی کر چکے ہیں باجی راؤ سے کوئی معاہدہ اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ وہ اپنے تخت و تاج سے دست بردار ہونے اور دکن سے باہر سکونت اختیار کرنے کا وعدہ نہ کر لے۔

پیشوا نے سر جان میلکام سے یہ درخواست بھی کی کہ وہ اسیر گڈھ کے قریب اس کے پڑاؤ پر آکے اس سے ملاقات کر لے۔ اسے قبول نہیں کیا گیا کیونکہ اس سے کمپنی کی غرض ظاہر ہوتی اور معاملات طے کرنے میں دقت پیدا ہو جاتی تاہم تاخیر رفع کرنے کی غرض سے سر جان کے مددگار کپتان لو (Captain Lowe) کو روانہ کر دیا گیا تاکہ وہ وہاں پہنچ کر اس بات کا اندازہ کرے کہ یہ پیغام کس حد تک صداقت پر مبنی ہے اور باجی راؤ اور اس کے ساتھیوں کی حقیقی حالت کیا ہے۔

پیشوا کی طرف سے اس قسم کی درخواست کا کبھی خیال بھی نہیں تھا لہذا سر جان میلکام کو اس بارے میں قطعی کوئی ہدایت نہیں ملی تھی تاہم جنگ کا قصہ ختم کرنے کی غرض سے وہ اپنے اوپر ذمہ داری لینے سے بالکل نہیں گھبرایا کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس کی یکسوئی پیشوا کی گرفتاری یا اطاعت کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے گرفتار کرنے کی اس وقت کوئی صورت ممکن نہیں تھی۔ وہ اسیر گڈھ پہنچ گیا تھا وہاں کے

گورنر نے اپنی خدمات اسے پیش کر دی تھیں اور اپنی تمام فوج اور پورا قلعہ اس کے
(۵۲۰) حوالے کر دیا تھا۔ یہ عین برسات کا موسم تھا لہٰذا پانچ چھ مہینے تک اس قلعہ کی
تسخیر ناممکن تھی۔

ان خیالات کے بعد جب سر جان میلکام کو یہ اندازہ ہوا کہ اس معاملے میں غیر معمولی تعویق کا اندیشہ ہے تو وہ خود بھی کچھ آگے بڑھ گیا تاکہ پیشوا کے پڑاؤ کے قریب رہ سکے۔ جنرل ڈوٹن برہان پور میں مقیم تھا لہٰذا پیشوا جنوب یا مغرب کی طرف نہیں بڑھ سکتا تھا۔ سر جان میلکام جب خود آگے بڑھا تو اس نے اپنی فوج کو اس طرح ترتیب دے دیا کہ پیشوا شمال اور مشرق کی سمت میں بھی مراجعت نہ کر سکے۔ اس ترکیب کا مقصد یہ تھا کہ باجی راؤ کو اطاعت قبول کرنے یا اسیر گڈھ کے قلعہ میں بند ہونے کے علاوہ جہاں صرف اس کی پیدل فوج اس کا ساتھ دے سکتی تھی اور کوئی چارہ باقی نہ رہے اور یہ صاف ظاہر تھا کہ اگر وہ یہاں سے نکل کر بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گا تو بارش کا موسم ختم ہوتے ہی فوجی کارروائی شروع ہو جائے گی اور وہ یقینی طور پر محصور ہو جائے گا۔

ایک طرف گفت و شنید جاری تھی دوسری طرف سر جان میلکام آگے بڑھ رہا تھا اور اس کی فوجیں نقل و حرکت کر رہی تھیں لیکن باوجود ان سب باتوں کے جب تک کہ خود سر جان میلکام نے باجی راؤ سے ملاقات کرنے پر رضامندی ظاہر نہ کی تصفیہ کی کوئی صورت نہ نکلی۔ باجی راؤ پر اس وقت اس قدر رعب طاری تھا کہ وہ اپنی تقریباً تمام فوج کی حفاظت میں ملاقات کرنے کے لئے باہر آیا۔ سر جان میلکام کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ جب تک کہ باجی راؤ کے دل میں اعتماد قائم نہ کیا جائے گا جو بغیر صداقت و دیانت کے پیدا نہیں ہو سکتا اس کا خوف رفع نہیں ہو گا لہٰذا وہ اپنے ساتھ ایک
(۵۲۱) نہایت قلیل جماعت لیکر گیا۔

اس کارروائی سے پیشوا کو ایک حد تک اطمینان حاصل ہوا اور وہ سکون کے ساتھ معاملات پر گفتگو کر سکا۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ سر جان میلکام پر ذاتی طور سے اسے کوئی بے اعتباری نہیں ہے۔ اس کی

درخواست قبول کرنے کے لئے جو شرائط ضروری تھیں وہ واضح طور پر بیان کر دی گئیں اور اسے مطلع کر دیا گیا کہ ان میں کسی قسم کی ترمیم یا تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ تخت و تاج سے دست برداری ضروری تھی انگریزی حکومت کے علاقے میں دریائے گنگا کے ساحل پر اسے زندگی بھر قیام کرنا ہوگا۔ انگریزی حکومت اسے آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ بطور وظیفے کے دے گی۔ ان تجاویز کو ایک معاہدے کی شکل میں ترتیب دے کر ملاقات کے دوسرے دن یعنی یکم جون کو باجی راؤ کے پاس بھیجدیا گیا۔

اس زمانے[1] میں میجر ڈوٹن کی فوج نے جو نقل و حرکت کی تھی اس کے متعلق تفصیلی واقعات تحریر کرنے کے بعد سر جان میلکام نے مارکوئس ہیسٹنگز کو لکھا کہ "اس موقع پر جو کارروائی بھی مناسب سمجھی جائے اس کے نتائج نیز دیگر متعلقہ امور پر آپ غور فرمالیں اگرچہ باجی راؤ کو اپنے فیصلے پر راضی کرانا ضروری ہے تاہم میں اسے مایوس کرنا یا اسیر گڈھ میں پناہ لینے پر مجبور کرنا نہیں چاہتا۔ اس کے پاس اب بھی پانچ چھ ہزار سوار موجود ہیں۔ انھیں (۵۲۲) پچیس دن آرام کرنے کا موقع ملا ہے اور اب وہ تازہ دم ہیں۔ چار پانچ ہزار پیدل سپاہی بھی اس کے پاس ہیں اور ان میں زیادہ تعداد عربوں کی ہے روزانہ اس کی فوج میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی حالت کتنی یاس انگیز کیوں نہ ہو لیکن ملک میں بے کار سپاہیوں کی ایک معقول تعداد موجود ہے اور ان میں سے سینکڑوں اس کے نام کی وجہ سے اس کے علم کے نیچے چلے آتے ہیں۔ بارش کے موسم کی وجہ سے ہماری وقت اس وقت اور بھی زیادہ ہے اور جنرل ڈوٹن کی رائے ہے جو میرے نزدیک صحیح حالات پر مبنی ہے کہ بارش کے موسم میں وہ اپنی فوج کے بل پر اسیر گڈھ کے محاصرہ میں کامیابی کی توقع نہیں کرسکتا۔ اس تاخیر کی وجہ سے جن خطرات کے پیش آنے کا اندیشہ ہے ان سے میں حتی الوسع بچنا چاہتا ہوں جنگ کے

[1] مورخہ ۷ جون ۱۸۱۸ء

طول کھینچنے اور زبردست مصارف لاحق ہونے کے علاوہ یہ معاملہ اس قدر نازک اور دشوار ہے کہ نہ معلوم دولت راؤ سندھیا کی طرف سے کس قسم کے حالات رونما ہوجائیں اور ان کا کیا حشر ہو۔ مالوے کے حالات سے جو مجھے واقفیت ہے اور جنوبی علاقے سے جو خبریں مجھے ملی ہیں ان کی بنا پر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جب تک باجی راؤ کو گرفتار نہ کیا جائے گا یا ملا نہ لیا جائے گا اس وقت تک میسور کی سرحد سے لیکر مالوے کے آخری سرے تک ہر علاقہ بے چین رہے گا۔ باجی راؤ کا گرفتار کرنا مشکل اور اگر جسونت راؤ لار نے اسے بلا کر اپنے یہاں پناہ دیدی تو وہ ناممکن ہوگا۔ اگرچہ مجھے اس بارے میں آپ کی طرف سے کوئی ہدایت نہیں ملی ہے تاہم میں نے مندرجۂ بالا واقعات سے متاثر ہوکر
(۵۲۲) بغیر آپ کی اجازت کے پیشوا اور اس کے خاندان والوں اور اس کے متعلقین کی اعانت کے لئے معقول رقم دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جسکی بابت باجی راؤ کو شش و پنج میں رکھنا ناممکن تھا۔ اس طور سے ایک قطعی وعدہ کر دینے کی وجہ سے اس کی نیز اس کے ساتھیوں کی رائے جو وہاں موجود تھے میرے موافق ہوگئی۔ ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھکر آپ خود اس بات کا اندازہ کر لیں گے کہ اس قسم کی رائے میری کامیابی کے لئے نہایت ضروری تھی[1]"

---

[1] لارڈ ہیسٹنگز اپنے مراسلے مورخہ ۲۰ جون ۱۸۱۸ء (جو مجلس عوام کے سامنے بھی پیش ہوا تھا) مجلس نظما کو لکھتا ہے کہ باجی راؤ نے جن فوجوں کو اپنے ساتھ لیکر دریائے تاپتی کو عبور کیا تھا ان کا پورے طور پر محاصرہ کر لیا گیا۔ وہ گوالیار کا قطعی رخ نہیں کر سکتا تھا جس طرح کہ اس کے لئے برطانوی فوجوں کا مقابلہ ناممکن تھا اسی طرح ان کے سامنے سے مراجعت کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ لہذا ان حالات میں جو شرائط بھی اسے پیش کی گئی ہیں وہ محض ہماری فیاضی پر مبنی ہیں اور یہ خیال ہے کہ انسانی ہمدردی کے لحاظ سے آپ بھی ایک مغلوب غنیم کے ساتھ اس نیک سلوک کو روا رکھیں گے۔"

گورنر جنرل نے یہ مراسلہ غالباً اسیر گڈھ کے واقعات اور باجی راؤ (بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

(۵۲۴) سرجان میلکام کے خیمے پر باجی راؤ کی ہمرکابی میں جو فوج پہنچی اس میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے تفصیلی حالات کا علم ہونے سے قبل لکھا تھا ورنہ ان شرائط کو فیاضی پر محمول نہ کیا جاتا۔ جس انسانی ہمدردی کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کے ساتھ گفت وشنید میں دوسری باتیں بھی شامل تھیں سرجان میلکام نے جو کچھ کیا وہ کسی ذاتی احساس کی بناء پر نہیں کیا بلکہ اس میں ایک خاص اصول شامل تھا جو برطانوی حکومت کی شہرت اور اس کے مفاد کیلئے ضروری تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی تدبیر اس معاملے میں کارگر نہیں ہو سکتی تھی بہر حال سچ تو یہ ہے کہ باجی راؤ قطعی ہمارے قابو میں نہیں تھا۔ اسیر گڈھ پہنچ جانے کے بعد وہ پانچ چھ ماہ تک جنگ جاری رکھ سکتا تھا اور اس زمانے میں ہندوستان کے ہر علاقے میں بدامنی اور بے چینی رہتی۔

سرجان میلکام نے اپنی تحریر میں گورنر جنرل کو اپنی خیالات وواقعات سے آگاہ کیا تھا جب اسے یہ احساس ہوا کہ عام خیال اس کی رائے کے خلاف ہے تو اس نے جنرل ڈوئن کو خط لکھا اور اس کی رائے طلب کی کیونکہ وہ سب سے زیادہ مقامی حالات سے واقف تھا اور جن حالات میں باجی راؤ سے معاہدہ کیا جارہا تھا انھیں اس سے زیادہ کوئی دوسرا شخص نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس کے جواب کے بعد سب معاملہ صاف ہو گیا اس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جنرل ڈوئن لکھتا ہے کہ باجی راؤ کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کرنے کے لئے جو کارروائی کی گئی ہے اس میں میرا نمایاں حصہ رہا ہے۔ علاوہ ازیں میں خود اس مقام پر رہا ہوں۔ لہٰذا اس معاملے میں مجھے سب سے زیادہ رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ زیر بحث معاملے کی نوعیت کی بابت جو خیالات آپ نے ظاہر کئے ہیں وہ بالکل میرے خیالات کے مطابق ہیں۔ شروع سے میری بھی یہی رائے رہی ہے اب بھی یہی ہے اور آئندہ بھی وہی رہے گی اس بات میں قطعی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ نے باجی راؤ سے جو گفت وشنید شروع کی اور اس کے دوران میں اسے حفاظت کا یقین دلایا اسی کی وجہ سے وہ میرے آگے بڑھنے کے باوجود اپنی قیام گاہ پر مقیم رہا۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ اسیر گڈھ کے قلعہ دار کو وہاں کے گورنر کی طرف سے حکم مل چکا تھا کہ وہ قلعہ مذکورہ کو باجی راؤ کے لئے (بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

(۵۲۵) چار پانچ ہزار تو سوار تھے اور تقریباً تین ہزار پیدل تھے۔ ان میں سے بارہ سو عرب تھے اور دو دن بعد ان کی دوسری جماعت کے واپس آجانے کے بعد جو پہاڑی علاقوں کی حفاظت کے لئے بھیجی گئی تھی ان کی تعداد دو ہزار تک پہنچ گئی سر جان میلکام نے گورنر جنرل کو لکھا کہ "میں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ میں اس معاملے میں بالکل سختی نہیں کروں گا اور ایک معزول فرمانروا اور اس کے باقی ماندہ ساتھیوں کی آخری ملاقات میں ہرگز مخل نہیں ہوں گا۔" سر جان کو اپنے تجربے سے بعد میں اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا کہ یہ فوج رفتہ رفتہ چھٹ جائے گی اور موجودہ حالت میں بھی اس کے پاس متحد ہو کر لڑنے کے لئے بہت کم وسائل ہیں۔

باجی راؤ جنرل میلکام کے ساتھ نربدا کی طرف کئی منزل تک گیا اور راستے میں بجز اس کے اور کوئی واقعہ پیش نہیں آیا کہ اس کے چند ساتھی دکن کی طرف اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے تاہم ایک کثیر تعداد اس کے ساتھ رہی اگرچہ سر جان میلکام نے کئی مرتبہ دوستانہ طریقے پر اسے سمجھایا بھی کہ اس قدر زیادہ تعداد کو ایک جگہ رکھنا مناسب نہیں ہے۔ ان میں سے اکثر سپاہی ایک جگہ مقیم رہنے سے بدظن ہو جائیں گے۔ عربوں کی بابت اس نے خاص طور سے کہا کہ اگر یہ لوگ بدظن ہو گئے یا بگڑ بیٹھے تو بہت سخت مشکلات کا سامنا ہو گا پیشوا اور اس کے ساتھیوں کو مخاطب کر کے سر جان میلکام نے یہ باتیں کہی تھیں انھوں نے اس سے اتفاق تو کیا لیکن اس کی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ کھول دے لہذا وہ جس وقت چاہتا قلعہ میں داخل ہو جاتا اور ہم اس وقت اسے ہرگز نہیں روک سکتے تھے۔

میں یہاں یہ بات صرف تذکرۃً بیان کرتا ہوں اور اگر ضرورت ہو یا آپ چاہیں تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اس موقع پر آپ نے باجی راؤ کو اطاعت قبول کرنے پر آمادہ کر کے اس ملک میں اپنے وطن کی ایک نہایت اہم و زبردست خدمت انجام دی ہے میرے نزدیک ہر ایماندار شخص جو حقیقی واقعات اور میری طرح ہر جماعت کے اندرونی حالات اور دیگر تمام متعلقہ امور سے واقف ہے وہ اس رائے سے قطعی اختلاف نہیں کر سکتا۔

نصیحت سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا۔ باجی راؤ اپنے سابق اقتدار کے باقی ماندہ لوازم کو اپنے سے جدا کرنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ اپنی اصلی حالت کو نہ وہ خود سمجھنا چاہتا تھا اور نہ دوسروں پر ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ بالطبع شکی اور بزدل واقع ہوا تھا لہذا اس کا بھی اس کے طرز عمل پر اثر پڑ رہا تھا۔ چونکہ سر جان میلکام ان سب باتوں سے واقف تھا اس لئے اس نے اندازہ کر لیا کہ اس کا صرف ایک ہی علاج ہے یعنی نہ تو اپنی طرف سے معاہدے کی خواہش ظاہر کی جائے اور نہ اپنی کسی حرکت سے اس بات کا شبہہ ہونے دیا جائے کہ پیشوا اپنی زبان پر قائم نہیں رہے گا۔ اگر پیشوا کو ہماری طرف سے کسی قسم کی غداری کا اندیشہ تھا تو وہ اس طرح رفع ہو سکتا تھا اور اگر خود اس کا ارادہ ہمیں دھوکا دینے کا تھا تو اسے ہماری بے اعتنائی کے بعد جو یقینی طور پر ہماری قوت کے احساس پر محمول کی جاتی اپنی تدبیروں پر عمل کرنے کی ہمت نہیں پڑ سکتی تھی۔ ان خیالات کی بناء پر سر جان میلکام نے راستے بھر باجی راؤ کو باتوں میں مشغول رکھا اور جب اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ انگریزی فوج کے پڑاؤ سے کچھ فاصلے پر قیام کرنا چاہیئے تو اسے بھی منظور کر لیا اور ہر موقع پر بہ حیثیت دوست کے اسے مشورہ دیتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے باجی راؤ کو بھی اس بات کا اطمینان دلا دیا کہ جب تک اسے کوئی خاص ضرورت محسوس نہ ہوگی وہ اس کے ساتھیوں کے معاملے میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گا۔ لیکن اس قسم کی ضرورت بہت جلد پیش آ گئی اور سر جان میلکام کی جن باتوں پر باجی راؤ نے اب تک توجہ نہیں کی تھی ان کی اہمیت کا اسے بخوبی اندازہ ہو گیا اور اس نے اپنے آپ کو پورے طور سے جنرل مذکور کے حوالے کر دیا اور اس کی حفاظت کا خواستگار بن گیا۔ (۵۲۶)

خاص اس کے خیمے میں عربوں کی بغاوت ہوئی۔ اس میں اس کی جان کا جو خطرہ تھا اور جس طور پر اسے وہاں سے نکالا گیا ان سب باتوں کی تفصیل مذکورۂ بالا ضمیمے میں درج ہے۔ یہاں صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ

اس واقعے کے بعد باجی راؤ نے سرجان میلکام کی ہر بات سے خواہ اس کا تعلق (۵۲۷)
اس کی نقل وحرکت سے تھا یا اس کے قیام سے پورا پورا اتفاق کیا اور اس کی تمام دیگر تجاویز بھی تسلیم کرلیں اس کے ساتھیوں کی تعداد تخفیف کے بعد چھ سات سو سوار اور صرف دو سو پیدل رہ گئی اور رفتہ رفتہ وہ اپنی اس حیثیت سے مطمئن بھی ہوگیا۔ درحقیقت واقعات بھی ایسے ہی تھے کہ اسے ضرور مطمئن ہو جانا چاہیئے تھا۔ اس کے لئے جو کچھ انتظام کیا گیا تھا وہ ہر لحاظ سے ایک فرمانروا کے شایان شان تھا اور سابق میں اس کا جو کچھ طرز عمل رہا تھا۔ اس کے بعد وہ اس قسم کے سلوک کی ہرگز توقع نہیں کرسکتا تھا لیکن ساتھ ہی جو لحاظ اس کا کیا گیا اس کا کوئی تعلق اس کے ذاتی کیرکٹر یا افعال سے نہ تھا اس انتظام سے پہلی غرض تو یہ تھی کہ اس لڑائی کا جس کی بدولت تمام ہندوستان میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی کسی نہ کسی طرح خاتمہ کیا جائے۔[۱]

۱۔ آنریبل ماؤنٹ سٹوارٹ الفنسٹن جو اس زمانے میں علاقہ پونہ کا کمشنر تھا اپنی تحریر مورخہ ۱۰ جون ۱۸۱۸ء میں لکھتا ہے " باجی راؤ کے معاملے میں آپ کو جو کامیابی حاصل ہوئی ہے اس پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں مبارک باد دینے کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ کی بدولت اس علاقے میں کامل امن قائم ہو جائیگا اور مجھے بندوبست کے اہم کام کی طرف توجہ کرنے کا موقع مل جائے گا۔

مجھے اس بات کا کامل یقین ہے کہ باجی راؤ پر آپ نے پورا قابو پالیا ہے اور اب وہ آپ کے ہاتھ سے نہیں نکل سکے گا۔ اس کے ساتھ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر آپ اس قدر عجلت و مستعدی نہ کرتے تو وہ کبھی اس سمجھوتے پر راضی نہ ہوتا۔ آٹھ لاکھ کا وظیفہ بھی نہایت مناسب ہے۔ ان تمام انتظامات پر میں آپ کو صدق دل سے مبارکباد دیتا ہوں اس سے بڑھ کر ہماری کیا خوش قسمتی ہوسکتی ہے کہ اس جنگ کا اس قدر جلد خاتمہ ہوگیا اس کی خاطر ہم نے جو ایثار کیا ہے وہ میرے نزدیک اس کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں"۔

سر تھامس منرو جو اسوقت پیشوا کے جنوبی علاقے میں (بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

دوسرے برطانوی قوم کے کیرکٹر اور اقتدار کا لحاظ تھا کیونکہ اس قسم کے موقعوں پر (۵۲۸،
وہ ہمیشہ انتہائی فیاضی سے کام لیتی رہی ہے مزید برآں ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ (۵۲۹)

(**بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ**) مقیم تھا اپنی تحریر مورخہ ۱۹ ماہ جون میں سر جان میلکام کو لکھتا ہے "موجودہ حالات میں باجے راؤ کے لئے آٹھ لاکھ سالانہ کی جو رقم طے پائی ہے وہ میرے نزدیک بہت کم ہے۔ اس کا اطاعت قبول کرنا ایک نہایت اہم واقعہ ہے اسکی بدولت امن قائم ہو جائے گا اور اس علاقے کے انتظام میں بہت سہولت ہو جائے گی۔ تمام سرکش اور بدظن لوگوں کے سردار اور ان کی اعانت کے چشمے کا خاتمہ ہو جائے گا"

سر ڈیوڈ اختر لونی پر بھی ان سب باتوں کا اثر ہوا اور اپنی تحریر مورخہ ۱۴ ر جون میں لفٹنٹ کرنل ایگنیو (Colonel Hegnew) کو لکھتا ہے" مجھے اس بات کی مسرت ہے کہ میلکام نے یہ معاملات طے کر کے ایک بھڑکتی ہوئی آگ بجھا دی جو اگرچہ بہت کچھ کم اور دھیمی پڑ گئی تھی تاہم اس میں ایک شعلہ باقی رہ گیا تھا جو اگر کسی وقت بھڑک اٹھتا تو ایک طوفان برپا کر دیتا۔ اس معاملہ میں ہماری کامیابی ایک معجزے سے کم نہیں ہے اس لئے مجھے خوف ہے کہ باجی راؤ کے اطاعت قبول کرنے کے واقعہ کی اہمیت اچھی طور سے نہیں سمجھی جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ اب ہم اس بات کا ٹھیک اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں کس قدر فوج رکھنی ہوگی اور اس کے لئے کس قدر مصارف درکار ہونگے۔ برخلاف اس کے اگر باجی راؤ اپنی اس گری ہوئی حالت میں بھی ملک میں چکر لگاتا رہتا تو میرے نزدیک بڑے سے بڑے معاملہ فہم لوگ بھی اس کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے"

حیدرآباد کا رزیڈنٹ مسٹر رسل (Mr. Russel) باجی راؤ کے اطاعت قبول کرنے پر سر جان میلکام کو مبارکباد دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ "پیشوا کے ساتھ آپ نے جو نیک سلوک کیا ہے اس میں میرے نزدیک فیاضی اور مصلحت دونوں شامل ہیں۔ اس سے جو بغض و عداوت تھی وہ سب اس کی مصیبت اور بے کسی کی حالت کے منظر سے رفع ہو جانی چاہیئے۔ یہاں کے لوگ دنیا کے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں لطف و کرم اور نیک سلوک سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں لہذا احسان کرنے کے ایسے معقول موقع کو ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیئے"

(بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

جو زبردست انقلاب واقع ہوگیا ہے اس سے ہر طبقے کو مانوس کرایا جائے اور اس بارے میں پیشوا کے پرانے ساتھیوں کے دل میں احسان مندی کا جذبہ پیدا کیا جائے کہ ہماری حکومت نے فتحمندی کے بعد اپنی شکایتیں فراموش کردیں اور ان کے معزول اور مصیبت زدہ فرمانروا کے معاملے میں ان کے تعصبات کا لحاظ رکھا۔

جہاں تک کہ اس فیاضی کا خود باجی راؤ سے تعلق تھا اس بات کی کبھی توقع نہیں ہوسکتی تھی کہ حکومت اسے معزول کرے اس کا وہ احسان مانے تاہم یہ خیال ضرور تھا کہ جو نیک سلوک اس کے ساتھ کیا گیا ہے اس سے وہ ضرور متاثر ہوگا اور جس قدر کوشش اس کی حالت سنبھالنے کی کی جائیگی اسی قدر اس کی طرف سے اندیشہ کم ہوگا اور وہ کسی انقلاب کا خطرہ مول لینے کی طرف راغب نہیں ہوگا لہذا اس کی طبیعت اور ذاتی خصوصیات کی وجہ سے اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا۔

باجی راؤ کے لئے جو سالانہ رقم منظور کی گئی تھی اگرچہ وہ ایک فرد کی بسر اوقات کے لئے بہت کافی تھی تاہم اعلیٰ مقاصد اور بلند حوصلوں کے خیال سے نہایت حقیر تھی اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ سازش اس کے خمیر میں پڑی ہے اور ہوس کی وجہ سے اس میں اس قدر جسارت بھی پیدا ہوجائے گی کہ وہ اپنی آزادی حاصل کرنے کے لئے ضرور کوشش کرے گا تو جس طریقے سے اور جن شرائط پر اس نے کمپنی کی اطاعت قبول کی تھی اس کے اسے اپنی اس کوشش میں بھی کسی قسم کی کامیابی کی توقع نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے از خود جلاوطنی اختیار کی تھی لہذا اس نے خود اپنے اس فعل سے اپنی رعایا کو وفاداری سے آزاد کردیا۔ اور اپنے پرانے ساتھیوں اور صادق دوستوں کو چھوڑ دیا جس کے بعد ان پر کوئی ذمہ داری نہ رہی اور وہ اپنے اپنے ذاتی اغراض کے لحاظ سے جدید تعلقات

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یہ ہیں خیالات اور جذبات ان اعلیٰ سیاسی عہدیداروں کے جو ملک کے ان تمام علاقوں میں جہاں باجے راؤ کے علم برقرار رہنے سے بدامنی اور شورش کا اندیشہ تھا امن وامان کے محافظ تھے۔

قائم کرنے کے لئے آزاد ہوگئے ۔ اسے عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے اور اس کے (۵۳۰) لئے ذرائع حاصل کرنے کی فکر تھی جس کی وجہ سے اس کی قوم کو اب اس سے وہ ہمدردی ہرگز نہیں ہو سکتی تھی جو اس کی معزولی کے بعد اس کی مصیبت کی وجہ سے تھی ۔ ان سب باتوں کو سر جان میلکام نے اپنے ایک مراسلے میں جو اس نے اپنی حکومت کو روانہ کیا تھا ایک جملے میں ادا کر دیا ہے ۔ باجی راؤ نے جب ایک مرتبہ کمان کھول کر ڈال دی تو وہ اسے دوبارہ نہ موڑ سکا"

باجی راؤ کے روبرو جو شرائط پیش کئے گئے تھے وہ گورنر جنرل کے نزدیک بہت زیادہ فیاضانہ تھے اور پیشوا کی طرف سے پیغام صلح موصول ہونے کے بعد سر جان میلکام نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا اس سے بھی وہ متفق نہیں تھا لیکن ایسی حالت میں جب کہ سر جان کسی قسم کے احکام موصول ہونے سے قبل ہی اپنی ذمہ داری پر ایک کام انجام دے چکا تھا تو اس نے اس کی توثیق میں قطعی تاخیر نہ کی ۔

گورنر جنرل نے مجلس راز دار کو جو مراسلہ[1] تحریر کیا اس میں وہ سر جان میلکام کی جملہ کارروائی سے اختلاف کرتا ہے اور اپنے دلائل پیش کرتا ہے ۔ سر جان میلکام نے اول باجی راؤ سے مراسلت کی ۔ دوسرے کمپنی کے عہدہ دار کو اس کی قیام گاہ پر روانہ کیا اور اس کے بعد اس کے لئے ایک کثیر رقم کا وظیفہ مقرر کر دیا ۔ گورنر جنرل کو ان میں سے کسی ایک بات سے بھی اتفاق نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ سر جان میلکام کے دلائل بھی تحریر کرتا ہے جو اس نے اپنی تجاویز کی تائید میں پیش کئے تھے اور آخر میں ان انتظامات کی خوبی کا اعتراف کرتا ہے ۔ (۵۳۱)

"باجی راؤ کے اطاعت قبول کرنے کی جو اہمیت ہے اس کا مجھے احساس ہے ۔ اس سے جو فائدہ حاصل ہوا ہے اس کا بھی میں اعتراف کر چکا ہوں ۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ سر جان میلکام نے اس معاملے میں جس قابلیت اور مستعدی

[1] مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۲۲ء

کا اظہار کیا اس کا مجھے بلا تامل اعتراف کرنا چاہیئے تھا۔ باجی راؤ کو اطاعت قبول کئے ہوئے چار سال گزر چکے ہیں اور مجھے سر جان میلکام کی پیش کردہ تلطف آمیز شرائط سے جن جن باتوں کا اندیشہ تھا ان میں سے ایک بھی اس مدت میں پیش نہیں آئی۔ البتہ ایک کثیر رقم اس پر ضرور خرچ ہو رہی ہے اگر اسے مغلوب کرنے کی کوشش کی جاتی تو اس کے مصارف اس سے کہیں کم ہوتے بہر حال تمام حالات پر غور کرنے کے بعد مجھے کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جس کی بنا پر میں یہ تسلیم کر سکوں کہ میری پہلی رائے جو مذکورہ بالا واقعات پر مبنی تھی اب غلط نکلی"۔

مجلس نظما نے اس معاملے کی تمام بحث پر غور کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار مندرجۂ ذیل الفاظ میں کیا:۔

باجی راؤ کے اطاعت قبول کرنے کی اہم خبر معلوم کرکے ہمیں اطمینان کلی حاصل ہوا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی بدولت ایک شاندار اور کامیاب جنگ کا نہایت خوش اسلوبی سے خاتمہ ہو گیا اور اب پورے ہندوستان میں امن قائم کرنے میں سہولت ہوگی۔ یہ بات کسی اور طریقے سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا ہمیں اس سے بہت مسرت ہے۔

باجی راؤ کی اطاعت کے معاملے میں آپ نے جو کچھ مراسلت صیغۂ راز میں کی ہے اس کے مطالعہ سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس معاملے کی تکمیل (۵۳۲)
کے لئے جو تدبیریں اختیار کی گئیں تھیں ان کی بابت آپ لوگوں میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ اس اختلاف کا فوجی انتظامات سے کچھ تعلق نہیں ہے جو ہر لحاظ سے قابل تحسین تھے۔ اور نہ اس کا کوئی تعلق سر جان میلکام کی نمایاں خدمات سے ہے۔ جن میں اس نے اپنے قومی جوش اور سرکاری مفاد کا لحاظ خاص طور سے ظاہر کیا ہے اور انتہائی ہوشیاری اور غیر معمولی محنت و مستعدی سے کام کیا ہے۔ صرف دو باتیں زیر بحث معلوم ہوتی ہیں کہ جن حالات میں سر جان میلکام نے یہ کام انجام دیا ان کا لحاظ کرتے ہوئے وہ اس قدر وسیع اختیارات کے استعمال کرنے کا مجاز تھا یا نہیں اور آیا ان

اختیارات کا اس نے دانشمندانہ طریقے سے استعمال کیا یا نہیں ان دونوں باتوں کے متعلق گورنر جنرل اور پولٹیکل ایجنٹ نے ایک دوسرے کے خلاف رائے کا اظہار کیا ہے۔

جب مئی ۱۸۱۸ء میں سر جان میلکام کو پھو ہیں باجی راؤ کی طرف سے پیغام صلح موصول ہوا تو اس کے پاس اس بارے میں بجز ایک خط کی نقل کے جو گورنر جنرل نے ۱۵ ؍ دسمبر ۱۸۱۸ء میں مسٹر الفنسٹن کو تحریر کیا تھا اور جس کی نقلیں مختلف مقامات پر کمپنی کے نمائندوں کے پاس بھیجدی گئی تھیں کوئی ہدایت نہ تھی۔ اگرچہ اس تحریر میں یہ بات درج تھی کہ باجی راؤ سے اب کسی قسم کی گفت و شنید نہیں کی جاسکتی تاہم جن حالات میں سر جان میلکام نے کام انجام دیا ان کا لحاظ کرتے ہوئے ہم اسے حق بجانب تصور کرتے ہیں اور اس کی تمام کارروائی کو منظور کرتے ہیں۔

اس بات کا ضرور اندیشہ تھا کہ باجی راؤ کے ذاتی مصارف کے علاوہ جو روپیہ اسے دیا جائے گا وہ سازشوں میں صرف ہوگا اور اس نقطۂ نظر سے آٹھ لاکھ سالانہ جیسی کثیر رقم کی منظوری خلاف مصلحت تھی۔ علاوہ ازیں یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بغیر کسی شرط کے بھی اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا اور اس صورت میں ہمیں اپنی طرف سے کسی قسم کی شرط پیش کرنے کی ضرورت نہ ہوتی لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ باجی راؤ کے بچ کر نکل جانے کا بھی امکان موجود تھا اور اگر وہ اسیر گڈھ کے قلعہ میں داخل ہو جاتا تو ایک عرصۂ دراز تک ہمیں وہ بات حاصل نہ ہوسکتی جو اس کے اس قدر جلد اطاعت قبول کرنے سے حاصل ہوگئی۔ اس نقطۂ نظر سے معاملات پر غور کرنے کے بعد ہمیں یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ سر جان میلکام کی پیش کردہ شرائط مناسب تھیں"۔ (۵۳۳)

اپاّ صاحب کی معزولی کے بعد ناگپور کے حالات

اس زمانے میں ناگپور کی حالت نہایت ابتر تھی۔ اپاّ صاحب کی معزولی کے بعد رگھوجی بھونسلا کے

پوتے کو گدی نشین کرا دیا گیا۔ اس کے بعد گورنر جنرل کی یہ خواہش رہی کہ کسی طرح ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں اس حکومت کی وقعت قائم ہو جائے لیکن سابق دور میں حکومت کی ہر ایک کل خراب ہو چکی تھی اور موجودہ حکومت میں کوئی ہندوستانی اس پایہ کا موجود نہ تھا جس پر وہاں کی رعایا کو اعتبار ہو سکے لہٰذا ان حالات سے مجبور ہو کر گورنر جنرل نے رزیڈنٹ کی اس رائے سے اتفاق کر لیا کہ ناگپور کے پورے علاقے کا انتظام انگریزی حکومت کچھ عرصہ کے لئے اپنے ہاتھ میں لے لے۔ جن وجوہ کی بنا (۵۳۴) پر گورنر جنرل موصوف نے اس رائے سے اتفاق کیا اور اس سلسلے میں جو تدبیریں اس نے اختیار کیں انھیں سمجھنے کے لئے اسی کے الفاظ کا پیش کر دینا زیادہ مناسب ہے۔ چونکہ ہم اس بات کا اعلان کر چکے ہیں کہ ہم رفتہ رفتہ حکومت کے معاملات اور اس کے اختیارات کے استعمال میں مداخلت کرنا ترک کر دیں گے لہٰذا اس پر قائم رہنے کے خیال سے میں نے مسٹر جنکنس کو بہ نظر احتیاط ہدایت کی کہ وہ وہاں کے قدیم دستور اور مسلمہ اصول حکومت سے زیادہ انحراف نہ کرے کیونکہ میرے نزدیک اگر ان قدیم اصولوں پر ٹھیک طور سے عمل کیا جائے تو حکومت کے روزمرہ کاموں میں پابندی اور باضابطگی پیدا ہو سکتی ہے اور ریاست کی وقعت بھی قائم ہو سکتی ہے۔ میری یہ خواہش تھی کہ سابق دور میں جو خرابی و بدنظمی وہاں پیدا ہو گئی ہے اسے وہ محسوس کرے اور اس کی اصلاح کرنا اپنا فرض سمجھے اور رگھوجی بھونسلا اور اس کے جانشین کے زمانے میں حکومت کے جن شعبوں میں انکی غلطیوں اور بدعنوانیوں سے خرابی پیدا ہو گئی ہے ان کی حالت سنبھالے اور انکی تنظیم کرے لیکن اس سے میرا یہ منشا نہ تھا کہ مسٹر جنکنس اپنے اس نیک اور قابل تحسین کام میں اس بات کی کوشش کرے کہ وہاں کی حکومت ہر لحاظ سے مکمل ہو جائے کیونکہ یہ بات تو عملی طور پر اسی جگہ حاصل ہو سکتی ہے جہاں مستقل طور سے برطانوی حکومت قائم کی جائے۔ چونکہ ہمارا مصمم ارادہ یہ تھا کہ سابق واقعات کی وجہ سے وہاں جو شورش اور بے چینی پھیل گئی ہے اس کے

رفع ہونے کے بعد ہم وہاں دیسی حکومت قائم کریں اور تمام انتظامی معاملات
اسی کے تفویض کر دیں صرف اس بات کا انتظار تھا کہ جدید حکومت میں اس قدر (۵
قوت و استحکام پیدا ہو جائے کہ وہ بغیر ہماری اعانت کے اپنا سب کام خود انجام
دے سکے لہٰذا ایسی صورت میں یہ بات انصاف و دانشمندی کے خلاف
ہوتی کہ ہم وہاں ایک ایسی حکومت قائم کر دیں جو برطانوی نمائندوں کی دیانت
قابلیت اور محنت و مستعدی کے بل پر قائم ہو اور ان کے ہٹنے کے بعد وہ خاطر خواہ
طریقے پر نہ چل سکے اور اس طرح نہ وہاں کی رعایا کو کچھ فائدہ پہنچے اور
نہ فرمانروا کو۔

ان خیالات کی بنا پر میری رائے یہ تھی کہ جہاں تک کہ وہاں کی
سیول حکومت کا تعلق ہے اس کا سابق دستور اور حتی الوسع اس کے ہر شعبے کی
نوعیت حسب سابق برقرار رکھی جائے اور دوبارہ قائم کی جائے۔ مالگذاری
وصول کرنے میں جو غبن ہوتا ہے اس کا تدارک کیا جائے۔ خرابیوں کی اصلاح
کی جائے اور ملزموں کو سزا دی جائے حکومت کے ہر شعبے میں تنظیم و باضابطگی
پیدا کی جائے اور کفایت کا خیال رکھا جائے۔ اور قدیم رسم و رواج اور ریاست
کے قوانین کی بنا پر ایک سیدھی سادی مگر معقول حکومت قائم کر دی جائے
تاکہ جب راجہ برسر حکومت آئے تو وہ ہماری حفاظت میں رہ کر اسے کامیابی اور
خوش اسلوبی سے چلا سکے برطانوی حکومت نے غیر معمولی حالات سے مجبور ہو کر
حکومت کا جو سب کام راست اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اس سے دست بردار (۵۲
دینے کے بعد بھی ہمیں معاہدے کی رو سے صلاح و مشورہ اور مدد دینے کا
اختیار حاصل رہے گا اور مجھے امید ہے کہ ہم بروقت ضرورت مناسب
طریقے سے مداخلت کر کے بد انتظامی روک سکیں گے اور وہاں کے ہندوستانی
عہدے داروں کی توجہ حکومت کے صحیح اصولوں کی طرف مبذول کرا سکینگے۔"

سنہ ۱۸۱۹ء میں نواب وزیر اودھ نے شہنشاہ دہلی کی اطاعت سے
انحراف کیا اور وزیر کے لقب کو جو قدیم زمانے سے اس کے خاندان والوں
کے لئے مخصوص تھا ترک کر کے بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا۔ اگرچہ دہلی کی شہنشاہی

اور اودھ کی زبردستی محض برائے نام رہ گئی تھی تاہم ہندوستانیوں کو اس کی اس حرکت پر سخت تعجب ہوا۔ لارڈ ہیسٹینگز اپنے مراسلے میں مجلس نظماء کو لکھتا ہے کہ "انگریزوں کے اودھ سے جو تعلقات قائم ہیں ان میں نواب وزیر کے اس فعل سے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی اور ایک لحاظ سے اس کا یہ فعل کمپنی کے لئے مفید ثابت ہوگا کیونکہ اس کی بدولت مسلمانوں میں ایک قسم کی تفریق پیدا ہو جائے گی اور ان لوگوں کے مذہبی جوش اور اتحاد سے ہمیں جو خطرہ لگا رہتا ہے اس سے ایک حد تک ہمیں امن مل جائے گا۔" اس مراسلے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شاہی خاندان کے جس نوعمر شہزادے کی تخت نشینی کا امکان تھا وہ انگریزوں کے مفاد کے خلاف سمجھا جاتا تھا لہٰذا اس بنا پر بھی اودھ کی دلی سے آزادی کمپنی کے لئے مفید تھی تاکہ دلی کے تاجدار کی اعانت کے لئے جو اتحاد قائم ہوا ہے اس میں اودھ شریک نہ ہو سکے۔ چونکہ لارڈ ہیسٹینگز نے اس معاملے کی نہایت پر زور الفاظ میں تائید کی تھی لہٰذا احکام بالا نے بھی اسے منظور کر لیا لیکن ان کا غالباً خیال یہ تھا کہ اس (۵۳۷) کا کوئی خاص اثر نہیں ہوگا۔ ہندوستان میں جو کام بھی کیا جائے اس کے مفید یا مضر ہونے کا کوئی خاص اندازہ نہیں ہو سکتا تاہم یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ قدیم حکومتوں اور اداروں میں جو تبدیلی ہم یہاں کرتے ہیں اس کا ضرور اثر ہوتا ہے۔ اس معاملے میں نواب وزیر اودھ سے جو حرکت سرزد ہوئی تھی اس کی وجہ سے شہنشاہ دہلی اور نواب مذکور کے خاندانی تعلقات میں فرق آنا ضروری تھا اور اس لحاظ سے گورنر جنرل کے خیال کے مطابق کمپنی کو فائدہ پہنچنے کا امکان تھا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ممکن تھا کہ خود شہنشاہ نیز اس کے عزیز و اقارب اور ساتھی اور دیگر تمام مسلمان جن کے دلوں میں اب تک تیموریہ خاندان کی عزت باقی تھی اس قسم کی باتوں سے مشتعل ہو کر خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں۔

اکثر لوگ اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ مسلمان فرمانرواؤں اور سرداروں کے دلوں میں اپنے سابق ممتاز بادشاہوں کی جو یادا ور

وقعت قائم ہے اس کے خطرات سے محفوظ رہنے کا ایک یہی ذریعہ ہے کہ جس طرح گذشتہ نصف صدی سے وہ غیر مضرت رساں رہی ہے اسی طرح اسے دباکر رکھا جائے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ کمپنی نے دیوانی یا بنگال و بہار واوڑیسہ کے علاقوں کی حکومت حاصل کرنے کے بعد سے آجتک جو ترقی کی ہے وہ ہر نقطۂ نظر سے ہندوستانیوں کے خیالات واحساسات وتعصبات کے مطابق رہی ہے۔ ہم نے شاہی خاندان کے ساتھ جو نیک سلوک کیا ہے اس کی وجہ سے ہماری وقعت بڑھ گئی ہے۔ مرہٹوں نے اپنے اثر کے زمانے میں شاہی خاندان والوں کو جس حالت میں رکھا تھا اس سے اب وہ کہیں بہتر حالت میں ہیں لیکن اب امکان اس بات کا ہے کہ ہم نے نواب وزیر اودھ کو شہنشاہ کے حلقۂ اطاعت سے علٰحدہ ہونے میں (اگرچہ وہ اطاعت محض برائے نام تھی) جو مدد دی ہے اسے[1] کی وجہ سے ان لوگوں کے خیالات میں تبدیلی واقع ہوگی اور وہ محض برطانوی حکومت کے احسانات ہی کو فراموش

[1] نواب سکندر جاہ بہادر نظام دکن کی بھی حیثیت نواب وزیر کی سی تھی اور دہلی کے نام نہاد شہنشاہ کے وہ برائے نام ماتحت تھے۔ اگر وہ بھی کسی بڑے لقب کی خواہش ظاہر کرتے تو برطانوی حکومت بلاشبہ انھیں بھی اسی طرح مدد دیتی لیکن انھوں نے سب سے پہلے نواب وزیر کی اس حرکت کی مذمت کی اور اپنی رائے کا اظہار کیا کہ اس کے اس فعل سے مسلمانوں کے جذبات کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ جب ٹیپو سلطان نے غرور میں آکر سلطان کا لقب اختیار کیا تھا اور اپنے نام کے سکے جاری کئے تھے تو دربار حیدرآباد نے اس وقت اس کے فعل پر بھی اظہار نفرت کیا تھا لہٰذا اس موقع پر بھی ان سے اسی قسم کی توقع کی جاتی تھی۔ حیدرآباد کے سپہ سالار میر عالم نے (جو بعد میں وہاں کا صدر المہام ہوا) ۱۷۹۹ء میں سرنگاپٹم کی تسخیر کے دو روز بعد فوج کے تمام مسلمان سردار اور سپاہیوں کو جمع کیا اور ایک جلوس کے ساتھ مفتوحہ دار الحکومت کی جامع مسجد میں پہنچا اور شاہ عالم کے نام کا خطبہ پڑھا۔ میر عالم نے اپنے اس ارادے کی برطانوی ایجنٹ سرجان میلکام کو اطلاع کرتے وقت (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

نہ کریں گے بلکہ ان کے احساسات کی نوعیت بھی بدل جائے گی اور اگر اس خاندان کے کسی شخص نے ہماری قوت کے خلاف کوئی جد وجہد کی جس کا بہت کم امکان نظر آتا ہے تو اس کی بدولت اسے بدظن طبقوں میں بہت ساتھی مل جائیں گے۔"

اگرچہ شہنشاہ کے نام نہاد وزیر اور انگریزوں کے حقیقی زبردست کو بادشاہ کا لقب اور اس کے لوازم اختیار کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی تاہم شاہی خاندان اور کمپنی کے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا اور انگریزوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد سے اس کا جو لحاظ و احترام کیا جاتا تھا اسے لارڈ ہیسٹنگز نے بھی جاری رکھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یہ تحریر کیا تھا کہ ٹیپو سلطان نے شہنشاہ دہلی کی باقی ماندہ وقعت کو جو نظر انداز کیا تھا اس کا میں اس وقت جواب دینا اور یہ بات جتلانا چاہتا ہوں کہ جس خاندان نے مسلمانوں کا نام دنیا میں روشن کیا ہے اس کی وقعت ہمارے دلوں میں اب بھی باقی ہے۔

یہ واقعہ ہماری اس حکمت عملی کے موافق تھا۔ جس کا مقصد اس قسم کے تمام تعلقات در وابط میں فرق ڈالنا اور تباہ کرنا ہے جو کسی وقت ہمارے خلاف متحد ہو سکیں لیکن شہنشاہ دہلی کی عزت و توقیر سے مسلمان فرمانرواؤں کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہو سکتا کہ وہ اسے دوبارہ برسر حکومت کرانے کے لئے کوئی متحدہ کوشش کریں کیونکہ شہنشاہ کا حقیقی اقتدار اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب کہ وہ ان تمام علاقوں کو دوبارہ حاصل کر لے جو ان لوگوں نے اس کے آباؤ اجداد کی کمزوری کے زمانے میں غصب کر لئے تھے لہذا اس کا بہت کم امکان نظر آتا ہے اور اگر کسی وقت اس خاندان کے کسی نمائندے کو آلہ بنانے کی کوشش کی گئی تو وہ کسی ایک کے فرد کی ہو گی نہ کہ کسی خاص اتحاد کی طرف سے اور ایسی صورت میں ہماری زبردست حکومت اور اس کی مسلمہ فوقیت پر جو حملہ کیا جائے گا اس میں کامیابی کی کوئی توقع نہیں ہو گی بلکہ حملہ آور خود ایک مصیبت میں پھنس جائیگا۔ تمام دنیا اور خصوصاً ایشیائی قوموں کی تاریخ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ جدید تعلقات اور نئے نئے القاب و خطابات سے جو بلند حوصلے قائم ہوتے ہیں اور تکبر کے ساتھ جد وجہد کرنے کا جو خیال پیدا ہوتا ہے (بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

جو لوگ ان تعلقات کی نوعیت اور فریقین کی حقیقی حالت سے واقف
ہیں ان کے لئے اس سے بڑھکر کوئی مضحکہ خیز اور خلاف عقل بات نہیں معلوم (۵۴۰)
ہو سکتی کہ انگریزی حکومت جسے ہندوستان میں اعلیٰ اقتدار حاصل ہے شہنشاہ
دہلی کے نام کا سکہ ڈھالے اور اس پر اپنے آپ کو اس بادشاہ کا خادم لکھے جو
اپنی روزی کے لئے اس کی فیاضی کا محتاج ہے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئیے کہ
برطانوی مشرقی سلطنت کے بانی نے اپنے سب سے پہلے اور قابل قدر علاقے
پر اپنا قبضہ اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جب تک کہ اس نے اس شہنشاہ سے
فرمان حاصل نہیں کر لیا حالانکہ شہنشاہ موصوف کو اس وقت بھی اپنے جانشینوں
سے زیادہ قوت حاصل نہ تھی۔ جو لوگ استدلال کے خوگر ہیں وہ اس فعل کو
اپنے تعصبات کے ایثار اور ایک نام نہاد قوت کی پرستش پر محمول کریں گے
لیکن حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لارڈ کلائیو نے جو ایثار کیا اور ایک نام نہاد
قوت کی جو پرستش کی وہ اس زمانے میں لاکھوں آدمیوں کے خیالات و
احساسات کے مطابق تھی۔ ہم پہلے سے زیادہ صاحب اقتدار ہیں اور شہنشاہ
دہلی پہلے سے بھی زیادہ کمزور و بے بس ہے لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی
کہ اس کمزور بادشاہ سے ہمارے جو برائے نام تعلقات قائم ہیں ان میں
فرق پیدا کر دیا جائے۔ تیموری خاندان کے بے کس جانشینوں سے ہمارے
جو تعلقات قائم ہیں اور ان میں جو غیر موزونیت دکھائی دیتی ہے وہ سیاسی
جماعتوں کے تعلقات میں عام طور پر پائی جاتی ہے اور ہندوستان میں تو
قدیم زمانے سے اس کا رواج چلا آتا ہے۔ اس قسم کی باتیں عادات و خصائل
احساسات اور جذبات اور بعض اوقات محض توہمات سے پیدا ہوتی ہیں اور
دانشمند مدبر کی غایت معلوم کر کے ہمیشہ ان کا مناسب احترام و لحاظ کرتے ہیں (۵۴۱)
لارڈ ہیسٹنگز نے ہندوستان پہنچنے کے تھوڑے ہی زمانے کے بعد اپنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وہ ہمیشہ احسان مندی و ہمدردی کے ان جذبات سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے جو ایک مفلس اور مصیبت زدہ خاندان کی سابق عظمت کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔

پیشرو کے اصول کے مطابق نواب سعادت علیخاں وزیر اودھ سے مراسلت شروع کردی تھی لیکن وزیر مذکور نے حسب سابق اپنے اندرونی معاملات میں اہم تبدیلی کرنے کی سختی سے مخالفت کی اوراُن کے اصرار کی وجہ سے لارڈ ہیسٹنگز بھی اس پر دباؤ ڈال کر اپنے تجاویز کی تکمیل نہ کراسکا۔ سعادت علی خاں کے انتقال[1] کے بعد خیال ہوا کہ اس کا جانشین گورنر جنرل کی خواہش کے مطابق اس کے تجاویز پر عمل کرنے کیلئے بہ آسانی آمادہ ہوجائے گا۔ نظماء کو بھی اس قسم کی تبدیلی کی توقع تھی لہٰذا انھوں نے لارڈ ہیسٹنگز کی کارروائی سے اتفاق کرتے ہوئے تحریر[2] کیا۔

"ہم اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مسئلے کو دوبارہ اٹھانے کے بعد اگر آپ نواب وزیر کو اپنے تجاویز کے موافق پائیں تب بھی اس کی حکومت اور اس کے سلطنت کے دستور میں تبدیلی کرتے وقت آپ اس بات کا خیال رکھیں کہ جو جدید تنظیم کی جائے اس میں وہاں کے قدیم اداروں اور عام رسم و رواج کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے"۔

نواب وزیر نے مجوزہ انتظام کو چند ترمیموں کے ساتھ منظور کرنے پر آمادگی ظاہر کی لیکن آخر میں اپنی رائے بدل دی اور اس قدر سختی سے اسکی مخالفت کی کہ بالآخر اصلاح کا ارادہ ترک کردیا گیا اور نواب کو منانے کی ہر ممکنہ (۵۴۲)
کوشش کی گئی۔ چونکہ نیپالیوں کے خلاف جنگ میں وہ کمپنی کی مالی امداد کرچکا تھا اس لحاظ سے گورنر جنرل نے اسکے ساتھ جو لطف آمیز سلوک کیا اس کا وہ مستحق بھی تھا۔

لارڈ ہیسٹنگز نے حکومت اودھ سے اس بارے میں جو مراسلت کئی موقعوں پر کی تھی اس کی پوری کیفیت وصول ہونے کے بعد مجلس نظماء نے لکھا کہ "سیاسی امور کی بابت آپ کا خط مورخہ ۱۶ر دسمبر ۱۸۲۰ء وصول ہوا

---

[1] ۔ سعادت علی نے ۱۱ر جولائی ۱۸۱۴ء کو انتقال کیا۔ اس کا بڑا بیٹا غازی الدین خاں رفیع الدولہ اس کا جانشین ہوا۔

[2] ۔ بحوالہ مراسلہ مورخہ ۲۲ر مارچ ۱۸۱۶ء بنام حکومت بنگال۔

اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب کی ناخوشی کی وجہ سے اس کی حکومت میں مداخلت کرنے کا خیال جب سے ترک کیا گیا ہے وہاں کی حالت کسی قدر سنبھل گئی ہے۔ جن اسباب کی وجہ سے اکثر جگہ مداخلت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمارے نزدیک لکھنؤ کے معاملے میں موجود نہیں ہیں۔ اپنے زرتی مطالبات کے وصول کرنے کے لئے اس کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی بہرحال ہمارے اداروں کی کچھ بھی خوبیاں کیوں نہ ہوں ہمیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم اپنے ہمسایوں کو ان کے اختیار کرنے پر مجبور کریں یا اس کے لئے ان پر بے جا اصرار کریں۔"

بڑودہ کے معاملات

حکومت پونہ کے خاتمے کے بعد دربار بڑودہ سے جو معاہدہ کیا گیا تھا وہ اس اصول پر مبنی تھا کہ وہاں کے فرمانروا استیاجی کو جو اختیارات دیئے جائیں ان میں ایسے تمام معاہدوں کا لحاظ رکھا جائے جو انگریزوں نے اس کے دوسرے خاندان والوں باجگذاروں اور سلطنت کے قرض خواہوں سے کئے تھے کیونکہ برطانوی حکومت ان سب کی ضامن تھی۔

(۵۴۳) ریاست مذکور کے معاملات میں کمپنی اس قدر جو پھنسی ہوئی تھی اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ یہاں کے سابق فرمانروا کی دماغی حالت اچھی نہیں تھی اور حکومت کا کام ایک مجلس کے سپرد تھا جس میں برطانوی رزیڈنٹ بھی شامل تھا۔ اس تمنائی ریاست کی بہتری اور امن کی خاطر برطانوی رزیڈنٹ کا اس مجلس میں شریک رہ کر کام انجام دینا نہایت ضروری تھا اور اس کی وجہ سے کمپنی کو اپنے اوپر مختلف قسم کی ذمہ داریاں لینی پڑی تھیں لیکن اب ایسی صورت میں جب کہ کمپنی یہ چاہتی ہے کہ وہاں کے موجودہ فرمانروا کو تمام اختیارات دیدیئے جائیں اور جس حد تک ہماری نیک نامی اجازت دے اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کم کی جائے تو ہر قدم پر مشکلات پیش آتی ہیں۔ بہرحال ان اصولوں کو پیش نظر رکھ کر اس مسئلہ پر بحث کی گئی اور آپس میں ایک قسم کا سمجھوتا ہو گیا۔ باجگذاروں سے خراج وصول کرنے کا کام برطانوی

حکومت کے تفویض کیا گیا اور اس طور سے گیکواڑ کے خاندان والوں کے وظائف اور ریاست کے کثیر قرض کی ادائی کا معقول انتظام ہو گیا۔ اس کے بعد رزیڈنٹ کی توجہ ان تمام انتظامات کی تکمیل کی طرف مبذول کر دی گئی اور اُسے ہدایت کی گئی کہ جب تک امن و امان میں خلل واقع ہونے یا ہمارے معاہدوں میں فرق آنے کا اندیشہ نہ ہو اس وقت تک وہاں کے کسی معاملے سے کچھ سروکار نہ رکھا جائے۔

میسور کے معاملات

میسور[1] کی ہندو حکومت کے قیام کا حال کسی پچھلے باب میں بیان ہو چکا ہے۔ حکومت ہند کا کوئی سیاسی کام بہ لحاظ نتائج اس قدر مفید و خوشگوار نہیں رہا ہے۔ اس کے جو (۵۴۴) خاص اسباب تھے وہ بھی تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکے ہیں منجملہ ان کے ایک خاص سبب اس کامیابی کا یہ تھا کہ ہندوستانیوں کا اعلیٰ اور معزز طبقہ (جو کمپنی کی حکومت میں اگر بالکل تباہ نہیں ہوتا تو کم از کم بدظن اور سرکش ضرور ہو جاتا ہے) اس کی ملازمت اور روزی کا اس تحتانی ریاست میں معقول انتظام کر دیا گیا تھا اس قسم کے طبقوں میں سب سے زیادہ اہمیت فوجی طبقے کو حاصل ہے کیونکہ امن کا برقرار رکھنا یا اس میں خلل پیدا کرنا انہی لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

چونکہ اس قسم کے انقلابات کے بعد آبادی کا فوجی طبقہ یک لخت بیکار و بے روزگار ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اندرونی انتظامات میں ہر قسم کی دقتیں پیدا ہو جاتی ہیں لہذا حکومت میسور کے قیام کے بعد سے اسکے قابل وزیر پورنیا نے اپنے علاقے کو اس قسم کے خطرات سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی۔ باقاعدہ پیدل فوج کے چند دستوں کے علاوہ اس نے مقامی فوج کی ایک کثیر تعداد بحال رکھی اور بے قاعدہ سواروں کی ایک زبردست اور کثیر التعداد جماعت قائم کی جس میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان

[1] بحوالہ صفحہ (۱۴۲)

کے زمانے کے بہترین سوار جنھوں نے اپنے زمانے کے ممتاز افسروں کے ماتحتی میں کام کیا تھا شامل تھے۔ یہ تدبیر انسانی فطرت اور ہندوستانیوں کے عادات و خصائل اور مخصوص احساسات کے علم پر مبنی تھی لہٰذا اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ ریاست کے اندر کسی قسم کی بدامنی واقع نہیں ہوئی اور راجہ کی فوجیں اور خصوصاً اس کی سوار فوج بہت مفید اور کارگزار ثابت ہوئی۔

مذکورہ حالات اور حکومت میسور کے جائز حق کی بنا پر جو اس نے (۵۴۵)
برطانیہ کی عنایت حاصل کرنے کے لئے قائم کر لیا تھا سر جارج بارلو نے بہ حیثیت گورنر جنرل کے عہد نامۂ میسور کی دفعہ (۳/۲) (میں جس) کی رو سے برطانوی حکومت کو جنگ کی صورت میں راجہ سے مالی امداد حاصل کرنے کے غیر محدود اختیارات حاصل تھے ترمیم کر دی۔ عہد نامے میں اس دفعہ کی کوئی تشریح درج نہیں تھی جس کی وجہ سے ماتحت حکومت کو ہمیشہ خوف لگا رہتا تھا لہٰذا اس کے عوض میں طے پایا کہ چار ہزار سوار فوج کا ایک دستہ تیار کیا جائے جس پر کمپنی کو ہر حالت میں پورا حق حاصل ہوگا البتہ جب کبھی اس سے ریاست میسور سے باہر کسی جگہ کام لیا جائے گا تو کمپنی اس کا زائد معاوضہ ادا کرے گی (لیکن یہ معاوضہ نہایت قلیل تھا)

اس انتظام میں بھی وہی اصول پیش نظر تھے جن کی بنا پر ابتدا میں تعلقات قائم ہوئے تھے۔ اس کی بدولت ایک غیر محدود و غیر مشروط چیز قطعی طور پر طے پا گئی اور جس معاملے کا انحصار پہلے مصلحت وقت یا حکمت عملی پر تھا اسے اب عہد نامے کا ایک جز قرار دے دیا گیا۔ اس اتحاد سے جو فوائد پیش نظر تھے وہ سب حاصل اور مستحکم ہو گئے۔ کیونکہ راجہ کو بہ حیثیت حلیف کے جو قوت حاصل تھی اور کمپنی اس سے جو استفادہ حاصل کرتی تھی اس میں کمی کرنے کا اب اسے اختیار نہیں رہا۔

اس فوج کے جس طبقے کی روزی کا مستقل انتظام کیا گیا اس کا لحاظ رکھ کر جو قواعد اس کے لئے بنائے گئے وہ وہاں کی حکومت کی نوعیت کے مطابق

تھے۔ اس سوار فوج کے تمام افسر ریاست مذکور کے امرا میں سے لئے جاتے تھے
اور برطانوی فوجوں کے ساتھ ان کا رویہ درست رہنے کی صورت میں وہ کمپنی کی (۵۴۶)
اعانت و حفاظت کے مستحق بن جاتے تھے۔[1] لیکن راجہ کو انھیں ترقی دینے یا معزول

۱؎ میسور میں جو سوار فوج رکھی گئی ہے اس کی وجہ سے وہاں کی حکومت کی وقعت اور اس کے استغناء میں اضافہ ہو گیا ہے جس کی بدولت اس کا وجود بہ حیثیت ماتحت کے عرصۂ دراز تک قائم رہ سکتا ہے۔ اگر باقاعدہ سوار یا پیدل فوج قائم کی گئی تو اس کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ ایک حکومت کی ساخت کے لحاظ سے موزوں اور دوسری غیر موزوں ہے۔ باقاعدہ فوج ایک باقاعدہ سلطنت ہی میں قائم ہو سکتی ہے اس کی تنخواہ پابندی سے ادا ہونی چاہیئے۔ محض امن کے زمانے ہی میں اس کے لئے معقول انتظام نہ کیا جائے بلکہ دوران جنگ میں جو خطرات ان کے لئے درپیش رہتے ہیں ان کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ بغیر اس کے کوئی فوج کسی انتظام یا قاعدے کی سختی برداشت نہیں کر سکتی اور بغیر تنظیم کے کوئی فوج کارآمد نہیں ہو سکتی لہذا اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی خاص فرمانروا کی مستعدی کی وجہ سے اس قسم کی فوج کچھ عرصہ کے لئے وہاں قائم ہو جاتی ہے لیکن اس کے اصول وہاں کی تنظیم کے اس قدر خلاف ہوتے ہیں کہ وہ سلطنت کا جزء نہیں بن سکتے جس جوش سے اسے قائم کیا جاتا ہے یا جس مستعدی سے ابتدا میں اسے برقرار رکھا جاتا ہے اس کے ختم ہونے کے بعد وہ منتشر ہو کر ایک نہایت بیکار و خطرناک جماعت بن جاتی ہے ہندوستانی ریاستوں میں باقاعدہ فوج قائم کرنے یا رکھنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں یا آئندہ ہوں گی ان سب کا یہی حشر ہوا ہے اور ہوتا رہے گا۔ جہاں کہیں اسے ہندوستانی طاقت کے ماتحت رکھا گیا وہاں اس کی خوبی برقرار نہیں رہ سکی اور جہاں کہیں ہم نے انھیں اپنی نگرانی میں لے لیا اپنے افسر مقرر کئے اور ان کی تنخواہوں کی باقاعدہ ادائی کا انتظام کیا وہاں وہ ہماری ہو کر رہ گئیں۔ اگر انہیں ہندوستانی فوجوں کے نام سے برقرار رکھا جائے گا تو ممکن ہے کہ کوئی عارضی مقصد حاصل ہو جائے لیکن مستقل طور پر یہ رواج مناسب نہیں ہو سکتا۔ اس طور سے جس حکومت کی وہ ماتحت ہوگی اس کی اس سے ہمت افزائی نہیں ہو سکتی بلکہ ہمت پست ہی ہوتی رہے گی اور اس سلسلے میں متواتر مداخلت کی جو

(۵۴۷) کرنے کا جو اختیار حاصل ہے اس میں مداخلت کئے بغیر مقصد حاصل نہیں ہوتا اور جب کبھی اس قسم کی مداخلت انصاف کے خلاف ہوتی ہے تو یہ حرکت اس قدر نازیبا معلوم ہوتی ہے کہ اس کے دوبارہ وقوع میں آنے کا شاذونادر ہی امکان رہ جاتا ہے۔

لارڈ منٹو کے دور حکومت میں میسور کے اندرونی معاملات میں کسی قدر تبدیلی واقع ہوئی جس سے ناگوار نتائج پیدا ہوگئے۔ پورنیا کے دشمن نوعمر راجہ کو اس قابل وزیر کے خلاف بدظن کرانے میں کامیاب ہوگئے۔ اسے مجبوراً اپنی خدمت سے مستعفی ہونا پڑا اور تھوڑی ہی مدت کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ حکومت کے اکثر محکموں کی حالت خراب ہوگئی لیکن جیسے جیسے راجہ کی عمر بڑھتی گئی ریاست کی حالت سنبھلتی گئی۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ ان حالات کا مذکورہ بالا سوار فوج کی کارگزاری پر قطعی کوئی اثر نہیں پڑا جس خوبی و وفاداری اور شجاعت سے اس نے دکن میں مرہٹوں کے خلاف ۱۸۰۳ء میں کام کیا تھا اسی طرح ۱۸۱۷ء و ۱۸۱۸ء میں اس نے مالوہ اور راجپوتانہ میں خدمت انجام دی۔

ادنیٰ ریاستوں کے حالات

اس زمانے میں ادنیٰ ریاستوں سے کمپنی کے جو تعلقات رہے ان کی تفصیل اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے بندھیلکھنڈ اور شمالی ہند کی ریاستیں حکومت بنگال کی ماتحت رہیں اور راجہ ٹراونکور و کوچین کا تعلق

(۵۴۸) مدراس سے رہا اور کچھ کا فرمانروا اور کاٹھیاوار کے سردار حکومت بمبئی کی نگرانی میں تھے۔ آخرالذکر علاقے پر کمپنی کا اثر حال ہی میں قائم ہوا تھا۔ دوسرے علاقوں کے مقابلے میں جن کی حفاظت کمپنی کے ذمہ تھی یہ علاقے زیادہ تر مغرب کی سمت واقع ہوئے تھے۔ ان کے حدود ایک طرف سندھ کے علاقے سے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) ضرورت ہمیں محسوس ہوگی اس سے اس حکومت کے خاتمے کے اسباب بہت جلد مہیا ہو جائیں گے۔

ملتے تھے اور ۱۸۲۰ء میں یہاں کے امیروں نے ان پر دھاوا کیا اور اس کے لئے عذر یہ پیش کیا کہ کمپنی کی فوجوں نے ان کے علاقے پر جو حملہ کیا تھا اس کا وہ انتقام لینا چاہتے ہیں۔ ایک حد تک ان کا عذر صحیح بھی تھا۔ خوسا کے قبیلے کے چند قزاقوں کے تعاقب کے لئے فوج کا ایک دستہ روانہ کیا گیا تھا جو اتفاق سے سندھیوں کی ایک جماعت پر ٹوٹ پڑا۔ یہ قزاق ہر سال گجرات کے علاقے میں غارتگری کیا کرتے تھے اور گمان یہ تھا کہ سندھی بھی ان میں شامل ہو گئے تھے اگر امیروں کے بیان کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی جو طرز عمل انھوں نے اختیار کیا وہ کسی لحاظ سے مناسب نہیں کہا جا سکتا۔ اس طرح سے جو غلط فہمی ہوئی تھی اس پر حکومت بمبئی اظہار افسوس کر چکی تھی لیکن اب اس نے اپنے تیور بدل کر امیران سندھ سے بلا وجہ مخاصمانہ کارروائی کرنے کی بابت جواب طلب کیا۔ اس مطالبے کے ساتھ ہی ایک زبردست فوج بھی سرحد پر جمع کر لی گئی۔ گورنر جنرل با جلاس کونسل کی ہدایات کی وجہ سے گورنر بمبئی کو جنگ سے بچنے کی بھی فکر تھی لہذا یہ سب تیاریاں اس قدر تیزی اور مستعدی سے کی گئیں کہ بغیر جنگ ہی کے خاطر خواہ طریقے پر مقصد حاصل ہو گیا۔ امیران سندھ کے جو وکیل بمبئی پہنچے ان سے ایک قابل اطمینان سمجھوتا ہو گیا منجملہ دیگر (۵۴۹)
انتظامات کے ایک بات یہ بھی طے پائی کہ خوسا قبیلے کے جو لوگ کمپنی کے علاقے پر متعدد مرتبہ دست درازی کر چکے ہیں۔ انھیں آیندہ سے روکا جائے۔

برمیوں سے کمپنی کے تعلقات و تنازعات

جن واقعات کی بنا پر برمیوں کی حکومت سے انگریزوں کا تصادم ہوا اگر ان کا یہاں ذکر نہ کیا گیا تو ہندوستان کے اس زمانے کی سیاسی تاریخ نامکمل رہ جائے گی۔ ان لوگوں نے حال میں جو فتوحات حاصل کی تھیں ان میں اراکان۔ آسام۔ اور کچھار کے علاقے شامل تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کی مشرقی سرحد پر چھوٹے چھوٹے راجاؤں کے بجائے جن کے پاس نہ کوئی قوت تھی اور نہ جن کی کوئی خواہش ہم پر نگاہ ڈالنے کی تھی گزشتہ تیس سال سے ایک زبردست حکومت قائم ہو گئی تھی اس کے

فرمانروا مغرور اور بلند حوصلہ تھے انگریزوں کی قوت سے وہ ناواقف اور اپنی
طاقت پر انھیں اس قدر گھمنڈ تھا کہ وہ کمپنی سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے
کا کبھی خیال بھی نہیں کر سکتے تھے۔

لارڈ ٹینماؤتھ (Lord Teignmony) کے دور میں ایک برمی سپہ دار
اپنے یہاں کے تین ملزموں کا تعاقب کرتا ہوا چٹگاؤں کے علاقے میں داخل
ہوگیا۔ اس بیجا مداخلت کو روکنے اور سپہ دار مذکور کو باہر نکالنے کے لئے
فوج کا ایک دستہ روانہ کر دیا گیا۔ برمی سپہ دار انگریزی افسر کے پاس
پہنچا۔ حکومت کی طرف سے اسے جو ہدایات تھیں اور اس حملے کا جو مقصد تھا وہ
اس نے بیان کیا اور اس طور سے جنگ رک گئی۔ اس کی مراجعت کے بعد
ملزموں کو اس کے حوالے کر دیا گیا۔ ان میں سے دو تو سخت بے رحمی سے قتل
کر دیئے گئے اور تیسرا ملزم بچ کر دوبارہ برطانوی علاقے میں داخل ہو گیا
قبیلۂ مگھ (Mugh) کے متعدد لوگ جو اراکان کے باشندے ہیں
ایک عرصہ سے چٹگاؤں میں آکر بس گئے تھے۔ ۱۷۹۷ء و ۱۷۹۸ء میں ان لوگوں (۵۵۰)
کی ایک کثیر جماعت برمی حکومت کے ناقابل برداشت تشدد و مظالم سے
تنگ آکر اور اپنے وطن کو خیرباد کہکر کمپنی کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ ان کی
کثیر تعداد سے ایک قسم کا خوف پیدا ہوا اور اس کے ساتھ ہی انھیں پناہ
دینے کے مضر نتائج کا بھی اندازہ ہو گیا لہذا احکام جاری کر دیئے گئے کہ
آئندہ کوئی شخص اس سمت سے داخل نہ ہونے پائے۔ ان احکام کی پورے
طور سے تعمیل نہ ہو سکی۔ نو واردوں کے طرز عمل کی وجہ سے ان کی تعمیل ناممکن
بھی تھی۔ جب ایک موقع پر ان بدبخت لوگوں کو واپس ہونے کا حکم دیا گیا
تو ان کے سردار نے نہایت بے باکی سے جواب دیا کہ "ہم اراکان ہرگز واپس
نہیں جائیں گے۔ اگر آپ چاہیں تو ہمیں اس جگہ قتل کر دیں۔ ہم مرنے کے لئے
تیار ہیں اور اگر آپ ہمیں جبراً نکال دیں گے تو ہم ان عظیم الشان پہاڑوں
اور گھنے جنگلوں میں جا بسیں گے جو درندوں کو پناہ دیتے ہیں۔"

۱۷۹۸ء کے آخر میں تقریباً دس ہزار مگھ انتہائی مصیبت اور

تکلیف کی حالت میں سرحد پر آپڑے۔ ان کے پیچھے ایک دوسری جماعت آئی جس کی تعداد پہلے آنے والوں سے بھی زیادہ تھی۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مگھ لوگوں کی آبادی کا ⅔ حصہ اراکان سے باہر جا چکا تھا اور اس کا دارالحکومت قریب قریب ویران ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ بیابان جنگل اور چٹیل میدانوں میں بغیر کسی خاص ارادے کے مارے مارے پھرتے ہیں اور بھوک پیاس، بیماری اور تکان سے سیکڑوں ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ دریائے ناف جو اراکان اور چٹگاؤں کی سرحد پر واقع ہے ضعیف اور معذور لوگوں کی لاشوں سے بھرا پڑا ہے۔ مائیں اپنے شیر خوار بچوں کو سینوں سے لگائے ہوئے پائی گئیں ہیں۔" ان لوگوں کی محض تعداد ہی کا خیال کر کے انسانی ہمدردی نیز حکمت عملی کا اقتضاء یہ تھا کہ کم از کم عارضی طور پر انھیں ضرور پناہ دی جائے کیونکہ سختی کا برتاؤ کرنا اول تو خطرناک تھا اور اگر اس میں کامیابی حاصل ہو جاتی تو یہ بیچارے سب کے سب اپنی وحشی حکومت کے ظالمانہ انتقام کے شکار بن جاتے۔ جب حکومت کلکتہ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا تو طے پایا کہ چٹگاؤں کے علاقے میں جو کثیر رقبہ ویران پڑا ہے وہاں انھیں بسا دیا جائے۔ اس مدت میں ان کی گزر درخت کے پتوں اور گھاس پات پر تھی جس کی وجہ سے روزانہ متعدد جانیں تلف ہو رہی تھیں۔ ان کی مصیبت قابل توجہ تھی لہذا حکومت نے ان کے فوری ضروریات زندگی مہیا کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ ان کی خوراک کا انتظام کیا گیا اور چونکہ بارش کا موسم شروع ہونے والا تھا اس لئے جھونپڑیاں بنانے کا سامان بھی انھیں دیا گیا تاکہ وہ اپنی حفاظت کا انتظام کر سکیں۔

کپتان ہیرام کاکس (Captain Hiramcox) کو جو ایک مرتبہ سفیر کی حیثیت سے آوا جا چکا تھا اس سلسلہ میں ان انتظامات کے لئے چٹگاؤں روانہ کیا گیا۔ یہ شخص اپنے خصوصیات اور اپنے تجربے کے لحاظ سے اس کام کے لئے نہایت موزوں تھا۔

جب مگھوں کی آخری جماعت اراکان سے روانہ ہوئی تو وہاں مشکل

سے تین سو برمی سپاہی ہوں گے اور یہ بھی ان لوگوں کی بدظنی سے اس قدر مرعوب ہو گئے کہ ان کی ہمت انھیں روکنے یا ان کا تعاقب کرنے کی نہ ہو سکی اور اس طور سے ان کی ایک کثیر تعداد نے بغیر کسی مزاحمت کے دریائے ناف کو عبور کر لیا لیکن ان کے ظالم حاکم اپنے شکار کو آسانی سے چھوڑنے والے نہیں تھے انھوں نے تقریباً چار ہزار سپاہی جمع کئے اور چٹگاؤں تک ان لوگوں کا تعاقب کیا اور وہاں پہنچکر گھنے جنگلوں میں اپنے آپ کو محفوظ کیا اور کئی ہفتہ تک کمپنی کی فوجوں پر وقتاً فوقتاً چھاپے مارتے رہے۔ ان حملہ آوروں کے سپہ سالار نے چٹگاؤں کے حاکم ضلع کو لکھا کہ اگر آپ سابق دوستانہ تعلقات کا لحاظ کرکے ان پناہ گزیں لوگوں کو ہمارے حوالے کردیں گے تو اخلاص و اتحاد باقی رہیگا لیکن اگر آپ ہمارے بادشاہ کے غلاموں کو اپنے ملک میں اس طرح پناہ دیں گے تو دونوں سلطنتوں کے باہمی تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ ہمارا جھگڑا[1] صرف ان ہی لوگوں کی بابت ہے۔ ہم نے پہلے بھی ان کی بابت آپ کو لکھا تھا اور انھیں طلب کیا تھا لیکن آپ نے ہماری تحریر کا برا مانا اور خفا ہو گئے۔ اس وقت آپ چٹگاؤں میں کمپنی کے بادشاہ کے نمائندے ہیں لہذا ہم آپ کو دوبارہ لکھتے ہیں کہ ان سب اراکانیوں کو یہاں سے لے کر ہٹیں گے انھیں جبراً لے جانے کے لئے اور فوجیں آرہی ہیں۔ اگر آپ ان لوگوں کو اپنے ملک میں رکھیں گے تو رشتۂ اتحاد ٹوٹ جائے گا۔

(۵۵۳) اس دھمکی اور مطالبے کا جواب دیا گیا کہ جب تک برمیوں کی فوج ہمارے علاقے سے باہر نہیں چلی جائے گی اس مسئلے پر کسی قسم کی گفت و شنید نہیں ہو سکتی اور اگر اس کی تعمیل نہیں کی گئی تو برمی سپہ سالار کو اس کے نتائج برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے لیکن اس کا کوئی اثر ان پر نہیں ہوا۔ وہ اپنی جگہ پر قایم رہے اور ہندوستانی سپاہیوں کا ایک دستہ جو ان کے خلاف روانہ کیا گیا اسے انھوں نے پسپا کر دیا۔ اس کے تھوڑے ہی

[1] بتاریخ ۱۸ر جولائی ۱۷۹۹ء

عرصہ بعد وہ خود اپنے علاقے میں واپس ہو گئے اور صدر حکومت نے اپنی طرف سے کپتان ہل کو (جو اس زمانے میں لفٹنٹ تھا) اراکان کے گورنر کے پاس ایک خاطر خواہ سمجھوتہ کرنے کی غرض سے روانہ کیا۔

جب کپتان کاکس رامو پہنچا جو دریائے ناف کے کنارے پر واقع ہے تو معاملات کی یہ صورت تھی لیکن اس نے اپنا کام شروع کر دیا اس نے کیفیت پیش کرتے وقت تحریر کیا کہ جب سے گھوں کو پناہ دینے کے احکام یہاں پہنچے ہیں یہ لوگ تلاش معاش کی غرض سے منتشر ہو گئے ہیں اور اب دور تک پھیلے ہوئے ہیں اس لئے ان کی صحیح تعداد معلوم کرنے میں کچھ زمانہ لگے گا لیکن عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ بوڑھے بچے اور عورتیں ملا کر ان کی تعداد پچیس تیس ہزار ہو گی۔ ان کے ہم وطن جو جنگلوں میں پہلے سے آباد ہیں انھوں نے ان کی خوراک کا انتظام کیا ہے اور یہاں کے باشندے بھی ان کی مدد کر رہے ہیں اور انھوں نے اکثروں کو ملازم بھی رکھ لیا ہے لیکن باوجود اس کے ان میں اب بھی موتیں برابر ہو رہی ہیں خصوصاً بچے زیادہ مر رہے ہیں تقریباً بیس روزانہ کا اوسط ہے۔ (۵۵۴)

اس کیفیت کے مطالعے سے آپ پر جو اثر ہو گا اس کا میں اندازہ کر سکتا ہوں۔ یہ حالات ایک انسان کے لئے سخت تکلیف دہ ہیں لہذا میرے دل میں یہ خوف باقی نہیں کہ میری یہ درخواست کہ ان نوواردوں کی مصائب رفع کرنے کا جلد از جلد فیصلہ کر دیا جائے کسی گستاخی پر محمول کی جائے گی ملک کی ترقی کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس زرخیز و نفیس خطے میں جس کی طرف اب تک کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی ہے زراعت کا خاص طور پر اہتمام کیا جائے۔ میری قطعی رائے یہ ہے کہ ان سب نوواردوں کو ایک ہی جگہ بسایا جائے۔ ایک جگہ مل کر رہنے کی صورت میں وہ ایک دوسرے کی مدد اور دل جوئی کر سکیں گے۔ ان کے یکجا قیام کی وجہ سے

سلہ بتاریخ ۱۳ر جولائی ۱۷۹۹ء

انھیں منتشر ہونے کے خطرات سے جو انھیں اپنی جہالت کی وجہ سے پیش آسکتے ہیں بہ آسانی محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس طور سے وہ اپنے قوانین اور اپنے ہی رسم و رواج کے پابند رہیں گے اور اس سرزمین سے مانوس ہونے میں انھیں سہولت ہوگی۔ ان کی تعداد و قوت میں بہت جلد اضافہ ہو جائے گا اور اس طرح ایک مفید اور ترقی پذیر نوآبادی قائم ہو جائے گی۔ برخلاف اس کے اگر انھیں منتشر کیا گیا تو ممکن ہے کہ ان میں سے چند افراد کچھ عارضی فائدہ حاصل کر لیں لیکن اغلب یہ ہے کہ کثیر تعداد بری حالت میں ماری ماری پھرے گی اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ سب نیست و نابود ہو جائیں گے۔

ان کے بسانے کے لئے میری رائے میں ماکالی یار اہو دریا اور ناف کا درمیانی علاقہ مناسب ہے۔ اس انتخاب کے لئے میرے دلائل حسب ذیل ہیں۔

اول۔ نووارد خود ہی اسے پسند کرتے ہیں

دوسرے۔ یہاں کی اراضی بالکل غیر آباد ہے اور اس پر قانوناً کسی قسم کا بار نہیں ہے لہٰذا اس جگہ ان کے بسانے میں نہ زیادہ دقت ہوگی اور نہ کسی قسم کے مصارف ہوں گے۔

تیسرے۔ اس علاقے میں زیادہ تر گھنے جنگل ہیں اور یہ ہماری اس قدر بعید سرحد ہے کہ دشمن بے باکانہ طور سے اس پر حملہ کرتے رہتے ہیں لہٰذا ہماری رعایا میں سے کوئی طبقہ اس علاقے کے صاف کرنے کے دشوار کام کو اپنے ذمہ نہیں لے سکتا۔

چوتھے۔ ان میں سے جو لوگ پہلے آئے تھے وہ بھی اس علاقے کی سرحد پر آباد ہیں لہٰذا اس جدید نوآبادی کو ان سے معقول مدد ملے گی۔

پانچویں:۔ سمندر کے ساحل اور تین قابل عبور دریاؤں کے قرب کی وجہ سے سامان خوراک بھی افراط کے ساتھ مہیا ہو جائے گا کیونکہ ادا کان کے باشندے نہایت ہوشیار و مشاق ماہی گیر ہوتے ہیں۔

" انھیں یہاں بسانے میں میرے نزدیک صرف ایک اعتراض ہو سکتا ہے

اور وہ دراصل ایک اہم سوال ہے کہ اس علاقے میں ان کے قیام کی وجہ سے ان کی سابق حکومت کو ان سے برابر حسد رہے گا اور اگر ان لوگوں نے اراکان پر لیے قاعدہ حملے شروع کر دئے تو اس کی وجہ سے حکومت برما سے ہمارا ایک لا متناہی تنازع قائم ہو جائے گا۔

اس اعتراض کے پہلے جز کی بابت میرا یہ جواب ہے کہ خود ہم نے جھگڑا مول نہیں لیا ہے۔ انسانی ہمدردی سے مجبور ہو کر ہم نے یہ راہ اختیار کی ہے۔ دوسرے حصے کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ دریائے ناف پر ایک فوجی چوکی قائم کرنے سے اور حاکم ضلع کی نگرانی اور مستعدی سے اس قسم کی بے ضابطگی کو روکا جاسکتا ہے۔"

کپتان کاکس اپنی رپورٹ مورخہ ۱۸ اپریل ۱۷۹۹ء میں کیفیت پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اس وقت تک میں نے تیرہ ہزار نو واردوں کے نام رجسٹر میں درج کر لئے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ اس صوبے میں چالیس پچاس ہزار آدمی موجود ہیں۔ جس وقت میں زمین کا انتظام کر لوں گا تو یہ سب بھی آجائیں گے" جون ۱۷۹۹ء میں ٹیکناف سے روانہ ہونے سے قبل وہ لکھتا ہے کہ "جو علاقہ میں نے منتخب کیا تھا اس میں دس ہزار چار سو ساٹھ گھر آباد ہو چکے ہیں" کپتان موصوف کے نام پر ان کی پہلی آبادی کا نام کاکس بازار رکھا گیا۔

لارڈ ویلزلی اپنی تحریر[۵۱] میں مجلس راز دار کو لکھتا ہے کہ کپتان ہل (Captain Hill) جنہیں گورنر اراکان کے پاس سفیر کی حیثیت سے روانہ کیا گیا تھا حال میں واپس آگیا ہے۔ اسی سلسلے میں برما کے بادشاہ نے اپنا سفیر کلکتے بھیجا تھا۔ اسے میں نے نو واردوں کی بابت سمجھا دیا ہے اور اپنی طرف سے ہر طرح کا اطمینان دلا دیا ہے تاکہ اسے اس بات کا یقین ہو جائے کہ برطانوی حکومت دوستانہ تعلقات برقرار رکھنے کی خواہشمند ہے[۵۲]۔

۵۱۔ مورخہ ۹ جون ۱۸۰۰ء

۵۲۔ سفیر مذکور کو جو جواب دیا گیا تھا اس کا لب لباب یہ تھا کہ اگر گھوں میں سے (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

سنہ ۱۸۰۰ء میں ارکان کے گورنر نے بلا کسی شرط کے مگھوں کی واپسی کا مطالبہ کیا اور چٹگاؤں کے حاکم ضلع کو اس کی بابت خط لکھا اور دھمکی دی کہ اگر اس کی فوری تعمیل نہیں کی گئی تو حملہ کیا جائے گا۔ گورنر جنرل اس تحریر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر اس بات کا یقین نہ ہوتا کہ گورنر اراکان نے یہ تحریر اپنی حکومت کی اجازت کے بغیر روانہ کی ہے تو میں اس توہین کا انتقام لینے کی غرض سے جنگ شروع کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا"۔ اس بات کی تحقیق اور حکومت برما سے تجارتی وسیاسی تعلقات بہتر بنانے کی غرض سے لفٹنٹ کرنل سائمس (Lt. Colonel Symes) سنہ ۱۸۰۲ء میں آوا روانہ کیا گیا اور اس عرصے میں لفٹنٹ کرنل فینوک (Lt. Colonel Fenwick) کی ماتحتی میں فوج کا ایک معقول دستہ چٹگاؤں کی سرحد پر متعین کردیا گیا۔

کرنل سائمس کی سفارت کی بابت جو کیفیت پیش ہوئی تھی اس میں یہ درج ہے کہ حکومت برما نے اپنی طرف سے دوستانہ تعلقات کا اطمینان دلایا اور کرنل مذکور نے برطانوی حکومت کی نیک نیتی اور صلح پسند مسلک کا پورا پورا اطمینان دلا دیا۔

اس کے بعد نوواردوں کے مسئلہ کی بابت کئی سال تک کوئی سوال نہیں اٹھا لیکن سنہ ۱۸۰۹ء میں کپتان کیننگ (Captain Conning) نے جو اس زمانے میں برما کے دربار میں موجود تھا اس بات کا پتہ لگایا کہ وہاں کے بادشاہ کا ایک عرصہ سے چٹگاؤں اور ڈھاکہ کے علاقوں کو فتح کرنیکا ارادہ ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ کسی کی بابت یہ ثابت ہو جائے کہ وہ کسی ایسے جرم کا مرتکب ہوا ہے جس کی بنا پر وہ پناہ کا مستحق نہیں ہوسکتا تو اسے بخوشی آپ کے حوالے کردیا جائے گا اور ایسی صورت میں دونوں حکومتوں کا یہ مقصد ہوگا کہ ایسے لوگوں کو سزا دیجائے۔ علاوہ ازیں ان میں سے جو لوگ اپنے وطن واپس جانے کے خواہش مند ہیں انھیں بلا کسی روک ٹوک کے واپس جانے کی پوری آزادی حاصل ہے اسی بنا پر اس عرصہ میں یہ اعلان کردیا گیا کہ نوواردوں میں سے جو شخص ایک مرتبہ اپنے وطن واپس چلا جائے گا اسے دوبارہ برطانوی علاقے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیجائے گی۔

۱۸۱۱ء میں برطانوی حکومت کو گمھوں کو اس علاقے میں آباد کرانے (۵۵۸)
کے مضر نتائج کا احساس ہوگیا کیونکہ یہ ایک ایسا مقام تھا جہاں سے وہ اپنے
وطن کی سرزمین پر نگاہ ڈال سکتے تھے اور یہ ایک ایسی بات تھی جس کی وجہ سے
ان کے دل میں اپنے وطن اور اپنے آبائی حقوق دوبارہ حاصل کرنے کا جذبہ لازمی
طور پر ہمیشہ تازہ رہنا چاہیے تھا۔

گمھوں کی اس جدید نوآبادی کے چند بہادر باشندوں نے قسمت آزمائی کے لئے اپنے سردار کنگ بیرنگ (King Cerving) کے تحت ارا کان پر بے قاعدہ حملے شروع کر دئیے۔ ان حملوں کی وجہ سے ارا کان کی کمک فوجیں کمپنی کے علاقے میں داخل ہوئیں اور برطانوی سرحد کے عہدے داروں کی برمی افسروں سے نوک جھونک شروع ہوگئی۔

۱۸۱۳ء میں پیگو کے صوبہ دار کی طرف سے ایک وفد کلکتے پہونچا۔ اس وفد کے پہونچنے سے قبل شاہ برما کا ایک نمایندہ ہندوؤں کی چند مقدس کتابیں خریدنے کے لئے بنارس پہونچ چکا تھا۔ اگرچہ اس بات کے شبہہ کی گنجایش تھی کہ سفیر مذکور کے ارادے کچھ اور نہیں تاہم اُسے بنارس جانیکی اجازت دے دی گئی۔ یہ شخص وہاں پہنچ کر کتابیں خریدنے کے بجائے خفیہ سازشوں میں مشغول ہوگیا جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے برطانوی حکومت کے خلاف تھیں۔ شاہ برما کے ایک اور عہدہ دار نے اسی بہانے (یعنی قلمی نسخے جمع کرنے کی غرض) سے دہلی جانے کی اجازت چاہی لیکن چونکہ اس بات کا اندازہ ہوچکا تھا کہ اس کا حقیقی مقصد انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کے لئے دیسی ریاستوں سے اتحاد قایم کرنا تھا اس لئے اُسے کمپنی کے ان علاقوں میں سفر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ ارا کان کے راجہ کو مطلع کر دیا گیا کہ مقدس کتابوں اور نسخوں نیز دیگر مطلوبہ اشیا کی ایک فہرست روانہ کر دی جائے انھیں خرید کر بھیجدیا جائے گا۔ اس کام کے لئے اپنے نمایندوں کو مقرر کرنے کی تکلیف گوارہ نہ کی جائے۔ (۵۵۹)

صدر حکومت کے مراسلوں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ۱۸۱۳ء

میں حکومت برما انگریزوں کے علاقے پر حملہ کرنے کی وسیع پیمانے پر نہایت تیزی
سے تیاریاں کر رہی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شاہ برما چٹگاؤں و ڈھاکے کے
صوبے حاصل کرنے کی فکر میں تھا اور کمپنی نے مختلف موقعوں پر اپنے طرز عمل
کی بابت اُسے جو اطمینان دلایا تھا اُس سے شاہ مذکور کے ان خیالات میں
کچھ تبدیلی نہیں ہوئی تھی کہ انگریز مگھ نو واردوں کو ابھارتے رہتے ہیں۔ اس
زمانے میں مگھوں کی ایک کثیر جماعت اپنے سردار کنگ بیرنگ کی ماتحتی میں
برمیوں کے علاقوں میں سخت زیادتیاں بھی کر رہی تھی اور انھیں باز رکھنے
کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہو رہی تھیں۔

ستمبر ۱۸۱۳ء کنگ بیرنگ کا ایک خط لارڈ منٹو کے ہاتھ لگ گیا جس
میں اُس نے صاف صاف الفاظ میں اراکان پر حملہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔
گورنر جنرل اور اس کی مجلس نے اب تک نہایت صبر سے کام لیا تھا اور نو وارد
مگھوں کی متعدد زیادتیاں معاف کر دیں تھیں (اور کبھی کبھی صرف ان کے سرغناؤں
کو گرفتار یا نظر بند کر دیا تھا)، لیکن اب اس بے باک ملزم اور اس کے ساتھیوں
کے خلاف سختی کا برتاؤ کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا لہٰذا اس امر کی بابت ایک اعلان
(۵۶۰) شایع کیا گیا کہ اگر دوبارہ اراکان پر دست درازی کی گئی تو برطانوی حکومت
کنگ بیرنگ اور اس کے خاص خاص ساتھیوں کو برمی حکام کے حوالے
کر دے گی۔ اس کے ساتھ لارڈ منٹو نے مصلحت اس میں سمجھی کہ حکومت کو معاہدے
کے طور پر اس کی پابندی اپنے اوپر عائد نہیں کرنی چاہئے لہٰذا اس نے طے
کیا کہ اس فیصلے کی اطلاع برمی حکام کو نہ کی جائے "کیونکہ ممکن ہے کہ اس طرح
ہمارے ہاتھ بندھ جائیں اور اگر کسی موقع پر کنگ بیرنگ اور اس کے ساتھی
ہمارے قابو میں آجائیں تو حکومت آوا ہمارے اس سرکاری اعلان کی بنا
پر انھیں ہم سے طلب کر بیٹھے۔"

پیگو کے صوبہ دار نے مگھ نو واردوں کو واپس حاصل کرنے اور لارڈ منٹو
کو اس بات پر آمادہ کرنے کے لئے اپنے جو سفیر روانہ کئے تھے انھوں نے
کلکتے پہونچکر لارڈ ہیسٹنگز کی آمد تک اپنی واپسی ملتوی کر دی اور اس کے سامنے

اپنے ملزموں کو حاصل کرنے کی درخواست از سر نو پیش کی لیکن انہیں اس موقع پر بھی پہلے سے کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی بعد کے واقعات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے رنگون واپس پہونچنے کے بعد انکی ناکامی سے ان کا صوبہ دار مشتعل نہیں ہوا۔

مگھوں کا خاص سردار کنگ بیرنگ جس کا کئی بار ذکر ہو چکا ہے اپنے قبیلے پر بہت حاوی تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ برمیوں سے انتقام لینے کا جذبہ اس پر بہت غالب تھا۔ کمپنی کے علاقے کے نوواردوں میں سے اس نے ایک جتھا قائم کیا اور اُسے اپنے ساتھ لے کر گھنے جنگلوں اور پہاڑوں میں روپوش ہو گیا اور وہاں سے ہر سال اراکان پر حملہ کرتا رہا۔ اسے متعدد مرتبہ جو (۱)
ناکامیاں ہوئیں اور اس کے چند ہموطنوں کے ساتھ (جو اگرچہ برمیوں کے قابو سے باہر نہیں تھے تاہم اس کی مدد کرتے رہتے تھے) جو مظالم (دوسروں) کے دل میں عبرت پیدا کرنے کے لئے کئے گئے وہ ایسے تھے کہ ان کے بعد بہت سے لوگ ان حالات میں اپنی کامیابی سے قطعی مایوس ہو جاتے۔

چٹگاؤں کے حاکم ضلع مسٹر پیشیل (Mr. Pechell) نے سردار مذکور کے استقلال کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ جب سے اسے اور اس کے ساتھیوں کو تنہا اپنی کوششوں سے کامیابی حاصل کرنے کی توقع جاتی رہی ہے وہ اپنے حصول مقصد کے لئے برطانوی حکومت اور دربار آوا کے باہمی تنازعات پر آس لگائے ہوئے ہیں اور اپنی ان حرکتوں سے حکومت آوا کے حسد اور خودداری کے جذبہ کو مشتعل کر کے اپنے مقصد کے لئے ہم سے جنگ کرانا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح جنگ کے ذریعہ سے اراکان فتح ہو جائے گا۔ وہ اپنے وطن واپس ہو جائیں گے اور انہی کی وہاں حکومت قائم ہو جائے گی۔

اگر ان کی یہ چال تھی تو اُن کے حصول مقصد کے لئے اس سے بہتر کوئی اور

سلہ - بحوالہ مراسلہ مسٹر پیشیل مورخہ ۲۹ر اپریل ۱۸۲۴ء بنام محکمہ سیاسی بنگال -

ترکیب نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ جس معاملے پر وہ دونوں سلطنتوں کو لڑانا چاہتے تھے اس میں دونوں کے اصول ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے اور باہمی سمجھوتے کی کوئی توقع باقی نہیں رہی تھی ۔ اب یہ بات ناممکن تھی کہ برمیوں کے
(۵۶۲) سفیروں کو سمجھا بجھا کر یا ان کے ملزموں کے خلاف تھوڑی بہت فوجی کارروائی کر کے ان کے شبہات رفع کر دئیے جائیں اور ان کا غصہ فرو کر دیا جائے یا ان کے انتقامی جذبے کو جس نے انھیں مگھوں کے خون کا پیاسا بنا دیا تھا ۔ ٹھنڈا کیا جا سکے ۔ ان لوگوں کو مگھوں سے جو تکالیف پہونچتی تھیں انھیں وہ ہماری پناہ اور اعانت پر محمول کرتے تھے لہذا ان حالات میں نہ وہ ہمارے بیانات تسلیم کر سکتے تھے اور نہ انسانی ہمدردی کے ان احساسات کو سمجھ سکتے تھے جن کی وجہ سے ہم ان بدنام ملزموں کو ان کے حوالے کرنے اور انھیں ان پر دردناک مظالم توڑنے کا موقع دینے سے قاصر تھے ۔ اور نہ ان کی سمجھ میں یہ بات آسکتی تھی کہ ہم اپنے قوانین کی نوعیت کی وجہ سے ان ملزموں کو باوجود ان کے مسلمہ جرائم کے سزا نہیں دے سکتے تھے کیونکہ ہماری عدالتوں میں جس قسم کا ثبوت پیش کرنا ضروری ہے وہ ہم نہیں پہونچا یا جا سکتا تھا ۔

۱۸۱۳ء کی سفارت سے قبل جو واقعات پیش آچکے تھے ان کی بنا پر لارڈ منٹو برمیوں کے خلاف جنگ اغلب سمجھتا تھا ۔ مجلس نظار کو وہ اپنے مراسلے میں لکھتا ہے کہ جب تک حکومتِ برما کی طرف سے قطعی طور پر کوئی دست درازی واقع نہ ہوگی یا مزید اطلاع ملنے کے بعد ہمیں اپنے حقوق یا اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے اپنا طرز عمل تبدیل کرنے کی مجبوری پیش نہ آئے گی ۔ ہم دونوں سلطنتوں کے تعلقات ختم کرنے کی کوشش نہیں کریں گے ۔

جنگاؤں کے علاقے کو ان وحشی لوگوں کی دست درازیوں سے محفوظ
(۵۶۳) رکھنا ہر حال میں ضروری ہے کیونکہ ان کی علانیہ اور بے باکانہ زیادتیوں سے ملک میں انتہائی ابتری اور تباہی برپا ہو جائے گی اور ہماری حکومت کی سخت ذلت و توہین ہوگی ۔ اس قسم کی ہتک و توہین کی مدافعت کرنا اور

برطانیہ کی عزت و شہرت کو ہر ذلت سے محفوظ رکھنا ایک ایسا فرض ہے جس میں قطعی کوتاہی نہیں کی جاسکتی۔ مقصد اول کے حصول کے لئے تھوڑی سی فوج اور دو ایک مسلح کشتیوں کا بھیجنا ضروری سمجھا گیا اور دوسرے مقصد کے لئے جب کبھی ان کی طرف سے کوئی گستاخانہ حرکت سرزد ہوتی ہے تو ہم سختی سے مگر ملایم الفاظ میں صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور اعتدال پسند مراسلوں اور ترکیبوں سے اپنا قومی وقار برقرار رکھتے ہیں۔

"جب کبھی حکومت برما سے بحث طلب یا مختلف فیہ امور پیش آتے ہیں تو ہم یہی طرز عمل اختیار کرتے ہیں اور انہی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہیں ہمیں امید ہے کہ چٹگاؤں کی سرحد اور دربار رنگون کے معاملات میں ہم نے جو صبر سے کام لیا ہے اور جو اعتدال پسند اور صلح آمیز طریقہ اختیار کیا ہے وہ آپ کے نزدیک قابل اطمینان ہوگا۔ ہمارا غنیم کمینہ ہے۔ اس کی طرف سے اشتعال انگیز حرکتیں سرزد ہوتی رہی ہیں لیکن باوجود ان سب باتوں کے موجودہ حالات امن برقرار رکھنے اور حکومت آوا سے سمجھوتا قائم رکھنے کی غرض سے ہم اپنے اصول پر استقلال سے قائم رہے ہیں۔ جب تک کہ حالات اجازت دیں گے ہم انھیں اصول پر عمل پیرا رہیں گے اور ہم بجا طور پر اس امر کی توقع کر سکتے ہیں کہ حسد و بدگمانی رفع ہو جائے گی اور جنگ کی کوئی صورت پیش نہ آئے گی"

لارڈ موصوف آخر میں یہ بھی لکھتا ہے کہ "ہم اس خیال کو بھی دل سے نہیں نکال سکتے کہ آیندہ کسی موقع پر اگرچہ وہ موقع عنقریب پیش (۵۶۴) نہ آئے ہمیں اس کمزور اور قابل نفرت سلطنت کی گستاخی اور مغالطے کو روکنے کی ضرورت پیش آجائے"

لارڈ ہیسٹنگز نے جب حکومت کا جائزہ لیا تو اس نے بھی جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہے چند سرکش سرداروں کو جو اس مدت میں گرفتار کرلئے گئے تھے حکومت برما کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا لیکن دوسرے ہر طریقے سے اس نے حکومت مذکور کو اس بات کا یقین دلانے کی کوشش

کی کہ وہ نہایت صدقِ دل سے ایسے لوگوں کو دبانے اور ہلاک کرنے کی کوشش کرے گا جو اراکان کے علاقے پر متواتر زیادتیاں کرتے رہتے ہیں۔

جب ان لوگوں کی ایک جماعت نے چٹگاؤں کے جنگلوں میں فرار ہو کر پناہ لی تو برمیوں کو ان کے تعاقب کی اجازت دے دی گئی لیکن اراکان کا راجہ اس سے بھی مطمئن نہیں ہوا اور سرحدی افسر کے پاس اس نے اپنے نمایندے بھیج کر اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ برطانوی علاقے میں جو برمی سپاہی داخل ہوں ان کے لئے انگریزی حکومت اسلحہ۔ سامان جنگ اور سامان رسد مہیا کرے۔ یہ ایک ایسی تجویز تھی جس پر گورنر جنرل باجلاس کونسل ہرگز توجہ نہیں کر سکتا تھا لہٰذا اس معاملے پر گفت و شنید بند کر دی گئی۔ مسٹر پیشل (Mr. Pechell) نے اس فیصلے کی اطلاع کرنے کے لئے اپنا جو نائب راجہ اراکان کے پاس روانہ کیا اُسے راجہ مذکور نے اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے گرفتار کر لیا۔

جس زمانے میں کہ مذکورۂ بالا گفت و شنید ختم ہوئی حکومت برما نے اپنے سفیر بھیج کر انگریزی حکومت کے خلاف اتحاد قائم کرنے کی دوبارہ کوشش کی۔ یہ سفیر سوداگروں کے بھیس میں تھے اور انھیں ۱۵۶۵ء
رنجیت سنگھ والی لاہور کے پاس جانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ یہ کوشش نہایت لچر اور پوچ سمجھی گئی اور حقیقت حال معلوم ہو جانے کے بعد سفیروں کو آگے بڑھنے سے روک دیا گیا تاہم اس واقعے کے اظہار سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ حکومت برما انگریزوں کے خلاف برابر مخاصمانہ کارروائی کر رہی تھی۔

۱۸۱۵ء کے اوائل میں گھوں کے خاص سردار کنگ بیرنگ کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد یہ توقع کی گئی کہ اس مدت میں لوواردوں کو دبانے کی جو کوشش کی جا رہی ہے اس میں اب سہولت ہو جائے گی اور حکومت نے اپنے لطف و کرم سے ان پر اثر قایم کرنے کی خواہش سے ان کے چند سرداروں کو جو پہلے گرفتار کر لئے گئے تھے رہا کر دیا اور کنگ بیرنگ

کے خاص معاون بھی تھیں کہ بھیجدیا گیا تھا چٹگاؤں اس شرط سے روانہ کردئے گئے کہ اگر ایک معینہ وقت تک وہ اپنے نیک چلنی کی بابت معقول ضمانت پیش کر دیں تو انھیں بھی آزاد کر دیا جائے۔ اس نیک سلوک کا حسب توقع مفید اثر نہ ہوا اور ۱۵-۱۸۱۲ء میں مگھوں نے کمپنی کے علاقے میں ایسی دست درازیاں کیں جن کی مثال پہلے کبھی نہیں ملتی لیکن اس مرتبہ ان ناقابل اصلاح ملزموں کی زیادتیاں اراکان تک نہیں پہونچیں لہذا اپریل ۱۸۱۶ء برمی سرحد کے صوبہ دار راجہ راہیر (Raja Ramere) کے پاس سے جو خط وصول ہوا اس پر قطعی تعجب نہیں ہوا۔ یہ خط نہایت طمطراق سے لکھا گیا تھا اور مگھ نوواردوں کے مطالبے کے ساتھ نہایت صاف الفاظ (۵۶۶) میں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ عدم امتثال امر کی صورت میں فوراً جنگ — چھڑ جائے گی۔

راجہ مذکور لکھتا ہے کہ " انگریزی حکومت دوستانہ تعلقات برقرار رکھنے کی کوشش نہیں کر رہی ہے۔ آپ تو آتش باری اور گولہ باری کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اراکان کے مگھ شاہ آوا کے غلام ہیں۔ انگریزی حکومت نے انھیں ہمارے علاقوں سے باہر جانے میں مدد دی ہے اور اب انھیں اپنے یہاں بسا لیا ہے۔ ہم میں اور آپ میں جھگڑا ہوگا اور مثل آگ کے ایک طوفان برپا ہوگا۔ حکومت اراکان نے برطانوی حکومت سے ان مگھوں کو طلب کیا۔ ان کی واپسی کا وعدہ کیا گیا لیکن بعد میں اُسے پورا نہیں کیا گیا۔ یہ لوگ آپ کے قابو سے باہر ہو گئے اور انھوں نے ہمارے علاقے میں داخل ہو کر چار رولاتیوں کو تاراج کر ڈالا اور جب وہ واپس گئے تو آپ نے انھیں دوبارہ اپنے یہاں پناہ دے دی۔ اگر اب آپ نے میرے مطالبے کی تعمیل نہ کی اور مگھوں کو واپس نہ کیا یا اس میں تاخیر کی تو ہمارے آپ کے دوستانہ تعلقات جو اب تک قایم رہے ہیں ختم ہو جائیں گے "۔

راجہ راہیر کا بیٹا اس خط کو لے کر مسٹر پٹیل کے پاس پہونچا اور اس

ہے کہا کہ "یہ مضمون خود بادشاہ سلامت نے لکھوایا ہے لہذا اب دلائل کی ضرورت نہیں۔ صرف جواب درکار ہے۔" مسٹر پیشیل نے جواب دیا کہ میں اس مسئلہ پر بحث کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ مجھے آپ نے جو خط دیا ہے اس کا میں ترجمہ کرا کر صدر حکومت کے پاس روانہ کردوں گا۔" اسکے ساتھ ہی اس نے اس بات پر تعجب ظاہر کیا کہ گمھوں کی واپسی کا سوال
اب ایسے موقع پر اٹھایا گیا ہے جب کہ سرحد پر کسی قسم کی بدامنی کا اندیشہ (۵۶۷)
نہیں ہے۔ سفیر مذکور نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اس زمانے میں درحقیقت کامل امن ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہا کہ اگرچہ کنگ ہیرنگ کا انتقال ہوگیا ہے تاہم اس کے ایسے عزیز اور ساتھی کافی تعداد میں موجود ہیں جو بلاشبہ دوبارہ دست درازیاں شروع کرنے کے مواقع سے فائدہ اٹھائیں گے اراکان اور اس کے ماتحت علاقے پر حملہ کریں گے اور اس کے فتح کرنے کی کوشش جاری رکھیں گے۔ مسٹر پیشیل نے اپنے دلائل پیش کر کے ثابت کیا کہ اس قسم کے واقعات کا اب بہت کم امکان نظر آتا ہے اور ساتھ ہی یہ تجویز پیش کی کہ بہ نظر احتیاط دریائے ناف کے ساحل پر کمپنی کی جو فوجی چوکیاں قایم ہیں ان کے قریب ایک تھوڑی سی بڑی فوج رکھی جاسکتی ہے۔ راجہ مذکور کے بیٹے نے اس کا جواب کسی قدر بدتمیزی سے دیا اور کہا کہ "ہم اپنے معاملات خوب سمجھتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ہمیں اپنی فوج کس مقام پر رکھنی چاہیئے۔ ہمارے بادشاہ سلامت کو اس بات کا یقین ہے کہ جب تک گمھوں کو واپس حاصل نہ کیا جائے گا سرحد پر امن زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکے گا۔ اس گفتگو کے بعد اس نے اپنے الفاظ دوبارہ دہرائے اور کہا کہ "اس مطالبے کی تعمیل کی جائے یا انکار کردیا جائے۔ مجھے صرف جواب درکار ہے" مسٹر پیشیل نے خط پڑھ کر دیکھا تو ابتدائی طرز تحریر اور خط کے آخر حصے کی عبارت کے انداز میں بہت فرق تھا۔ راجہ کے بیٹے نے کہا کہ "جو کچھ ہمارے بادشاہ نے کہا تھا وہ اس میں درج ہے۔ آپ براہ کرم اسے

بلا تاخیر کلکتے روانہ کر دیں تاکہ میں جلد از جلد واپس ہو سکوں۔"
(۵۶۸) مسٹر مینگل نے جو طریقۂ عمل اس معاملے میں اختیار کیا تھا۔ اس کی گورنر جنرل باجلاس کونسل نے تائید کی اور اُسے ہدایت[1] کی گئی کہ وہ خود ہی راجہ راہیر کو جواب تحریر کر دے جس کا طرز تحریر سخت مگر صلح پسند ہو اور آخر میں تحریر کر دیا جائے کہ یہ جواب حکومت کے احکام کے بموجب روانہ کیا جاتا ہے۔ مسٹر مینگل کو یہ بھی ہدایت تھی کہ وہ اپنے طور پر اس بات کا پتہ لگائے کہ حکومت آوا کا گھوں کے سوال کو اس وقت اُٹھانے سے مدعا کیا ہے۔

گورنر جنرل نے اس خیال سے کہ شاہ آوا کو گھوں کے مسئلہ کی بابت برطانوی حکومت کے خیالات واضح طور پر معلوم ہو جائیں ایک خط پیگو کے صوبہ دار کو خود بھی تحریر کیا اور گھوں کی واپسی کے متعلق راجہ راہیر کے مطالبے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ جو لوگ خود برطانوی حکومت کی پناہ کے خواستگار بنے ہیں اور جو گزشتہ تیس سال سے اس کے علاقے میں آباد ہیں انھیں وہ اپنے اصولوں کی خلاف ورزی کئے بغیر جن پر وہ ہمیشہ بلا تخصیص عمل پیرا رہتی ہے کسی کے حوالے نہیں کر سکتی ہے لیکن اسی کے ساتھ ان میں سے جو لوگ از خود اپنے وطن واپس جانا چاہیں انھیں ہرگز نہیں روکا جائے گا مگر برطانوی علاقے سے نکالنے کے لئے ان پر جبر نہیں کیا جا سکتا اور خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اس قسم کی کارروائی کے لئے سر دست کوئی خاص وجہ نہیں معلوم ہوتی برطانوی حکومت کی کوشش سے کامل طور پر امن قائم ہو گیا ہے۔ کنگ بیرنگ کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کے خاص خاص ساتھی مقید ہو گئے ہیں۔ عام طور پر مگھ محنت
(۵۶۹) کے عادی ہو گئے ہیں اور صنعتی پیشے اختیار کر رہے ہیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے اب دوبارہ بد امنی واقع ہونے کا امکان نظر نہیں آتا۔

[1] مورخہ ۱۰ مئی ۱۸۱۶ء

صوبہ دار مذکور کو یقین دلایا گیا کہ برطانوی عہدہ دار اپنی نگرانی بدستور جاری رکھیں گے اور جو لوگ مجرمانہ جدوجہد کے مرتکب پائے جائیں گے انھیں نہایت سخت سزا دی جائے گی۔ برطانوی حکومت کے اصول وخیالات اور ارادوں کو اس طرح واضح کرنے کے بعد گورنر جنرل نے آخر میں لکھا کہ "مجھے امید ہے کہ آپ کے روشن خیال بادشاہ اب اس مسئلہ پر بحث ومباحثہ بے سود تصور کریں گے کیونکہ مزید بحث سے کوئی ایسی نتیجہ خیز بات پیدا نہیں ہو سکتی جو دونوں سلطنتوں میں سے کسی ایک کے لئے بھی مفید مطلب ہو۔"

چٹگاؤں کے حاکم ضلع نے اسی زمانے میں حکومت کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا کہ موجودہ آئین وقوانین نوآباد مگھوں کو اراکان پر حملہ کرنے سے باز رکھنے کے لئے ناکافی ہیں اور اگر یہی قوانین جاری رکھے گئے تو ممکن ہے کہ ہمیں برمیوں کے خلاف جنگ میں مبتلا ہونا پڑے۔ اس یادداشت کی بنا پر ۱۸۱۵ء میں ایک اعلان شایع کیا گیا جس میں نوآباد لوگوں کو صاف طور پر جتلا دیا گیا کہ اس قسم کے واقعات دوبارہ پیش آئے تو ملزموں کو اراکان کے عہدہ داروں کے حوالے کر دیا جائے گا تاکہ جو سلوک وہ ان کے ساتھ مناسب سمجھیں کریں۔

اس اعلان کے تھوڑے ہی عرصے بعد ان سرکش لوگوں کے ایک بدنام سردار چیری پو (Charips) نے علاقے مذکور پر ایک نہایت ہی جسارت آمیز دھاوا مارا۔ اسے مع اس کے چند ساتھیوں کے گرفتار کر لیا گیا اور مسٹر پیٹل نے تجویز پیش کی کہ اس ناقابل اصلاح ملزم اور اس کے خاص خاص ملزم ساتھیوں کو بلا تاخیر حکومت برما کے حوالے کر دینا چاہئے کیونکہ دوسروں کو اس قسم کی حرکتوں سے باز رکھنے کی یہی ایک تدبیر ہے۔ مجلس کے نائب صدر[570] نے مسٹر پیٹل کے استدلال کی تائید کی

۵۷۰۔ اس وقت لارڈ ہیسٹنگز شمالی ہند میں مقیم تھا۔

اور اپنی رائے کا اظہار کیا کہ اس ترکیب سے خاطر خواہ فائدہ حاصل ہو گا اور دوسروں کو اس سے جو عبرت حاصل ہو گی اس کا اثر مستقل ہو گا لیکن باوجود اس یقین کے چٹگاؤں کے جج کی رائے سے اتفاق نہیں ہو سکا۔ حکومت کے معتمد خاص نے مذکورۂ بالا حاکم کو مراسلہ[1] تحریر کیا کہ "جب نائب صدر نے ان دردناک وحشیانہ مظالم پر غور کیا جو برمی ان بدبخت لوگوں سے انتقام لینے کے لئے ان پر کرتے تو اس نے ایک معقول تعداد کو اپنے غنیم کے انتقام کے لئے ایسی حالت میں اس کے حوالے کرنا جب کہ وہ ان کی متعدد دست درازیوں سے مشتعل تھا برطانوی قوم کے رحم و کرم اور اسکے خصوصیات کے خلاف تصور کیا۔ ان قیدیوں کو غنیم کے حوالے نہ کرانے کے فیصلے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نائب صدر باجلاس کونسل نے یہ محسوس کیا کہ اس طور سے برمی حکومت کی ہمت افزائی ہو گی اور اس کے اس قسم کے مطالبات میں اضافہ ہو جائے گا اور پناہ گزیں لوگوں کو واپس حاصل کرنے کے لئے جو مطالبات وہ کرتی رہی ہے ان کے لئے ایک مثال قایم ہو جائے گی جس کی وجہ سے اس قسم کے موقعوں پر سخت مشکلات کا سامنا ہو گا۔

(۱۸۵) حکومت نے اپنے اس فیصلے کے بعد یہ مناسب سمجھا کہ ایک جج کو چٹگاؤں میں متعین کر دیا جائے جو دورہ کر کے ملزموں کے مقدمات کی تفتیش میں مسٹر پیل کو مدد دے لیکن اسلامی قانون کی رو سے جس قسم کا ثبوت بہم پہونچانا ضروری تھا وہ چیری بو اور اس کے ساتھیوں کو سزا دینے کے لئے فراہم نہیں ہو سکتا تھا حالانکہ جو الزامات ان کے خلاف عائد کئے گئے تھے ان پر وہ فخر کرتے تھے اور تمام ملک میں یہ بات مشہور تھی جج مذکور نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ ملزموں کا سرغنہ اس بات کا خود اقبال کرتا ہے کہ اس نے ارا کان پر دھاوا کیا اور وہاں کے ایک سوداگر کو لوٹا لہٰذا اس جرم میں اسے جو انتہائی سزا دیجا سکتی ہے

[1] مورخہ ۳۱ اگست ۱۸۰۱ء

وہ چودہ سال کی سزا ہے

جو کچھ واقعات پیش آچکے تھے ان کے بعد برمیوں کی سی حکومت سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس قسم کے فیصلے سے مطمئن ہو جائے گی یا ان اصول اور دقتوں کو محسوس کر سکے گی جن کی بنا پر ہم اپنی علانیہ خواہش کے باوجود اس قسم کی دست درازیوں کو جن کی وہ بجا طور پر شکایت کرتی ہے روکنے سے قاصر ہیں۔

یہاں جو معاملات اس سلسلے میں پیش آرہے تھے ان سے حکام بالا غافل نہیں تھے۔ مجلس نظما نے حکومت ہند کو لکھا کہ ہمیں توی امید ہے کہ تم کنگ بیرنگ کی حفاظت سے دست بردار ہوتے پر مجبور نہیں ہوئے ہو گے کیونکہ جن لوگوں پر اس بات کا شبہہ بھی تھا کہ وہ کنگ بیرنگ کے حامی ہیں انھیں قتل کر ڈالا گیا اور اس طرح سے پورا ایک گاؤں جس کی آبادی ڈھائی ہزار تھی تہ تیغ کر ڈالا گیا اور وہاں مرد عورتوں اور بچوں میں سے کوئی بھی نہ بچ سکا۔ اگر حکومت آوا کے خلاف جنگ سے بچنے کی خاطر تم اس بات پر مجبور ہو گئے ہو تو ہمیں امید ہے کہ تم نے تنہا کنگ بیرنگ کو برمی حکومت کے حوالے کیا ہو گا اور اس کے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی اگرچہ وہ سرکش و مغرور ہیں تم نے نہیں دیا ہو گا۔ اگر اس خط کے پہونچنے تک کنگ بیرنگ کو نہ دیا گیا ہو تو ہماری رائے میں اُسے گورنر جنرل کی تحریر مورخہ ۳۰ جولائی ۱۸۱۳ء کے مطابق جس میں اس نے پیگو کے صوبہ دار کو اپنی طرف سے اطمینان دلایا تھا سخت نگرانی میں رکھنا زیادہ مناسب ہو گا[1]" دوسرے سرا سلے[2] میں اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہ برمیوں کی فوجیں برطانوی سپاہ کے ساتھ مل کر ملزموں کا تعاقب کریں نظما کہتے ہیں کہ "ہمیں یہ معلوم کر کے خوشی (۵۷۲)

عـــہ[1]۔ بحوالہ مراسلہ مورخہ ۴ر جنوری ۱۸۱۵ء

عـــہ[2]۔ مورخہ ۱۹ر مئی ۱۸۱۵ء

ہوئی کہ حاکم ضلع نے نہایت احتیاط سے کام لیا اور اپنی طرف سے اس قسم کے کوئی الفاظ استعمال نہیں کیے جن سے برمی یہ مطلب نکال سکیں کہ ہماری حکومت اس بات کا وعدہ کرتی ہے کہ اگر ملزموں نے اپنے آپ کو برطانوی سپاہ کے حوالے کر دیا تو انھیں برمی حکومت کے سپرد کر دیا جائے گا۔"

واقعات مابعد سے جب اس بات کا یقین ہو گیا کہ گمھ نووارد دل کی اصلاح ناممکن ہے اور ان کی دست درازیوں سے سخت اہم خطرات پیش آنے کا اندیشہ ہے تو مجلس نظما کے خیالات بالکل بدل گئے اور نوبت (۵۷۳) یہاں تک پہونچی کہ جن دلائل کی بنا پر نائب صدر باجلاس کونسل نے ملزموں کو برمیوں کے حوالے نہیں کیا تھا ان پر غور کرنے کے بعد انھوں نے اپنی یہ رائے ظاہر[1] کی کہ اگر آئندہ اس قسم کی کوئی صورت پیش آئے تو یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ ملزم اب ہماری اعانت و پناہ کے مستحق نہیں رہے ہیں لہذا اب جب کبھی وہ گرفتار کیے جائیں انھیں برمی حکومت کے حوالے کر دیا جائے۔

۱۸۱۷ء کے اواخر میں دربار آوا کے دو سفیر لاہور کے راجہ کے پاس جانے کی غرض سے کلکتے پہونچے۔ ان کے پاس گورنر جنرل کے نام کے بھی خطوط تھے لیکن وہ اس وقت پنڈاریوں کے خلاف جنگ میں مشغول تھا۔ مسٹر پیٹکل نے اس بارے میں جو معلومات چٹگاؤں میں فراہم کیں ان سے یہ پتہ لگا کہ کسی شخص نے رنجیت سنگھ کی طرف سے شاہ برما کو دھوکا دیا ہے اور اسی طرح ایک اور شخص نے اپنے آپ کو نواب[2] گوہاٹی بتا کر اپنی ریاست حاصل کرنے کے لئے برمی سپاہ حاصل کی اور گوہاٹی پر قابض

---

[1] ۔ بحوالہ مراسلہ مورخہ ۱۴ نومبر ۱۸۲۱ء

[2] ۔ یہ ایک ادنیٰ ریاست ہے جو آسام کی سرحد پر واقع ہے اور برطانوی حکومت کا اس سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

ہوگیا لہذا مذکورۂ بالا دونوں سفیر جن کا خاطر خواہ طریقے پر استقبال کیا گیا تھا اس اطلاع کے بعد گرفتار کر کے برمی حکومت کے عہدے داروں کے حوالے کر دیئے گئے اور انھیں جتلا دیا گیا کہ یہ لوگ دھوکے باز ہیں لیکن برمیوں نے اخلاص و اتحاد کے اس اظہار اور خیال کی کوئی وقعت نہ کی اور یہ بات بھی بعید از امکان نہیں معلوم ہوتی کہ مذکورۂ بالا دھوکے کی (۵۷۴) کارروائی برمی وزرا کے ایما سے کی گئی ہو اور ہندوستان کے اندرونی علاقے میں اپنے سفیر دوبارہ بھیجنے کی یہ ایک مزید کوشش ہو۔

۱۸۱۸ء میں راجہ رامبیر کا بیٹا دوسری مرتبہ سفیر کی حیثیت سے چٹگاؤں پہونچا اور مسٹر پیٹیل کو مطلع کیا کہ اس کے والد نے شاہ آوا کے حکم کے بموجب ایک خط لکھ کر گورنر جنرل کے نام روانہ کیا ہے اور وہ خود کلکتے جا کر اسے پیش کرنا چاہتا ہے۔ اور اس خط کی ایک باضابطہ نقل اس نے مسٹر پیٹیل کو بھی دی۔ اس تحریر کا لب لباب یہ تھا کہ چٹگاؤں ڈھاکہ، مرشد آباد و قاسم بازار کے علاقے ہندوستان میں شامل نہیں ہیں۔ یہ ہمارے علاقے ہیں۔ برطانوی حکومت دھوکے باز ہے۔ پہلی کوئی حکومت ایسی نہیں تھی۔ آپ کو ان علاقوں سے مالگزاری وصول کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ مناسب یہ ہے کہ آپ اُن علاقوں کی مالگزاری ہمیں دیا کریں اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ہم آپ کے مقبوضات تہ تیغ کر ڈالیں گے۔"

اس بات میں قطعی شبہ کی گنجایش نہیں کہ راجہ رامبیر نے برطانوی حکومت کے خلاف جنگ چھیڑنے کی غرض سے اپنے بادشاہ سے مشورہ کرلیا تھا اور واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ برما نے اپنی رائے میں اس موقع کو مناسب بھی خیال کیا تھا۔ عام خیال یہ بھی تھا کہ اس نے مرہٹوں سے بھی کچھ سمجھوتا کر لیا ہے۔ سفیر مذکور اپنے علاقے کو واپس بھی نہ ہونے پایا تھا کہ برطانوی فوجوں کو ایک شاندار فتح حاصل ہوگئی اور اسی زمانے میں برمیوں کو سپاہیوں کے خلاف سخت شکست ہوئی۔

لارڈ ہیسٹنگز نے اس خط کو جعلی قرار دیا اور شاہ برما نے اس طرز عمل کو (۵۷۵)
ناپسند بھی نہیں کیا۔ لارڈ موصوف لکھتا ہے کہ "اس ترکیب سے یہ بات
ٹل گئی اور مجھے اس گستاخانہ حرکت کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں رہی
میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ جب شاہ برما کو اپنے رازدار حلیفوں کی
شکست کا علم ہوگا تو وہ میری اس رائے سے جس کی بدولت اُسے
خاموش بیٹھنے کا بہانہ مل جائے گا خوب خوش ہوگا۔"

مگھ نوواردوں کا طرز عمل اور اس کے نتائج یہاں توضیح سے
بیان کردیئے گئے ہیں تاکہ ان اسباب کے بیان کرنے میں سہولت
ہو جن کی وجہ سے برطانوی اور برمی حکومتوں کے درمیان غلط فہمیاں
پیدا ہو رہی تھیں۔

اراکان کی فتح کے بعد برمیوں نے وہاں کے باشندوں پر جو
دردناک مظالم کئے تھے ان کی وجہ سے یہ لوگ برطانوی علاقے
میں داخل ہوئے۔ جب یہ لوگ یہاں آئے تو ان کی حالت ایسی تھی
کہ ہم انھیں پناہ دینے سے ہرگز انکار نہیں کر سکتے تھے اور مقامی حالات
کے لحاظ سے اس بات کی ضرورت تھی کہ انھیں ایک ایسے مقام پر
آباد کرایا جائے، جہاں ان کے لئے ذریعۂ معاش خاطر خواہ طریقے پر
مہیا ہو سکے۔

جو مقام تجویز کیا گیا تھا اس پر جو اعتراضات تھے وہ صاف طور
سے بیان کردئیے گئے لیکن جس شخص کو وہاں متعین کیا گیا تھا اس نے
یہ رائے ظاہر کی کہ ان اعتراضات کو رفع کیا جا سکتا ہے لہٰذا
حکومت نے اس کی رائے سے اتفاق کرلیا۔

جس روز سے کہ ان مگھوں کو سرحدی مقامات پر آباد ہونے
کی اجازت دی گئی اُسی دن سے اس قبیلے کے فطری جذبات اور
حب وطن کے احساس اور ہماری انسانی ہمدردی اور ہماری حکومت کے
اصولوں کا مغرور برمیوں کے مغالطوں، غرور اور حسد سے تصادم (۵۷۶)

شروع ہو گیا جس کی وجہ سے انھیں برابر صدمہ و اشتعال پہونچتا رہا۔

اس قسم کے تصادم سے دست درازیاں اور انتقامی کاروائیاں شروع ہو گئیں اور صاف ظاہر تھا کہ ان کی بدولت ایک نہ ایک دن جنگ ہو کر رہے گی۔

جن اسباب کی بنا پر برمیوں کو جائز شکایت تھی ان میں لارڈ ہیسٹنگز کے دور حکومت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ کنگ بیرنگ کے انتقال کے بعد سے مگھوں کا اراکان میں کوئی زبردست حملہ نہیں ہوا تھا لیکن باوجود اس کے برمی حکومت کے عہدہ داروں کی تحریر اور مراسلوں کا طرز تحریر روز بروز گستاخانہ ہوتا گیا اور ہماری طرف سے جنگ سے بچنے کی جو خواہش ظاہر کی گئی اس سے ان کے مخاصمانہ جذبات اور ارادے مشتعل ہوتے رہے لیکن انھیں اپنی نیز ہماری طاقت کا بہت غلط اندازہ تھا لہذا ان کی بجا شکایت اور ہوس کے علاوہ ان کے اس طرز عمل کی ایک وجہ یہ بھی تھی اور سرکاری کاغذات جن سے یہ سب واقعات اخذ کئے گئے ہیں ان کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شروع سے جو خطرات پیش آرہے تھے انھیں زیادہ عرصہ تک نہیں ٹالا جا سکتا تھا۔

رنجیت سنگھ کی مصروفیت

لارڈ ہیسٹنگز کے دور حکومت میں رنجیت سنگھ والی لاہور پورے طور سے پنجاب کے استحکام اور کشمیر و ملتان کی تسخیر میں مشغول رہا۔ اس زبردست سردار نے اس زمانے میں برطانوی حکومت کے خلاف کسی قسم کی کوئی کاروائی نہیں کی۔ وہ انگریزوں کی
قوت سے بخوبی واقف ہو گیا تھا لہذا وہ دھوکا کھا کر کسی ایسے اتحاد (۵۷۷)
میں شریک نہیں ہو سکتا تھا جس کی وجہ سے خود اس کی طاقت معرض خطر میں آجائے کیونکہ باوجود اس کی زبردست شخصیت کے اس کی سلطنت چند منتشر اور بے میل عناصر کا مجموعہ تھی اور ہمارا خیال

ہے کہ وہ اپنے بانی کے بعد زیادہ عرصے تک اپنا وجود نہیں برقرار رکھ سکے گی۔

رُہیلکھنڈ کے تنازعات اور بریلی کی بغاوت

۱۸۱۶ء میں بریلی میں جو جو واقعات پیش آئے[۱] اگرچہ ان کا سیاسی معاملات سے راست کوئی تعلق نہیں تھا تاہم ان کا انگریزوں کی حکمت عملی کے عام اصولوں سے اس قدر قریبی تعلق ہے کہ انھیں اس جگہ خاموشی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پولیس کے مصارف کے لئے وہاں ایک معمولی محصول عائد کرنے کا جب خیال کیا گیا تو اس بنا پر ایک زبردست بغاوت ہو گئی۔ سلطنت کے دوسرے علاقوں میں اس قسم کی کارروائی ہو چکی تھی اور ابتدا میں جو مشکلات پیش آئی تھیں وہ رفع کر دی گئی تھیں[۲] لیکن رُہیلکھنڈ کی آبادی اس قسم کی تھی کہ وہاں بہت سخت مخالفت کا اندیشہ تھا اور جس دن سے کہ اس محصول
کی اجرائی کی کوشش کی گئی بریلی میں جو اس علاقے کا مستقر تھا شورش برپا (۵۷۸
ہو گئی اور اس کی وجہ سے پورے شہر میں بدامنی پھیل گئی۔ جن واقعات اور حالات کی وجہ سے علانیہ بغاوت کی نوبت پہونچی ان پر خاص طور سے

---

[۱] ۔ ان واقعات اور متعلقہ کارروائی کے تفصیلی حالات حکومت بنگال کے سرکاری کاغذات متعلقہ محکمہ عدالت و مراسلات مورخہ ۳۱ مئی ۱۸۱۶ء و ۲۲ جولائی ۱۸۱۶ء میں درج ہیں۔

[۲] ۔ صدر حکومت نے ان واقعات کی کیفیت اپنے مراسلہ مورخہ ۲۳ مارچ ۱۸۱۴ء میں بیان کی ہے۔ اگرچہ اس میں کہیں کہیں بغاوت کے حالات بھی درج ہیں لیکن حکومت کو بالآخر کامیابی کی توقع تھی۔ ڈھاکہ میں اس کی جو مخالفت ہوئی اُسے وہاں کے باشندوں کی اشتعال انگیز طبیعت پر محمول کیا گیا۔ علاوہ ازیں جن کاموں کا ان کے قریبی مفاد سے تعلق ہوتا ہے اُس کی بابت وہ ہمیشہ بری رائے قائم کرتے ہیں۔ الہ باد کے حاکم ضلع مسٹر فورٹیسکیو (Mr. Fortes cue) کی دانشمندی اور سنجیدہ طبیعت کی وجہ سے وہاں یہ محصول کامیابی کے ساتھ رائج ہو گیا۔

توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اس بغاوت کے اسباب و حالات کے متعلق تفصیلی اور نہایت مستند واقعات کمشنر وائف[1] کی پیش کردہ کیفیت میں ملتے ہیں جو حکومت کی طرف سے اس کے اسباب اور اس کی نوعیت کے متعلق تحقیقات کرنے اور تحقیق شدہ مسائل کے ہر متعلقہ امر پر اپنی رائے پیش کرنے کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ ان محققین کی رائے میں چوکیداری یا پولیس کے انتظامات سے (یا عوام کے سمجھانے کے لئے جو نام بھی تجویز کیا جائے) ایک قسم کا براہ راست محصول عائد ہوتا تھا جسے ذاتی یا شخصی محصول سے بہ آسانی جدا نہیں کیا جا سکتا اور ان کے بیان کے مطابق اس قسم کے محصول سے ہندوستانیو کو ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ سابق موقع پر جو محصول پولیس اور امکنہ[2] کے لئے

---

[1] ۔ یہ کیفیت ایک مراسلہ کی صورت میں حکومت کے معتمد خاص کے نام روانہ کی گئی تھی۔ (بحوالہ کاغذات متعلقہ محکمۂ عدالت مورخہ ۲۵ر اکتوبر ۱۸۱۶ء) تحقیقات کنندگان سر ایڈورڈ کول بروک Sir Edward Colebrook مسٹر ایلیٹ Mr. Elliote اور مسٹر پیری Mr. Perry تھے۔ ان اصحاب کے ذاتی خصوصیات اور خصوصاً ان کے لائق اور ممتاز صدر کی شخصیت کی وجہ سے ان کی پیش کردہ کیفیت نہایت قابل وقعت ہے۔

[2] ۔ اس میں ۱۸۱۲ء کے بنارس کے واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ بنگال، بہار و اڑیسہ کے اکثر بڑے بڑے شہروں میں مکانات پر محصول عاید کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ شہر بنارس میں اس کی جو مخالفت ہوئی اس کی نوعیت اور اس کے طریقوں کی طرف خاص طور سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس سے محصول کے معاملات میں ہندوستانی رعایا کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی سوسائٹی کس طرح متحد اور با اثر ہے ان پر لا شبہہ برہمنوں کا بہت زیادہ اثر ہے لیکن ان کے ہر قبیلے اور ہر طبقے کے سردار کا اپنے اپنے حلقہ میں اس سے بھی زیادہ اثر ہے ایک عرصے تک تمام دکانیں بند رہیں لوگوں نے محنت و مزدوری کرنے سے انکار کر دیا اور اس عرصہ میں یہ لوگ اپنے اپنے سردار کے احکام کی نہایت سختی سے پابندی کرتے رہے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک فوج کسی زبردست تنظیم کی ماتحتی میں کام کر رہی ہے۔

تجویز ہوئے تھے اور جنھیں عام مخالفت کی بنا پر مسترد کر دیا گیا تھا ان سے (۵۷۹)
یہ مشابہ تھا لہذا یہ خیال کر لینا چاہئے تھا کہ اس موقع پر بھی عام مخالفت
ہوگی اور پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی مخالفت کا لحاظ کرنا پڑے گا[1]
محققین اس بات پر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ حاکم ضلع نے اس
محصول کی اجرائی کا تمام انتظامی کام کوتوال یعنی پولیس کے ہندوستانی
عہدہ دار کے تفویض کر دیا۔ پولیس والے ہر قسم کی دھمکیاں دینے اور
بیجا حرکات کرنے کے عادی ہوتے ہیں جو رعایا کے اکثر طبقوں کے
وقار اور عادات وخصائل کے منافی ہوتی ہیں اور ان کے لئے زیبا نہیں
معلوم ہوتی ہیں۔ کوتوال مذکور پہلے ہی سے مغرور مشہور تھا۔ اس کی
اس قسم کی حرکات سے اس کے خلاف ایک آگ بھڑک اٹھی۔ یہ معلوم
ہوتا ہے کہ اعلیٰ طبقے کے پٹھان اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔
یہ لوگ اپنے ذاتی وقار کے خلاف ہر معمولی بات کو بھی بہت محسوس کرتے
تھے لہذا ایک کمینے دیہاتی ہندو (کوتوال) کی بابت یہی مشہور تھا کہ اسکی بدزبانی
خاص طور پر ان کے تعصبات و احساسات کے خلاف تھی اگرچہ عہدے دار
مذکور کی نفرت سے ایک آگ بھڑک گئی اور معاملات بہت بڑھ گئے تاہم
یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ روہیلکھنڈ کی پوری آبادی اور خصوصاً ہندو (۵۸۰)
محصول عائد کرنے کے اس اصول[2] کے خلاف تھے اور اسی وجہ سے استعدل

---

[1] اقتباس از مراسلہ عدالت بحوالہ کاغذات مذکورہ بالا۔
صفحہ (۱۱۹) صفحہ (۶)۔

[2] حکومت ہند اپنے مراسلہ مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۸۱۰ء میں مجلس نظار کو سرکاری
آمدنی بڑھانے کی ہدایات کا حوالہ دے کر مکانوں پر محصول عاید کرنے کی تجویز کے متعلق
اپنے دلائل تفصیل سے پیش کرتی ہے اور یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ اس معاملے میں کسی خاص
مخالفت یا معقول وجوہ کی بنا پر کسی قسم کی بدظنی کی ہرگز توقع نہ تھی کیونکہ:-
اول۔ ایک عرصہ سے یہ محصول کلکتے میں جاری ہے

بقیہ حاشیہ بر صفحہ آیندہ

زبردست مخالفت ظہور پذیر ہوئی اور چونکہ بریلی اس صوبے کا دارالحکومت ہے لہٰذا یہیں سے اس کی ابتدا ہوئی۔

بریلی میں ہنگامہ آرا جلسوں کے منعقد ہونیکے کئی روز بعد مفتی[1] (یعنی عدالت کے ایک خاص عہدہ دار) نے رعایا کی طرف سے حاکم ضلع کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی لیکن اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔

۱۵ اپریل کو جب کہ پولیس کے چند آدمی محصول وصول کرنے کی غرض سے ایک معمولی چیز جس کی مالیت مطلوبہ رقم کے مساوی تھی قرق کر رہے تھے تو اس کے دوران میں ان
(۵۸۱) کے ہاتھ سے ایک عورت زخمی ہو گئی۔ اس واقعے سے شورش میں بہت اضافہ ہو گیا بہت سے لوگ اس عورت کو ایک چارپائی پر ڈال کر مفتی کے پاس لے گئے۔ جس نے حاکم ضلع کے پاس لے جانے کی صلاح دی۔ آخرالذکر نے جب ان لوگوں کو حسب قاعدہ عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کی ہدایت کی تو وہ اسے دوبارہ اپنے ہندوستانی حاکم عدالت کے پاس لے گئے۔ اس نے یہ سن کر کہا کہ اگر حاکم ضلع کا یہی انصاف ہے تو اس شہر میں نہ کسی شخص کی جان محفوظ رہ سکتی ہے اور نہ کوئی اپنی عزت برقرار رکھ سکتا ہے لہٰذا اب جس قدر جلد ممکن ہو اس شہر کو خیرباد

بقیہ حاشیہ صفحہ (۴۵۷) دوسرے۔ ہندوستانی حکومتوں میں بھی لوگ اس قسم کے خاص محصول سے ناواقف نہیں ہیں۔ لیکن باوجود اس کے ہر طرف ایک خطرناک اور عام مخالفت محصول کی دکھائی دیتی ہے لہٰذا اس سلسلے میں حکومت کی بھی مخالفت ہے۔ برہمنوں اور سادھوؤں کے اثر سے لوگوں کو مخالفت پر آمادہ کیا جاتا ہے مقامی عہدہ داروں کے احکام کی علانیہ مخالفت کیجاتی ہے ایسی صورت میں حکومت کے پاس بجز اسکے اور کوئی چارہ باقی نہیں رہا کہ "اپنے احکام و قوانین کی پابندی کرانے کے لئے قومی قوت استعمال کرے"۔

[1] ۔ چونکہ اسلامی قانون کی بنیاد قرآن شریف پر قایم ہے۔ بقیہ حاشیہ بر صفحہ آیندہ

کہہ دینا چاہئے۔" یہ کہنے کے بعد اس نے اپنے ارادے پر عمل کرنے میں قطعاً تاخیر نہ کی اور جج سے شکایت کرنیکے لئے جو قریب ہی رہتا تھا اپنے مکان سے باہر آیا لیکن بدقسمتی سے حاکم ضلع سے ملاقات ہوگئی جو چند فوجی سپاہیوں کے ہمراہ شورش دبانے کی غرض سے شہر میں جارہا تھا مفتی یہ افواہ سن چکا تھا کہ حاکم ضلع اُسے گرفتار کرانے والا ہے لہذا اس وقت مسلح سپاہیوں کے ساتھ اُسے دیکھ کر اس بات کا یقین ہوگیا کہ وہ اسی ارادے سے آرہا ہے۔ سڑک پر جو مجمع تھا اُسے بھی یہی خیال ہوا لہذا مسلح سپاہیوں سے ان لوگوں کی ایک جھڑپ ہوگئی جس میں کئی جانیں تلف ہوئیں۔ مفتی کسی قدر زخمی ہوکر بچ گیا اور وہاں سے نکل بھاگا لیکن دو شخص جن کا ان سے قریبی تعلق تھا اور جو خاص اس کی حفاظت میں تھے ہلاک ہوگئے۔ خیال (۵۸۲) کیا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک نے سب سے پہلے حملہ کیا تھا اور اس خیال کی بناء پر کہ حاکم ضلع اس کے مربی کو گرفتار کرنے کی غرض سے آیا ہے اس نے دو سواروں کو ہلاک کرڈالا۔

چونکہ مجمع کا شروع سے حکام کی مخالفت کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا لہذا اُسے بآسانی منتشر کردیا گیا لیکن اندازے سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی پر یہ خیال غالب رہا کہ حاکم ضلع اُسے گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اس نے سواد شہر کی ایک مسجد میں جاکر پناہ لی اور وہاں آنحضرتؐ کے نام کا ایک سبز علم مفتی کے ساتھیوں اور معاونوں کو اس کی حفاظت کی خاطر جمع کرنے کے لئے نصب کردیا گیا۔

۱۸ اپریل کو حکم دیا گیا کہ ہندوستانی سپاہیوں کی فوج کے دو دستے کپتان باسکیون کی کمان میں مع دو توپوں کے مسجد مذکور کے قریب متعین کردئے جائیں۔ اگرچہ اس کا مقصد بلوہ روکنا تھا تاہم ان سپاہیوں کی

بقیہ حاشیہ صفحہ (۴۵۸)۔ اس لئے انکا قانون داں افسر حاکم عدالت بھی ہوتا ہے اور مذہبی پیشوا بھی۔

عله ۔ بحوالہ کیفیت پیش کردہ تحقیقات کنندگان۔

عله ۲ ۔ لفٹنٹ لوکاس جو حاکم ضلع کا ہمرکاب تھا اس کے بیان سے یہ بات واضح ہے۔

قیام گاہ کے قرب کی وجہ سے سب لوگوں کو یقین واثق ہو گیا کہ ان کا منشاء مفتی کو گرفتار کرنا ہے۔ مفتی کی پہلے ہی بہت کافی عزت تھی۔ اس کی بزرگی۔ اس کے تقدس اور عہدے کی وجہ سے اس کی جو وقعت تھی اس کے علاوہ اب اس کی حیثیت ایک مظلوم کی سی تھی چونکہ اس نے عوام کا ساتھ دیا تھا لہذا ایسی صورت میں ہر طبقے اور ہر فرقے کا یہ فرض تھا کہ وہ اس کی حفاظت کے لئے آپس میں متحد ہو جائیں۔

(۱۸۳۱ء) مفتی کے پاس جو لوگ جمع ہو گئے تھے ان سے گفت وشنید شروع کی گئی اور سمجھوتے کے لئے مختلف تجویزیں پیش کی گئیں لیکن کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کے دل سے مجوزہ محصول کی مخالفت اور اس کے وصول کرنے والوں کی نفرت سب غائب ہو گئی ان کے مذہبی جذبات کو ابھار دیا گیا تھا لہذا وہ اب اپنے مذہبی جوش کے سامنے کسی اور چیز کو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ گرد و نواح کے علاقے سے جو لوگ ان کی اعانت کے لئے جوق جوق آنے شروع ہوئے ان سے اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا اور ان کے سرکش اور بہادر سرداروں[1] نے بھی انھیں خوب ہی ابھارا حتیٰ کہ جن لوگوں نے ابتدا میں انھیں اسطرح آمادہ کیا تھا اب مجمع ان کے قابو سے باہر ہو گیا۔ کپتان باسکیون کی فوج پر ایک نہایت زبردست حملہ کیا گیا اور استقلال کے ساتھ اُسے جاری رکھا گیا۔ اگرچہ کپتان مذکور کو تھوڑی سی کمک مل گئی تھی تاہم یہ خیال تھا کہ اس قدر کثیر مجمع کے حملے اگر اسی طرح جسارت کے ساتھ جاری رہے تو یہ فوج زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکے گی۔ خوش قسمتی سے سپہدار اور اس کے معاون افسروں کے عزم اور قلیل التعداد مگر بہادر ہندوستانی سپاہیوں کے استقلال اور نڈری اور چند بے قاعدہ سواروں

---

[1] ان سرداروں میں سے ایک ذی وقار بد طن پٹھان محمد عیسیٰ نامی نے اس میں بہت نمایاں حصہ لیا تھا۔

کی وفاداری، مستعدی اور جسارت کی بدولت (اگرچہ ان میں سے اکثر کے عزیز و اقارب ان کے مقابلے پر موجود تھے) فوج غالب آگئی اور بدحواس مجمع منتشر ہو گیا۔ لڑائی کئی گھنٹے جاری رہی تھی اور اس میں رعایا کے تقریباً دو ہزار آدمی مجروح اور ہلاک ہوئے۔

اگر اس لڑائی کا نتیجہ کچھ اور ہوتا تو نہایت ہی دردناک منظر پیش (۵۸۴)
آجاتا۔ اس بات کے لئے کافی ثبوت موجود ہے کہ روہیلکھنڈ کے پورے علاقے میں ایک خاص قسم کے خیالات پیدا ہو گئے تھے جن کی وجہ سے اس صوبے کا ہر فرد بریلی والوں کا ساتھ دینے کے لئے تیار تھا۔ ان خیالات اور خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ رعایا کو اپنی حکومت سے کوئی خاص وابستگی نہیں تھی مفتی کی حمایت میں جو صدا اٹھی اس پر ہر ایک نے بے ساختہ لبیک کہا۔ جس جگہ بھی یہ صدا پہونچ سکی وہاں اس کا یکساں اثر ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں عوام کو بھڑکانے یا مذہبی جوش کو ابھارنے کے لئے محض ایک ادنی اشتعال کافی ہوتا ہے اور اس بات میں بھی قطعی شبہہ نہیں ہو سکتا کہ بریلی میں جو حالات درپیش تھے اگر ان میں کپتان باسکوسن کی فوج ختم ہو جاتی تو صوبے بھر میں اس یوروپین آبادی کا جو زبردست فوجی حفاظت میں نہ تھی قتل عام ہو جاتا۔

تحقیقات کرنے والوں کو ہدایت تھی کہ وہ اپنی کارروائی بریلی کے واقعات تک محدود نہ رکھیں بلکہ کمپنی کی حکومت سے شمالی ہند کے مغربی صوبوں میں جو اثرات پیدا ہوئے ہیں ان پر بھی غور کریں لہذا اس مسئلے پر انھوں نے جو رائے پیش کی ہے اس سے زیادہ کوئی دوسری رائے قابل وقعت نہیں ہو سکتی۔ ان اصحاب نے اس اہم موضوع پر جس آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کے ذاتی خصوصیات اور حکومت کے اعتماد کے جو اسے ان کی ذات پر تھا شایان شان ہے۔ انھوں نے جو کیفیت پیش کی تھی

(۴۸۵) اس میں وہ لکھتے ہیں کہ اس قابل نفرت محصول کی اجرائی کے علاوہ ہیں کوئی دوسری وجہ اس شورش کے آغاز کی نہیں معلوم ہوتی۔ یہ محصول رُہیلکھنڈ میں ہر جگہ بری نگاہ سے دیکھا گیا تھا۔ ان علاقوں میں اس قسم کے محصول یا کسی قانون کو معقول احتیاط اور قبل از قبل پوری تحقیقات اور باخبر و واقف کار عہدہ داروں کے اتفاق آراء کے بغیر جاری کرنا خلاف مصلحت ہے۔" اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ان بعید صوبوں میں جہاں حکومت کو رعایا کے مختلف اور بے میل طبقوں کے عادات و خصائل۔ رجحانات اور تعصبات کا پورے طور پر علم نہیں ہو سکتا ایسے معاملات سے بچنے کا جن میں حکومت بغیر کسی معقول حفاظت کے پھنس جائے اور تھوڑے ہی زمانے کے بعد ان سے علیٰحدگی اختیار کرنے کی ضرورت محسوس ہو تنہا ذریعہ یہ ہو سکتا ہے کہ مقامی عہدہ داروں اور عدالت و مالگزاری کے خاص خاص حکام کی رائے قبل از قبل حاصل کر لی جائے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے قانون کے اجراء سے قبل جس میں حکومت کا کوئی خاص مفاد پیش نظر نہ ہو (جیسا کہ اس معاملے میں تھا) کسی طریقے سے باخبر ہندوستانیوں کے خیالات معلوم کر کے اندازہ کر لیا جائے کہ مجوزہ قانون کے عمل درآمد کا کیا اثر ہوگا۔ ایسے موقعوں پر مقامی احکام کے ذریعے سے مذکورۂ بالا حیثیت کے لوگوں کے خیالات معلوم کئے جا سکتے ہیں اور ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایسے قوانین جو محض ہندوستانی رعایا کی حفاظت اور فائدے کی خاطر رائج کئے جائیں ان کے احساسات اور تعصبات کے خلاف تو ثابت نہیں ہوں گے

(۵۸۶) تحقیقات کنندگان حکومت کی توجہ خاص طور پر اس مسئلے کی طرف مبذول کراتے ہیں کہ اگر مشرقی صوبوں میں یا مغربی صوبوں کے کسی خاص علاقے میں مقامی حالات کے لحاظ سے کسی قانون کی ضرورت محسوس

ہو تو اسے بغیر سوچے سمجھے دوسرے صوبوں میں جاری کر دینا خلافِ مصلحت ہے۔ یہ اصول جو غالب نظر آتا ہے کہ برطانوی حکومت کے تمام قوانین لازمی طور پر عام ہونی چاہئیں غلط ہے۔ اپنی اس خیال کی تائید میں وہ زیر بحث معاملے ہی کو بطور مثال کے پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "یہ بات صاف ظاہر ہے کہ دوسرے اضلاع کے شہروں میں چوکیداروں کے انتظامات سے خاطر خواہ فائدہ حاصل ہوا ہو لیکن بریلی میں نہ وہ صرف بے ضرورت تھے بلکہ اِن سے پولیس کے سابق انتظامات میں جو شہر کی حفاظت کے لئے معقول اور وہاں کے باشندوں کے نزدیک قابلِ اطمینان ثابت ہو چکے تھے کمزوری واقع ہونے کا اندیشہ تھا۔"

ان اصحاب نے اپنی یہ رائے بھی حکومت سے پوشیدہ نہیں رکھی کہ مالگزاری و عدالتی انتظامات کا جو طریقہ رائج ہے اُسے شمالی ہند کے ممتاز طبقے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ وہ اس بات کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ اکثر قوانین رعایا کے قومی خصوصیات اور معاشری خیالات کے منافی ہیں اور اُنھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی سلسلے میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ہماری عدالتیں ان صوبوں کے اعلیٰ طبقوں کے لئے تکلیف دہ ہیں اور ادنیٰ طبقوں کے نزدیک بھی وہ آیۂ رحمت نہیں ہیں۔ مصارف کی وجہ سے ان کی توان عدالتوں میں رسائی تک نہیں ہوتی۔ مقدمات کے فیصلے میں جو تاخیر ہوتی ہے اس کی وجہ سے وہ بے کار سمجھی جاتی ہیں۔[1]" (۵۸۷)

"ادنیٰ حیثیت کے لوگوں کے ذریعے سے ملزموں کا پتا لگانے میں جو بے جا سختی اور بے احتیاطی برتی جاتی ہے اور اس سلسلے میں معمولی

---

[1] - مجوالۂ مراسلہ تحقیقات کنندگان۔ ان کا بیان ہے کہ عدالتی و مالگزاری انتظامات کی بابت جو رائے ہم نے قائم کی اور اس سے جو نفرت بتائی جاتی ہے اس کی تصدیق صوبہ کے قابل ترین حکام کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

باتوں پر جو گرفتاریاں عمل میں، آتی ہیں اور خانہ تلاشیاں ہوتی ہیں ان کی لپیٹ میں اکثر ذی مرتبہ اور باوقعت اشخاص بھی آجاتے ہیں" ان سب باتوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے وہ اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ان حرکتوں کا عوام پر جو اثر ہوا ہے وہ ان کے خاص مرکز سے لے کر بہت دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔

اس کے بعد وہ اپنی توجہ مالگزاری کے انتظامات کی طرف مبذول کرتے ہیں۔ اور دوامی بندوبست کے مواقف اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اس بات کی زبردست سفارش کرتے ہیں کہ جب تک دوسرا طریقہ رائج ہے مالگزاری وصول کرنے میں زیادہ سختی سے کام نہ لیا جائے اور جب کبھی کوئی خاص مصیبت پیش آئے یا عارضی طور پر کوئی نقصان واقع ہو تو کبھی کبھی مالگزاری معاف کرنے کی طرف بھی توجہ کی جائے۔

بریلی کے فساد میں ہندوؤں کی تعداد بلاشبہ مسلمانوں سے زیادہ تھی اور ان کی برہمی کا خاص سبب مذکورۂ بالا قابل نفرت محصول تھا لیکن جیسا
که اکثر سابق موقعوں پر ہو چکا ہے اس مرتبہ بھی ہندو رفتہ رفتہ مسلمانوں کے (۵۸۸)
مذہبی احساسات کے ہمدرد بن گئے۔ ان دونوں طبقوں میں جو عام خیال ہے کہ انھیں عیسائی مذہب قبول کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اس کی وجہ سے یہ صورت پیش آجاتی ہے۔ حکومت سے جو لوگ بدظن ہوتے ہیں وہ اس خیال کو ہمیشہ تازہ رکھتے ہیں اور جب کبھی برطانوی حکومت کے خلاف کوئی کارروائی کرنی ہوتی ہے تو اسی کی بدولت اتحاد قائم کرلیا جاتا ہے۔ تحقیقات کرنے والے اصحاب اس مسئلے کا بریلی کے واقعات کے سلسلے میں حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اس بات میں قطعی شبہہ کی گنجائش نہیں کہ مسلمانوں کے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا ہے کہ حکومت ان کے مذہب کا خاتمہ کرنا چاہتی ہے لہٰذا ان کے خیال کے موافق اگر کسی معاملے میں اس قسم کی ذرا سی جھلک بھی آجاتی ہے تو وہ اُسے نہایت حسد اور اشتباہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس موقع پر اُنھوں نے ہندوؤں کو بھی اسبات کا یقین دلا دیا کہ ان کا مذہب بھی معرض خطر میں ہے"

چند لوگوں کو جن پر یہ شبہ تھا کہ انھوں نے فساد میں نمایاں حصہ لیا تھا گرفتار کیا گیا اور ان پر فوجداری مقدمہ چلایا گیا لیکن تعجب خیز امر یہ ہے کہ ثبوت ناکافی ہونے کی وجہ سے سب رہا کر دیئے گئے۔ البتہ صرف ایک نوعمر جاہل شخص کا جرم ثابت ہوا مگر اُسے بھی معاف کر دیا گیا۔ تمام باشندوں کو بجز خاص خاص سرغنوں کے جو شروع ہی میں شہر سے فرار ہو گئے تھے معاف کر دیا گیا اور امن کا اعلان ہو گیا۔

بریلی میں جو واقعات پیش آئے اگر انھیں دماغ سے نکال کر ہم اسبات پر غور کریں کہ رعایا کی ایک ایسی کثیر تعداد سے جو حکومت سے بدظن، مسلح اور مذہبی جوش سے مغلوب تھی اس قسم کے جرائم سرزد ہوئے تھے انھیں کمپنی کی سی حکومت ہرگز معاف نہیں کر سکتی تھی تو مذکورۂ بالا واقعات کے مطالعے (۵۸۹) سے ہمیں سخت تعجب ہوگا لیکن اس قسم کے واقعات آئندہ پیش آنے کا ہمیشہ امکان رہے گا لہٰذا اگر صحیح طریقے پر ان کا مطالعہ کیا جائے تو ان سے متعدد تکلیف دہ مگر مفید سبق حاصل ہوں گے اور ان پر پورے طور سے توجہ کرنے کے بعد ہی ہم اپنی ہندوستانی سلطنت کے برقرار رکھنے کی توقع کر سکتے ہیں۔

مارکوئس ہیسٹنگز کے دور پر ایک نظر

(۱) غنیموں پر غلبہ۔

مارکوئس ہیسٹنگز کے دور کے سیاسی واقعات کا ذکر ختم کرتے ہوئے اس کے ان تمام کاموں پر جو پہلے بیان ہو چکے ہیں مزید رائے زنی کرنے کا خیال نہیں ہے۔ جس طرح اس نے نیپال کے خلاف جنگ میں مستعدی و دانشمندی ظاہر کی اس طرح کامیابی کے بعد جو ریاست مذکور کے خلاف حاصل ہوئی نہایت اعتدال اور حکمت عملی سے کام لیا۔ پنڈاریوں کے ہر سال کے حملوں سے جو کمپنی کے علاقے پر ہوتے رہتے تھے اور مرہٹوں کے مخاصمانہ اتحاد کا پتہ لگنے کے بعد جو بار بار قائم ہوتا رہتا تھا اُسے اسبات کا یقین ہو گیا کہ اول الذکر کا خاتمہ کرنا اور آخر الذکر کو ان کے اس مسلک سے ہٹانا ضروری ہے خواہ وہ گفت و شنید سے

ہو یا جنگ کے ذریعہ سے کیونکہ جب تک اس کا سلسلہ باقی رہے گا ہندوستان میں مستقل طور پر امن قائم کرنے کی ہر کوشش ناکام رہے گی لیکن اس کام کی مصلحت و ضرورت کی بابت کامل یقین ہونے کے باوجود اس نے اپنی طرف سے کوئی فعل ایسا سرزد نہیں ہونے دیا جس کی وجہ سے وہ خطرات جو اسے اٹل معلوم ہوتے تھے قبل از وقت پیش آجائیں۔ حملہ آوروں کو سزا دینے اور اپنی رعایا اور اپنے حلیفوں کو محفوظ رکھنے کے لئے وہ جو کارروائی ضروری سمجھتا تھا اسکی حکام بالا سے اس نے منظوری حاصل کرنے کی کوشش کی اور وہ حاصل ہو گئی۔

لارڈ ہیسٹنگز نے جب اپنی زبردست اور عاقلانہ حکمت عملی پیش کی (۵۹۰)
تو اس نے اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا کہ انگلستان میں حکام بالا کو پورے واقعات سے آگاہی ہو جائے اور اس وسیع موضوع کے ہر پہلو پر اس کے جو خیالات ہیں ان سے بھی وہ واقف ہو جائیں۔ یہ سب باتیں اس کے ایک قابلانہ مراسلے میں نہایت وضاحت کے ساتھ درج ہیں جس میں اس نے سلطنت کی گزشتہ اور موجودہ حالت کی نہایت جامع کیفیت پیش کی ہے اول ان مختلف طریقوں کو بیان کرنے کے بعد جن کے ذریعہ سے قوموں کو محکوم بنایا جاتا ہے یا آپس میں ایک دوسرے سے قریبی تعلقات قائم کئے جاتے ہیں وہ ان تمام اصولوں پر تفصیلی بحث کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ برطانوی حکومت ہند کی انوکھی حالت پر ان کا کس حد تک اطلاق ہو سکتا ہے۔ بعدہٗ وہ سابق تجربوں سے نتائج اخذ کرتا ہے اور بالآخر مارکوئس ویلزلی کی حکمت عملی اور اس کی دانشمندی پر اپنا اعتقاد ظاہر کرتا ہے اور ناقابل تردید واقعات پیش کر کے یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کے خلاف طریقۂ عمل اختیار کر کے ہم نے نہ صرف اپنی مشکلات میں اضافہ کر لیا ہے بلکہ ہندوستان کے سب سے زیادہ زرخیز صوبوں میں جنگ و غارتگری روا کر دی ہے اور یہ سب نتیجہ اس بات کا ہے کہ ہمیں مقتدر اعلیٰ کی حیثیت سے جو زبردست قوت حاصل ہے اس کا استعمال ہم نے ترک کر دیا ہے۔ اور اس جدید طریقۂ عمل کو

برقرار رکھنے کی جو کوشش حال میں کی گئی ہے اس سے متعدد خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جن سے ہمیں بہت زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے۔ گذشتہ چند سال ہی میں کسی اہم واقعات سے یہ بات صاف طور پر ثابت ہے کہ یہ طریقۂ عمل جتنا کہ دوسری ریاستوں کے امن واستحکام کے منافی ہے اُسی قدر ہمارے مقبوضات کے امن وامان اور حفاظت کے بھی خلاف ہے۔

(۵۹۱) اس زبردست پیروی کے باوجود حکام بالا غالباً انگلستان سے کسی ایسے کام کی ہرگز منظوری نہ دیتے جس میں جنگ کا خطرہ ہوتا مگر پنڈاریوں کی روز افزوں دست درازیوں نے گورنر جنرل کی پیشین گوئیوں کو صحیح ثابت کردکھایا اور حکام بالا یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ اب زیادہ تحمل کی گنجائش نہیں ہے۔ برطانیہ کا نام برقرار رکھنے اور اپنی رعایا کی حفاظت کرنے کے لئے جو ہم پر آس لگائے بیٹھی ہے سختی سے کام لینے اور اور فوجی قوت استعمال کرنے کی ضرورت ہے"۔ یہ خود نطا کے الفاظ ہیں۔

مارکوئس ہیسٹنگز کی حکمتِ عملی کی کامیابی۔

لارڈ ہیسٹنگز نے اس طرح اپنے حکام بالا کی زبردست تائید حاصل کرنے کے بعد لارڈ ویلزلی کے سب کاموں کو اسی میدان میں پایۂ تکمیل پر پہنچا دیا جہاں بارہ سال قبل ان کی کامیاب ترقی روک دی گئی تھی۔ جس خوبی سے اس کام کا آغاز ہوا تھا اُسی پر اس کا انجام ہوا۔ گورنر جنرل نے اس کی تکمیل کے لئے جو زبردست وسائل جمع کئے تھے ان کے استعمال میں اور فتح حاصل کرنے اور حاصل ہونے کے بعد اس سے استفادہ اٹھانے میں بہ حیثیت ایک سپہ دار و مدبر کے اعلیٰ جوہر نمایاں کئے۔

برطانیہ کا ہندوستان میں اقبال و اقتدار

لارڈ ہیسٹنگز کے دورِ حکومت کے ختم پر انگریزوں کی جو حیثیت تھی وہ اس سے بہت مختلف تھی جو لارڈ موصوف

کے ہندوستان پہنچنے کے وقت تھی۔ کمپنی کے علاقوں میں معقول اضافہ ہوا۔ اس کی آمدنی میں ترقی ہوئی۔ پنڈاریوں کا خاتمہ ہوا پیشوا کو اپنے تخت و تاج کو خیرباد کہنا پڑا۔ اور دریائے گنگا کے ساحل پر جو مقام اس کے لئے تجویز کیا گیا وہاں قیام کرنے پر وہ مجبور ہوا۔ سلطنت ناگپور برطانوی حکومت کے تحت آگئی۔ صرف سندھیا ایک ایسا حکمراں تھا جس کے وسائل میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی لیکن اس نے اپنے افعال سے یہ ثابت کردیا تھا کہ اب اس کے تمام بلند حوصلے ختم ہو چکے ہیں۔ (۵۹۲)

مرہٹے اپنے احساسات اور اپنے مسلک۔ اپنی لوٹ مار کی عادت اور اپنے طریقۂ جنگ کی وجہ سے جس میں غارت گری خاص طور پر شامل تھی اور جس پر ان کی پوری حکومت کی بنیاد قائم تھی[۱] برطانوی قوت کے حقیقی دشمن تھے۔ جن دو حکومتوں کے مقاصد اور اصول میں ہمیشہ تصادم ہوتا رہے ان میں کبھی مستقل طور پر صلح نہیں ہوسکتی۔ اس قوم کی قوت کو پہلے لارڈ ویلزلی نے ایک زبردست صدمہ پہنچایا۔ اور اس کا خاتمہ لارڈ ہیسٹنگز کے ہاتھ سے ہونے والا تھا۔ اس قوم کے باقی ماندہ فرمانرواؤں سے جو معاہدے ہوئے ان سے اس کی توثیق بھی ہوگئی ہے اور ان کے دائرۂ عمل کو اس قدر زیادہ محدود کردیا گیا ہے کہ اب وہ مثل سابق ہندوستان کے عام امن میں قطعی خلل انداز نہ ہوسکیں گے۔

جب پنڈاریوں اور مرہٹوں سے جنگ ختم ہوئی تو لارڈ ہیسٹنگز نے برطانوی حکومت کی شہنشاہی کا اعلان کرنے میں قطعی پس و پیش نہیں کیا کیونکہ بلاشبہ اب وہی اس کی مالک تھی اور جس طریقے سے ہندوستان کے ہر فرمانروا اور سردار نے اس اعلان کا استقبال

---

[۱] اس انوکھی قوم کی حکومت کے اصولوں کے لئے ملاحظہ ہو وسط ہند، صفحہ (۶۶) جلد اول۔

کیا جسکی رو سے کمپنی پر عام امن برقرار رکھنے کی ذمہ داری عاید ہوتی تھی اس سے اندازہ ہوسکتا
ہے کہ آیندہ کس قسم کی نعمتوں کی توقع کیجاتی ہے جن اصول پر اس اقتدار اعلیٰ کی بنیاد قایم کی گئی تھی (۵۹۳)
وہ ایک دوسری کتاب میں توضیح سے درج ہیں۔ یہاں صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ کمزور کی
دستگیری۔ زبردست کی سرکوبی اور جن پر ہمیں اقتدار و اثر حاصل ہے ان سب کی فلاح و
بہبودی اور خوشحالی کی ترقی اس کے خاص مقاصد ہیں۔

لارڈ ہیسٹنگز، گورنر جنرل کے عہدے پر نو سال فائز رہنے کے بعد ۱۸۲۳ء میں انگلستان واپس ہوا۔ اسکے دور کے چند غیر اہم امور کی بابت اختلاف آرا پایا جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ اس سے اختلاف رکھتے ہیں اگر انھیں حق بجانب تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی ان کاموں کی نوعیت ایسی نہیں ہے جسکی وجہ سے اس تحسین و آفریں میں ذرہ برابر بھی فرق آسکے جو اسکے دور کے تمام اہم سیاسی کاموں پر کیجاتی ہے۔

تمت

له بحوالۂ وسط ہند صفحہ ۲۶۴ جلد دوم۔

صحت نامہ سیاسی تاریخ ہند

جلد اول (میلکم)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۹	۲۲	اہم وصول	اہم اصول	۹۶	۱۹	وفادار ہے گا	وفادار رہے گا
۲۵	۲۰	قیام لی	قیام کی	۱۰۲	۱۶	کرڑلا	کہڑلا
۳۱	۱۳	خظر	خطر	۱۰۶	۲۳	سندھیپا	سندھیا
۳۴	۲	ہذہب	مذہب	۱۰۹	۹	منرل	منزل
۴۰	۷	کشتر	کمشنر	۱۱۳	۲۴	ہردار	سردار
۴۳	۱۹	علقمند	عقلمندی	۱۲۸	۱۰	دونوں کی ضرورت	دونوں انگریزی
۴۴	۱۵	کارنولس	کارنوالس			نہیں۔	بٹالین کی ضرورت نہیں
"	۲۱	اصطلاحات	اصلاحات	۱۴۶	۵	سرجان شعور	سرجان شور
۵۸	۲۳	کے	کہ	۱۵۲	۲۵	عمل	عمل میں
۶۰	۳	کرنے لئے	کرنے کے لئے	۱۵۳	۱۳	کرتا تھا	کرنا تھا
۶۷	۱۷	ضروری تیاری جو	ضروری تیاری میں جو	۱۶۷	۹	پہ	پر
۷۱	۶	بتا چلتا	پتا چلتا	۱۹۰	۲۱	معتوجہ	مفتوحہ
۷۶	۵	مسالحوں	مصالحوں	۲۳۲	۱۳	حفاظت	حفاظت سے
"	۱۰	مارہا تھا	مار رہا تھا	۲۳۴	۲۲	ہدایت	ہدایات
۸۰	۸	عرض سے	غرض سے	۲۴۷	۲۴	اوسیاسی	اور سیاسی
"	۱۲	آپ نو	آپ کو	۲۵۰	۱۴	لے	نے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۲۶۸	۱۶	دریاسے چیل	دریائے چیل	۳۳۶	۱۶	ولزکی	ولزلی
۲۷۵	۴	اودے	اودے پور	۳۵۷	۵	لاڑ	لارڈ
۲۸۹	۴	ے سود	بے سود	۳۸۴	۴	نہیں	میں
"	۲۱	اصول	وصول	۳۹۴	۲	فرماں راؤ	فرماں روا
۲۹۰	۷	ایک سخت	یک لخت	۳۹۹	۷	جنکسن	جنکنسن
۲۹۶	۴	کو	×	۴۲۸	۲	د فوائد	جو فوائد
۳۱۳	۶	دسس ہزار	دس ہزار سوار	۴۶۴	۱۶	سے	×
۳۳۲	۴	تااہل	نااہل	"	۲۵	سعروض	معرض

تمت